THE HAREEM

لکھنؤ

[illegible] آخر میں جلد ساز نے ڈنڈی ماردی۔ سالنامے کی سلائی [illegible] کہ خریداروں کو ملنے کے بعد اسٹیچ کھلنے کی شکایتیں بھی [illegible]

[illegible] افسوس ہے کہ نقاب کو حریمی بہنوں نے زیادہ [illegible] اس کے سلسلے میں میں اتنا ہی کہوں گا کہ جن حالات [illegible] حفت بہن نے یہ ناول لکھا وہ بڑے صبر آزما تھے، ان کی صحت [illegible] تھی، بہرحال کسی بھی مصنف کے تمام ہی ناول یکساں دلچسپی [illegible] نہیں ہوتے۔ نرم گرم ہوتے ہیں، اس لیے اگر نقاب کو زیادہ [illegible] نہیں کیا گیا تو انشاء اللہ تعالیٰ حفت بہن اس کی تلافی کردیں گی۔

[illegible] کر چھ روپیہ کا نقصان

حریم خواتین کا پرچہ ہے۔ اس سے انھیں کی دلچسپیاں متعلق [illegible] ہیں۔ مرد حضرات کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ حریم کی سالانہ قیمت کا منی [illegible] کرنے کیلئے پوسٹ آفس میں لائن لگائیں اس لیے زیادہ تر بہنیں [illegible] وی۔ پی سے ہی منگاتی ہیں، تاکہ گھر بیٹھے روپیہ دے کر اسے وصول [illegible] فرمالیں۔ اگر ہم وی۔ پی سے رسالہ بھیجنے کا طریقہ ختم کردیں تو شاید ۲۵ فیصدی بہنیں ہی خریدار رہ سکیں۔ لیکن ہماری اس درخواست پر [illegible] بہت سی بہنوں نے توجہ نہ فرمائی کہ اگر خریداری منظور نہ ہو تو ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر یا یہ بھی گوارہ نہ ہو تو بیرنگ خط لکھ کر ہی دفتر کو اطلاع [illegible] دیں کہ انھیں خریداری منظور نہیں۔ ہمیں شکوہ ہے کہ پچاسوں [illegible] نے وی۔ پی وصول نہیں فرمائے۔ اور اس طرح ہر وی۔ پی [illegible] محصول ڈاک کا نقصان ہوا۔ اخلاق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر [illegible] خرچ کرکے کسی کو چھ روپیہ کے نقصان سے بچایا جاسکے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔ پھر حریم سے تو ہر خریدار بہن کا ایک رشتہ ہوتا ہے اس لیے اس کے نقصان کا تو خیال رکھنا ہی چاہئے۔

مولانا وحیدالدین خاں کی قدر افزائی

معزز معاصر صدق جدید لکھنؤ میں شائع شدہ یہ خبر نظر سے گزری کہ مشہور دینی ماہنامہ الرسالہ کے اڈیٹر جناب مولانا وحیدالدین خاں [illegible] پاکستان نے موصوف کی کتاب "پیغمبر انقلاب" پر دس ہزار روپیہ کا نقد انعام مرحمت فرمایا ہے۔ جن حضرات نے الرسالہ یا مولانا موصوف کی دیگر تصانیف کا مطالعہ کیا ہے انھیں یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ جس کتاب پر انعام دیا گیا ہے وہ کتنی معیاری اور عظیم ہوگی۔ ستائش و قدر یک جہتی کی علم بردار ہماری حکومت بھی اس سلسلہ میں مولانا وحیدالدین خاں صاحب کو نوازے۔

مفارقت جھیلنے والی دلہنیں

پاکستانی اخبار کی یہ خبر افسوسناک ہے کہ وہاں سے پچیس فی صدی نوجوان اور جوان مرد عرب ممالک میں دولت کمانے کے لئے چلے گئے ہیں۔ ان میں کے بیشتر شادی شدہ ہیں۔ کچھ ایسے جن کی شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور کچھ ایسے ہیں جو غیر شادی شدہ تھے، بعد میں شادیاں کرکے اپنی نئی نویلی دلہنوں کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

کون نہیں جانتا کہ شادی کے بعد میاں بیوی ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں اس لئے کہ انھیں ازدواجی زندگی کے کیف و سرور کا علم ہوجاتا ہے اور انھیں جدا رہ کر زندگی کے دن گذارنا دشوار ہوجاتا ہے۔ خصوصیت سے ایسی صورت میں جبکہ ان کے لئے کوئی کام نہیں ہوتا۔ وہ شب و روز بس اپنے شوہروں کی یاد میں تڑپا کرتی ہیں، جو انھیں پیسہ کما کما کر بھیجا کرتے ہیں۔

اخبار نے لکھا ہے کہ اس دولت کو وہ فیشن پرستی اور ذہنی عیاشی پر صرف کرنے کے لئے ایسے کلبوں میں جانے لگی ہیں جہاں نشہ آور چیزیں ملتی ہیں۔ جن کا استعمال اب اتنا عام ہوتا جارہا ہے کہ [illegible] بھی ان سے کمتر ہی محفوظ رہ پاتی ہیں۔

یہ عورتیں گھریلو مشاغل میں مبتلا رہنے پر مجبور ہوتیں تو ان کا وقت بھی کٹتا رہتا اور اخلاقی برائیوں سے بھی بچی رہتیں، لیکن جہاں دولت کی فراوانی ہو، وہاں کوئی بھی عورت گرہستن بن کر نہیں رہ سکتی۔

سب ہی جانتے ہیں کہ پاکستان میں فیشن انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ عیش و عشرت کے سامان کی بہتات ہے۔ آزادی تو غیر مغربی ممالک سے بھی شاید بڑھی ہوئی ہے۔ شوہروں سے برسوں بچھڑی رہنے والی یہ نئی نویلی دلہنیں کس طرح اپنے نفس کو قابو میں رکھتی ہوں گی۔ سوچنے کی بات ہے۔ خصوصیت سے ایسی حالت میں جبکہ وہ اس درجہ آزاد ہوں کر کلبوں کی رونق بنتی ہوں ـــــ کیا دولت ہی سب کچھ ہے۔ کیا دولت کمانے والے جوڑے اپنی ازدواجی زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر اس کمائی سے کیا حاصل۔

محسنِ انسانیت

از محمد سرفراز ناز

خاوند بیوی کا محافظ اور اس کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہے اس بارے میں اس سے پرسش ہو گی۔

عرب کی زمین پر جو ہمیشہ انسانوں کے خون سے رنگین رہتی تھی۔ انسانیت پامال ہو چکی تھی شرم و حیا نام کو نہ تھی کوئی ضابطہ نہ تھا کسی قانون کا تصور نہ تھا۔ ہر شخص ہر قبیلہ جھوٹی انا کے نشے میں مست رہتا تھا۔ کوئی حکومت نہ تھی۔ عربوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ بالکل معمولی معمولی بات پر جنگ چھڑ جاتی تو سالہا سال تک رکنے کا نام نہ لیتی ان ہی لڑائیوں کے بارے میں حالی نے کہا تھا۔

کبھی پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
کبھی گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

انسانیت حیوانیت کی سطح پہ پہنچ گئی تھی۔ حرام حلال کی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ اخلاق کا جنازہ نکل چکا تھا۔ ایران کی شمع گل۔ ایک خدا کا نام لیوا کوئی نہ تھا۔ کوئی درخت کو اپنا خدا مانتا تھا تو کوئی پتھر کی پوجا کرنے کو جزو ایمان سمجھتا تھا۔ کوئی سورج کی پوجا کرتا تھا اور کوئی چاند کی۔ کوئی پانی کو باعث نجات سمجھتا اور کوئی آگ کو اپنا دیوتا سمجھتا رہا تھا۔

معاشرے میں عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کو ایسی زمین تصور کیا جاتا تھا۔ کہ جو بیٹا پیدا کرے تو گوارا لیکن اگر لڑکی پیدا ہوتی تو زندہ ہی دفن کر دیتے یا قتل کر دیتے۔ شراب و شباب کی محفلیں ان کی زندگی تھی عورت کو پستی کی انتہا گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا تھا۔

آخر کار خدا کی کو جوش آیا اور اس نے اپنی اس مخلوق پر رحم کھا کر اسے ان پستیوں سے نکالنے کے لئے وہاں اپنے محبوب خاص کا ظہور فرمایا۔

عرب کی زمین پر ایک ایسا پھول کھلا۔ جس نے ساری دنیا کو خوشبو سے معطر کر دیا۔ ایک ایسا نور آیا جس نے [illegible] روشنیاں بکھیر دیں۔ بقول حفیظ جالندھری

ترے آنے سے رونق آ گئی گلزار ہستی میں
شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضل ربانی

زمیں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی۔ اجڑے باغ پھر سے رنگ برنگے پھولوں سے لد گئے حضرت آمنہ کی خوش بخت گود سے جنم لینے والے میرے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں ظلمت و بربریت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ ہمارے حضور رحمۃ للعالمین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاج رسالت پہنے جلوہ افروز ہوئے اور اس شان سے آئے کہ سارا جہاں بقعہ نور بن گیا۔

جہاں تاریک تھا ظلمت کدہ تھا سخت ...
کوئی پردے سے کیا نکلا کہ گھر گھر میں اجالا ہو گیا

حضور کی باطل شکن ندائے حق سے شیطان تھرا اٹھا۔ اور دنیا کی بت پرستی لرز اٹھی۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر تشریف لائے جنہوں نے انسانیت کو وحدانیت کا سبق دیا۔ اور بالآخر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور خدا اس وقت تک کسی کو مومن نہیں مانتا جب تک خدا کی وحدانیت کے علاوہ پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

(ترجمہ) نہیں کوئی معبود مگر اللہ (اور) محمد اللہ کے رسول ہیں۔

نام محمد میں وہ لذت ہے کہ جس کی مٹھاس اہل ایمان ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

آپ ساری دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے۔ کفر و شرک کی جگہ کو آپ نے نور ایمانی میں ڈھال دیا۔ عربوں کو جہالت سے نکال کر عالموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کے دشمن تھے آج بھائی بھائی تھے

وہ لوگ جو کفر و شرک [illegible]
خدا کی راہ [illegible]

[illegible] پہلے لوگ ان کی اہمیت سے ناآشنا تھا آپ نے بتایا جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔

بیٹیوں کو وہ لوگ زندہ دفن کر دیتے تھے تو آپ نے فرمایا۔

• جس نے دو بیٹیوں کی پرورش کی وہ جنت کا حقدار ٹھہرا۔

بیوی کی گھر کی حیثیت ایک بے زبان کی سی تھی۔ آپ نے فرمایا۔

• خاوند بیوی کا محافظ اور اس کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہے اسس بارے میں پرسش ہوگی۔

آپ محسن انسانیت اور محسن انقلاب ہیں کہ انسان اور انسانیت کی تکمیل آپ نے ہی کی۔ آپ نے انسانیت کی کایا پلٹ دی۔ انسان کو قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اپنے اسوہ حسنہ سے ایسا عملی نمونہ پیش کیا۔ کہ دنیا [illegible]۔

قرآن کی ایسی عملی تفسیر پیش کی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ عرب کو جنھیں اخلاق کا صحیح ادراک نہ تھا انھیں اخلاق کا پتہ دیا۔ تقویٰ۔ ذکر۔ شکر۔ تدبیر تفکر۔ عدل۔ احسان۔ تحمل۔ صبر۔ عفو۔ امانت۔ صداقت۔ علم۔ خدمت خلق۔ آداب مجلس۔ آداب شرب و طعام۔ حقوق اولاد۔ حقوق والدین حقوق زوجین۔ مسجد۔ مکتب۔ معاشرہ۔ اقارب۔ ہمسایہ۔ شہری۔ امت اخوت۔ جہاد۔ تبلیغ۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کو باہم مربوط کیا۔ اور یوں انسانیت کی تکمیل ہوئی

وہ لوگ جو کہ کل جاہلوں کی صفوں میں تھے۔ آج وہ عالم تھے۔ فاضل تھے۔ امام تھے۔ مجاہد تھے حاکم تھے۔ غرض آپ نے انسان کو اس کے اصلی و اعلیٰ مقام سے آگاہ کیا۔

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا!

اسے اس کے فرائض کے ساتھ حقوق سے بھی آشنا کیا۔ اسے مساوات کا سبق دیتے ہوئے ایک خدا کی پرستش کرنے کا سبق دیا۔ اس کا عملی اور جامع اظہار ہمیں عرفات کے میدان میں حجۃ الوداع [illegible] آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

دیگر باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا۔

آج کے دن تم گواہ رہنا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اس [illegible] اللہ تعالیٰ کے حضور بھی سجدہ ریز ہوں میں

تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اور وہ ہے قرآن حکیم اور میری سنت۔

اور میں ہوں

رخشاں ملیح آبادی

دلِ خلوت نشیں ہے اور میں ہوں
غمِ دنیا و دیں ہے اور میں ہوں

مرا خلوت کدہ ہے رشکِ جنت
جمالِ دل نشیں ہے اور میں ہوں

منور ہو رہا ہے خانۂ دل
کوئی ماہ مبیں ہے اور میں ہوں

ذرا تھم جا ابھی اے شامِ فرقت
کہ زلفِ عنبریں ہے اور میں ہوں

نظر جو آ گیا جلوہ کسی کا
تو اک عالم حسیں ہے اور میں ہوں

ہوئے روپوش سب رنگیں نظارے
نگاہِ حسن بیں ہے اور میں ہوں

تخیل لے گیا مجھ کو وہاں تک
جہاں کوئی نہیں ہے اور میں ہوں

بڑھی آتی ہے جو سوئے نشیمن
وہ برقِ آتشیں ہے اور میں ہوں

جسے سمجھے تھے قاتل اے درخشاں
رگِ جاں سے قریں ہے اور میں ہوں

• شوہر کا غصہ، بیوی کی روح کا سرطان ہے۔ (مارگز)

• "شوہر بننا" فل ٹائم جاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت ناکام ثابت ہوتے ہیں [illegible] اپنی بیویوں کے مسائل کو پارٹ ٹائم بنیاد پر حل کرتے ہیں۔ (رنجلے)

• میرا شوہر ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اپنا عکس دیکھ سکتی ہوں۔ (لیبوس)

قصہ ایک پڑوسی کا

عبدالمعید خاں

میں چونک گئی مگر پھر اسے واہمہ سمجھ کر مشین پر جھک گئی۔
یہ فراک پوری کرکے ابھی تو ببلو کا سوٹ سینا ہے۔ تتلا تتلا کر بولنے والا ببلو میری نظروں میں گھوم گیا، تب ہی ننھا ببلو مچل کر گود میں ہوا۔
"باجی پہنے ہمانے کپڑے سیں" (باجی پہلے ہمارے کپڑے سیں)
اور پھر رومانہ بھی چہکی: "نہیں باجی پہلے ہمارے کپڑے سیں"
"نہیں باجی جانا" ببلو مچل گیا۔
"اچھا، اچھا بھئی دونوں کے کپڑے پہلے سی دوں گی۔ میں نے انھیں مطمئن کرنا چاہا۔

یہ پھول! کیا سچ مچ کسی کی زندگی میں صرف پھول ہی پھول ہوتے ہیں؟ ایسا تو ہونا ناممکن ہے نا۔ پھول کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ضروری ہے۔ اب ہر کسی کی زندگی کوئی اس فراک کے کپڑے کی طرح تھوڑی ہے ——— جس پر چاروں طرف پھول ہی پھول بکھرے ہیں۔ سرخ سرخ، زرد زرد سے،
میں نے اپنی اور اپنی بیوہ ماں کا موازنہ پھولوں سے کر ڈالا۔
فراک پر بخیہ کرتے کرتے میں زندگی ہی کے بخیوں میں اُلجھ گئی۔
اوہ یقیناً کوئی کراہ رہا ہے۔ میں نے چونک کر آواز کا اندازہ لگانا چاہا۔ کراہ اور پھر سسکیاں، اماں بی نے سسکیوں کی سرسراہٹ پر کروٹ بدل کر آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر کروٹ بدل لی ——— سسکیاں تیز ہو گئیں۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ اٹھ کر میں نے اماں بی کو جھنجھوڑا۔
"اماں بی اٹھو تو، پڑوس کی کوٹھری میں کوئی کراہ رہا ہے شاید دکھی رہا ہے"
اماں بی نے تیزی سے چپل پہنی اور دوڑتی ہوئی برابر والے پڑوسی کے دروازے پر جا کر اسے کھٹکھٹایا، شاید دروازہ کھلا تھا۔ جب ہی اماں بی دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے خیال کے گھوڑے دوڑائے۔

پڑوس کی یہ کوٹھری پچھلے پانچ ماہ سے خالی تھی۔ شاید اسی ماہ اس میں کوئی آ کر رہا ہے، پتہ نہیں کون ہے؟ صبح کا جاتا ہے تو شام کو آتا ہے۔ کبھی اتفاق ہی نہ ہوا دیکھنے کا اور دیکھتی بھی کیسے کہ شرفا کی اس لائن میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور سامنے والی لائن کے پہلے سرے سے دوسرے سرے تک آتے سامنے دروازوں پر شاید ہر وقت پہرہ ہی رہتا ہے۔ ابھی اسی سال کے تیسرے کو اوڑھنی ہی سے تو میرا ذرا دروازے میں کھڑی ہو کر گلی میں جھانکنے لگی تو شام ہی کو محلے کا ایک وفد میرے ابا کے پاس شکایت لے کر پہنچ چکا تھا۔
"صاحب محلے میں جوان لڑکے بھی رہتے ہیں۔ جوان لڑکی کا دروازے میں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔"
اور پھر چپکے کے ایک ہی وار میں میرا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ اس قدر پابندِ رسوم محلے میں بھلا میں اس نئے پڑوسی کو کیسے دیکھ سکتی تھی؟ لے دے کے چپکے کی مدد گار امداد تھی نہ ہی محلے والوں کا ہجوم اپنے دروازے پہ برداشت کر سکتی تھی ——— میں تیزی سے واپس آئی۔ اماں بی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"بخار میں تپ رہا ہے بے چارہ اکیلا ہی ہے تو جلدی سے چائے بنا۔ میں سامنے سے مرزا صاحب کو آواز دیتی ہوں۔"
چائے کا پانی چولہے پر چڑھاتے ہوئے میں نے اماں بی کی ہوئی آواز سنی جو مرزا صاحب کو کل کے واقعات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ اماں بی کی آواز سے اور دو ایک دروازوں میں سے بھی کا فرد باہر نکل آئے اور سب مل کر اس اکیلے پڑوسی کی تنگ سی کوٹھری کی طرف بڑھے ——— کافی دیر تک بولنے کی آوازیں آتی رہیں مگر بولا کیا جا رہا تھا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔
بجھے کوئلوں پر چائے کی کیتلی چھوڑ کر میں پھر مشین پر جھک گئی۔
شاید مشین میں تیل ختم ہو گیا جب ہی کھڑ کھڑانے لگی تھی
مشین اور انسان ..... انسان اور مشین
اگر میں گھنٹہ دو گھنٹہ مشین میں تیل نہ ڈالوں گی تو کون سی مشین خراب ہو جائے گی یا ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ پر انسان۔ اوہ میں تیزی سے باورچی خانے کی طرف دوڑی اس بیمار پڑوسی کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کے آنے تک اس کو گرم چائے کی ضرورت ہے، جو نہ ملی تو ہو سکتا ہے کہ میرا دامن

الجھنے لگا۔

ارے یہ لوگ! یہ مرزا صاحب اور دیگر ارکان وفد یہ اتنی دیر سے کون سا مسئلہ حل کر رہے ہیں اور یہ اماں بی؟ مجھے اماں بی پر ڈھیر سا غصہ آیا۔ کوئلے بھی راکھ ہو چکے اور چائے بھی ٹھنڈی ہو چلی۔ مگر ان ارکان وفد کی موجودگی میں اماں بی کو کیسے پکاروں؟ ہو سکتا ہے میری آواز سنتے ہی یہ وفد میرے گھر میں گھس پڑے اور کوئی حکم نافذ کر دے کوئی خطرناک قسم کا حکم اور پھر میں نے تو آٹھ کلاس بھی پڑھی ہیں۔ اسکول میں پڑھا کر بے راہ ہو جانے کا فتویٰ بھی صادر ہو جائے تو؟

پڑوسی کے گھر میں آوازوں کی تیزی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شاید مرزا صاحب گرج رہے تھے "ہم کیا جانیں یہ صاحبزادے کون ہیں۔ شریف بھی ہیں یا......؟ اور پھر ہم ان کے لئے کر ہی کیا سکتے ہیں؟"

تب ہی اماں بی کی مایوس آواز سنائی دی۔

"مرزا بھائی! آپ سے تو اس کی امید نہ تھی۔ یہ ہمارے لئے اجنبی ہے تو کیا انسانیت کسی کے لئے اجنبی نہیں ہوتی۔ آپ جائیں اس کے علاج کے لئے میں ڈاکٹر کراؤں گی اور خود ہی دیکھ بھال کروں گی" آخری جملہ اماں بی نے تند آواز میں کہا

"انسانیت!۔۔۔ انسانیت کے دھوکے میں اپنے مطلب حل کئے جاتے ہیں، یہ ہم خوب جانتے ہیں"

مرزا صاحب غراتے ہوئے تیزی سے واپس پلٹے تو ان کے ساتھ باقی ارکان وفد بھی لوٹ گئے۔ پسینے میں تر بتر اماں بی بڑبڑاتی ہوئی آئیں۔

"دوسروں کو بدنام کرتے ہیں اور خود اپنی خبر نہیں لیتے۔ بیمار مر رہا ہے، اکڑ گئے ہیں۔ انسانیت کی بحث میں جلدی سے چائے کا کپ میں نے اماں بی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ارے ہاں۔ اس بحثا بحثی میں چائے تو بھول ہی گئی واہ" کانپ نے کر وہ تیزی سے پلٹیں، "بس اب خود ہی ڈاکٹر کو بلانا ہے" وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔ اماں بی کی اس سرگرمی پر میں بے ساختہ ہنس دی.... ارے اماں بی! تم تو اس وقت سچ مچ فلسفی ہو رہی ہو.... انسانیت کے لئے کتنی اچھی اور سچی بات کہی تم نے "انسانیت کسی کے لئے اجنبی نہیں۔" مگر وہ مرزا صاحب کی طرف سے "انسانیت کے دھوکے میں اپنے مطلب حل کئے جاتے ہیں" تو بیچارے مرزا صاحب! میں بھی خوب جانتی ہوں اس بات میں آپ کا کون سا اشارہ پوشیدہ ہے۔ مگر اپنے نام کی مناسبت سے آپ اتنا تو نہ کریئے۔

مرزا صاحب کی اتنی ہی سی بات نے ان کی شخصیت کی ساری عمارت دھڑام سے گرا دی۔

ڈاکٹر کے پاس سے واپس آئے اور وہاں تیمارداری اور وہ سارے سوالات حل ہو گئے تھے۔ جو رگ تجسس نے ترتیب دیئے تھے، آخر انسانیت اجنبی ثابت نہ ہوئی بلکہ اپنائیت کا ایسا گہرا جذبہ بیدار ہوا کہ اماں بی ایک حقیقی ماں کی طرح اس پر نثار ہو جاتی تھیں۔

خلوص اور محبت بڑی چیز ہے۔ جہاں تک وہ دو ہیں۔ جو انسان کی روح تک کو تسخیر کر لیتی ہے.... دراصل یہی انسانیت ہے یا پھر انسانیت کی معراج۔

میں نے حل شدہ سوالنامے پر نظر ڈالی، اچھا تو یہ بیمار صاحب یتیم ہیں، ماں باپ کی لازوال محبت نے بچپن ہی میں محروم کر دیا، اور ماں باپ کا بھی کیا قصور؟ موت کے آگے کسی کی چلی ہے کسی کے آنسوؤں نے اسے روکا ہے؟ اور پھر جب محبت کا اصل منبع ہی بند ہو جائے تو کہاں.... کسی طرف کوئی روشنی پھوٹتی ہے؟ اور شاید کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا... تب ہی تو تمام عزیزوں کو ٹھکرا کر دہلی سے کراچی آ گیا۔

بلو اور رومانہ کے سلے ہوئے کپڑے بدستور میز پر پڑے تھے۔ بلو کی امی ابھی تک کپڑے لینے نہ آئیں جلدی کا اس قدر شور مچایا تھا کہ مشین کے ساتھ ساتھ میں خود بھی مشین بن گئی تھی۔

شام کو بلو کی اماں کپڑے لینے آ ہی گئیں، ادھر میں تھکی ہی تھی کہ انہوں نے بیمار پڑوسی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اماں بی آپ کچھ سن بھی رہی ہیں۔ مرزا صاحب کی طرف تو بتا رہی تھی، آپ کا پڑوسی غنڈہ ہے آپ کس کی خدمت میں لگی ہیں۔؟

اماں بی نے یہ جان کر کہ مرزا صاحب تو ہیں ہی مخالف، اس بات کو ایک گپ کہہ کر ٹال دیا اور میری رگ تجسس نے پھر سے ایک سوالنامہ

ترتیب دے ڈالا۔ مرزا صاحب کی خادمہ نے یہ بات کہی تو کیوں؟
یہ مشہور ہے کہ رائی کا پہاڑ بنا دیا جاتا ہے، اگر چہ بات کبھی ہوتی ہے، اس میں ذرا سی اصلیت ضرور ہوتی ہے اور شاید اس سوال کے حل ہونے کا وقت قریب ہی تھا۔ بیماری سے چھٹکارا پاتے ہی وہ مزدوری پر چلا گیا۔ شام کو اماں بی سامنے والی لائن میں تیاری کے کپڑے دینے گئیں۔ اور میں باورچی خانے میں مصروف ہو گئی، عجب محلہ اس قدر قدامت پسند اور شریف ہو تو کس بات کا ڈر۔ اماں بی بے دھڑک دروازہ کھلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب ذرا سامنے ہی تو گئی تھیں، لوٹ آئیں گی لمحہ بھر میں۔ میرے ہاتھ تیزی سے آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئے، اور میں نے اپنی ساری سوچیں آنے والے کل کے کاموں پر موڑ دیں۔
دروازے پر کسی کی آہٹ ہوئی، میں سمجھی اماں بی ہوں گی۔ بدستور سر جھکائے آٹا گوندھتی رہی۔
"اماں بی"! ۔ کوئی سرور آواز میں بولا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ سامنے چوڑے چکلے شانے والا گٹھیلا سا نوجوان کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی زردی اور سرخی تھی۔
"کون ہے؟" میں گھبرا گئی۔
"دیکھئے بہن جی میں آپ کا پڑوسی ہوں، میں اماں بی کے پاس آیا تھا"
"اماں بی تو نہیں ہیں۔ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔
اچھا تو یہ روپے ہیں۔ اماں بی کو دے دیجئے گا۔ روپے رکھ وہ تیزی سے واپس لوٹ گیا۔
فرطِ خوف سے میں دروازہ بند کرنے کو دوڑی، کہیں محلے کا کوئی دیکھ نہ آ جائے، مرزا صاحب کوئی حکم نافذ نہ کر دیں، دیر تک اپنی گھبراہٹ کو قابو میں کرتی رہی، ہوا میں اڑتے ہوئے نوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اچھا تو یہ ہے ہمارا پڑوسی! مگر مرزا صاحب کی خادمہ نے کہا تھا غنڈہ ہے۔ لیکن میرے سامنے تو اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ ہاں البتہ اس کے چہرے پر اس کی آنکھیں بڑی بے باک تھیں۔ جنھیں میں نے حیرت سے لمحہ بھر کو دیکھا تھا۔ پھر وہ تو نظریں جھکائے بات کر رہا تھا۔ مگر کیا یہ جرم کم ہے کہ بغیر اطلاع گھر میں گھس آیا۔

اور یہ نوٹ کیوں دے گیا ہے؟ پورے بیس روپے تھے، نوٹوں نے مجھے الجھا دیا۔ تب ہی اماں بی گھر میں داخل ہوئیں۔ نوٹ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے لمحہ بھر میں تمام تفصیل سنا دی۔ اماں بی الٹے پیروں واپس ہوئیں اور پھر کچھ دیر بعد نہیں نہیں کرتی ہوئی لوٹ آئیں۔ پڑوسی بھی نوٹ لئے پیچھے چلا آ رہا تھا۔
لے لیجئے اماں بی۔ آپ نے میری اتنی خدمت کی ہے کہ میرا کوئی عزیز بھی نہ کر سکے گا۔ آپ نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تو سب کچھ کیا۔ اب میں بھی اپنی ماں سمجھ کر آپ کو یہ حقیر رقم دے رہا ہوں۔
نہیں بیٹے، تمہاری خدمت کوئی اس لالچ میں تھوڑی کی ہے۔ میں تمہاری یہ رقم ہرگز نہ لوں گی۔ اماں بی کی تیز بانداز آواز پر وہ مجبوراً خاموش ہو گیا۔ مگر پھر فوراً ہی میری طرف مڑ گیا۔
آپ خود ہی کہئے بہن جی میں نے آپ کو اتنی تکلیف دی اب آپ میری ذرا سی بھی خدمت قبول نہیں کریں گی۔ انسانیت کے ناطے میرا بھی تو کچھ رشتہ ہے آپ سے"
اس کے لہجہ میں اتنی مایوسی تھی کہ مجھے اس پر رحم آ گیا میں نے بڑی بے باکی سے اسے دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے جوتے کی نوک سے زمین کرید رہا تھا۔ میں نے اماں بی کو اشارہ کیا۔ مگر اماں بی نے نفی ہی میں سر ہلا دیا۔ مجھے فوراً ہی ایک ترکیب سوجھی۔
اچھا تو ایسا کیجئے بھیا، ہم روپے لے لیتے ہیں مگر اب آپ ہمارے ہاں ہی کھانا کھائیں گے" میں نے اپنی تجویز پیش کی۔ وہ ایک دم ہی خوش ہو کر اماں بی کی طرف مڑا اور ان کے ہاتھ چومتے ہوئے بولا ——— یہ ٹھیک ہے اماں بی۔ میں کما کر آپ کو دیا کروں گا اور آپ میری تندرستی کا خیال رکھیں گی۔ کیوں منظور ہے نا اماں بی۔

اماں بی نے اس کے اس خلوص، اس محبت سے متاثر ہو کر سر ہلا دیا۔ تو اس نے وہ تمام نوٹ اماں بی پر نچھاور کر دیئے۔
مگر یہ تو بتائیے بھیا، ایک دن میں بیس روپے آپ نے کیسے کمائے؟ میں نے بڑی ہمت سے سوال کیا۔
بندرگاہ پر میں نے سامان اٹھانے کی مزدوری کی تھی۔ یہ دیکھو اماں بی، یہ ٹین کی پتری سے میری انگلی زخمی ہو گئی"

اس نے اپنے ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر دکھایا۔ جن پر پٹی بندھی تھی، اور خون پٹی میں سے نظر آ رہا تھا۔

گو وہ بڑی بے باکی سے گھر میں آنے جانے لگا تھا۔ پھر بھی مرزا صاحب اور دوسرے ارکان خاندان کی جانب سے اندیشہ ہی رہتا۔ جس کا اظہار میں نے پہلے ہی اماں بی سے کر دیا۔

پڑوسی کا آنا جانا کوئی معمولی بات نہ تھی، گو اپنائیت کا جذبہ اس قدر تھا کہ وہ گھر کا ایک فرد سا بن گیا اور مجھے جس بھائی کی تمنا تھی وہ مل گیا اور یہ بھی بہت حیرت انگیز بات تھی کہ کوئی غیر منہ بولا بھائی بن کر بالکل ہی سگا بھائی جیسا ہو جائے، مگر محلہ میں بڑی ہنڈیاں پک رہی تھیں اور کھچڑیاں بھی پک رہی تھیں۔

ادھر میں نے بھی چند سوال ترتیب دیئے تھے، اور پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ اس کے جوابات ضرور بڑدکا سے پوچھے جائیں گے۔ شام کو جب آم کی تھیلی ہاتھ میں تھامے وہ گھر میں آیا، ابھی دروازے پر ہی تھا کہ میں بول اٹھی۔

"بس وہیں رک جاؤ۔ خبردار آگے نہ بڑھنا"

کیوں؟ وہ حیرت سے رک گیا۔

"یہ بتاؤ تم یہاں بغیر اجازت کیوں آتے ہو؟" میں نے اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ تلخ بنانا چاہا۔ وہ گھبرا گیا۔

"میں؟ اپنی ماں کے پاس آتا ہوں۔ اپنے گھر آتا ہوں۔ اپنے گھر آنے کے لئے تو ضروری نہیں" اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔

"جب ہی اپنا گھر سمجھ کر پہلی دفعہ بھی بغیر اجازت گھس آئے تھے، کیوں؟"

اوہ، وہ میری غلطی ضرور تھی، مگر میں اس دن کچھ زیادہ ہی مسرور تھا دراصل اس دن پہلی بار میں نے سچی خوشی پائی تھی۔ میں نے ایک دن میں ۲۰ روپے کمائے تھے۔ مزدوری پر جانے سے پہلے میں نے سوچا تھا۔ آج اپنے لئے نہیں، اپنی ماں کے لئے، اپنی بہن کے لئے مزدوری کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔

یہ سب کہتے کہتے اس کی آواز کسی خیال کے تحت بوجھل ہو گئی، اماں بی غیرت سے مجھے گھور رہی ہیں، زور سے بولیں۔

"مگر یہ سب انگوائری کس لئے ہو رہی تھی —؟"

"وہ... بس اماں بی... ذرا... پڑوسی جس کا نام جمال ہے پریشان کرنے کے لئے"۔ جمال کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر میں زور سے ہنس دی۔

اچھا یہ بات تھی، ٹھہر تو ذرا شیطان۔ وہ ایک دم جھینپ گیا اور ایک پلپلا سا آم لے کر پوری قوت سے میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ رس میرے منہ سے بہہ نکلا تو وہ زور سے ہنس دیا۔

ارے دیکھو ذرا اس جنگلی کو۔ آم کھانے کا سلیقہ بھی نہیں"

مگر جمال صاحب آپ کو تو خوب سلیقہ ہے، آپ نے تو یہ بھی نہ دیکھا کہ آم مٹی میں اٹا ہوا ہے۔ سارے دانت کرکرے کر دیئے"

اچھی سزا ہے۔ وہ مسکرا دیا۔

تو جناب آپ بھی تیار رہیئے اپنی سزا کے لئے۔ میں نے اسے وارننگ دی۔ اور ایک شام جب اماں بی مرزا صاحب کے ہاں تھیں۔ وہ مزدوری پر سے لوٹ کر آیا۔ تو میں نے فوراً ہی تیر چھوڑ دیا۔

"تم غنڈے ہو"؟

کیا؟ اس کے ہاتھ سے دہی بڑوں سے بھرا مٹی کا پیالہ چھوٹ کر گر گیا، مسالے دار دہی اڑ کر اس کی بے داغ پتلون پر تجریدی آرٹ کی مانند پھیل گیا۔ اضطراری طور پر ہاتھ ملتے ہوئے اس کا سر جھک گیا۔

یہ تم سے کس نے کہا۔ مجھے بتاؤ کیا نہیں ہو"

"نہیں..... نہیں.... میری اچھی بہن نہیں" وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسک اٹھا۔

تھا، جب میری ماں مر گئی تھی، میرا باپ فوت ہو گیا تھا، میرے عزیزوں نے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔ تب میں ایک ذلیل انسان تھا۔ میں نے گرلز کالج کے ہزاروں چکر لگائے، چوری بھی کی تھی، ایک آدمی کو چاقو سے زخمی کر دینے کے جرم میں چھ ماہ جیل بھی کاٹی مگر اب نہیں ہوں۔ اب نہیں ہوں۔ مجھے خلوص کی تلاش تھی انسی اور محبت کی جستجو تھی، تلخی اور جھڑکیوں نے مجھے ذلیل بنا دیا تھا۔ مگر تم جیسی فرشتہ بہن اور اماں بی نے مجھے انسان بنا دیا ہے۔ میری انسانیت پر شک کر کے نفرت نہ کرنا اچھی بہن، ورنہ ایک اچھا آدمی پھر سے برا آدمی بن جائے گا"

وہ بچوں کی طرح اٹھا رہیں۔ زیر بڑی حیرت سے اسے دیکھا اور یہ تو اپنے سے ۔۔۔ رہا ہے جیسے کوئی بچہ اپنا کھلونا چھن جانے پر سسک

اُٹھے، اور کہے میرا کھلونا نہ توڑنا، میرا کھلونا نہ توڑنا۔

تب ہی اماں بی نے گھر میں داخل ہو کر ساری محویت توڑ دی، وہ بچوں کی طرح اماں بی سے لپٹ گیا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اماں بی تمہاری شفقت کی، تمہاری محبت کی ضرورت ہے۔"

اور میں اس کی سسکیوں پر کتنی نادم تھی۔ ارے یہ تو بالکل ہی نیا انسان ہے۔ بالکل ایسا جیسے ابھی ابھی جنم لیا ہو —— شاید اس کے ساتھ کچھ ایسی ہی بات ہوئی ہو، درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ گناہوں کی حد سے گزر کر جب سزا کی حد پر آیا تو گناہ یکایک نیکیاں بن گئے اور ان نیکیوں نے اسے کتنا نیا انسان بنا دیا۔ بالکل ہی سچا انسان۔"

مرزا صاحب اپنی ملازمہ کے کہنے پر یقین ضرور کیجئے مگر خدا کے معجزے پر بھی یقین کیا کیجئے۔ میں نے مرزا صاحب کو مخاطب کر کے دل میں کہا۔

اور تب ہی جمال کی شرافت، سخاوت، انسانیت پر میرا اتنا یقین ہو گیا، جتنا خدا کی وحدانیت کا۔ اب میں جمال سے متعلق کسی بھی قسم کی غلط بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھی، پھر شاید مرزا صاحب کو کچھ جلال آگیا تھا، شام ہی کو مع وفد کے دروازے پر حاضر تھے۔

"کہاں ہے وہ جمال غنڈہ، اس کی یہ مجال، یہ ہمت۔" وہ زور سے دہاڑے۔

کھانا کھاتے کھاتے میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، اماں بی نے حیرت سے نوالہ پلیٹ میں چھوڑ دیا۔ وہ ایک دم خوفزدہ سی آواز میں بولا! میرا کچھ قصور نہیں اماں بی، شام کو واپسی پر سامنے نل پر مرزا صاحب کی ملازمہ اور لڑکی پانی بھر رہی تھیں، ملازمہ نے مجھے غنڈہ کہا تو لڑکی زور سے ہنس دی۔ بس میں بھی نفرت سے تھوک کر چلا آیا۔"

ارے یہ نل بھی عجیب ہے۔ آمنے سامنے کی دو لائنوں کے بیچ کو اڑیوں کے بالکل ہی درمیان کسی پہرے دار کی طرح جہاں عجیب عجیب تماشے ہوتے رہتے، مگر اس تماشہ کی کیا ضرورت تھی اگر اس قدر پابند رسوم محلے میں محترم مرزا صاحب کی دختر عالیہ پانی بھرنے کھڑی ہو جائیں۔ دروازے پر مرزا صاحب کی دوبارہ چنگھاڑ بلند ہوئی تو جمال تیزی سے دروازے پر جا کر دہاڑا۔

مرزا صاحب! غنڈہ جمال تو اپنی عزت کو گھر میں سنبھال کر رکھئے! تماشہ بنا، نل پر کاہے کو سجائے ہیں؟۔

بات بڑھنے ہی والی تھی کہ اماں بی نے معاملہ صاف کیا۔

ٹھیک ہے مرزا صاحب! غنڈہ ہے تو آپ کو خود ہی بچاؤ کرنا چاہیئے۔ آپ کی عزت پر تھوکنے وہ آپ کے گھر میں تو نہ گھسا تھا۔"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ غازی صاحب نے کہا۔ غلطی آپ ہی کی ہے۔ مرزا صاحب، یہ جلال آپ کو گھر کی عزت پر اتارنا چاہیئے۔"

اماں بی نے جمال کو اندر گھسیٹ کر کھٹ سے دروازہ بند کر دیا اور پھر جمال محلے والوں کا موضوع بحث بن گیا۔ لوگوں کے خیالات کچھ بھی ہوں، مگر مرزا صاحب کا تبصرہ سب ہی سے تلخ تھا، وہ زخمی درندے کی طرح پھر رہے تھے۔

اور شاید یہ کسی بے گناہ کے آنسوؤں ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک رات چہل قدمی کرتے ہوئے غازی صاحب نے مرزا صاحب کی دختر عالیہ کا ہاتھ جمال کی کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے پکڑ لیا۔ اور دوسرے لمحے وہ مرزا صاحب کا دروازہ بجا رہے تھے۔

اٹھیے مرزا صاحب مرزا صاحب آج آپ کی عزت خود دروازہ کھول کر باہر نکلی ہے۔"

مرزا صاحب تیزی سے باہر آئے، اور بیٹی کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے، فوراً ہی غازی صاحب کے قدموں پر گر گئے۔ "غازی صاحب خدا کے لئے اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیجئے گا ورنہ میں زندہ درگور ہو جاؤں گا۔ میری عزت آپ کے ہاتھ ہے۔"

اور غازی صاحب نے دوسرے لوگوں کی آہٹ پاتے ہی مرزا صاحب اور بیٹی کو دروازے میں دھکیل دیا۔

"کیا ہوا! کیا ہوا غازی صاحب؟" لوگوں نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

کچھ نہیں، کوئی چور مرزا صاحب کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی سامنے سڑک کی طرف رفو چکر ہو گیا۔" غازی صاحب بھی اپنی قسم کے ایک ہی نیک خصلت آدمی تھے —— جو بات بنا گئے، اور جمال نے دروازے کی جھری میں سے سب کچھ دیکھتے ہوئے بڑی حیرت سے سوچا، مرزا صاحب کی بیٹی اور میرے دروازے میں۔! حیرت انگیز بات ہے! نہ کوئی رشتہ، نہ ناطہ۔! صبح جب اس نے مجھے اور اماں بی کو یہ بات بتائی تو میں ششدر ہی رہ گئی۔ خدا بھی کیا تماشے

پھوپھی کہہ رہی تھیں، کتنا اچھا ہے، جمال خدا نے تمہارے گناہوں کو معاف کر دیا ہے اور خدا نے تمہیں طوفان سے نجات دی ہے۔"

اور پھر جمیلہ کے واقعی رشتوں کی واپسی کے بعد مرزا صاحب کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ اب اتنی جتنی بیٹی کس کے در پر چھوڑ آئیں اور جب یہی سوال کرتے ہی انھوں نے اپنی بیگم صاحبہ کو اماں بی کے پاس دوڑایا۔ بیگم صاحبہ خود ہراساں تھیں آتے ہی اماں بی کے پیر پڑ گئیں اور شاید جمال نے تمام تر انسانیت برتتے ہوئے اپنے لئے جنت کے دروازے کھلوائے۔ پھر مرزا صاحب کی بیٹی اور جمال کے رشتہ کی بات اتنی سرعت سے محلے میں پھیلی کہ سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے ہر طرف سے سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی مگر مرزا صاحب کا ایک ہی جواب تھا۔

"یہ بھی ہم لوگ غلطی پر تھے۔ جمال واقعی شریف انسان ہے" اور سب مرزا صاحب کی انسانیت پر داد تحسین دیئے رہے تھے اور میں اپنی چھیتی بھابی کا گھونگھٹ اٹھائے، اس کے تیکھے نقوش کو گھورتے ہوئے دل میں کہہ رہی تھی۔

"میں خوب جانتی ہوں مرزا صاحب، انسانیت کے دھوکے میں اپنے مطلب حل کئے جاتے ہیں۔"

گرم کپڑوں کی حفاظت کیجئے

موجودہ دور میں ہر چیز کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی فیشن کا رواج بھی ترقی پر ہے پہلے زمانہ میں چیزیں ارزاں قیمت پر ملتی تھیں مگر فیشن کا اتنا رواج نہ تھا بڑے بڑے گھرانوں میں ایک یا دو بڑھیا کوٹ پر گزارا کر لیتے تھے مگر اب گرانی کے ساتھ فیشن بھی اتنا بڑھ گیا ہے معمولی طبقہ بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں ہے۔ گھر کے ہر فرد کے پاس کم سے کم پانچ چھ سوئٹر کوٹ جرابیں وغیرہ ہونا ضروری ہیں اس کے لئے لازمی ہے کہ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کی جائے۔ بہت سے گھرانوں میں دیکھا جاتا ہے کہ گرم کپڑوں کی بے احتیاطی سے وہ اس قابل بھی نہیں رہتے کہ آئندہ سال ان کو استعمال میں لایا جا سکے چوہے اور کیڑے وغیرہ بالکل ہی ناس کر دیتے ہیں پھر سال شروع ہونے سے پہلے گرم کپڑے بنانے کی فکر دوسری اور اس کے ساتھ پیسہ الگ برباد اگر سلیقہ شعار خواتین اس پر تھوڑی سی بھی توجہ دیں تو یہ ناممکن ہے کہ گرم کپڑے ایک سال کے بعد خراب ہو جائیں کیونکہ گرم کپڑے تو زیادہ پائیدار اور دیرپا ہوتے ہیں اور بعض دفعہ تو دیکھا گیا ہے کہ اگر انہیں احتیاط سے رکھا جائے تو سوئٹر نو دس سال تک تو بالکل اچھی حالت میں رہتے ہیں اور اسی طرح دوسرے گرم کپڑے بھی زیادہ عرصہ تک چلتے ہیں۔

اگر فرصت کے اوقات میں تھوڑی سی توجہ دیں تو آپ کے کپڑوں کی عمر بڑھ سکتی ہے موسم سرما ختم ہونے کے بعد یہ ضروری ہے کہ جو کپڑے دھونے کے قابل ہوں ان کو حفاظت سے دھو لیا جائے اور جو خشک دھلائی کے قابل ہوں ان کی خشک دھلائی کرائی جائے اس کے بعد گرم کپڑوں کو دھوپ میں رکھنا چاہیئے دھوپ میں رکھنے کے وقت کپڑوں کا رنگ اترنے کا ڈر رہتا ہے کپڑوں کو الٹا رکھنا چاہیئے۔ ورنہ کپڑوں کے اوپر چادر یا دوپٹہ ڈال دینا چاہیئے اسکو دھوپ دکھانا ضروری ہے تاکہ اس کے اندر جو کیڑے [illegible] نیم کی پتیاں پہلے سے سکھا کر رکھ لیں سب سے پہلے بکس یا صندوق میں چاروں طرف یہ سوکھی ہوئی نیم کی پتیاں ڈالیں اس کے بعد نیم کی پتی اور فنائل کی گولی کپڑوں کی ہر جگہ میں رکھنی چاہیئے کیونکہ یہ زیادہ اچھا رہتا ہے یہ چیزیں نہایت ہی جراثیم کش دوا ہے اس کے بعد ایک سوتی چادر جس پر دھلائی نہ پڑی ہو بکس میں بچھا دیجئے اور گرم کپڑوں کو اس میں رکھ دیجئے اور پھر دوسری نئی چادر کپڑوں پر اوپر سے ڈال دیں اور چاروں طرف سے خوب دبا دیں اس کے بعد بکس بند کر دیں مگر بکس کو زمین پر نہ رکھیں بلکہ کسی دوسرے بکس کے اوپر رکھیں اور اس بکس میں جس میں کہ گرم کپڑے رکھے گئے ہیں اس میں دوسرا مثلاً ریشمی سوتی کپڑا نہ رکھیں اس کے اندر ہوا چلی جائے گی اس کے ساتھ ہی سال میں دو مرتبہ کپڑوں کو دھوپ دینا ضروری ہے اگر مندرجہ بالا طریقے پر عمل کیا گیا تو آپ کے کپڑے کیڑوں سے محفوظ رہیں گے اور ان کی عمر بڑھے گی۔

"رفتہ رفتہ ہوتا جائے گا۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو کبھی نہ ہونے کو یکجا کر کے پہنچا دیتی ہے ——— اکثر کامیابی کا لمحہ میں صرف ایک لمحہ کے لئے ملتا ہے اور اگر اس وقت ہم اس کو ضائع کر دیں تو سالہا سال کا کامیابی کا لمحہ نا گذر جاتے ہیں۔" (چرچل)

سفر اور نیند

از سہالوی

معلوم نہیں کیا وجہ ہے کچھ لوگوں کو چاہے گھر پر نیند آکے پاس آئے لیکن ریل اور بس پر ضرور آنے لگتی ہے۔ اپنا یہ حال ہے کہ چاہے جتنا لمبا سفر ہو لیکن باوجود کوشش کے جھپکی تک نہیں آتی اور ہم بڑے رشک سے دوسرے مسافروں کو اونگھتے، سوتے اور خراٹے لیتے دیکھا کرتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں آج کل ریل کا سفر کوئی آسان کام نہیں ہم یوں بھی سفر سے کافی گھبراتے ہیں۔ ہمارا بس چلے تو ہم سوائے سفر آخرت کے اور کسی سفر پر جانے کے لئے تیار ہی نہ ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آج کل بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل کی وجہ سے ریل کے سفر اور سفر آخرت میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ریل کے سفر میں آدمی مرتا نہیں تو ادھ موا ضرور ہو جاتا ہے۔ مرزا صاحب کا خیال ہے کہ ہم سفر آخرت کے لئے بھی مجبوراً ہی تیار ہوں گے کیونکہ ملک الموت ڈیوٹی کے بڑے پابند ہوتے ہیں اور جس کام کے لئے آتے ہیں وہ پورا کر کے ہی ٹلتے ہیں۔ خوشامد و درآمد حتیٰ کہ رشوت سے بھی وہ روح قبض کیے بغیر نہیں جاتے حالانکہ ہمارے یہاں رشوت ایسی چیز ہے کہ اس سے مشکل سے مشکل کام چٹکی بجاتے میں پورا ہو جاتا ہے۔

آپ گھبرائیے نہیں۔ میں ذرا بہک گیا تھا ریل کے سفر کا حال بتانے کے بجائے سفر آخرت کی طرف چل پڑا تھا۔ تو عرض یہ کر رہا تھا کہ میں سفر سے بہت گھبراتا ہوں مگر جب بیوی کی بہن یعنی سالی کی شادی ہو تو جان پر کھیل کے جانا ہی پڑتا ہے اپنا قطع کلام کر کے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ سالیوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ کان پیارے تو بالیاں بھی پیاری تو سالیاں لگا مہر ہو کہ بیوی کا پیارا ہے یہی اس طرح سالیوں کا پیارا ہونا لازمی ہو گیا۔ چنانچہ ہم اپنی چہیتی سالی کی شادی میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے اس موقع پر اگر آپ اجازت دیں تو یہ عرض کر دوں کہ میں مادر زاد گل ہوں [illegible] سالیوں میں گورا کالا ہونے کی بنا پر کسی قسم کا احتیاز نہیں کرتا بلکہ

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

کے مطابق میں سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں اور رام چندر [illegible] کی سالی کی طرح میں اپنی سالی کو منہ پر دیکھ سے یہ کہنے کا موقع نہیں دیتا ہے

جانے کیا اس وقت ہوتی میں اگر کالی نہ ہوتی
آپ کی کچھ اور ہوتی آپ کی سالی نہ ہوتی

اس جگہ پر یہ بتا دینا ضروری ہے ورنہ بیگم اور سالی دونوں خفا ہو جائیں گی کہ ہماری سالی کالی نہیں بلکہ ان کا سانولا سلونا رنگ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ”سب رنگ کچا کالا رنگ پکا“ آپ کہہ رہے ہوں گے کہ میں پھر بہک گیا ایسی بات نہیں مگر جب سالیوں کا ذکر چھڑ جائے تو پھر موضوع بدلنے اچھا نہیں لگتا مگر آپ کی خاطر میں اپنے سفر کا حال پھر شروع کر رہا ہوں تو میں کسی نہ کسی طرح ریل پر سوار ہو گیا بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی لیکن ایک صاحبزادے نے اپنا بیگ نیچے رکھ کر مجھ سے کہا بیٹھ جائیے اس کے بعد لوگ آتے گئے اور ٹھنستے گئے یہاں تک کہ کھڑے ہونے کی کیا بات رکھنے کی بھی جگہ باقی نہیں رہی۔ کھڑے ہونے والوں میں بلا تفریق صنف، عورت اور مرد سبھی تھے تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ جو صاحبزادے میرے پاس بیٹھے تھے وہ آنکھیں بند کر کے گہری نیند سونے لگے مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس بھیڑ بھاڑ اور چیخ پکار میں نیند آنے پر مجھے تعجب ہوا اور میں نے کہا تمہاری نیند قابل رشک ہے مگر [illegible] نہیں رہا تھا میں نے آنکھیں اس لئے بند کر لی ہیں کہ [illegible] کھڑا رہنا دیکھ نہیں سکتے اس پر ہم ہی نہیں بلکہ کھڑی ہوئی خاتون بھی مسکرا دیں۔

اس کے بعد صاحبزادے نے پھر آنکھیں بند کر لیں [illegible] دیر کے بعد ان کا سر میرے کاندھے پر گر پڑا اور وہ خراٹے نہیں بلکہ [illegible] کے کھڑے رہنے کے غم میں آہیں بھرنے لگے چونکہ اس بیچارے غم میں جگہ [illegible] اس لئے ہم نے اس کا سر [illegible] اپنا اخلاقی فرض سمجھا اور جب ہم اترنے لگے تو ہم نے کہا بھیا سر اٹھاؤ [illegible] ہے کھڑی ہوئی خاتون کے لئے میں جگہ خالی کر رہا ہوں۔

عورت کے متعلق

میر ناصر علی کے چند خیالات

جنہیں عزیزی سیما سمیع سلمہا نے ایک مضمون سے ماخوذ کر کے اشاعت کے لئے بھیجے ہیں۔ یہ اقتباس شاہد احمد دہلوی کے مضامین کی ایک کتاب سے حاصل کئے گئے ہیں جو جنوبی ہند کے بی۔ اے کلاس میں پڑھائی جاتی ہے ——— ادارہ

• "عورت جب منہ پھیر کے چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑ لے"

• "کسی کے خیال میں اپنی جان کو خوش رکھنا برا نہیں۔ خاص کر ایسی محبت جس میں یار کا مسکرا کر یہ بتانا ہے کہ

نہ دیکھو اس وقت میں ہوتی ہوں بدنام"

• "محبت وہ چیز ہے جو سامان و اسباب کی محتاج نہیں محبت کے لئے ایک اکیلا دل چاہیئے"

• "عورت کیسی ہی آوارہ کیوں نہ ہو مگر پارسائی پر جان دیتی ہے"

• حسینوں کو شاعروں سے شاعر مزاج زیادہ پسند ہیں۔ ان کے لئے موزونی طبع بے کار ہے ان کو اس خیال میں مزہ آتا ہے کہ کسی کو ہمارا خیال ہو اور ہمیں کسی کا"

" وہ حسین عورت بھولنے کی چیز نہیں جو لڑکپن سے نکلتی جوانی تک کسی کے خیال میں ہو۔ ایسی عورت کو اپنے چاہنے والے سے یہ سننے کی تاب نہیں کہ بات زیادہ گئی ہے۔ اس کی ایک رات الف لیلہ کی ہزار راتوں سے بہتر ہے"

• "یہ عورت جو دامن کشاں جا رہی ہے اس کو آپ کی بے التفاتی کا رنج ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ آپ کسی اور کی طرف نہ دیکھیں"

• "عورت کے پاؤں فرش مخملیں چاہتے ہیں۔ مرد کے پیر کانٹوں کے لئے بنے ہیں۔ مصائب میں عورت کا حال شاخ گل کا سا ہے جو آندھی میں جھک جاتی ہے اور جہاں ہوا تھمی پھر سیدھی ہو گئی"

• "عورت کا دماغ ہمیشہ بہار کا نمونہ سمجھئے جس میں خزاں کو دخل نہیں"

• عورت جس بات کا ارادہ کرے کر گذرتی ہے۔ اس لئے محبت میں زیادہ لطف اس محبت کا ہے جو عورت کی طرف سے ہو کہ اگر عورت چاہے تو سو بہانے سے ملے گی۔ ورنہ ادھر چاہے تو ملنا معلوم

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے"

• "کہتے ہیں کہ محبت میں ہوش نہیں رہتا۔ میری رائے میں مرد کو ہوش نہیں رہتا۔ عورت کو ہوش رہتا ہے"

• عورت کو معلوم ہے کہ میں اکیلی بے کار ہوں۔ میری زندگی کا مدار دوسرے پر ہے جو غیر جنس (مرد) ہے"

• یہ بات عورت کی عادت میں داخل ہے کہ منہ چھپائے اور حسن التفات کا دعویٰ کرے"

• "عورت کو چپکے ہی چپکے گھر میں جان دیتے سنا"

• مرد عشق کرتے ہیں مگر عورت عشق مجسم ہے"

• "عورت میں محبت کے سوا کسی چیز کی قابلیت ہی نہیں"

• محبت بغیر عورت جی نہیں سکتی۔ مرد اور طرح بھی جی سکتا ہے"

• "عورت کے دل میں محبت جس قدر جلد اثر کرتی ہے۔ اسی قدر دیرپا بھی ہے"

• عورت کے لئے نرمی اور پارسائی کافی نہیں۔ دلربائی اور دلفریبی بھی ضروری ہے"

مرسلہ۔ سیما سمیع آلندور

• ایک کنجوس کے یہاں اس کا ایک کنجوس دوست مہمان بن کر آیا۔ کھانے کے وقت کنجوس میزبان نے دسترخوان پر گھی کی ایک شیشی لاکر رکھی اور ایک سینک اس میں ڈال کر دال میں ڈال دیا۔ میاں کنجوس نے حیرت سے یہ عمل دیکھ کر کہا" ارے بھائی تم بڑے فضول خرچ معلوم ہوتے ہو، بھلا اس طرح یہ گھی کتنے ماہ چل سکے گا۔ میں تو یہ کرتا ہوں کہ کھانا پکا کر دسترخوان پر رکھتا ہوں اور منتظر رہتا ہوں کہ پڑوسن دال بگھاریں۔ پھر جیسے ہی بگھار کی خوشبو آتی ہے میں کھانا کھا لیتا ہوں۔

(مرسلہ:۔ زہرہ جمشید۔ کلکتہ)

بزمِ غم و مسرت

اس عنوان کے تحت ہر ماہ ایسی خبر ارشاعت کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال کے سلسلہ میں ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں لکھ کر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کی جائے۔ ۲۰ تاریخ کے بعد موصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• بیگم منیر احمد (ماڈل ہاؤس لکھنؤ) ہماری بیٹی مسز ثمر رحمٰن سلمہا کے گلشن حیات میں اللہ بزرگ و برتر نے ۶ر جنوری ۸۴ء بروز جمعہ ایک چاند سا فرزند عطا فرمایا۔ خدائے قدوس سے دست بدعا ہوں کہ نومولود اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے، عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

• عمارہ خاتون، بشرہ اور عابدہ ذیشان (دیٹ غازی پور) ہماری چھوٹی بہن رابعہ سلمہا کو اللہ پاک نے ۳۰ر اکتوبر ۸۳ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ نام صبیحہ ارم رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• رابعہ ممتاز (رنگولی۔ اڑیسہ) میرے منجھلے بھائی محمد عتیق الرب اور بھابی سلیما سلمہا کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲۱ر جولائی ۸۳ء کی شب میں ۸ بجے ایک فرزند عطا فرمایا نام حبیب الرب قرار پایا۔ ۳۰ر اگست ۸۳ء کو ۱۰ بجے دن میں چھوٹے بھائی عتیق الرب اور انوری بیگم کو بھی پہلی بار ایک بیٹا عطا فرمایا۔ نام محمد آصف احمد رکھا گیا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھیں۔

• توحید الحق صاحب (گورنرس کیمپ۔ لکھنؤ) میری بیٹی تسنیم رابعہ کو اللہ پاک نے ۲۹ر دسمبر ۸۳ء بروز جمعرات ایک فرزند عطا فرمایا اللہ پاک اس کی عمر میں برکت دے اور صاحب نصیب بنائے۔

• مسز او۔ کے۔ ثریا علیم (دامبا ڈی) میری بہن ڈاکٹر مسز اوکے راضیہ انوار اللہ، ایم بی بی ایس، ڈی سی۔ ایچ کو اللہ پاک نے ۱۹ر نومبر ۸۳ء کو بج کر ۵ منٹ پر ایک دختر عطا فرمائی۔ نام مبرد کہ عنبرین قرار پایا۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

• فی ثمینہ پروین۔ شوانہ پروین۔ عزالہ یاسمین (آمبور) ہماری آنٹی فریدہ تبسم اور انکل بشیر احمد صاحب کو اللہ پاک نے ۱۸ر دسمبر ۸۳ء کو ایک دختر عطا فرمائی نام فائقہ نوشین قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔

• رشیدہ بانو (بنگلور) میری چچا زاد بہن زہرہ اور بہنوئی صابر کو اللہ تعالے نے پہلی بار ۲۹ر نومبر ۸۳ء کو ۱۱½ بجے دن میں ایک دختر عطا فرمائی۔ نام امانت جہاں قرار پایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور عمر طویل پائے۔

• فضل النسا (سانتا کروز۔ بمبئی) میری دیورانی سعدیہ فاطمہ و دیور سراج احمد (گلاسگو۔ انگلینڈ) کو اللہ پاک نے پہلی مرتبہ ۲ر دسمبر ۸۳ء ۵ بجے ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• شہناز نیلوفر ناہید (ترکی وارڈ۔ سورت) ہماری آپا شاہین فاطمہ کو اللہ پاک نے ایک دختر کے بعد ۱۲ر اکتوبر ۸۳ء کی شام کو پونے چار بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔

• روبینہ نوشیں (رانچی) میری آپی فرح رضوانہ اور بھائی اعجاز احمد کو اللہ پاک نے ۲۲ر دسمبر ۸۳ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے نیک، صالح، صاحب نصیب اور فخر خاندان بنائے۔

پیغامات نشاط

مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم کی نواسی اور عبد العلیم قدوائی صاحب کی صاحبزادی عزیزہ کوثر سلمہا کا عقد نکاح عزیزی شمیم احمد خسرو (فرزند جناب قاضی معز الدین احمد) کے ساتھ ۱۱ر فروری ۸۴ء کو ۵۰ کرزن روڈ نئی دہلی میں ۵ بجے شام کو انجام پایا۔ اللہ پاک مبارک کرے

(نسیم انہونوی)

• بھائی فاروق احمد رضوی (مصطفٰے منزل لکھنؤ) کے فرزند دلبند سید علی عبد الحق سلمہ کی شادی نور چشمی نسرین سلمہا (دختر نیک اختر ڈاکٹر سید محمد فضل محمد صاحب) کے ہمراہ ۳ر فروری ۸۴ء کو بمقام علی گڑھ عمل میں آئی۔ اس سلسلہ میں عزیزی فاروق سلمہ نے ۵ر فروری کو اپنے اعزہ اقربا اور معززین شہر کو دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

[illegible] تھا کہ مجھے امید بھی تھا اور نا امید بھی۔ مجھ پر احساس برتری کا غلبہ [illegible] احساس کمتری کا بھی۔ [illegible] اور برہمیکا نے مجھے یہ حال کر رکھا تھا کہ میں عبادت گھر کے باہر میری ماں بھی موجود ہے میرا دل چاہا میں دوڑ کر اس سے لپٹ جاؤں اور التجا کروں کہ مجھے اپنے آنچل میں چھپا لے مجھے ان بھیڑیوں سے بچا لے۔ مگر میں ایک جم غفیر کے درمیان تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میں عبادت گھر کی ذاتی گھگی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے ساتھ دو پختہ کار مغاں بھی جا رہے تھے۔ یہ مناظرہ شہر سے باہر ایک میدان میں ہونا تھا۔ سب نے الوداع کہی اور کوچوان نے تازیانہ لہرا کر گھوڑوں کو دوڑا دیا۔ میرے خیالات اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑنے لگے۔

جب ہم مناظرہ گاہ میں پہنچے تو وہاں پہلے ہی سے کافی لوگ موجود تھے۔ ایک قنات باندھ کر ہمارے لئے الگ نشست گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ گاڑی سے اترا اور ایک مختصر سے جلوس کی شکل میں اس جگہ پہنچ گیا کپڑے کی چار دیواری میں داخل ہو کر ہم اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ دس پندرہ ساعتیں گزر گئیں۔ میں نے معلوم کیا کہ وہ بے دین شخص کہاں ہے جو ہم سے مناظرہ کرے گا تو کچھ لوگ ہنس پڑے کچھ نے گردنیں گھما کر ادھر ادھر ایسے بکنے لگے۔ جن کے قہقہے گونج گئے۔ میں نے متعجب ہو کر دیکھا اور پوچھا، لوگ ہنسے کیوں؟ ان میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھوں کو چوما میری عبا کے دامن کو آنکھوں سے لگایا اور بولا۔ وہ بدقسمت شخص ادھر میدان کے بائیں طرف جنگل کے قریب بیٹھا ہوگا۔

"کہاں ___؟" میں نے پھر سوال کیا۔

[illegible]

کہ یہ دنیا تو تاریک ترین [illegible] ہے۔ اب آگے آ جانا چاہئے [illegible] مجھ جیسے لوگ کہاں جائیں گے۔ اگر وہ آئے [illegible] میرے بعد اس دنیا میں آیا تو میرا علم [illegible] ہو جائے گا۔ میں تو اس گناہوں کے اندھیرے میں تحلیل ہو چکا ہوں ___ میرے بزرگ مجھے روشنی کا سراغ دیجئے۔ مجھے اس نور تک پہنچائیے میں ساری زندگی تاریکی میں سسک سسک کر مرنا نہیں چاہتا۔ پھر شاید میں سو گیا تھا۔ میں نے خواب میں ایک روشن ستارہ دیکھا جس کی روشنی آسمان سے زمین کی طرف آ رہی تھی میں نے اپنے اردگرد روشنی دیکھی تو میں خوشی سے ناچ اٹھا۔ اپنے ناچ ہی پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر فوراً دیوتاؤں کی بزرگی بیان کی ان کا شکر ادا کیا اور اپنے استاد کے لئے اچھی آخرت کی دعا کی۔ پھر میں ایک مناجات گانے لگا۔ اپنی آواز سے مجھ پر وجد سا طاری ہو گیا۔ میں کلام کے سحر میں ڈوب گیا ___

پچھلے دس روز سے میں اس کے عافیت کدے میں تنہا بیٹھا ہوں۔ میرے دل کو کسی قدر قرار آ چلا ہے میں زیادہ وقت اپنے نفس کو تنبیہہ کرتا رہتا ہوں اس درمیان دو بار میری ماں مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے اس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت کا گہرا عکس دیکھا۔ وہ میری زندگی کے اس انقلاب پر بہت خوش ہے۔ اور اسے میرا عبادت گھر میں رہ کر ریاضت کرنا پسند آیا ہے۔ دوسری بار جب وہ آئی تو اس نے کہا تھا کہ میں نے تیرے مستقبل کے سلسلے میں بڑا اچھا فیصلہ کیا تھا۔ مغاں بن کر انسان دین اور دنیا کی ساری نعمتوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ زندگی کی تمام راحتیں اسی کے لئے ہوتی ہیں اور ان کے حصول کے لئے اسے خواہ کوئی راہ اختیار کرنا پڑے کوئی شخص انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا [illegible] ماں کو سمجھا نہ [illegible] اسے بتاؤں کہ دین [illegible] نہیں بلکہ [illegible]

[illegible]

چکا ہوں کہ میں اپنی ماں کو اور تکلیف نہیں دے سکتا اگر وہ اس بات سے خوش ہے کہ میں بھی مغاں ہوں تو یہی سہی۔ میں تو نیکی کا طرفدار ہوں۔ میں نے تو اس راہ کو اختیار نہیں کیا۔ جس کی تشریح میری ماں کر رہی ہے۔ مجھے اپنے اوپر اتنا اعتماد ہے کہ بدی مجھے تسخیر نہیں کر سکتی اور میں ماں کے سامنے اپنا فلسفہ رکھ کر اسے مایوس کرنا نہیں چاہتا وہ محض اگر خیالوں سے خوش ہو سکتی ہے تو میرا کیا نقصان ہے۔ زندگی کی بے شمار محرومیوں کے بعد کیا اسے صرف خیالوں سے بھی خوش ہونے کا حق نہیں ہے؟ بس اسی سوچ نے میری زبان بند رکھی۔ لیکن میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ خوشی اور اطمینان انسان کو کس طرح بدل دیتا ہے۔ کل تک یہی عورت تفکرات اور پریشانیوں سے کیسی مرجھائی ہوئی رہتی تھی لیکن آج وہ از سر نو جوان دکھائی دینے لگی۔ اور یہی بات میری طمانیت کا باعث بنی ۔۔۔ مجھے اپنی ماں سے بے پناہ محبت ہے بلکہ میں اس کا احسان مند ہوں۔ کہ اس نے ایک اچھی اور پارسا عورت ہونے کا ثبوت دیا اور محض میری وجہ سے زندگی کی ساری خوشیوں سے منہ موڑے رہی اور میری تعلیم و تربیت پر عام ماؤں سے زیادہ توجہ دی۔ قابل پرستش ہوتی ہیں وہ مائیں جو اپنے بیٹوں کو اعلیٰ قدروں کی طرف راغب کرتی ہیں اور انکے درمیان آنے والی رکاوٹوں سے خود نبرد آزما ہوتی ہیں۔

تین چار دن سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اپنی روح کی کثافت کو کافی حد تک دھو دیا ہے۔ میرا مطالعہ اور ریاضت مجھے مایوس نہیں کر سکا تھا لیکن آج شام ماں پھر ملنے آئی تو مجھے ایک بات اچھی نہیں لگی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ مجھے اپنی ماں سے والہانہ لگاؤ ہے لیکن غلط بات تو غلط [illegible] جائے گی۔ میں نے دیکھا کہ ماں عبادت گھر میں بہت زیادہ آرائش

[illegible] سے نوازا [illegible] کے بعد سب نے مجھے گلے لگا کر حوصلہ دیا اور دعاؤں سے [illegible] تاریخ میں میں پہلا شخص تھا جو اتنی کم عمری میں مناظرے کے [illegible] کے مجمع میں بھی بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے تھے۔ چونکہ میری طرح کم عمر [illegible] ان کے علم پر کسی کو اتنا اعتماد نہیں تھا کہ اتنی اہم ذمہ داری سونپ دی جاتی میں جانتا تھا کہ اس کم عمری میں اتنا مکمل اور جامع مجھے استاد کی شفقت مہربانی اور عنایت نے کیا۔ مغاں کی خصوصی توجہ نے اس قابل بنایا ہے جس کی بنا پر یہ بوڑھے مغاں مجھ پر اس قدر مہربان ہو رہے تھے۔

رو بو بظاہر بہت خوش نظر آ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پوشیدہ تھی۔ میں اپنی ذلت سے ہمیشہ ڈرتا رہا ہوں اس وقت رو بو کی آنکھوں میں ایک بار دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں مسکرانے کی کوشش میں منہ بسور کر رہ گیا۔ رو بو میرے قریب آیا اور میری پشت پر اپنی بانہیں پھیلا کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا پھر آہستہ سے بولا: "اگر تو اس مناظرے میں دیوتاؤں کی عنایات سے فتح مند ہو گیا تو یقین رکھ بریمیکا بلا معاوضہ تجھے سونپ دوں گا۔ میرے کہنے پر چل ورنہ تیری ذلتوں کے بہت سامان ہیں میرے پاس۔ اور ہاں بریمیکا [illegible] ہے کہ جس دعا کا اس نے تجھ سے ذکر کیا تھا وہ تیرے ساتھ ہے۔" رو بو کی آنکھوں میں بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ میں ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ یہ بد فطرت شخص میرے ساتھ چوہے بلی کا سا کھیل کرتا آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا مجھے چڑانے اور تکلیف پہنچانے کے لئے بریمیکا نے اسی کے ذریعہ یہ دعا کی یاد دہانی کرائی ہے۔ لیکن میں تو سب کچھ برداشت کرنے کا عہد کئے ہوئے تھا۔

پھر سب عبادت گھر سے باہر آ گئے۔ [illegible] شہر کی ایک بڑی تعداد باہر جمع تھی [illegible] خوش [illegible]

وہ زیبائش کرکے آتی ہے۔ پہلی بار تو میں اسے اتفاق سمجھا تھا لیکن [illegible]
بھی جب سلمان آرائش کا اسی طرح استعمال دیکھا تو مجھے یہ بات لگی [illegible]
اس کا لباس بھی قیمتی اور اچھا ہوتا ہے اور اس میں استعمال کی جانے والی خوشبو [illegible]
کے جانے کے بعد کمرے میں پھیلی رہتی ہے۔ میں مال کے آنے جانے پر تو پابندی
نہیں لگانا چاہتا لیکن اسے سادگی اور وقار کے ساتھ آنا چاہئے اس کے
حالات اور عمر کا تقاضہ بھی یہی ہے اور اگر عورت ہونے کے ناطے وہ [illegible]
قابو نہیں پا سکتی تو کم از کم یہاں آتے ہوئے یہ سب نہ کیا کرے۔ وہ تقریباً
ایک گھنٹہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے بارہا کوشش کی کہ اس پر یہ بات کسی
طرح واضح کر دوں مگر میں سوچتا ہی رہ گیا اور وہ چلی بھی گئی۔ آہ! اسے کس
وقت یہ احساس ہوا کہ وہ حسین بھی ہے اپنے جمال کی سجاوٹ اور نمائش
کے لئے اس نے کیسے سنگین دور کا انتخاب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ دنیا
منور ہو جائے لوگوں کے دلوں سے سفلی جذبات ختم ہو جائیں۔ کتنا اچھا خیال
ہے۔ میں اکیلا اس دنیا کو سنوارنا چاہتا ہوں جبکہ ہر شخص میرے خیالات اور
فلسفے کا نہ صرف منکر ہے بلکہ استہزائیہ انداز پر میرے اصولوں کا ذکر کرتا
ہے۔ آج زندگی کے عیش و آرام کو چھوڑ کر آبائی دین کی سادگی اور پاکیزگی کو
کوئی بھی اپنانا نہیں چاہتا۔ اچھی قیمت ملے تو ساری قدریں بیچنے کو لوگ
تیار ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مغاں بھی اپنی بولی لگانے لگے۔ اس دنیا میں میں صرف
حیران ہونے کے لئے رہ گیا ہوں۔ کس کس بات پر حیرت کروں۔ کس کس شخصیت
کا ماتم کروں!

رات میں سونے لیٹا تو میری نیند ہی اڑ گئی۔ اپنے حالات پر میں [illegible]
غور کرتا رہا۔ میری نیند [illegible] رات کو عبادت [illegible]

سامنے معشوق کا نام لیتا ہے۔ میرا سا علم وہ اپنی ساری دولت لٹا کر بھی
حاصل نہیں کر سکتا۔

آہ! ظلوم بریسیکا کی بددعا زمین سے آسمان پر گئی اور شرف قبولیت حاصل
کرکے میرے ساتھ مناظرے کے وقت تک پہنچی۔ ان میں مناظرے میں بری طرح
شکست کھا گیا۔ میں ہار گیا میں جو مغاں طبقہ کا نمائندہ بن کر گیا تھا۔ سب
کی رسوائی کرا بیٹھا۔

اب پچھلے دو تین روز سے میں اپنے گھر میں منہ چھپائے بیٹھا ہوں۔ سبھی مجھ
سے ناراض ہیں۔ میں سب کو اپنے علم سے مرعوب کرتا تھا۔ مناظرے میں ایک
گھنٹے بھی نہ ٹک سکا۔ میری ماں بھی شاید مجھ سے ناراض ہے وہ مجھ سے ملنے
میرے کمرے میں نہیں آئی۔ میں نے اتنی تنہائی کبھی محسوس نہیں کی تھی جیسی آج
کر رہا ہوں ۔۔۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں یہ شکست مجھے مایوس نہیں کر سکی۔ اب
جبکہ میں بریسیکا کی بددعا کا شکار ہو ہی چکا ہوں تو اپنی شکست کا حال آپ کو سنا
رہا ہوں کیونکہ اس شکست سے میں خود شرمندہ نہیں ہوں۔

میں پیچھے کہیں لکھ آیا ہوں کہ جس دن مناظرہ تھا روبوع اندھیرے ہی
سے مجھے تیاری کا حکم دے گیا تھا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی میں نے غسل
کیا پھر لباس تبدیل کرکے بادشاہ پہنا۔ مغاں کا مذہبی خصوصی لباس لازم۔ رستم
[illegible] کندھوں پر ڈالی اور باہر نکلا۔ مختلف عبادت گھروں کے
[illegible] عبادت گھر کے احاطے میں میرے منتظر تھے۔ [illegible]

[illegible] گیا تو مجھے خود ہی تھکن کا احساس ہونے لگا۔ میں [illegible]
گیا اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے اپنا وہم سمجھ کر سر کو
جھٹک دیا مگر جلد ہی دوسری اور تیسری دستک سن کر میں اٹھا اور آہستگی سے
زنجیر کھول دی اور پھر دروازہ کھلتے ہی میرا ذہن گھوم سا گیا۔ سامنے سیاہ چادر
اوڑھے بریسیکا کھڑی تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا اس نے مجھے
ایک طرف کو ہٹایا اور خود ہی اندر آ گئی۔ مجھے اس کا اس طرح رات کو تنہا آنا کچھ
زیادہ پسند نہ آیا۔ مگر اسی کے ساتھ میری شکستگی دور ہو کر ٹھنڈک کا سا احساس بھی
ہوا۔ میں واپسی کے لئے مڑا تو وہ بولی: "دروازہ بند کر دو۔"
"کیوں ۔۔۔؟" میں نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا۔
"تم جیسا نیک اور با اصول انسان گلی لوگوں کا ہدف بنے یہ مجھے منظور نہیں۔"
"تو پھر اس وقت آنے کی ضرورت کیا تھی ۔۔؟" میرا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔
"اُف ۔۔۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا پھر شکوہ سنج نظروں
سے مجھے دیکھا اور بولی: "کیا تم کسی دکھی دل کی پکار سننا بھی ناپسند کرتے ہو؟"
"ایسی پکاریں تو میں ہر وقت سنتا ہوں بریسیکا۔ ایسی پکاروں نے میرے
دل میں زخم ڈال دیے ہیں میری روح کو بے چین کر رکھا ہے۔ مجھے ساری کائنات
میں انہیں پکاروں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔"
"تم ان کے لئے کیا کر رہے ہو ۔۔۔!" اس نے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا "یہ زمانہ میرا نہیں ہے۔ میں
کچھ نہیں کر سکتا کچھ بھی نہیں ۔۔۔"
وہ اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی پھر آہستہ سے بولی: ساری دنیا سے
[illegible]

[illegible] بن جاؤں یا پھر [illegible] انداز [illegible] بنا رہا ہوں۔ بریسیکا
پرستی اس کے لئے ایک چیلنج بنی ہوئی ہے ایک خطرہ ہے۔ بریسیکا کے [illegible]
میں اس نے میری شکست کو یقینی بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں شک نہیں
کہ بریسیکا کا حسن کسی بھی نوجوان کے قدم ڈگمگانے کے لئے کافی تھا لیکن میرے
عہد اور قسم نے مجھے اس لغزش سے بچائے رکھا اور یہی پاکیزگی [illegible]
سے رابو اور بریسیکا دونوں کے لئے وجہ اشتعال بن گئی اور میں دونوں میں سے
کسی ایک کو بھی قائل نہ کر سکا۔ یہ دنیا کیسی عجیب ہو گئی ہے جہاں نیک خیالات
اور پاکیزہ جذبات تہمت بن چکے ہیں۔ سادگی حماقت کہلانے لگی ہے۔ پاک صاف
بزدلی ہے اور عزت نفس محض بے وقوفی۔
میرے بزرگ استاد میرے مربی میرے مہربان آپ نے مجھے یہ کس جگہ کا
انسان بنا دیا ۔۔۔ کہاں جاؤں میں کہاں جاؤں کس کو اپنا دل دکھاؤں کس کو
اپنی سچائیوں کا یقین دلاؤں کیسے سمجھاؤں ۔۔۔!!
رات بھر میری نظریں کتابوں پر رہیں اور دل روتا رہا۔ میرے خیالات [illegible]
کے اطراف چکر لگاتے رہے۔ سچ یہ ہے میں کچھ بھی نہیں پڑھ سکا۔ اب مناظرے
میں جانے کی تیاری کرنا ہے۔ کل صبح رابو آ کر مجھے ہدایات دے گیا ہے۔
ویسے اس مناظرے کے لئے میرے دل و دماغ میں بہت علم موجود ہے۔ مجھے
رابو کی ہدایات کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس بات کو وہ بھی جانتا ہے
کہ میرے پاس علم ہے اسی لئے وہ اتنا کچھ ہونے پر بھی مجھ سے دست بردار
ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بہرحال یہ وہ اپنے کم علمی اور گستاخ پن کو
چھپائے رہے گا بس اسی جگہ میں اس کے مقابلے میں برتری حاصل کر سکتا
[illegible] سامنے کھل کر اور

ظلم نہیں کر سکے گا میں تجھے دنیا سے چھپ کر گلدستہ کی طرح نہیں اپنانا چاہتا۔ تو تو
میرے نزدیک پاکیزگی کا مظہر ہے۔ میری زندگی میں آ جا شفق کی طرح آ نا۔ مہتاب
کی چاندنی کی طرح۔ راتوں کے اندھیرے میں آ کر میرے سامنے اپنے [illegible]
احساسات مت کر۔" برتیکا ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گئی ایک بھرپور نظر
مجھ پر ڈال کر بولی: "تو کہتا ہے کہ تو ساری زندگی دل میں لئے بیٹھا رہے گا اور دنیا
سنور جائے گی۔ تو کسی کو سہارا دینے کو ہاتھ نہیں بڑھائے گا اور لوگ سنبھل جائیں
گے۔ تو ستاروں کی روشنی کو دنیا کا کرتا رہے گا۔ اور کائنات منور ہو جائے گی
تیری رگوں میں کسی بزدل کا خون ہے شاید جبھی تو صرف باتیں بنانا جانتا ہے
میری غلطی تھی جو میں آئی۔" میں جھلا کر رہ گیا۔ سچائی بے حد کڑوی ہوتی ہے۔
[illegible] دن جاتا۔ میں نے برتیکا کی طرف پشت کر لی اور خشک لہجہ میں
کہا: "اب تو جا ـــ میں کوشش کروں گا کہ تجھ پر اور ظلم نہ ہو ـــ لیکن تجھے
بہرحال کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔" میں رخ موڑے کھڑا رہا۔ آہٹ سے
میں نے سمجھا کہ برتیکا چلی گئی۔

صبح تک میرا دل روتا رہا۔ میں کس کس کو سہارا دوں میں تو خود کسی سہارے
کا محتاج ہو رہا ہوں۔ میں نے تو پہلی بار دیکھ کر ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ برتیکا
میری ہے لیکن صرف دل میں سوچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسی تو نہ جانے
کتنی باتیں میں سوچا کرتا ہوں۔ میرے لئے عمل کا میدان کہاں ہے ہر چیز
پر تو رودلو کا قبضہ ہے۔ میرے جذبات بھی اپنے نہیں رہے ان پر بھی رودلو کا
خوف مسلط ہے ـــ

قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کے معطر جسم سے اٹھنے والی خوشبو [illegible]
مہکا دیا تھا۔ میرا دل خود بخود کھنچنے لگا۔ وہ بغیر [illegible]
اس کی مسکراہٹ بڑی قاتل تھی۔ مجھ پر نظر ڈال کر اس کی نگاہیں [illegible]
گئیں ـــ

میں تو گم صم اسے تک رہا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا۔ پھر وہ خود
سے ہنس پڑی اور بولی۔

"یہ سب کتابیں تو نے پڑھی ہیں ـــ؟"

"ہاں ـــ" مجھے اپنا اقرار، اقرارِ جرم سا لگا۔

"خوب!" وہ تعریفی انداز سے بولی۔ "تو پھر تو نے [illegible] کیا سیکھا؟"

"نہ میں تجھے سمجھا سکوں گا اور نہ تو سمجھ سکے گی۔" [illegible] جواب دیا۔

"تو نہ سمجھانا چاہے تو بات الگ ہے ورنہ ان کو سمجھنے میں کیا رکھا ہے۔"
وہ بے نیازی سے بولی۔ میں نے نظریں چرا لیں تو وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی اور
کہنے لگی: "سنا ہے کل تو مناظرے کے لئے جائے گا؟"

"تو نے ٹھیک سنا ہے" میں نے کہا۔

"میں پچھلے ہفتہ بھر سے بس ایک ہی دعا مانگ رہی ہوں۔"

"کیا ـــ؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی کہ اس مناظرے میں تو ہار جائے ـــ" وہ مکمل ظلم بن گئی۔

"یہ بات تو کر رہی ہے۔"

"ہاں ـــ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میں دل سے یہی چاہتی ہوں کہ
تو اس بے دردی سے شکست کھا جائے تو ذلیل اور رسوا ہو جائے زمانہ تجھ
پر تھو تھو کرے اور تو منہ چھپائے پھرے ـــ"

مگر کچھ ڈرتا تھا اور جھوٹ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا۔
"تم نے مناظرے کی تیاری کر لی ہے کیا؟" اس کی نظریں ان کتابوں پر تھیں جو کمرے کے ایک گوشے میں بکھری ہوئی تھیں۔
"الف — میں کچھ عرصے سے اپنے دین کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ [illegible] کیا لُدیو کا مخالف لاجواب ہو جائے گا۔ مجھے اپنے محترم استاد کی دی ہوئی تعلیم پر مکمل بھروسہ ہے مگر میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"
"پوچھو —" وہ بولا۔
"تم اس بے دین شخص سے اپنے کس دین کی بات کرو گے؟" میں نے پوچھا
"جو ان کتابوں میں لکھا ہے۔" روبو نے بکھری کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔
"مگر ان میں تو وہی علم ہے جو آپ کے باباجان اور میرے استاد کے اصولوں پر مبنی ہے۔"

"ہمارا مقصد اس شخص کو منہ توڑ جواب دینا ہے۔" وہ ترشی سے بولا اور کھڑا ہو گیا، میری طرف دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی نظروں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ غصہ، نفرت، استہزا، برتری اور افشائے راز کی دھمکی۔ میں سہم سا گیا اور پھر بڑی تندہی سے مطالعہ میں لگ گیا شاید اسی میں میری نجات ہو اور میں نئے آبا لُدیو کی اسی طرح کچھ خدمت کر سکوں۔ اپنے عہد کو نبھا دوں۔ اپنی قسم پوری کر دوں۔ اپنے استاد کا قرض اتار دوں۔ نہ جانے سرخروئی میرا مقدر ہے یا نہیں — کیونکہ میں سمجھ چکا ہوں آج علم اور عمل دو متضاد چیزیں بن چکی ہیں۔ کل مجھے مناظرے کے لئے جانا ہے۔ ابھی آدھ گھنٹے پہلے روبو آیا تھا [illegible] کو مجھے سونپ کرنے کو کافی تھا۔ مگر آج اس نے خصوصی [illegible] سے کام لیا تھا اس کا عہدہ، لباس اور ساتھ ہی [illegible]

پچھلے تین دن سے میں نے خود کو کتابوں میں غرق کر رکھا ہے۔ یہ مجھ روبو ہی کا حکم ہے۔ میں نے ان کتابوں کو وقتاً فوقتاً اب سے پہلے بھی پڑھا ہے۔ اپنے استاد کی ہدایت پر اور کبھی اپنے شوق اور ذوق کے تحت۔ اس وقت مجھے ان کتابوں سے جو کچھ حاصل ہوا وہ آج کل کے تین دن کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکا۔ آخر کیوں؟ کتابیں بھی وہی ہیں اور میں بھی وہی ہوں۔ میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ چونکہ روبو نے کہا ہے اس لئے میں ان کتابوں کا مطالعہ دلی طور پر نہیں کر سکا ہوں، جب ذہن حاضر نہ ہو تو پھر کیسا مطالعہ اور کیسی جانکاری۔ کہاں میرے استاد کی پرشفقت ہدایت کہاں روبو کا سخت رویہ اور حکم۔ انسان پر کوئی چیز لادی نہیں جا سکتی۔ خواہ وہ اسے کتنی پسند کیوں نہ ہو۔ جن کتابوں کے پڑھنے میں میں اتنا ڈوب جاتا تھا کہ کھانے پینے کا ہوش نہیں رہتا تھا انہی کتابوں نے آج مجھے تھکا سا دیا۔ اس تھکن کو دور کرنے کے لئے میں آج صبح ماں کے پاس پہنچا۔ ایک خادمہ اس کا سنگھار کر رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کیا میری ماں نے اپنے لئے کسی منزل کا انتخاب کر لیا ہے جو دن بہ دن اس کا شوقِ آرائش بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی پاس بلا کر پیار کیا اور کہا۔ "تو شاید خادمہ کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہے اب مجھ سے کام نہیں ہوتا۔ تو جانتا ہے پچھلے کتنے ہی سالوں سے میں دوسروں کی خدمت کرتی آئی تھی۔ اسی لئے اب خادمہ رکھ لی ہے؟"
"بہت اچھا کیا —" میں نے خوشی کا اظہار ضرور کیا [illegible]

طعام خانے میں سب اکٹھے تھے۔ رات کا کھانا ہو چکا تھا۔ اور انہیں [illegible]ے کا انتظار تھا۔

معتصم جلد سے جلد بھاگنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اُلٹے سیدھے چند لقمے حلق سے اُتارے اور سر درد کا بہانہ کر کے چلے گئے ان کے جانے کے بعد نعمانی بھی اُٹھ گئے۔

محفل سونی ہو گئی۔

علوی صاحب نے پوچھا: "وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں؟"

"ارے ماموں جان تو جیسے منہ پھیلائے بیٹھے تھے۔" چہک کر باجی جان نے جواب دیا۔ "انہیں انتظار تھا کہ کب ہم پیغام دیں اور کب وہ راضی ہو جائیں اب عمی سے پوچھنا ہے کہ ——!"

"انداس عجیب سی لگی۔" بیگم علوی نے کہا: "پہلے اتنی فیشن ایبل نہیں تھی میرا سامنا بھی نہیں کرتی تھی مگر آج تو سلام میں پہل کی اور سر کھولے پھر رہی تھی۔"

"بے حد غصیلی لگتی ہیں نانا جان۔" نازنینہ نے لقمہ دیا۔ "گھر کی ملازم لڑکی سے ان کے نہانے کا پانی ٹھنڈا رہ گیا تھا اُسے چپل سے خوب مارا۔"

"تمہارے سامنے۔؟" علوی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"جی سامنے نانا جان۔" نازنینہ نے کہا۔

کرنے لگے۔ تب ایک نینا سوپ لائی۔ وہ سو چکی تھیں! باری باری [illegible] صاحب، ارضا اور سلمٰی کمرے میں جھانک گئے۔

اب کمرے میں معتصم تھے اور رومہ۔ وہ پائینتی بیٹھی بیگم علوی کے تلوے [illegible] دبا رہی تھی! اس کا سر جھکا ہوا تھا اور دل سارے جسم میں کنپٹیوں تک دھڑک رہا تھا۔ کان جل رہے تھے۔ وہ اپنی خدمت چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی تھی۔

معتصم اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ رومہ کو اس کا احساس تھا۔

پھر وہ چپکے سے بولے: "اگر آپ کے نازک نازک ہاتھ دکھ گئے ہوں تو ادھر آکر بیٹھ جائیے۔ امی سو چکی ہیں۔ اب پاؤں دبانے کی ضرورت نہیں ہے!"

رومہ خاموش رہی۔

"میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ چپ چاپ اپنا کام کرتی رہی۔ معتصم کے قرب نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ ان کی باتیں کوئی سن لے تو پھر ——؟ معتصم کو اس کی پریشانی سے بڑا لطف آ رہا تھا۔ بولے: "یہ سارا ڈرامہ جو ہوا۔ آپ کو کیسا لگا؟"

"جی۔" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ معتصم کا مسکراتا ہوا چہرہ سارے راز کھول رہا تھا۔ اس کا سر پھر جھک گیا۔

"پوری یوسف زلیخا سننے کے بعد آپ یہ نہ پوچھئے گا کہ زلیخا عورت تھی کہ مرد؟" معتصم نے کہا۔ "کیونکہ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پورے ایک لاکھ روپے قیمتی جہیز اور تعلیم یافتہ صاحبزادی سے میں نے صرف آپ کی خاطر صاحب سے ہاتھ دھوئے ہیں۔ اُف فوہ۔ پچاس ہزار نقد۔ پچاس ہزار کا جہیز ماشاءاللہ سبحان اللہ [illegible]

"ابا جان اس میں لاحول کی کیا بات ہے۔" باجی جان نے کہا۔ "اب سال باپ کی وہی اکیلی رہ گئی ہے۔ سب تو گھر بار کے ہو گئے۔ ماموں جان کے دُلار نے اسے ذرا تیز مزاج کر دیا ہے۔ سو اس کا کیا؟ ہماری [illegible] کے ڈیڈی نے اسے بھی کچھ کم خراب کر کے رکھا ہے۔ یہ بھی تو ملازموں کی جوتی سے خبر لیتی ہے۔" پھر انہوں نے اپنی بیوی کو گھورا۔ اور بیگم علوی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"امی۔ وہ فیشن ایبل نہیں۔ ماموں جان سمجھتے ہیں کہ معتصم تین سال تک باہر کی معاشرت دیکھ آئے ہیں۔ انہیں آزاد خیال فیشن ایبل اور ترقی پسند بیوی ہی پسند آئے گی۔ گھریلو بیا ایسی لڑکی کو بھلا وہ کب دھاریں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بیاہ معتصم کو کرنا ہے۔ ہمیں تو ان کی خوشی منظور ہے۔" بیگم علوی نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ فیشن ایبل بہو ہم لوگوں کو کیا سمجھے گی۔" علوی صاحب بولے۔

"آپ کا زمانہ گیا ابا جان" باجی جان نے پھر ان کی بات رد کر دی۔ "اب آپ بیٹھے بہوؤں کا شکوہ دیکھئے اور اللہ اللہ کیجئے۔ کل کو اللہ نے نینا بھی اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔ آخر امی کب تک گھر کی چکی میں پیسا کریں گی۔؟"

"ماشاء اللہ ہماری بچی سلیقہ لاکھوں میں ایک ہے۔ خدا گواہ ہے کہ میں اسے [illegible] اور نینا ہی کا روپ سمجھتا ہوں۔ بہو نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ [illegible] بہو بھی اسی کی سی آئے۔" علوی صاحب نے کہا۔ [illegible] گوارہ نہیں کہ کوئی ایسی لڑکی آجائے جو ہمارے گھر [illegible]

بےہوش ہو جائیں گے۔ آپ پھر سب سے رشتے جوڑ لیجئے۔ جو آپ کی خوشی وہ میری خوشی۔ مجھے ساری زندگی الماس کے ساتھ تلخیوں میں گزارنا پڑے، مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں۔ بس آپ اچھی ہو جایئے!"

"امی کوئی بھی خفا ہو جائے تو ہم سے کیا۔؟" نینا بولی۔ "آپ اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔ اگر الماس ہم میں کھپ نہ سکیں۔ بھیا کا جی جلاتی رہیں آپ کو دکھ دیتی رہیں تو کیا آپ صرف اسی لئے ان سے بھیا کو بیاہ دیں گی کہ ماموں جان اور باجی جان خفا نہ ہو جائیں۔ چاہے بھیا کی زندگی دوزخ ہو جائے۔"

ماں کو بیزار ہوتے دیکھ کر معتصم نے نینا کو آنکھ سے اشارہ کیا اور بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولے۔ "نہیں بہن۔ یہ مت کہو۔ اگر امی کی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میری زندگی ایسی کون سی قیمتی ہے۔ امی کی مرضی پر قربان ہو جائے تو۔۔۔!"

"دور کرو۔ میاں!" تڑپ کر امی نے کہا۔ "اللہ کرے تمہاری زندگی پھولوں میں گزرے۔ تمہاری مرضی نہیں ہے نہ سہی۔ لڑکیوں کا کیا کال پڑ گیا ہے۔ میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے تھے۔ رضوانہ نے ایسا جو رنگ کر دیا۔ سچ ہے کہ الماس اس گھر میں کھپ نہیں سکتی۔۔۔!"

"میں امی کے لئے سیب کا عرق لے آؤں۔" نینا ایک نظر معتصم پر ڈال کر چلی گئی۔

"شاید کوئی نیند کا انجکشن دیا ہے ڈاکٹر صاحب نے۔" بیگم علوی نے کہا۔ "نیند چلی آ رہی ہے۔ کچھ دیر سو رہوں۔ شاید یہ چکر بند ہو جائیں!"

"ہاں امی سو جایئے کچھ دیر۔" معتصم نے بے حد پیار سے کہا اور ان کے سرہانے نیم دراز ہو کر ان کے بالوں میں انگلیوں سے ہولے ہولے کنگھی

ہو سکے۔ بیٹھو ہم بڈھوں کی تو عاقبت ہی برباد ہو کر رہ جائے گی۔"
"امّاں ایسے نہیں امّاں جان۔" وہ ہنس دیں۔ "ایسا نہیں ہے۔" بیگم علوی
چہک پڑی تھیں۔
"معتصم کو پتہ ہے کہ تم لوگ سید صاحب کے پاس کس غرض سے گئی تھیں"
علوی صاحب نے پوچھا۔
"وہ تو مست مولیٰ قسم کا لڑکا ہے۔ اسے کیا پتہ۔ ابھی میں اس سے
کہوں گی۔" باجی جان نے کہا۔ اور ان کی نظریں رومہ کی طرف اٹھ گئیں جو
ایک گوشہ میں کھڑی چائے پی رہی تھی۔ باجی جان نے اس سے کہا۔
"جاؤ تو ذرا معتصم کو بلا لاؤ۔ کہنا کہ بس فوراً ہی آ جائیں۔"
اسکے ہاتھ میں پیالی کانپ گئی لیکن عدول حکمی کی مجال کب تھی۔ پیالی
ہوادان پر رکھ کر وہ باہر نکلی۔ پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ کیسے جائے گی وہ
ان کے کمرے تک۔ لیکن وہاں تک جاکے فوری طلبی کا پیغام تو سنانا ہی تھا!
وہ باہر کے برآمدے میں پہونچی اور دروازے پر آہستہ سے انگوٹھا بجایا۔
نعمانی باہر نکلے اور دہلیز پر ٹھٹھک گئے۔ رومہ نے اطمینان کی سانس لی
"کیا ہے بہنی ــ!" نعمانی نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔
"احمد بھیا..... نازنینہ بٹیا کی امی نے عصمی بھائی کو فوراً بلایا ہے"
رومہ نے کہا۔
"اچھا تم جاؤ۔ میں انہیں ابھی بھجواتا ہوں۔"
رومہ وہاں سے بھاگ آئی۔
تھوڑی دیر بعد معتصم بھی باجی جان کی خدمت میں پہونچے۔ صورت پر
[illegible] بولیں۔

کروں۔ شاید نارمل ہو جائے امی کا پریشر۔"
"تب تمہارا پریشر ہائی ہو جائیگا عصمی بھیا۔ امی شام تک ٹھیک ہو جائیں گی"
سلمیٰ نے بہت آہستہ سے کہا۔ "جو ہوا سو ہوا۔ اب تم راضی مت ہو جانا۔"
"بھابی۔"
"امی کے پاس جاؤ عصمی بھیا۔ وہ تم سے خفا ہیں۔ راضی کر دو انہیں۔"
"آپ ساتھ چلئے بھابی۔"
"تم نینا کے ساتھ جاؤ۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔ ذرا منصور کے لئے
نرم کھچڑی بنا دوں۔ اسے بھی حرارت ہو رہی ہے۔"
ڈاکٹر صاحب امی کو دیکھ کر نکل رہے تھے۔ تب معتصم کمرے میں گئے۔
علوی صاحب اور رضا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر تک چلے گئے تھے۔ کمرے
میں رومہ اکیلی تھی معتصم اور نینا امی کے پاس گئے۔ تب رومہ ان کے پہلو میں
سمٹ گئی بیگم علوی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"امی!" معتصم نے کہا۔ اور ان پر جھک گئے۔"
"آپ خود کو سنبھالئے۔ اگر آپ اسی میں خوش ہیں کہ میں الماس سے شادی
کروں۔ تو میں راضی ہوں۔ امی۔ مجھے اپنی مرضی اور زندگی کی کوئی پرواہ نہیں
میں تو آپ کی خوشنودی چاہتا ہوں۔ میں ماموں جان سے معافی مانگ لونگا
امی بس آپ اچھی ہو جائیے۔ امی آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بھلا کیسے
زندہ رہوں گا۔"
اور بس امی موم ہو گئیں۔ بولیں۔ "رضوانہ جو خفا ہو گئیں۔ بھیا نے
رشتہ توڑ دیا۔"
"مہرو شادی سے سب ٹھیک ہو جائے گا امی۔ ماموں جان اور باجی

بھائی کا رونا دھونا ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ انہیں سمجھانے لگے
تب بیگم علوی نے آپے سے باہر ہو کر کہا "چلا جا۔ میرے سامنے سے، ناخلف،
ناشدنی، پاپی، دفعان ہو جا یہاں سے۔ منہ پر کالک تھوپ دی۔ خبیث نے
رضا ایسا اپنے کہے میں ہے۔ دو بچوں کا باپ بن گیا ہے۔ مگر پانی بھی پیتا ہے تو
میری اجازت سے اور یہ موت کھایا ہے کہ ماں کو اٹھا کر طاق پر بٹھا دیا ہے
سارے میں تھڑی پٹ گئی۔ بھیا تو عمر بھر کا تعلق ختم کر گئے۔ ہائے ہائے۔
رضوانہ الگ ناراض ہو گئی۔ اب میں کس کا منہ دیکھ کر جیوں گی۔ میرے پروردگار
بھائی بھی گیا بیٹی کی صورت کو بھی ترسوں گی۔ فقط اس جنم جلے ناشاد کی وجہ سے"
"امی میں" معتصم بدحواس ہو کر منمنائے۔
"چلا جا۔ میرے سامنے سے۔ میں کہتی ہوں چلا جا" وہ چلائیں۔ "مجھے امی
کہہ کے مت پکار ۔۔۔!"
"جاؤ۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔!" رضا نے کہا۔ انہیں امی کی گریہ وزاری
ماموں اور بہن کی خفگی سے کچھ زیادتی لگ رہی تھی۔ کسی کو شادی نہیں کرنی
ہے۔ لڑکی پسند نہیں ہے تو خواہ مخواہ کی زبردستی اور ظلم و جبر کیا۔ معتصم بے بسی
سے ماں کو دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نعمانی نہیں تھے اکیلے
میں وہ خوب روئے۔ امی ان کی وجہ سے روئی تھیں۔ خفا ہو گئی تھیں ان سے۔
گھر کی فضا عجیب سی ہو گئی تھی۔ بیگم علوی کی طبیعت رونے دھونے سے
خراب ہو گئی اور وہ بھی اپنے کمرے میں جا کر پڑ گئیں۔
نینا اور سلمیٰ نے معتصم کو خبر کی۔ امی کا پریشر ہائی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر تک کو
بلانے کی نوبت آ گئی ہے۔
ہیں! گھبرا کر معتصم نے کہا۔ "تو پھر کیا خیال ہے بھابی۔ میں الماس سے شادی

"ایسے کٹے کٹے پھرتے ہو کہ کہیں باجی نامراد دبوچ ہی کے بیٹھ جائیں
ارے میں آج تمہارے یہاں مہمان آئی ہوں کل چلی جاؤں گی۔"
"کون سا مجھے روز روز یہاں آنا ہے۔ کبھی تو تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ
میرے پاس بیٹھ کے باتیں کرتے۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا کرتے۔ کبھی میرے پاس
پھٹکتے تو آتے نہیں۔ محبت کی ماری میں ہی بھاگ بھاگ کے آتی ہوں۔"
"میں یہاں تھا ہی کہاں" معتصم نے انھیں رالس لیتے دیکھ کر جلدی
سے کہا "اب آیا کروں گا۔۔۔ آپ نے بلایا تھا اس وقت۔۔؟"
"ہاں۔ احمد کیا سو گئے۔۔؟"
"جی نہیں۔ کچھ پڑھ رہے تھے۔"
"بلاؤ۔"
"کیوں؟"
"اے لو۔ کیوں کیا۔؟ بھائی کی شادی کی بات ہو اور دوسرا بھائی
دلچسپی نہ لے۔" وہ ترخیں۔
چنانچہ نعمانی صاحب بھی آ گئے۔
معتصم کا دل دھڑک دھڑک کے حلق میں آیا جا رہا تھا۔ یا الٰہی۔ کیا
وہ گھڑی آ پہنچی؟
"تسلیمات۔ باجی جان۔؟" نعمانی نے رکوع کے انداز میں جھک کر
سلام کیا۔ "جیتے رہو" انہوں نے ٹھٹھا مار دیا۔ "کیوں کیا ابھی سے نیند
آ گئی تھی۔"
"جی! نہیں تو۔" انھوں نے مسکرا کر کلائی پر نظر دوڑائی۔ "ابھی سے
کیسے آ جاتی۔ دس بھی نہیں بجے۔"

"اچھا بھتیا۔ تو مبارک۔ تمہارے بھائی کی نسبت تو ہم پکی کر آئے۔"
باجی جان نے بے حد خوش ہو کر کہا۔
"کہاں پکی کر آئیں؟" بے تحاشہ حیرت ظاہر کر کے نعمانی نے آنکھیں پھیلائیں
"کہاں کا کیا مطلب؟" وہ خفا ہو گئیں۔ "اتنے بے خبر رہتے ہو۔ اسے
وہ تو کئی سال سے بات طے تھی۔ میں نے تجدید کر دی۔ ماموں جان نے کہدیا
کہ انہیں معتصم کی ملازمت وغیرہ کی فکر نہیں وہ خود اسے نوکر رکھا دینگے
لہٰذا اللہ نے چاہا تو اگلے رجب کی کسی تاریخ کو ——"
"آہا —— باجی جان کا دہ یاں آج تک سجا ہوا ہے" رضا بھی آکر بیٹھ گئے
اور بات از سر نو شروع ہو گئی۔ رضا نے مڑ کر معتصم کو دیکھا جن کے چہرے
پر علانیہ ناگواری اور برہمی کے آثار تھے۔
"تم نے آج پروفیسر حبیب [illegible] کو ملا یا تھا۔ کیا نتیجہ نکلا" علوی صاحب
نے رضا سے دریافت کیا۔
رضا نے [illegible] انہیں پتہ تھا کہ پروفیسر صاحب کے
پاس کیا معاملہ ہوا تھا۔ [illegible] نے معتصم سے کچھ گہرے گہرے سوالات
کئے تھے۔ چھوٹا منہ [illegible] معتصم نے ایسے اوٹ پٹانگ جواب دے کر
پروفیسر صاحب سخت مکدر [illegible] اور صاف صاف رضا سے کہدیا کہ
معتصم کو قطعی کچھ آتا جاتا نہیں [illegible] کو بھی چاپل بنا کے چھوڑینگے
اور انہیں کوئی معمولی سا پوسٹ [illegible] مجبوری ظاہر کر دی تھی۔ رضا
راستے بھر معتصم کو برا بھلا کہتے آئے تھے مگر معتصم تو چکنا گھڑا بن گئے۔
ایک کان سے سنی باتیں دوسرے کان سے نکال دیں۔ چنانچہ علوی صاحب
کے سوال کے جواب میں رضا نے گلا صاف کر کے کہا "جی ہاں۔ وہ کچھ ایسا

معاملہ ہے جناب اور پھر۔ مجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے کہ میں آنکھیں بند
کر کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں ——!"

جس طرح ایک ہولناک طوفان اپنے پیچھے دور دور تک تباہیاں چھوڑ جاتا
ہے۔ اسی طرح رضوانہ بیگم کے جانے کے بعد بڑی پریشانیاں سامنے آگئیں
وہ اب کی بار والدین بہن بھائی بھاوج اور اس شہر ہی سے خفا ہو کر گئی
تھیں اور عہد کر گئی تھیں کہ پھر کبھی نہیں آئیں گی۔ ان کی بڑی توہین ہوئی تھی۔
معتصم سے وہ ملیں تک نہیں۔ نہ ماں باپ ہی سے مخلصانہ انداز میں رخصت
ہوئیں۔ علوی صاحب ان کی خوشامد ہی کرتے رہ گئے۔ ماں نے ہاتھ جوڑے
مگر نہیں۔ وہ تو طوفان بنی ہوئی تھیں۔ دندناتی ہوئی آئیں۔ دندناتی ہوئی گرز گئیں
غضب یہ کیا کہ نہ معلوم کب اپنے ماموں کو خط لکھ کر سارے حالات سے
آگاہ کر دیا۔ ماموں جان کے طیش وغضب کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ وہ آئے
اور اپنی بہن سے خوب لڑے۔ جب ان کا لڑکا اس قدر آوارہ خود سر اور ضدی
تھا تو آخر وہی لوگ کیوں اس کا پیغام لے کر آئی تھیں۔ بیگم علوی گڑ گڑا رہی تھیں۔
تاویلیں کر رہی تھیں وعدے کر رہی تھیں کہ وہ بیٹے کو سمجھائیں گی مگر سید
صاحب قبلہ کا پارہ تو جہنم بنا ہوا تھا۔ وہ کیا ٹھنڈا ہوتا۔ خوب گرج برس
کے اور بہن سے تاطہ توڑ کر رہ گئے تو بیگم علوی رونے بیٹھ گئیں۔ سارا گھر دم
بخود تھا۔ معتصم چپ رہ کے رہ گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بات گھر کے افراد
کے رشتے ناطوں پر بھی اثر انداز ہوگی۔

"آپ ماموں جان سے سوال کر لیجئے گا۔ میں تو صبح ہی کی گاڑی سے چلی جاؤں گی۔ اپنی بے عزتی میں نہیں برداشت کر سکتی!"

"معتصم" نعمانی نے مکاری سے کہا "کم از کم باجی جان کی بات کا پاس و لحاظ تو تمہیں کرنا چاہئیے۔"

"تم خاموش رہو" معتصم نے انہیں بری طرح جھڑک دیا "تم کون ہوتے ہو۔ میرے معاملہ میں بولنے والے۔ میں تمہیں سمجھتا کیا ہوں"

"ارے سنا اس نے" رضا نے کہا۔

نعمانی نے بے بسی سے باجی جان کو دیکھا۔ وہ چنگھاڑ کر بولیں "ہاں ہاں تم بھی چپ رہو اور سب کوئی منہ پر تالے لگا لیں۔ میں تو چلی شادی دادی کو جوتی کی نوک پر مار کے۔ اب اماں با جا جائیں اور سر پھر بیٹھے جائیں۔ میں بھی کون ہوتی ہوں۔ بھلا چاہا تھا وہ جب برا ہو گیا تو میری بلا سے!"

جھنکارتی ہوئی وہ اٹھ کر چلی گئیں!

"ٹھیک تو ہے" رضا نے چپکے سے کہا "باجی جان نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ ابھی سے نسبت پکی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں پوچھتا ہوں" علوی صاحب بولے "صورت حال اتنی نازک ہے اب سید صاحب قبلہ کو کیا جواب دیا جائے گا۔"

"میں کیا جانوں" بیگم علوی بے حد گھبرا گئی تھیں۔ معاملہ ان کے بڑے بھائی کا تھا۔ بھانجی کا تھا اور بیٹے کا تھا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گئیں ان کی حالت دیکھ کر یونہی رسماً سب نے معتصم کو سمجھایا کہ آدمی سیکڑوں کا لیے مرضی سے کرتا ہے۔ ایک یہ بھی سہی۔ معتصم نے جواب دیا "زندگی بھر کا

وعدہ کیا ہے کہ جب اگلے سال کالج دوبارہ کھلیں گے تو ان کا خیال رکھا جائیگا ابھی تو ساری جائیدادیں بکھری ہوئی ہیں"

"ارے تو اب تیری میری خوشامد کی کیا ضرورت ہے؟" باجی جان نے کہا۔ "بڑے ماموں جان نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر یہ پھر امریکہ جانا چاہیں تو وہ رقم وغیرہ کا سارا بندوبست کر دیں گے!"

"استغفراللہ" معتصم نے بے ساختہ کہا "میں نے تو اپنی ساری غیرت شرم و حیا کہیں گروی رکھ دی ہے نا کہ ماموں جان کی بھیک پر امریکہ چلا جاؤں گا آپ سب کو اپنے روزگار کی اتنی وحشت کیوں ہے۔ میں سر پہ اینٹیں ڈھو دونگا اور روٹی پیدا کر لوں گا۔ مجھے کسی کا دست نگر ہونا پسند نہیں ہے۔ باجی جان آپ کس سے پوچھ کے سید صاحب کے دیوانِ اقدس پر گئی تھیں؟"

"ہوش میں تو ہو" وہ گرجیں "میں بھلا تم سے اجازت لے کر جاتی۔ تم کہہ کیا رہے ہو۔ تمہارا بھلا کرنے گئی تھی۔ مجھے کیا غرض!"

معتصم جو ابھی تک بزدل بنے رہے تھے یک بیک جھلا گئے اور کسی کا خیال کئے بغیر بولے "میں نے سنا ہے۔ محترمہ الماس بڑی ترقی پسند، آزاد خیال اور فیشن ایبل ہیں۔ مجھے معاف رکھئے۔ میں ایسی بیوی نہیں چاہتا مجھے اپنے گھر میں خواہ مخواہ کا سر پھٹول کرانا پسند نہیں ہے۔ مجھے تو یہی تعجب ہے کہ ایسی واہیات لڑکی امی کو کیوں کر پسند آ گئی؟"

باجی جان کا خیال تھا کہ معتصم بلبلا جائیں گے۔ مگر یہ تو الٹی آنتیں گلے پڑیں وہ آگ بگولہ ہو گئیں۔

"آئی عزت کو ٹھکرا رہے ہو۔ کون دیتا ہے یکمشت پچاس ہزار اور پچاس ہزار کی شادی۔ گھر بھر جائے گا جہیز سے۔ سمجھے!"

"جہیز...؟" معتصم نے بھی برہم ہو کر کہا۔ "آگ دکھا دوں گا ایسے جہیز کو۔ میں معافی چاہتا ہوں۔۔!"

"تو پھر کیا ہم ماموں جان کے سامنے ذلیل اور سُبک ہوں گے۔۔۔؟"

باجی جان کا چہرہ فرطِ غیظ سے بگڑنے لگا تھا۔

"اس کا ذمہ دار میں کب ہوں؟" معتصم نے جواب دیا۔ "آپ نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا۔ میں نے تو امی سے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے ابھی شادی وادی نہیں کرنی ہے۔"

علوی صاحب چپ چاپ سگار کے کش لے رہے تھے۔ بیگم علوی بھی خاموش تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں اچھا ہے بھائی بہن آپس میں نپٹ لیں۔ دونوں میں خوب زور دار بحث ہو رہی تھی۔ پھر دفعتہً جیسے کوئی منظر بدل گیا ہو۔ روما ننھے انصار کو لئے ہوئے آئی اور سلمہ کے پاس پہونچ کر چپکے سے بولی "نہیں سو رہے ہیں۔ بھابی۔ رو رہے ہیں۔ آپ لے لیجئے شاید چپ ہو جائیں۔"

معتصم کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ سلمہ جیسے نیلے رنگ کے سوتی لباس میں وہ کتنی پیاری ہو رہی تھی۔ پلکیں جھکی ہوئی۔ ننھے منے لب کپکپاتے ہوئے سہمی ہوئی فاختہ۔

معتصم کی پُرشوق اور معنی خیز نگاہیں کسی سے پوشیدہ نہ رہیں۔ ان کی آنکھوں میں کتنی تیز چمک تھی۔ سب نے اسے دیکھا اور اپنی اپنی جگہ سب ہی متحیر سے رہ گئے۔ یہ بھی تو بدقسمتی ہی تھی کہ ان کا راز بھری محفل میں عیاں ہوا تھا۔

روما نے روتے بسورتے بچے کو سلمہ کے حوالے کیا اور ادھر سے [illegible] معتصم نے رخ پھیر لیا اور ناخوش گوار انداز میں

پاؤں ہلانے لگے۔ اب انہیں ضد سوار ہو گئی تھی۔ ہر چہ بادا باد۔ چاہے جو کچھ ہو جائے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ آخر ان کی قسمت سے کھیلنے کا حق کسی کو کیا تھا؟

"تم سمجھاؤ۔" باجی جان اچانک نعمانی پر الٹ پڑیں۔ "یہ آخر کیسی نادانی ہے۔ انہیں ایک لاکھ روپیہ برا لگ رہا ہے۔ کون لڑکی جہیز نہیں لاتی۔ اور آج کل تو لین دین کا بھی رسم ہے۔ اس میں بے غیرتی بے شرمی کیا؟ دیکھ رہے ہو گھر میں گت کی ایک چیز نہیں ہے تب تو گھر قرینہ کا ہو گا۔"

معتصم نے جواب دیا۔ "کیوں کیا آپ سمجھتی ہیں کہ میں معذور ہو گیا ہوں۔ میں جاہل ہوں۔ میں خود کما نہیں سکتا۔ اپنے گھر میں گت کی چیز نہیں لا سکتا۔ مجھے دوسروں سے خیرات لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ارے پاگل دلوانے سودائی۔ دوسروں کی خیرات کیا۔ وہ تو تیری بیوی لائے گی۔" باجی جان نے سر پیٹ لیا۔ چیخ چیخ پڑیں۔ مگر معتصم متاثر نہیں ہوئے۔

"نہ مجھے ابھی بیوی کی ضرورت ہے نہ اس کی چیزوں کی۔ پہلے میں کہیں ملازم ہو جاؤں۔ پھر سوچوں گا۔"

"اور چاہے ماموں جان کے سامنے ہماری ناکیں کٹ جائیں۔" وہ بولیں اور بیگم علوی سے کہا۔ "امی۔ آپ کیوں چپ ہیں۔ سمجھاتی کیوں نہیں۔ اگر اس پاجی صورت حرام نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ ابھی شادی نہیں کروں گا تو آپ مجھ سے کہہ دیتیں۔ آپ وہاں میرے ساتھ گئی کیوں؟"

"مجھے کیا پتہ تھا کہ ایسا کرا اسعد کے دماغ میں بیمار پڑے گا؟" امی بولیں

"اچھا تو پھر مجھے بھی کچھ نہیں معلوم۔" وہ طیش میں ہانپتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں۔

786

عِفّت مُوہانی
کا
نیا شاہکار
ایک پُر فریب محبت
اور جذبۂ انتقام
کی حیرت انگیز کہانی
تشنہ کام
جو قطعی عِفّت کا شاہکار ثابت ہوگا
قیمت اِکیس روپیہ

THE HAREEM

Mar 84

Rs. 1|50

ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر آفس - ۲۲۵۰۹
ٹیلیفون نمبر رہائش - ۴۵۳۲۲

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا
ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۴) فہرست مضامین مارچ سنہ ۸۴ء نمبر (۳)

اڈیٹر و نگراں: نسیم انہونوی

معاونین: - شوکت جہاں بیگم غزالہ —— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	" "	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری	" "	تیئیس روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر بحیثیت زائد فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

غیر ممالک سے

انھیں کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری اور ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔ • حریم ہر انگریزی ۵ ر کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ ر کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ ر کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۳۰ ر تاریخ سے پہلے دفتر میں وصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس ورنہ

ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لکھنؤ
حلاوتوں لطافتوں اور نزاکتوں کا شہر ہے اور
اور اس شہر نگاراں میں بخشی کمپنی کی محافظ صحت ادویات
حسن افزا مصنوعات، آپ کو آسانی حاصل ہوسکتی ہیں۔
قلب شہر کے علاوہ اتر پردیش کے مرکزی شہروں
میں بھی بخشی کے اسٹاکسٹ، موجود ہیں۔
اپنے قریبی بخشی اسٹاکسٹوں سے
اپنا پسندیدہ سرمہ نورِ نظر۔ سندری سہاگ تیل
اور
اکسیر اعظم ڈراپس وغیرہ
آسانی سے حاصل فرمائیں
ایس، اے، بی بخشی کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۲۲۴۵ کلکتہ ۷۳
اسٹاکسٹس:۔
لکھنؤ۔ ۱۔ اشتیاق حسین پرفیومرس مولوی گنج لکھنؤ
۲۔ اسلامی بک ڈپو مسجد پڑا گلی امین الدولہ پارک لکھنؤ
کان پور۔ ناظم علی صدیقی ۹۹ نالہ روڈ چمن گنج کانپور

میری صحت ٹھیک نہیں۔ لمعات نہیں لکھ سکا اس لئے اُمِّ ہانی سلمہا کا یہ مضمون لمعات کے کالمس میں شائع کر رہا ہوں، جس کے لئے یہ بید موزوں ہے۔ نسیم امروہوی

"اَلنِّسَاءُ حِبَالَةُ الشَّیْطَانِ"

مذکورہ بالا حدیث شریف دیکھ کر میں چونکی۔ پڑھی "النساء حبالۃ الشیطان" یعنی عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں۔ کیا یہ حدیث حقیقتاً مجسم ہو کر آج ہمارے روبرو نہیں ہے؟۔ وہی عورت جس کی تعظیم و توقیر کی خاطر اسلام نے بہترین قوانین پیش کئے، جس کی عزت و عظمت کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلائی۔ پھر انھیں عورتوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں یہ ارشاد فرمایا کہ عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں"

پہلے ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ رسّی کس کام میں لائی جاتی ہے؟۔ اس کی کیا خصوصیت ہے؟۔ رسی ایک طرح کا جال اور پھندا ہے جس سے کسی چیز کو باندھنے کا کام لیا جاتا ہے۔ رسّی کچھ پھنسانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں اس حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ شیطان کسی کو پھانسنے کے لئے عورتوں کو ذریعہ بناتا ہے۔ ان کو جال بنا کر کسی کو دام میں پھنساتا ہے۔ شیطان تو موقع کا منتظر رہتا ہے۔ وہ ہر طریقے سے انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپئے رہتا ہے۔ اور بہکانے کے لئے اسے عورتوں کو مستعمل کرنا سب سے کارآمد لگتا ہے لہٰذا اسے عورتیں سب سے بہترین ذریعہ نظر آتی ہیں۔

لیکن کبھی ہم عورتوں نے یہ سوچنے کی کوشش بھی کی ہے کہ آخر شیطان کا داؤں ہم پر کیونکر چل جاتا ہے۔؟ کیوں وہ ہمیں گناہ کروانے کا ذریعہ بنا رہا ہے؟ آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی؟ وہ ہم پر اس قدر حاوی کیسے ہوگیا؟ ضرور ہم میں کمزوریاں ہوں گی، خود ہم میں ہی کھوٹ ہوگا۔ تبھی شیطان کی اس قدر جرأت ہوئی کہ وہ ہمیں یوں زیر کر رہا ہے!

> حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے آپ نے فرمایا کہ وہ دونوں ہی تیری جنت ہیں یا پھر دوزخ (انکی اطاعت جنّت اور نافرمانی جہنم ہے) ——— ابن ماجہ

عصرِ حاضر میں جو چلن عورتوں نے اپنایا ہے اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے کہ شیطان بھی اپنی مکاریوں اور عیاریوں میں مات کھا گیا ہے۔ آج عورتوں کی بے حیائی اور عریانی سے شیطان کے بھی تمام داؤں پیچ ماند پڑ گئے ہیں۔ شاید ان کی ان لغویات کو دیکھ کر شیطان بھی اپنی شیطنت کی بے وقعتی پر دنگ رہ جاتا ہو۔ اس نے تو ایک شوشہ چھوڑ دیا لیکن اس رائی کو پربت بنانے والی، اس کو پھیلا دینے والی اور اس پر بہ بانگ دہل صاد کہنے والی یہی عورتیں ہیں۔

آزادیٔ نسواں کی حامی عورتیں آئے دن احتجاجی جلوس نکالتی پھرتی ہیں۔ جگہ جگہ جلسے منعقد کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ سڑکوں پر، سینما ہالوں، تفریح گاہوں اور بازاروں وغیرہ میں چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے اور چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں مگر وہ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ان مردوں اور لڑکوں کو برانگیختہ کرنے کے پورے سامان سے لیس ہو کر وہ کیوں گھروں سے نکلتی ہیں؟ کیوں ایسے عریاں ملبوسات زیبِ تن کئے رہتی ہیں کہ دیکھنے والوں کے ذہن آلودہ ہوں اور بری فطرت کے مرد اور لڑکے ان

کیسا تو فحاشی پر اتر آئیں ؟ ۔ کیوں وہ اس قدر میک اپ سے
بن ٹھن کر نکلتی ہیں کہ خواہ ان پر بری نظریں اٹھیں، ان سے فحش کلامی
کی نوبت آجائے اور لوگ غنڈہ گردی کر کے اپنے وحشی نفس کو
تسکین دیں۔ جب عورتیں خود ہی اپنی طرف اس ڈھنگ سے راغب
کرنے میں پیش پیش ہیں اور صرف مردوں کو دعوت نظارہ دینے
کی غرض ہی سے وہ باہر نکلتی ہیں تو پھر سماج میں بکھرنے والے برے
عناصر سے کیا شکوہ ؟۔ ان کو اتنا موقع ہی کیوں فراہم کیا جائے کہ
وہ ان سے چھیڑ چھاڑ کریں ؟۔ یہ نوبت ہی کیوں آئے کہ وہ عفت
عصمت کے زندہ مجسمے ان کی فحاشیوں کا شکار بنیں ؟۔ اور
شرم و حیا کی سوداگری اسی طرح ہوتی رہے !۔

مجھے تعجب ہوتا ہے ان عورتوں پر جو جلسے اور جلوس کے
لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں، مگر جو عورتیں آج فحاشی کو اپنا
وتیرہ بنا چکی ہیں ان کے خلاف یا عورتوں کے عریاں پوسٹرس
اور اشتہارات کے خلاف کوئی احتجاج بلند نہیں کرتی ہیں! بلکہ انھیں
کی تقلید کرنے پر کمربستہ نظر آتی ہیں۔ سینما میں مردوں کے شانہ
بہ شانہ بیٹھی ہوئی اور گردنوں کو فخر و غرور کے ساتھ اکڑائے، اسمارٹ
بننے کے اسٹائل میں بیٹھی ہوئی زنا بالجبر کے مناظر
Rape Scene دیکھا کرتی ہیں۔ ان مکروہ حرکتوں
کو دیکھ کر انھیں کراہت نہیں آتی! یہ بیہودگیاں ان کی طبع
نازک پر گراں بار نہیں ہوتیں۔

آہ! یہ کیا ہو گیا ہے عورتوں کی حمیت کو ؟۔ خود اپنا ہی ننگا ناچ بڑے
فخر سے دیکھ رہی ہیں۔ خود اپنی عزت کی دھجیاں اڑتے ہوئے دیکھتی
ہیں اور مسکراتی ہیں، خوش ہوتی ہیں کہ یہ تو محض تفریح ہے۔ اپنی ہی
جیسی نازک آبگینہ سی عورتوں کو سربازار عریاں دیکھتی ہیں اور ہزاروں
ناظرین کو اس منظر سے حظ اٹھاتے دیکھتی ہیں اور اسے صرف تفریح
کا نام دیتی ہیں۔ تف ہے ایسی تفریح پر جو شرم و حیا کو ریزہ ریزہ
کر دے، جو عفت و عصمت کا جنازہ نکال دے۔

آزادیٔ نسواں کی حامی عورتیں تو بڑی بے باکی سے مختلف
مسائل کے لئے احتجاجی جلوس نکالتی پھرتی ہیں۔ مخالف مضامین
چھپواتی ہیں۔ بڑی بڑی عدالتوں میں مختلف مقدمات پیش کرتی
ہیں۔ لیکن کیا وہ ان فحاشیوں کے لئے احتجاج نہیں کر سکتیں؟

کہ عورتوں کو اس طرح سر عام بے عزت کیا جائے۔ عورتیں
گھروں کی زینت ہیں، مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بیٹیاں ہیں،
بیویاں ہیں، مردوں کے لئے سکون کا ذریعہ ہیں اور آئندہ نسلوں
کی معمار ہیں۔ تو پھر تصویروں اور اشتہاروں کے ذریعہ
ان کا اس طرح استحصال کرنا کہاں تک تہذیب و اخلاق کی تائید
کرتا ہے۔ مگر نہیں ——— یا عورتیں بڑے ذوق و شوق
سے ان بیہودگیوں کو سراہتی ہیں۔ اور پھر انھیں کے نقش قدم
پر چلنے کے لئے پوری طرح کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ اور پوری
قوت و صلاحیت کے ساتھ ان کی نقالی میں کوشاں نظر آتی
ہیں۔ وہ خود شیطان کی رسیاں بن بیٹھی ہیں۔ پھر ایسی
حالت میں شیطان سے یا شیطان نما آدمیوں سے شکوہ کناں
ہونا عبث ہے۔

اس وقت ندامت سے سر جھک جاتا ہے اور آنکھیں اشکبار
ہو جاتی ہیں جب شرم کا آنچل ڈالنے اور عفت کا زیور پہننے کی
مستحق خواتین کاغذ کے بیجان صفحوں پر عریانی کا اشتہار
بنی ہاتھوں ہاتھ بکتی نظر آتی ہیں۔ ہر طرح کی گندی نظروں کا
شکار بنتی ہیں، انھیں بیہودہ عوامل پر اکساتی ہیں اور پورے
سماج کو گندہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

میری مسلمان بہنو! آج آپ سے ہماری تہذیب پکار
پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہمیں اس طرح تباہ ہونے سے بچالو!
باطل نظام کو بدل ڈالو! صالح معاشرہ کی تشکیل کر دو!
کیا اب بھی وقت نہیں آگیا ہے کہ ہم خود ایمان کی
قوت اور نیکیوں کا عصا لے کر اٹھ کھڑے ہوں تاکہ اس بے دینی
اور شیطنت کا خاتمہ ہو سکے۔ اور خدا اور اس کے سچے
رسول مقبول سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بنائے
ہوئے نظام کو قائم کرنے میں معاون بن سکیں۔ اور خود شیطان
کی رسیاں بن جانے جیسے ہتک آمیز فعل سے بری الذمہ
ہو جائیں ——— !

آہ اظہر نگرامی

۱۹۶۰ء کی بات ہے، جب اظہر نگرامی سے میرا

غوث الاعظم

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

عالم اسلام کے لئے پانچویں چھٹی صدی ہجری کا دور بڑا نازک تھا کیونکہ حکومت واقتدار حاصل تھا۔ مگر حقیقت میں ملت اسلامیہ ذہنی اور فکری انتشار، عقائد کی کمزوری اور بدعتوں کی تاریکیوں میں گھر چکی تھی۔ باہمی نفاق، اقتدار کی کمزوریاں اور خود علماء میں ذہنی وفکری ہم آہنگی کے فقدان اور باہم منافرت ومخالفت نے عجیب ہی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اسلام کی حقیقی روشنی اور تعلیمات نبویؐ خرافات کے پردوں میں پسٹی جا رہی تھی۔ سیاسی، اخلاقی، معاشی اور تمدنی انتشار پھیل رہا تھا — اور مسلمان تیزی سے زوال وانحطاط کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بغداد کی خلافت اسلامیہ نہ صرف بے عملی اور کمزوری کا شکار تھی۔ بلکہ اس میں عقائد کے فتنے بھی پیدا ہو چکے تھے جس نے اس کی مرکزی حیثیت بھی تقریباً ختم کر دی تھی اور ملوکیت بدترین شکل میں مسلط تھی۔ علماء کا ایک گروہ ملوکیت کا ہمنوا بنا ہوا تھا۔

اس نازک دور میں شیخ الثقلین غوث الاعظم حضرت محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس دنیا میں آب وگل میں تشریف لائے اور بچپن سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک اسلام کی خدمات ادا کیے اور تعلیمات رسولؐ کی اشاعت میں ہمیشہ مصروف رہے اور اپنی عملی زندگی سے اسوۂ رسولؐ کا نمونہ پیش کر کے مسلمانوں میں عقائد وایمان کی پختگی پیدا کی اور بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لا کر اسلام کی ایسی خدمت کی جو رہتی دنیا تک یاد رہے گی اور ہمیشہ مسلمانوں کے لئے مشعل راہ رہے گی۔ آپ نے اقتدار اور تاج وتخت کے بجائے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی۔ لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ جہاں کی تاریکیاں دور کر کے ہر سو ایمان کا اجالا پھیلا دیا۔ اصل میں آپ کی ساری زندگی وعظ وتنبیہ سے زیادہ سراپا شفقت اور عملی تھی۔ آپ نے اپنی روزمرہ کی زندگی اور اخلاق ومحبت سے ایک انقلاب برپا کر لیا۔ جس نے اس دور میں مسلمانوں کو انحطاط سے نکال کر استحکام ویقین کی منزل سے ہم کنار کیا۔

پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱، ۴۷۰ھ یکم ماہ رمضان المبارک میں جیلان ہی گاؤں میں ہوئی۔ ولادت کے کچھ دنوں کے بعد ہی آپ کے والد بزرگوار ابوصالح جنگی دوست کا سایۂ شفقت اٹھ گیا۔ اس طرح آپ اپنے نانا کے زیر سایہ آ گئے۔ والدہ ماجدہ فاطمہ عرف ام الخیر کی تربیت اور نانا سید عبداللہ کے سائے میں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ دی گئی۔

آپ کی والدہ ماجدہ کی عظمت وتقویٰ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ شادی سے پہلے ان کے والد سید عبداللہ نے اپنے ہونے والے داماد ابوصالح سے کہا کہ بھائی دیکھو میری یہ بیٹی پاؤں سے لنگڑی، ہاتھوں سے لنج، کانوں سے بہری اور آنکھوں سے نابینا ہے۔ یہ سن کر ابوصالح حیران ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ میری بیٹی پاؤں سے لنگڑی اسلئے ہے کہ آج تک گھر سے باہر قدم نہیں نکالا ہے۔ ہاتھوں سے لنج اس مفہوم میں ہے کہ اس نے آج تک خلاف شریعت کوئی کام نہیں کیا۔ کانوں سے بہری اس معنی میں ہے کہ اس نے کوئی خلاف حق بات نہیں سنی اور نابینا اس معنی میں ہے کہ اس نے آج تک کسی نامحرم پر نظر نہیں ڈالی۔

" تو یہ تھیں غوث اعظم کی والدہ ماجدہ جن کے تقویٰ کا ابتدائی گھر میں یہ حال تھا۔ تقویٰ و پرہیزگاری کی یہ خصوصیات بیٹے میں بدرجہ اتم منتقل ہوئیں۔ آپ کی ولادت کے وقت والدہ ماجدہ کی عمر ۶۰ سال تھی۔ آپ کے بچپن کا یہ واقعہ تو مشہور ہی ہے کہ جب آپ مزید حصول علم کے لئے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ بغداد جانے لگے تو والدہ نے چالیس دینار آپ کی صدری کے اندر ٹانک دیئے تاکہ اخراجات میں کام آئیں۔ ساتھ ہی روانگی کے وقت یہ تاکید کر دی کہ بیٹا ہمیشہ سچ بولنا

جھوٹ سے پرہیز کرنا۔ بیٹے نے ماں کی نصیحت کو ذہن نشین کر لیا اور قافلے کے ساتھ چل پڑے۔ راستے میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے قافلے والوں کو لوٹ لیا۔ کسی نے عبدالقادر جیلانیؒ کے پاس کوئی سامان وغیرہ تو تھا نہیں۔ ان سے پوچھا کہ تمھارے پاس کیا ہے تو انھوں نے صاف صاف بتا دیا کہ میری صدری میں چالیس دینار ہیں۔ ڈاکوؤں کو اس صاف گوئی کا یقین نہیں آیا چنانچہ انھیں ساتھ لے کر اپنے سردار کے پاس پہنچے۔ سردار کے پوچھنے پر بھی انھوں نے یہی جواب دیا۔ تو سردار نے ان کی صدری کا استر چاک کیا تو اس میں چالیس دینار برآمد ہوئے۔ سردار یہ ماجرا دیکھ کر بے حد حیران ہوا اور پوچھا کہ آپ نے سچ بول کر اپنی متاع کے ضائع ہونے کا خطرہ کیوں مول لیا تو انھوں نے کہا کہ میری ماں نے ہر حال میں سچ بولنے کی ہدایت کی تھی جس پر میں نے عمل کیا

آپ کی اس صداقت کا ڈاکوؤں کے سردار پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رو پڑا اور گناہوں سے توبہ کر کے نیکوکاروں میں شامل ہو گیا۔

آپ کی عملی تبلیغ کا یہ پہلا کارنامہ تھا جس کا سلسلہ ساری عمر جاری رہا بغداد پہنچ کر آپ نے اپنی تعلیمی اور تبلیغی زندگی کا آغاز اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ المخزومی کی مدد سے کیا اور علم ظاہری و باطنی کی تکمیل ہوئی۔ آپ کی تبلیغ و وعظ سے ایک خلقت متاثر و مستفیض ہونے لگی اور لوگوں کی زندگی اور معاشرے میں انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ علم و فضیلت میں آپ کو سب پر فوقیت حاصل ہوئی اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپکو قطبیت و ولایت کے اعلیٰ مقام پر سرفراز فرمایا۔ آپ اپنی محفل میں وعظ فرماتے تو یہودی و عیسائی بھی متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے۔ آپ کی پوری زندگی محبت رسولؐ اور اتباع سنت کی لازوال مثال تھی۔ اپنی تعلیمات میں لوگوں کو شریعت پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید فرماتے۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر حدود اللہ (یعنی احکام شریعت) میں کوئی حد ٹوٹ جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ فتنے میں پڑ جانے کا احتمال ہے اور شیطان دغا دے رہا ہے ایسے موقع پر شریعت کی طرف رجوع کرو۔"

حضرت عبدالقادر جیلانی نے عبادت و ریاضت میں بڑی سختیاں اور مصائب بھی برداشت کیے۔ پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں میں بھی زندگی گزاری اور یاد الٰہی میں غرق رہے۔ چنانچہ آپ خود اس دور کا اپنا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں عراق کے بیابانوں، جنگلوں اور ویرانوں میں گھومتا رہا اور شب و روز مجاہدات میں مصروف رہا۔ فنا فی اللہ اور فنا فی الرسولؐ کا مقام تھا اور اس عرصے میں مجھ پر ہزار ہا اسرار ظاہر ہوئے۔"

آپ اپنے قصیدے میں جو قصیدہ غوثیہ کے نام سے مشہور ہے فرماتے ہیں کہ "اگر میں اپنے راز پہاڑوں پر ڈال دوں تو پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر ریت بن جائیں۔" آگے فرماتے ہیں:۔

"ہر ولی اپنے پیغمبر کے نقش قدم پر ہوتا ہے میں اپنے جد امجد یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر ہوں۔ جہاں جہاں میرے جد امجد نے قدم رکھے ہیں میں نے انہی مقامات پر اپنے قدم رکھے ہیں بجز راہ نبوت کے کہ میں وہاں معذور تھا۔ وہاں غیر نبی کی گنجائش نہیں۔"

غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور تصانیف میں غنیتہ الطالبین، فتوح الغیب، اور الفتح الربانی شامل ہیں جب آپ کی عمر ۹۱ سال کی ہوئی تو آپ کے رب نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا آپ کا وصال مشہور روایت کے مطابق ۱۱ ربیع الثانی ۵۶۱ھ میں ہوا اور عقیدت مندوں کے ہجوم کثیر میں آپ کو آپ ہی کے مدرسے کے احاطے میں سپرد خاک کیا گیا۔

ارشادات غوث الاعظم رحمتہ اللہ علیہ

• کھردرے اور موٹے کپڑے پہننے اور روکھا سوکھا کھانے میں شان نہیں ہے۔ شان تیرے قلب کے زہد اختیار کرنے میں ہے۔

• اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارا ہو جائے تو اس کی اطاعت اور اس کے ساتھ صبر کرنے اور اس کے افعال پر جو تمھارے اور دوسروں کے متعلق صادر ہوں راضی ہو جانے میں مشغول ہو۔

• قلب کی اصلاح کرو کہ یہی ایسی چیز ہے کہ جب سنور جائے تو سارے حالات سنور جاتے ہیں۔

• پہلے اپنے نفس کو نصیحت کرو اس کے بعد دوسرے کے نفس کو۔

• تقویٰ کو ضروری سمجھو اور شریعت کی حدود کو اپنے اوپر لازم کرو نفس خواہش، شیطان اور برے ہم نشینوں سے دور رہو۔

• جب تم کو کوئی تکلیف لاحق ہو تو صبر کے ہاتھ سے اس کا استقبال کرو اور سکون سے رہو۔

• اگر دولت مند اور مفلوک الحال کے امین، دونوں کے پاس کاتے
وقت کچھ ترقی پائے گا تو تمیں ہرگز فلاح نہیں ہوگی۔

• اتباع کرو، بدعتی نہ ہو، موافقت کرو مخالفت نہ کرو، تابعدار
ہو نافرمان مت ہو، مخلص ہو۔

• جلوت و خلوت میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان اختیار کرو۔

• نعمتوں کے شکر گذار ہو ورنہ وہ ہاتھ سے چھن جائیں گی۔

بادل کا سایہ

ایک نئے قسم کا رومانی جذباتی اصلاحی ناول پست قسم
کی جذباتیت سے عاری رہ کر یہ ایک ایسی لڑکی کی رومان
پرور کہانی ہے جس کا کردار زندگی سے قریب اور ہم آہنگ
ہے۔ اس کے پلاٹ میں نیا پن ہے، مکالمے اور انداز بیان
میں دل کو چھو لینے والا اسلوب ہے اور کرداروں کے جذبات
اور نفسیات کی عکاسی نہایت ہی اچھی ہے ایک ایسا دلفریب
ناول جو آپ کو مصنف کے دوسرے ناول
کے لیے بے چین کر دے گا
یہ دعویٰ ہے نسیم بک ڈپو کا جس نے

عفت موہانی، عطیہ پروین، مسرور جہاں
واجدہ نازلی، رفعیہ منظور الامین، شاہدہ بانو بلگرامی
وسیم بانو قدوائی، بخم اعزاز، نوشابہ سعید ناز جیسی
مشہور خواتین ناول نگاروں سے پڑھنے والوں کا تعارف کروایا اور
ان کے شاہکار پیش کئے

مچھلی: سانپ، مینڈک اور کچھوا سب پانی میں رہنے والی چیزیں
ہیں مگر پانی کا جو محبت ہے، وہی کچھ ہے کہ بغیر پانی تڑپ تڑپ کر جان
دے دیتی ہے۔ (تلسی داس)

اگر مچھلی ہوشیار ہو اور وہ ایک دفعہ شکاری کی زد سے بچ نکلی ہو
تو پھر گدلے پانی سے کنارے کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔ (خوشحال خان خٹک)
سمندر میں جب طغیانی ہو، تو اس وقت مچھلی کا شکار کرنا مشکل ہے۔
(ماتیبو)

شبِ معراج

درخشاں ملیح آبادی

حق کے مہماں تھے شہ جن و بشر آج کی رات
عرش اعظم پہ ہوا ان کا گذر آج کی رات

واہ کس شان کی تھی سیر شہنشاہ اُمم
طے دو عالم کا کیا پل میں سفر آج کی رات

مژدۂ وصل سنانے لگے آکر جبریل
زلف لیلیٰ جو گئی تا بہ کمر آج کی رات

شور تھا ارض و سما میں کہ ہے سج دھج کے چلا
سوئے افلاک مدینے کا قمر آج کی رات

جگمگانے لگا کونین کا ہر اک ذرہ
بارش نور رہی تا بہ سحر آج کی رات

کہکشاں نے جو سر راہ بچھائے تارے
بہر تعظیم جھکا ماہ کا سر آج کی رات

مسکرانے جو لگے خلد بریں کے غنچے
رنگ پھولوں کا گیا اور نکھر آج کی رات

بوئے گل کی طرح تھی ہفت سما میں پھیلی
آمد احمد مرسل کی خبر آج کی رات

ہو کے مسرور یہ کہنے لگا ہر اک قدسی
ہم کو دکھلائے گا رب حسن بشر آج کی رات

کھینچ کر لایا تھا حوران بہشتی کو بھی
شوق دیدار سر راہ گذر آج کی رات

ہوش کھو بیٹھے ملائک بھی جو دیکھی صورت
حسن دلکش میں تھا جادو کا اثر آج کی رات

خلوت خاص میں حاصل ہوئے جب راز و نیاز
بر تمنائے دلی آگئی بر آج کی رات

درمیاں سے جو ہٹا ایک حجاب نوری
آگیا جلوہ یزداں بھی نظر آج کی رات

آسرا آپ سے درخشاں کو ہے اے دلبر رب
چشم رحمت ہو ذرا اب تو ادھر آج کی رات

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر اس طرح روانہ کریں کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں موصول ہو جائے۔ اس کے بعد والی خبریں ایک ماہ تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر کا پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ آنا ضروری ہے۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کا ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

ولادتِ اطفال کی خبریں

● مہر النسا (بنگلور) میری چھوٹی بیٹی شمیم النسا اور داماد عبداللہ کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد اللہ پاک نے ۱۱ر جنوری [illegible] کو ۲ بجے دن میں ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام ضمیر احمد قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنے۔

● فضل النسا (سانتا کروز۔ بمبئی) میری بہن نصرت سلمہا و بہنوئی سلطان محمود کو اللہ پاک نے ۱۸ر دسمبر ۸۳ء بروز اتوار ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اسے عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔

● ایم اقبال تنصیر (آمبور) میرے ماما جی۔ ایم مولانا اور [illegible] پروین کو اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ ایک دختر عطا فرمائی۔ نام سعدیہ صدف قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔

● نسیم الرحمت (اعظم گڑھ) میری چھوٹی آپا مریم فاروقی کو اللہ پاک تعالیٰ نے ۳۰ر جنوری ۸۴ء بوقت صبح صادق ۴ بج کر ۵ منٹ پر عرصہ دراز کے بعد ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے اور اللہ و رسول کے احکام کی پیروی کرنے والا بنائے۔

● نازنین سلطانہ (بے نگر۔ بنگلور) میری باجی شاہین سلطانہ اور بہنوئی فیاض احمد کو خدائے تعالیٰ نے ۱۴ر اکتوبر کو ایک دختر عطا فرمائی۔ نام جویریہ عرف نازیہ فیاض رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے عمر طویل پائے اور صاحب نصیب ہو۔

● فرزانہ، ریحانہ، فرحانہ اور افشاں (بریلی) ہماری بہن عابدہ بیگم اور بہنوئی رفعت خاں کو اللہ پاک نے دوسری بار ۳۰ر جنوری ۸۴ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ نام زوبیہ قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ عمر طویل عطا فرمائے اور صاحب نصیب ہو۔

پیغاماتِ نشاط

محمد عبدالرحمٰن (اچھے میاں) نیا گاؤں۔ لکھنؤ کے فرزندان معراج محمد اور آفتاب محمد سلمہا اللہ تعالیٰ کی شادیاں حسب ترتیب ہمراہ بنت محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم انجینئر۔ نشاط گنج لکھنؤ و بنت محمود علی صاحب۔ لکھیم پور کھیری بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اس سلسلہ میں رفاہ عام کلب لکھنؤ میں ۶ر مارچ ۸۴ء کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

● میرے قدیم کرم فرما اور جرنلسٹ محترم رحیم علی الہاشمی (علی گڑھ) کے نواسے خسرو سلمہ (خلف قاضی معز الدین احمد صاحب۔ دہلی) کی تقریب شادی کے سلسلہ میں ۱۳ر فروری ۸۴ء بروز دوشنبہ اسٹاف کلب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شاندار دعوت ولیمہ دی جس میں معززین و اکابرین، ادبا اور شعرا نے شرکت فرمائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

● حبیب الرحمٰن صاحب۔ گیٹ ملک گنج کی صاحبزادی مہ جبین سلمہا کی شادی انعام الحق سلمہ (فرزند [illegible] الحق صاحب لکھنؤ) کے ہمراہ ۲۶ر فروری ۸۴ء کو بحسن و خوبی عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی و عزالرحیم نسیم انہونوی)

● اشفاق احمد صاحب (سراج احمد وکیل احمد [illegible] گیسٹ۔ لکھنؤ) کے فرزند شاہد احمد سلمہ کی شادی کے سلسلے میں جو ہمراہ شہابہ اختر سلمہا (دختر [illegible] اختر مسٹر سعید اختر عادی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ معیاری اور موزوں ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجا گیا ہو کہ جس ماہ کے پرچے میں شعر چھپنا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہونچ جائے۔ اپریل کے لیے عنوان ہے "تارے" اور مئی کیلئے "راز"

(ادارہ)

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

مرسلہ۔ پروین نذر (مدراس)

پھولوں پر میں نے لکھ دی ہے تمہاری داستاں
کہتے پڑھنا کتابِ شوق کا ہر باب تم

مرسلہ:۔ گوہر فاطمہ (آرہ)

ٹپکتا ہے شمع آنسو بن کے پروانوں کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

مرسلہ:۔ رحمت فاطمہ (دانگیرے)

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

مرسلہ: عرفانہ منظور (رامپور)

پوچھو نہ داستانِ غم، اجڑے ہیں کس طرح سے ہم
گھر کا چراغ کیا بجھا، گھر ہی اجڑ کے رہ گیا

مرسلہ: حفصہ رحمٰن (رامپور)

ابھی سے کیوں چھلک آئے تمہاری آنکھ میں آنسو
ابھی چھیڑی کہاں ہے داستانِ زندگی میں نے

مرسلہ: مہناز پروین بارہ۔ سیتاپور)

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مرسلہ
عمرہ اسین جہید (نندیال)

غم داستاں اپنی اشکوں سے لکھ کر
سرِ بزم ہم نے پڑھی روتے روتے

مرسلہ: افشائی جی۔ ایم انگوارے (گلابہ۔ رائے گڑھ)

بڑے دکھ بھرے ہیں جاناں مری زندگی کے لمحے
کبھی ہو سکے تو سننا مری داستاں خدارا

مرسلہ۔ زینت اشرف (فیض آباد)

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مرسلہ: ایس رضیہ حسن (کرنول)

داستاں در داستاں ہے شاعری تیری فراق
محفل انجم تری، راتیں تری، باتیں تری

مرسلہ: قمر طلعت (بیجاپور)

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

مرسلہ: عفت آرا (بانکا)

سننے کو جب نہ کوئی ملا داستانِ غم
آئینہ رکھ کے سامنے خود کو سنا لیا

مرسلہ: مہناز زیبا (مرادآباد)

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

مرسلہ: کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)
مرسلہ: عذرا فضلی (رام پور)

ایک لمحہ بات میری ذرا سن تو لیجئے
چھوٹی سی التجا ہے کوئی داستاں نہیں

مرسلہ: شاہدہ خالدہ (مہسلہ۔ رائے گڑھ)

مجھے دیکھئے میں بھی اک داستاں ہوں
بہت کچھ ہے دل میں مگر بے زباں ہوں

مرسلہ: فہمیدہ پروین (پورہ۔ بھاگلپور)

اجل مٹا دے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر
نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے نہ شاد یہ داستاں رہے گی

مرسلہ: رفعت سعیدہ (۔۔۔۔)

ترقی کے بدلتے انداز

منزل کی جانب تیزی سے گامزن اترپردیش

منزل خوشحالی کی، امن اور چین کی، ایک فلاحی ریاست کے قیام کی، فطری طور سے آسان نہیں ہوتی لیکن ترقی کی رفتار سے پتہ چلتا ہے ان کوششوں کا جو قدم بہ قدم اس منزل کے پاس لاتی ہیں۔ اترپردیش میں ان کوششوں کا مرکز ہے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا بیس نکاتی پروگرام۔

جس لگن اور ایمان داری سے اس پروگرام کو ہمہ گیر ترقی کے لئے بروئے کار لایا جا رہا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ اس پروگرام کے کم سے کم دس نکات کے تحت صد فی صد سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ سب سے قابل ذکر کامیابی حاصل ہوئی ہے سماج کے پسماندہ ترین طبقوں —— اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی معاشی ترقی کے میدان میں۔ ان طبقوں کے خاندانوں نے دیہی اور چھوٹی صنعتیں قائم کرنے میں مقررہ نشانہ کے پانچ سو گنا سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سال ان طبقوں کے خاندانوں کے لئے پانچ ہزار سے بھی زیادہ مکانات تعمیر کئے گئے۔

اس کے علاوہ حکومت نے اقوام مندرجہ فہرست کا ریزرویشن کوٹہ تین سال کے اندر پورا کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور بے سہارا بیواؤں کے لئے امدادی اسکیم بھی نافذ کی گئی ہے۔ عوامی نظام تقسیم کے تحت گیارہ ہزار سے زیادہ دکانوں کے ذریعہ ۴۲۸ کروڑ روپیہ کی اشیاء تقسیم کی گئیں۔

ادھر امداد باہمی قرضوں کی تقسیم کے معاملہ میں اترپردیش ملک بھر میں سرفہرست رہا۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو روزگار دلانے کی اسکیم کے تحت ۴۲،۰۰۰ افراد کے لئے روزگار کا بندوبست کیا گیا۔ اس کے علاوہ خود روزگاری اسکیم کے تحت ۲۷،۰۰۰ افراد مستفید ہوئے۔ صنعت کاری کے تحت کیمیاوی کھاد کے چار بڑے کارخانے اور بارہ کتائی ملیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی مدت میں ۴،۰۰۴ مواضعات اور ۴،۴۰۰ ہریجن بستیوں کی بجلی کاری کی گئی۔ زراعت کے زمرہ میں ۸ر۲۵۱ لاکھ ٹن گیہوں کی پیداوار ہوئی اور گنا کسانوں کو ۴۰۰ کروڑ روپیہ کے واجبات ادا کئے گئے۔ خصوصی نگرانی اور مستعدی کے نتیجہ میں ریاست کی امن و امان کی صورت حال مسلسل بہتر ہو رہی ہے۔

۲۰ نکات: عوامی اعتماد کی ٹھوس بنیاد

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں میری روح میں اترتی جا رہی تھیں مجھ پر ایک کیف سا طاری ہونے لگا۔ میں نے روحانی طور پر اپنے استاد کو آواز دی۔ مگر وہاں خاموشی رہی۔ میں جو تمکنا اٹھا پھر میں نے اس کو بیٹھے دیکھا۔ میں سنبھل کر اٹھا ہاتھ میں عصائے مغاں لے کر میں نے اس بے دین کو مخاطب کیا۔ "میں بیدکس بن لیوکس قوم ماد سے تعلق رکھتا ہوں وطن پارس ہے اور آبائی دین مجوسی ہے اس کے عظیم دیاؤں کا ادنیٰ خادم ہوں میں نے سنا ہے تم پر سے دیوتاؤں نے نظر کرم اٹھا لی ہے اور اب تم بے دین ہو کر اپنے آبائی دین کی مخالفت کر رہے ہو مغاں طبقے کو بری بھلی سناتے ہو کیا یہ سچ ہے۔"

اتنا کہہ کر میں بیٹھ گیا۔

وہ شخص اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا "اس عظیم ہستی کی قسم میں جھوٹ سے نفرت کرتا ہوں۔ میرا نام سپتمان پوروشاسپ نسلاً پارس کا ہوں وطن آذربائیجان ہے اور آسمانوں میں میرا نام زرتشت رکھا گیا ہے۔ میں شہنشاہ پارس منوچہر سے چودھویں پشت میں جا ملتا ہوں۔ مگر یہ باتیں میرے باعث افتخار نہیں ہیں۔ میرا اصل تعارف یہ ہے کہ میں ایک انسان ہوں تمہاری طرح مگر میں غریبوں سے محبت کرتا ہوں کمزوروں کا ساتھی ہوں بیماروں کا مسیحا ہوں عورت کی عظمت کا خواہاں ہوں۔ بے مایہ انسانوں کی ہمت ہوں نیکی اور صداقت کا علمبردار ہوں اگر یہ بے دینی ہے تو یقیناً میں بے دین ہوں اور یہ بھی سن لو کہ میں مغاں طبقہ کی موجودہ زندگی کا مکمل کر مخالف ہوں اور کیا پوچھنا چاہتے ہو۔۔۔؟"

میں حیران و ششدر رہ گیا سے دیکھے رہا تھا وہ تو میرے دل میں اٹھنے والی باتوں کا اصل سبب تھا اس کا جرأت و بے باکی کا پیکر تھا۔ مجھے سوچ میں

ہے اس سے نکلنے کی کوشش تو کرنا ہی ہوگی انسان کا کوئی عمل فضول نہیں ہوتا۔"

"اس طرح کی بے معنی باتیں سوچ کر تو خود کو ہلکان مت کر ہر شخص اپنے اعمال کا ذمے دار ہے آج بھی اور کل بھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی کا سامنا کر سے میں اور جنگ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اب تو جا سو جا عبادت گھر جانا چاہیے مت جا۔" اتنا کہہ کر ماں کمرے سے نکل گئی اور میں دل کا بوجھ دل پر لئے بیٹھا رہ گیا۔

ماں کے جانے کے بعد سے میں بیٹھا یہ سوچ رہا ہوں کہ حالات کا شکنجہ میرے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے وہ ماں جو مجھے نیک انسان بنانے کی خاطر مذہبی علوم دلوا چکی ہے خود کیوں اس قدر دنیا کے عیش و عشرت کی خواہاں ہو گئی۔ بدی کو کیوں پسند کرنے لگی۔ مجھے اس راہ پر کیوں ڈالا تھا جب خود اس کی منزل کا راستہ کوئی اور تھا مجھے بھی اسی راستہ کا مسافر بنانا تھا۔ اے عظیم اور لامحدود سپہر (آسمان) کیا اس نے مجھے مغاں اس لئے بنایا تھا کہ میں بھی انہیں کی طرح اسے محل نما مکان پر عشرت زندگی دولت کے انبار اور اسباب تعیش فراہم کر سکوں۔ میرے استاد نے تو کہا تھا کہ برائی کے راستے آنے والی ہر چیز بری ہے خواہ وہ نیکی ہی کیوں نہ ہو انہوں نے کہا تھا چوری کر کے کسی بھوکے کو کھانا کھلانا نیکی نہیں ہے ۔۔۔ میں ماں کو کیسے سمجھاؤں!

دوسری طرف مجھے بریکا کے قول و فعل کے تضاد پر بھی حیرت ہے وہ میری شکست کے لئے بد دعا کرتی ہے اور میری مشکلات کے لئے ڈھال بھی بننا چاہتی ہے جانے وہ خدا ہے یا شبنم میری کیسی محبت ہے۔

[illegible] ... کس انداز میں ... اس
[illegible] ... اس کے ... نہیں
[illegible] ... کہ میرے ساتھی ... بڑے ... اور قوت
[illegible] ... کہا: اسے بے دین انسان ... اپنے دین کے حافظ
[illegible] ... نیکی کا سبق پڑھاتا ہے ہم سب کچھ جانتے ہیں ...
... تیرے بتانے کی ضرورت نہیں ہے اب تو صرف اتنا بتا کہ تیرا وہ
معبود ہے کہاں جس نے ہمارے دیوتاؤں کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے ہم بھی
تو دیکھیں اس معبود کو جس پر تو ناز کرتا ہے۔؟ " جس نے فقیروں کی طرح
... کو کہا وہ کیسا بے عقل معبود ہے!"

... کی نظریں مسلسل میرے چہرے پر تھیں میں پسینے پسینے ہوا جا رہا تھا
میرے ساتھی کی لن ترانی پر وہ اٹھا اور بڑی خوش اخلاقی سے بولا " ہمارے اس
نوجوان کا خون کچھ زیادہ گرم ہے۔ خیر میں نے تیری باتوں کا برا نہیں
مانا جو بات میں نے ابھی تک تجھے سمجھائی نہیں اس بارے میں تو سوال
کرنے کا حق رکھتا ہے مگر میرے عزیز تو مذہبی عالم ہے، مثال ہے معلم
بھلا اپنے عوام کا رہنما ہے اپنے لہجے کو شیریں بنا اپنے مزاج میں حلم پیدا
کر۔ اس نے پھر میری طرف دیکھ کر کہا " برو کسی میرے پیارے! تیرے
ساتھی نے مجھ سے دو باتیں کہی ہیں اور میں دونوں کا جواب ضرور دوں گا
سب سے پہلی بات تو یہ کہ اسے اعتراف ہے کہ وہ ایمان، صداقت
محبت، عصمت، ہمدردی، پیار، خوش اخلاقی، نیکی ان تمام فضائل
... سے واقف ہے کیونکہ وہ عالم ہے اور وہ مثال بھی ہے اس لئے
[illegible] ... ہے۔ وہ ... کا وہ مالک ہے

... ہفتہ بھر سے میں گھر ہی میں تھا ... اور ... عبادت
گھر ہی گیا۔ رو بو نے بھی مجھے نہیں بلوایا۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ اب
مجھے بلوانا پسند بھی نہیں کرے گا اور اب عبادت گھر سے میرا تعلق ختم ہی
ہو جائے گا۔ بہر حال فی الحال میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ
دیا ہے۔ مستقبل میرے لئے جو بھی فیصلہ کرے گا مجھے قبول ہو گا کیونکہ میں
نے پہلے ہی آپ کو بتایا تھا کہ حالات کی ڈور کا سرا میرے ہاتھ سے
نکل چکا ہے۔

آج صبح ایک طویل مدت کے بعد (میں اسے طویل ہی کہوں گا) مثال نے
میرے کمرے میں قدم رکھا۔ بشاش چہرہ، قیمتی لباس اور آرائش و زیبائش
نے اسے بہت بدل دیا ہے۔ مجھے احساس ہوا میری اس ناکامی سے وہ
مایوس یا افسردہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں
تھا وہ آ کر میرے سامنے دیوان پر بیٹھ گئی اور بولی " تیرے لئے ایک اچھی
خبر لائی ہوں عبادت گھر کے معانی اعلیٰ رو بو نے تیری شکست کا بدلہ
لے لیا۔ رات اس کے آدمیوں نے اس بے دین شخص پر حملہ کر کے اسے
زخمی کر دیا ارادہ تو ختم ہی کرنے کا تھا......"

" نہیں... نہیں... میں بے تاب ہو اٹھا ایسا مت کرو روشنی کی
ہر کرن کو ختم مت کرو ورنہ یہ تاریکی ہم سب کو نگل جائے گی... ہم سب
کو......"

" تو اس کے حق میں ... ہے " مثال نے حیرت سے کہا۔

... دوسرے مذہب کی تاریخ پر ان کا اعتقاد نہیں ہوتا ... ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک دوسرے کے مذہب کی ... ہم ... ناواقف رہتے ہیں۔ یروکسی کی داستان کا تعلق ... سے ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس دور کی ... تاریخ کے ساتھ ہی تھوڑی سی مذہبی تاریخ بھی آپ کو بتاتا چلوں۔ اس کے پس منظر میں آپ یروکسی کے ساتھ صحیح انصاف کر سکیں گے۔ کیونکہ آنے والے حالات اب آپ کے لئے ایک سوچ اور فکر ... آ رہے ہیں۔

سپتما اہل پارس کے وہ پیغمبر ہیں جنہوں نے دین زرتشت پیش کیا تھا۔ زرتشتی کتاب "زندا اوستا" جسے ہم الہامی کتاب مانتے ہیں اس میں آیا ہے کہ آپ کا نام دنیا میں سپتما اور آسمانوں میں زرتشترا ہے۔ سپتما کا مطلب ہے "ابن ابیض" اور زرتشترا دو لفظوں کا مرکب ہے۔ زرد + اشترا۔ زرد کے معنی بوڑھا، بزرگ، اور اشترا کے معنی وہ شخص جس کے اونٹ بوڑھے ہو گئے ہوں۔ یا قدیم علم ... انسان یونانی اس نام کے معنی "روشن ستاروں کا پرستار" ... یا مشابہت "سنہری ... والا" ویسے قدیم پارس کے باشندے آپ کو صرف سپتما ہی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے نام زردشت، زرتشت، اور زرہشت بھی آتے ہیں۔ ہماری مذہبی کتابوں میں آتا ہے کہ آپ کے ظہور کی ... نشانیاں ... سے ... تھیں۔ اوستا کے باب پیدائش میں ہے کہ آپ ایک ... کی صورت میں اس گھر میں اترے جہاں

ہر صورت میں خدا اس خداوندی کی صفات ہی کہلائیں گی۔ کیونکہ خدا ہر نیکی میں موجود ہے۔ انسانوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے حقیقی خدا کی طرف آؤ۔ تیرا اعتراض ہے کہ جب ہم اسے دیکھ نہیں سکتے تو کیسے مانیں۔ اس وقت کتنی اچھی ہوا چل رہی ہے کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ پھر کیوں مانتا ہے۔ تو نے اپنے گھر میں آگ کا شعلہ دیکھا ہوگا۔ کبھی اسکو ہاتھ میں لے سکا ہے؟ پھر کیسے اس پر یقین ہے۔ پانی کی دھار کو مٹھی میں بند کر سکتا ہے۔ نہیں تو پھر اسے کیسے پانی سمجھ لیا؟ خداوند خود بھی ایک ماورائی ہستی ہے جسے اہل دانش ہی مان سکتے ہیں اہل علم ہی پہچان سکتے ہیں۔ یاد رکھ اس خالق اکبر کا بدی اور گناہ سے کوئی تعلق نہیں یہ سب اہرمن کی حرکات ہیں۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا ایک سوال اور پوچھنا ہے۔ آپ کی بیان کی ہوئی اتنی خوبیوں اور آپ کے دین کی ان گنت خامیوں کے باوجود لوگ اسی کے طرفدار کیوں بنے ہوئے ہیں؟

سپتما کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہوگیا وہ کچھ افسردہ مگر ٹھہرے لہجے میں گویا ہوا۔ "بروکسی جب انسان یہ دیکھتا ہے کہ بدی غالب آتی جارہی ہے اور اہل علم لب سئے بیٹھے ہیں تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ تو وہ بھی نیکی سے منہ موڑ لیتا ہے جب وہ سوچتا ہے کہ برائیاں مستقل چنپ رہی ہیں اور مذہب بھی ان کا تدارک کر رہا ہے تو وہ یاس کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب اس کے کان یہ سنتے ہیں کہ ہر شخص بدی کے حق میں بول رہا ہے تو پھر وہ نیکی کو ایک خیالی چیز تصور کر لیتا ہے اور اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ عالموں کے بے عملی انسان تو ...

میرا کہنا یہ ہے کہ نیک انسان تعداد میں کتنے بھی کم ہوں معاشرے
کی اصلاح اور تربیت کا کام ان کو کرتے رہنا چاہئے۔ خواہ وہ زمانے
میں تنہا ہی کیوں نہ رہ جائیں اور لوگ انہیں کم عقل ہی کیوں نہ سمجھیں لیکن بدی
کے خلاف اپنے آخری دم تک لڑنا چاہئے یہ مت دیکھو کہ لوگ تمہارے
تمہارے مخالف بن گئے بس تم اپنی بات کو اپنے دل میں تولو وہ مطمئن ہو
کہ اگر تم راستی اور نیکی کی طرف ہو ضروری نہیں کہ تمہیں اپنی زندگی ہی
میں کامیابی مل جائے مگر وہ روشنی جو تم دنیا میں چھوڑ کر جاؤ گے آنے
والی نسلوں کو راہ دکھائے گی۔ اور وہ تمہیں عزت و احترام دیں گی کیونکہ
تمہاری تنہا کی آواز تھی جس نے سارے زمانے کی بدی کو للکارا تھا۔
ہر نیک عمل قربانیاں چاہتا ہے ان قربانیوں کو اپنی محرومی یا مفلسی مت
سمجھو ان کو رنج محض اور پریشانی مت جان لو۔ آنے والا روشن عہد
تمہارا احسان مند ہوگا۔ انسان کو نیکی اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ اسے
دنیا کی عیش و آرام ملے گا یا وہ جنت کا حقدار بن جائے گا بلکہ یزداں
اور اہرمن کی لڑائی میں اپنے اچھے اعمال سے یزدانی قوتوں کو تقویت
دینے کا نام دین ہے۔ اپنی زندگی کو اتنا قیمتی مت سمجھو کہ ساری نعمتوں
پر تیرا ہی تصرف ہو بات تو جب ہے کہ ان نعمتوں کو عام کر کے تو
یزداں کا سفیر کہلائے۔"

میں نے بڑی عقیدت بھری نظروں سے سپتا کو دیکھا اس نے
مسکرا کر میری عقیدت کو قبول کیا اور بولا "میں وہ فلسفہ کیمیا لایا ہوں
جو تمہاری تمام تکالیف کا خاتمہ کر دے میرے پاس وہ ضابطۂ حیات
ہے جو اوستا یزداں سے ملا ہے۔ اور اسے اختیار کر کے

تم زندگی کی مسرتوں اور مشکلات پر فتح حاصل کر سکو گے!!"
میں واپس آنے کے لئے اٹھا [illegible]
شکست اور اس کا خاموش اعتراف انہیں چھپانے [illegible]
میرے کان ان کے جگر سوز جملے سن رہے تھے مگر [illegible]
آسمانوں کی سیر کر رہی تھی میرا دل ہر برائی سے [illegible] لینے پر آمادہ
تھا میں نے اس روشنی کو پا لیا تھا جس کی پیشین گوئی میرے استاد نے
کی تھی۔

میں اور تم ہر دور میں بہت دیر سے خاموش تھا کیونکہ داستان [illegible]
طور پر ہی آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس منظر نامے کے بعد میرا فرض ہو
جاتا ہے کہ وہ تاریخی حقائق پیش کر دوں جو اس سلسلے میں میرے
سامنے ہیں۔

تاریخ دو طرح کی ہوتی ہے ایک سیاسی اور جغرافیائی حالات
سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری مذہبی تاریخ ہے جو کسی انسان کا
آسمانی ہستیوں سے تعلق ظاہر کرتی ہے اور اس انسان کی نیک
ذات کو مذہبی فلسفہ پیش کرنے میں جو واقعات پیش آتے ہیں
اسے ہم مذہبی تاریخ کہتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ
سیاسی اور جغرافیائی تاریخ کا تعلق تمام اقوام سے ہوتا ہے اور ہر
قوم دوسرے کی تاریخ پر یقین رکھتی ہے مگر مذہبی تاریخ ہر مذہب
کی اپنی الگ ہوتی ہے اور ان پر اپنے مذہب کے مطابق ہی لوگ

اچھا اور پسندیدہ کھانے، کیف آور مشروبات، یہ لوگ سب سے الگ
تھلگ ایک بڑے کیبن میں جا بیٹھے جہاں دریچوں سے دُور دُور کے
پرکشش مناظر تصویر کی طرح نظر آ رہے تھے۔!

سلمیٰ تو بہت جلد نارمل ہو گئیں اور خوش نظر آنے لگیں مگر نینا اور
رضیہ، نعمانی اور معتصم سے جھینپ رہی تھیں۔ ان کی یہ کیفیت بھانپ کر
معتصم نے ایسی گفتگو شروع کر دی کہ انھیں ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ اور
اس طرح تکلف دُور ہوا۔ لیکن نہ تو نعمانی ہی نینا سے مخاطب ہوئے
اور معتصم نے رضیہ سے کوئی گفتگو کی۔ بس وہ آپس ہی میں بول رہے
تھے۔ خاص کر کوئی کسی کا مخاطب نہیں تھا۔

"ہم تو ہنی مون منانے یہیں آؤں گا۔" معتصم نے کہا۔ "کیا پر فضا
اور دلکش مقام ہے۔ آہا ہا۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ یہ جنگلی گلابوں
کی مہک۔ یہ طرح طرح کے کھانوں کی رال ٹپکاتی خوشبوئیں۔۔۔ یار نعمانی
تمہارا ارادہ کہاں جانے کا ہے ۔۔۔؟"

"سچ پوچھو تو آج تک ہنی مون کے معنی ہی میری سمجھ میں نہیں آئے"
نعمانی نے کہا۔ "یعنی جب چاند غروب نکلا ہو تو ہم شہد اور روٹی کھائیں یہ
مجھے بھی پتہ نہیں۔۔ بھابی سے پوچھو۔" معتصم نے کہا۔

"میں کیا جانوں۔" سلمیٰ تنک اٹھیں۔ "فضول باتیں کرتے ہیں آپ
لوگ۔۔"

"آئس کریم اور منگواؤں۔؟" نعمانی نے پوچھا۔

"ہاں۔ اور پھر چلیں گے۔" "ہوشیار !" معتصم نے کہا۔

"ان کو ہم نہیں رکھا۔" نینا بولی۔ "ہم ایک دفعہ گئے تھے [illegible]

مجھے سکون سے جینے دیجئے۔ ورنہ میں نہیں جانتی کہ پھر ایک [illegible]
آپ کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ مگر میں کہیں کی نہ رہوں گی!"

"تم سے نینا نے نہیں کہا تھا کہ میں اپنا سنہرا مستقبل چھوڑ کر
تمہاری خاطر یہاں چلا آیا ہوں۔ میں نے اپنے تمام جذبات [illegible]
دوست نعمانی اور نینا پر واضح کر دیئے ہیں۔ وہ دونوں میرے [illegible]
ہیں اور اب یہ باتیں میں بھابی سے بھی کہوں گا۔ پھر بھائی جان [illegible]
اور اس طرح آہستہ آہستہ میدان ہموار کر کے میں اپنی منزل [illegible]
طرف چل پڑوں گا۔"

"ہائے اللہ۔۔!" وہ وحشی ہرنی کی طرح انھیں تکنے لگی۔

"کیوں۔ اس میں ہائے اللہ کی کیا بات ہے۔"

"مجھے نعمانی بھیا اور نینا کے سامنے جانے سے بھی [illegible]
آج میں بہت پہلے کہہ چکا ہوں۔ اس کے بعد سے تم ہزار [illegible]
کے سامنے گئی ہو۔ نینا کا تمہارا روز و شب کا ساتھ ہے کیا تم نے
محسوس کیا کہ ان دونوں نے اپنا سلوک بدلا ہو۔ دراصل تم
ڈرپوک اور بزدل ہو۔ خواہ مخواہ سوچتی اور اختلاج میں مبتلا ہوتی
ہو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ بہت زیادہ گھبرا گئی۔ "میں آپ سے [illegible]
ہوں۔ میرا خیال چھوڑ دیجئے۔ مجھے اپنے گھر کی ادنیٰ ترین خادمہ [illegible]
اور اب بھابی جان سے کچھ مت کہئے۔ ورنہ میں سچ کہتی ہوں کہ [illegible]
کھا کے سو جاؤں گی!"

"تمہارا جو جی چاہے کہو۔" معتصم نے کہا۔ "رہ گیا ایسے سو [illegible]
[illegible]

[illegible] کر چکا ہوں کہ ہم تم اگر جئیں گے تو ساتھ ساتھ اور مریں تو بھی ساتھ ساتھ!"

"اتنی ذرا سی بات پر آپ نے نہیں دیکھا کہ اماں کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔ تب کیا ہوگا؟" رومہ تو رو ہی دیتی تھی۔

"رومہ۔ تم مجھے نہ ملو گی تو میری زندگی کے لالے پڑ جائیں گے!"

"نہیں مل سکتی میں آپ کو۔" وہ بول پڑی۔ "آپ آقا ہیں۔ میں خادم ہوں۔ اور۔ اور۔ یہ کوئی زبردستی ہے کہ۔۔۔!" وہ رک گئی۔

"کہو کہو۔ رک کیوں گئیں۔ یہ کوئی زبردستی ہے کہ میں تمہیں بھی خود سے محبت کرنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ یہی کہہ رہی تھیں نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے نظریں چرا لیں۔ "مجھے آپ اچھے نہیں لگتے۔"

معتصم نے قہقہہ لگایا۔ "کوئی پرواہ نہیں۔ ابھی میں بیروزگار ہوں۔ باپ دادا کی روٹیوں پر پڑا ہوں۔ نکما ہوں۔ لیکن میں بہت جلد روزگار سے لگ جاؤں گا۔ دودھ گھی کھاؤں پیوؤں گا۔ صحت بن جائے گی تو پھر اچھا بھی لگنے لگوں گا۔ تم اس کی پرواہ مت کرو۔!"

رومہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے اپنی خوش بختی پر ناز کرے یا اپنی بدنصیبی سے خوف کھائے۔ معتصم پر اس کی کسی التجا خوشامد اور نصیحت کا رتی بھر اثر نہ تھا! رومہ یہ سوچ سوچ کر دہلتی تھی کہ کہیں وہ اپنی لن ترانی بھابی یا بھائی جان سے نہ کر دیں تب تو واقعی کوئی صورت نہ رہ جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ گھر کا اینٹ چھا ہے جہتہ گئی۔ [illegible] اچھا [illegible] لیا۔ جادو کر دیا [illegible] [illegible] کہے گی کہ وہ بے قصور

"بھابی! گھر میں ڈانٹ پڑے تو قبول ہو جانے گا۔ ابھی دونوں کی شامت آئے تو اچھا ہے۔ اللہ ری سینہ زوری۔"

"پتہ نہیں کس دوست کو مار ڈالا عصمی بھیا نے۔" سلمیٰ نے کہا۔ مینا کو یکایک ہنسی آگئی۔ "فرضی دوست کو مارا ہے۔ اس کا جنازہ شام کو اٹھا کر روتے دھوتے گھر واپس چلے جائیں گے۔"

رومہ چپکے سے بولی۔ "کوئی پوچھے گا نہیں کہ سب ساتھ کیسے واپس آئے۔؟ ہائے اللہ۔ بھابی میرا تو برا حال ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔"

ہول کھا کے سلمیٰ نے معتصم کے کندھے پر مکوٹا مارا اور چیخ کر بولیں۔

"عصمی بھیا اب بھی وقت ہے۔ واپس چلو۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔"

"اسے نکلنے سے روک لیے بھابی۔" قہقہہ لگا کر معتصم نے جواب دیا۔ "اب تو ہم بنجارہ ہلز کے قریب پہونچ رہے ہیں۔ اسے آپ ڈر کیوں رہی ہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ احمد آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دے گا۔ اور زینیا رومہ کو لے کر کالج کے فنکشن کے بعد گھر چلی جائے گی۔ ہم اور نعمانی تو مرحوم کو مٹی دے کر ہی لوٹیں گے۔!"

نعمانی بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔

"خدا سمجھے۔!" جل کر زینیا نے دانت پیسے۔

ہوٹل راک کیسل پہونچ کر سب اترے اور جیسے ان سب کا خوف ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ بڑا عمدہ ماحول تھا۔ صاف ستھری فضا، نیلا آسمان، آس پاس پھولوں کی بہتات، پہاڑ پر تعمیر کیا ہوا یہ کیفے بڑا پرشکوہ تھا۔ خاموشی، [illegible] ماحول، [illegible]

ملایا۔ "پہلے کہاں چلیں گے ؟" نعمانی نے پوچھا۔

"ارے احمد بھائی سنئیے تو" سلمیٰ نے سہم کر کہا۔" آپ لوگ چوروں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ گھر میں کسی کو خبر لگ گئی تو آپ دونوں کا کچومر نکل جائے گا۔ مگر ہم تینوں کا حشر کیا ہوگا۔ مجھ سے تو آپ کے بھائی بھی خفا ہوں گے۔"

"اب تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے بھابی" نعمانی بولے۔" آپ بھی گھر سے باہر نکلتی ہی کہاں ہیں۔ ایک روز سیر سپاٹے سہی۔ آپ اطمینان رکھئیے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی ۔۔ !"

"بچے کہاں ہیں ؟" اندر جھانک کر معتصم نے پوچھا۔

"امی کے پاس ہیں۔ سلمیٰ نے کہا۔

"اچھا تو پہلے راک گیمل چلیں۔ کیوں۔ "معتصم بولے۔" وہاں خوب ناک تک کھا پی کے ہوسٹل جا پہنچ جائیں گے !"

"پیسے کہاں ہیں۔" نینا بولی۔ "عصمی بھیا آپ نے میرا صندوقچہ تو نہیں کھولا۔ ؟"

معتصم نے اپنی ماں اور ابا کو بیوقوف بنانے کا حال سنایا۔ تینوں لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں۔ وہ تو فوراً ٹیکسی سے اتر کر گھر جانے پر تیار ہو گئی تھیں۔ مگر ان کی سنتا کون تھا ! نعمانی نے آواز دے کر ڈرائیور کو بلایا اور دونوں بھائی اگلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ یہ لوگ تو نجانے کیا بکواس کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔ لیکن تینوں لڑکیاں گم صم تھیں۔ ان کے کانوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ پھر ہمت اکٹھا کر کے بولی۔

سارا کیا دھرا معتصم کا ہے۔ یقین کون کرے گا۔ یہ لوگ جو ماں باپ بہن بھائی کا پیار دے رہے ہیں تب کتنی پُر نفرت نظروں سے اسے دیکھنے لگیں گے۔ !

اسکے دنوں کا چین حرام ہونے لگا۔ راتوں کی نیندیں اُڑنے لگیں ایک مرتبہ نینا کے پوچھنے پر وہ بے اختیار رو پڑی اور معتصم کی ساری باتیں اس سے کہدیں۔

نینا ہکا بکا رہ گئی۔ "عصمی بھیا کو ہوا کیا ہے۔ کیوں تمہاری زندگی خراب کرنے پر تلے ہیں۔

"پتہ نہیں۔ احمد بھیا سے کیا کیا کہا ہے" دوسرے آنسو قابو سے باہر ہو رہے تھے۔" اور اب بھابی سے بھی کہدیں گے۔ نینا۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑوں۔ میری بہن۔ تم عصمی بھیا سے کہو۔ مجھے سکون سے جینے دیں۔"

"اچھا اچھا۔ آج ہی رات کہوں گی۔ تم دل سنبھالو۔"

روز رات کو معتصم چائے پیتے تھے۔ اسی رات نینا نے لڑکے سے باہر کہلا بھیجا۔ عصمی کو اندر بلا لائے۔ نعمانی کسی ملاقاتی سے ملنے چلے گئے تھے۔ معتصم نے نینا کو باہر بلا لیا۔ وہ گئی اور چائے کی پیالی میز پر پٹخ کر دروازہ بند کرنے لگی۔ اس کے تیور بگڑے دیکھ کر معتصم نے دہائی دی۔ "یہ کیا کر رہی ہو کھولو دروازہ۔ واہ۔ یہ کیا مذاق ہے۔ بند کمرے میں گلے پر چھری چلا دو تو کون دیکھنے آتا ہے۔ دیکھو میں شور مچا دوں گا ؟"

نینا کو ہنسی آگئی۔" آپ چائے پی چکئیے تو پھر خبر لوں آپ کی ۔!"

اور جانے کے بعد جب وہ سہمی شکل بنا کر رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگے تب بھی نینا کو رحم نہیں آیا۔ وہ روما کی تائید میں دبی زبان سے ان پر برس پڑی۔ معتصم سنتے رہے۔ مسکراتے رہے پھر بولے "نینا میں پاگل خانے میں پیدا نہیں ہوا۔ اپنی سہیلی کے بھیجے میں یہ بات ٹھونس دو کہ خواہ مخواہ بقول تمہارے میاں کے اپنے خون کا تیل نہ کریں۔ کیا مجھے ان کی عزت و آبرو اور پوزیشن کا خیال نہیں ہے؟"

"آپ تو اپنے ۔۔۔ لو ہی میں نہیں۔" نینا تیوری بدل کے بولی۔ "یہ خواہ مخواہ میاں میاں کیا بکنے لگے آپ؟ مجھے ایسی باتیں بالکل پسند نہیں۔ ایسی ہی بڑی باتیں ہوگی آپ نے روما سے۔ جو بے چاری رو رہی تھی۔"

"سنو یار!" معتصم نے کہا۔ "ایک بات ہم تم سے کہہ دیں کہ ہمارے سینے میں جو دل ہے اس دل میں تمہاری بے وقوف سہیلی کی محبت اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر چکی ہے کہ اب وہ کسی طرح دل سے نکل نہیں سکتی۔ ہم انہی سے بیاہ بھی کریں گے یہ دل لگی کھیل نہیں ہے۔"

"مگر سب لوگ کیا کہیں گے؟" نینا بولی۔

"کسی کے کہنے سننے سے میری صحت پر کیا اثر پڑے گا؟"

روما کی صحت پر تو پڑے گا!

سب ٹھیک ہو جائے گا!

آپ جانیئے۔

تمہیں اس سے محبت تو ہے نا؟۔

"آپ کو تو پوچھنے والے۔۔۔؟"

ہوگی۔ کسی نے منہ میں پانی بھی نہ ڈالا ہوگا۔ اور پھر چندے کا کفن دفن۔ ملے نہ ملے پورا چندہ۔ اللہ بچائے۔" بیگم علوی نے کہا۔ صدق دل سے مرحوم کی مغفرت کی دعا کی اور بولیں۔ "میرے پاس چھ سو روپے وکیل صاحب نے رکھائے تھے۔ لائے دیتی ہوں۔ قرینے سے تجہیز کی مٹی ہو۔ اے بالا۔ سب پر یہ وقت آنا ہے۔"

انہوں نے بھی سو سو کے چھ نوٹ چندے میں دے دیئے اور پوچھا "میت کب اٹھے گی۔۔۔!"

دل ہی دل میں منت تو بہ تلا کرتے ہوئے معتصم نے مری ہوئی آواز میں کہا "شاید مغرب کے وقت۔۔۔!" "سپرد تفریح کرے مغرب ہی کے وقت سب کی واپسی ہو سکتی تھی۔"

"اچھا بیٹا تو جاؤ پھر۔" لو اجی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔ "کتنا درد بھرا دل ہے میرے بچے کا۔ دوست کی موت پر کتنا سسک سسک رو رہا تھا۔ شروع ہی سے ایسا ہے۔ ایک دن بلی نے چڑیا پکڑ لی تھی۔ اے بیگم۔ یہ کوئی ڈھائی سال کا سن ہوگا۔ مگر آپ کو یاد ہے کیسا زار زار رو رہا تھا۔"

اور تقریباً ساڑھے سات سو روپیہ سے جیب گرم کر کے جب معتصم مقررہ جگہ پہونچے تو فوائی پروگرام کے مطابق سلمیٰ کو بھی ان کے میکے سے لے آئے تھے اور اب سلمیٰ نینا اور روما ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی حیران پریشان ان لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جو بڑی خوش دلی سے ہنس رہے تھے اور خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ معتصم نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ سنانی کو دی۔ دونوں نے ہاتھ

نظر پڑی اور بدحواس ہو کر بھاگے۔ !"

نعمانی دروازے کے پاس ہی کرسی پر رخ پھیر کر بیٹھ گئے۔ مگر نینا کا غصے کے مارے بُرا حال تھا۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی! معتصم اور نعمانی نجانے کس بات پر ہنس رہے تھے۔ نینا نے صرف اتنا سُنا۔

"بھائی کو میں ان کے گھر سے پک کر لوں گا۔ تم اس کی فکر مت کرو مگر شرط یہی ہے کہ بھائی جان قبلہ تک کو ہوا نہ لگے۔ ارے وہ بیچاری بھی کہاں جاتی ہیں۔ رومہ اور نینا کو پہلے ہی چلتا کر دیں گے" انھوں نے قہقہہ لگایا۔

"تو پھر میں ٹیکسی ٹھہرائے لیتا ہوں" نعمانی بولے۔

"ہاں بس۔ کل ہی۔" معتصم نے کہا۔

"لیکن اتنا سمجھ لیجئے۔" نعمانی نے کہا۔ "اگر آپ کو بعد میں کوئی انعام یا شاباشی ملی تو اس کا میں حصہ دار نہیں بنوں گا۔!"

معتصم اپنی طوفانی محبت کے اس دور میں تھے جہاں ہوش و خرد پر بجلی گر جاتی ہے اور آگا پیچھا سجھائی نہیں دیتا۔ وہ رومہ سے تنہائی میں ملنے اور اسے اپنی رام کہانی سنانے کے لئے بے تاب تھے۔ چنانچہ ایک پروگرام بنایا۔ اس کے تحت پہلے ہی مسلم گوا کے بیکے بھی لیا تھا پھر نینا کالج میں اولڈ اسٹوڈنٹس کے جلسے کا بہانہ کر کے گئی۔ رومہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اکثر وہ ایسے جلسے اٹینڈ

کرتی تھی۔ رومہ کا ساتھ جانا بھی نئی بات نہ تھی بیگم علوی نے اجازت دے دی۔ گویا اسے شام کے سات بجے تک آزادی تھی۔

پھر اپنے کام سے نعمانی بھی گئے اور جب بیگم علوی اکیلی ہی علینا سے بیٹھی بوا جی سے باتیں کر رہی تھی۔ پان کھایا کھلایا اور پرانی پرانی باتیں کر کے ہنس رہی تھیں اتنے میں رمضانی نے بڑی وفاداری سے بیگم علوی کو خبر کی۔ چھوٹے سرکار اپنے کمرے میں بیٹھے رو رہے ہیں۔

دونوں خواتین چونک پڑیں۔ رمضانی سے پوچھا کیوں رو رہے ہیں؟ "مجھے کیا پتہ بیگم صاحب۔ ان کے تو ہچکیاں لگی ہیں۔"

"کچھ کہہ دیا ہوگا۔ میاں نے۔" بوا جی بے حد بچوں کی طرح کہنے کو باپ ہیں۔ مگر اس لڑکے کی محبت ان کے دل میں رتی بھر نہیں۔ جو منہ میں آتا ہے جیو ان لڑکے کو کہہ دیتے ہیں۔ نوج ڈرا ہی کے دم لیتے ہیں۔"

"میرا تو ناطقہ بند ہے۔ بوا۔" بیگم علوی نے کہا۔ "قانون پڑھ کر ان کی عقل سوکھ گئی ہے۔ آؤ چلیں۔ پوچھیں۔ کیا ہوا ہے؟"

ہچکیاں اور سسکیاں اتنی معمولی نہ تھیں جو سنائی نہ دیتیں۔! عورتیں بدحواس ہو گئیں۔ اب لاکھ لاکھ پوچھ رہی ہیں اور معتصم سر منہ سے بات ہی نہیں نکلتی۔

"جان کی قسم بیٹا۔ اب زیادہ نہ ہولاؤ۔" بوا جی بولیں "ہوا کیا ہے۔" "یہ مجھے دفنا کر ہی کے سکھ کی سانس لے گا۔ بوا،" بیگم نے کہا۔ "اسعد کیا باپ نے کچھ کہا ہے کہ ممتا خفا ہوا ہے۔ کیوں بھ

عفت موہانی
کا
نیا شاہکار
ایک پر فریب محبت
اور جذبہ انتقام
کی حیرت انگیز کہانی
تشنہ کام
جو قطعی عفت کا شاہکار ثابت ہوگا
قیمت اکیس روپیہ

THE HAREEM

Apr 84

Rs: 1|50

ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر آفس ۴۴۵۵۹

ٹیلیفون نمبر رہائش ۴۵۳۴۴

حریم

لکھنؤ

ماہنامہ

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم اہنولوی و شفیق النساء بیگم سلیم اہنولوی مرحوم

جلد (۵۴) فہرست مضامین اپریل [illegible] نمبر (۴)

ایڈیٹر و نگراں: نسیم اہنولوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ ——— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری	"	تیئیس روپیہ

وی. پی سے پرچہ منگانے پر چار روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

——— غیر ممالک سے پچہتر روپیہ ———

انھیں کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری اور ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵، ۶ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں

آفس اور ترسیل زر کا پتہ: دفتر نسیم بکڈپو۔ ۱۲۵/۱ گوئن روڈ لکھنؤ

نسیم اہنولوی پرنٹر پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا

لکھنؤ

لمعات

ایک ماہنامہ کے اڈیٹوریل میں تعلقات کو تجارت ثابت کرتے ہوئے یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "اس ضمن میں سب سے بڑا امتحان والدین اور بچوں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں، انھیں تعلیم دلاتے ہیں، زمانے کی اونچ نیچ سکھاتے ہیں اور پھر وہی بچے بڑے ہو کر ان کی نافرمانی کرتے ہیں، یا عدم توجہی کا اظہار کرتے ہیں تو والدین شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں بھی وہی تجارت کا نقطۂ نظر ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ جائیں اور "نیکی کر کنویں میں ڈال" کے اصول پر کاربند ہو جائیں تو ہمیں زندگی کی بیش تر مایوسیوں سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔"

اور سلسلوں میں تجارتی نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے، لیکن والدین اور اولاد کے تعلقات میں یہ کہنا قطعی معقول بات نہیں۔ حیرت ہے کہ ایک اڈیٹر کے قلم سے ایسی بات کیسے نکل سکی۔ والدین کا جو درجہ اولاد کے مقابلہ میں خدا و رسول نے بار بار بتایا ہے اس سے شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جو واقف نہ ہو۔ بڑے سے بڑا عبادت گذار بھی اگر والدین کی نافرمانی کرتا ہے یا والدین کی خدمت نہیں کرتا تو شاید وہ بخشا نہ جائے گا اور اس کی عبادت و ریاضت بیکار ہی جائے گی۔ بالکل واضح احکامات کے بعد اسے تجارت کہنا قطعی مناسب نہیں۔ جس طرح خون پسینہ ایک کر کے والدین بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کے بعد نافرمانی اور عدم توجہی پر والدین کو سب کچھ کرنے کا اختیار ہے۔ اسے کسی حالت میں بھی تجارت نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اس سلسلہ میں "نیکی کر کنویں میں ڈال" والی مثل صادق آسکتی ہے۔ ایسی بات کو لکھ کر مدیر محترم نے ایک طرح سے اولادوں کو ان کے فرائض سے جو والدین کے لئے ہوتے ہیں منحرف کرنے کی کوشش کی ہے۔ والدین کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اولادوں کی نافرمانیوں اور عدم توجہی پر انھیں سرزنش کریں۔

بانجھ عورتیں کیا کریں

ایک بہن نے لکھا ہے کہ حکومت منصوبہ بندی کے تحت بہت کچھ کر رہی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ بچوں کی پیدائش میں کمی ہو ——— اس کے لئے اس کو میڈیکل سہولتیں دی جاتی ہیں۔ روپیہ بھی دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ عورتیں کیا کریں جو بانجھ ہوتی ہیں اور نعمت اولاد سے محروم رہتی ہیں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں حکومت کو توجہ دلا سکتے ہیں؟"

میرا خیال ہے کہ حکومت اس سلسلہ میں توجہ دلانے پر بھی کچھ نہ کر سکے گی اس لئے کہ بانجھ پن کا کوئی علاج ابھی تک تجویز نہیں ہو سکا ہے لیکن ایسی بہنوں کو میں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ کسی کا بچہ لے کر اولاد کی طرح پالیں اور یہ سمجھ لیں کہ وہ انھیں کا بچہ ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو بخوشی دے سکتے ہیں، بشرطیکہ انھیں یہ یقین ہو جائے کہ ان کے بچے کو لینے والا اولاد سمجھ کر پرورش کرے گا۔

اس سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لے پالک سے اولاد جیسی محبت کیسے کی جا سکتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے جو عورتیں بچہ نہیں پیدا کر سکتیں وہ دوسرے کسی کے بچے کو لے کر پالیں تو یقیناً اس سے اولاد ہی جیسی محبت ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر ہم کوئی بلی یا کتا پالتے ہیں تو اس سے بھی ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کی ہر تکلیف پر ہم تڑپ اٹھتے ہیں اور اس کے آرام کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ تو پھر انسان کا بچہ تو کہیں زیادہ پیارا ہو سکتا ہے۔ اگر کسی بچے کو ہم اپنا ہی بچہ سمجھ لیں تو وہ ہمیں اولاد ہی کی طرح پیارا ہو سکتا ہے۔ اور پھر محرومیٔ اولاد کا خیال بھی دل سے نکل سکتا ہے۔

جسم فروشی کے لئے تجویز

بڑودہ۔ ۵ / فروری۔ گجرات ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بی۔ ایس۔ پوٹی نے زور دیا ہے کہ جسم فروشی کے انسدادی ایکٹ کو منسوخ کر دیا جائے کیونکہ یہ قانون جسم فروشی کرنے والیوں کی تعداد میں برابر اضافہ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔

جنسی رابطے سے ہونے والی بیماریوں پر ۸ ویں ملک گیر سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے چیف جسٹس بھگوتی نے تجویز پیش کی کہ جنسی نوعیت کی بیماریوں "امراض خبیثہ" کو روکنے کے لئے جسم فروشی کرنے والیوں کو باضابطہ لائسنس دینے کا طریقہ رائج کیا جائے اور ایسی بیماریوں میں مبتلا جسم فروشی کرنے والیوں کے باقاعدہ طبی معائنہ اور علاج کا بندوبست کیا جائے۔

چیف جسٹس بھگوتی کل جس سیمینار میں تقریر کر رہے تھے اس میں ہندوستان کے علاوہ برطانیہ، آسٹریلیا اور آئرلینڈ کے بھی آئی کمیٹ شریک تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ جسم فروشی ایسے نرم قوانین سے ختم نہیں ہو سکتی بلکہ خدشات ہے کہ ایک ہی بازار میں جسم فروشی ہونے کے بجائے ہر گلی کوچے اور محلوں میں ہونے لگے۔ یہ تو اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب اسلام کے لیے سخت قوانین بنائے جائیں۔ لیکن خواتین جس بیباکی اور جس انداز میں پھرتی ہیں، اس کے بعد شاید اسلام کا سخت قانون بھی اس جرم کو نہ روک سکے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جسم فروشی کو روکنے کے لئے مجبور عورتوں کے بجائے ان مردوں کو سزائیں دی جائیں جو جسم خریدتے ہیں، بیشتر عورتیں مجبور ہو کر جسم فروشی کرتی ہیں، لیکن مرد کمتر ہی ایسے ہوں گے جو جسم کی خریداری کے لئے مجبور ہوتے ہوں۔

ایک شادی کا اردو کارڈ: ۔ اردو کے نامور شاعر اور علامہ اقبال کے بہترین شارح و ترجمان جناب جگن ناتھ آزاد کی دختر نیک اختر کی شادی کی تقریب کا کارڈ مدیر صدق جدید کے نام صرف اردو زبان و رسم خط میں موصول ہوا۔ شادی کی رسم ۲۲ر جنوری کو نئی دہلی میں ہوئی جو بدقسمتی وقت پر ملا اس لیے شرکت کی مسرت حاصل نہ ہو سکی تاہم کارڈ کی اردو عبارت سے غیر مسلم شاعر کی اردو نوازی کا پورا ثبوت مل کر رہا ہے۔ کاش اس سے وہ اردو پر جان چھڑکنے والے مسلمان بھی سبق لیں جو انگریز کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی اپنے یہاں کی شادی کے کارڈ صرف انگریزی میں چھپواتے یا آزادی ہند کے بعد کے انقلاب سے مرعوب ہو کر صرف ہندی زبان کے کارڈ چھپواتے ہیں۔ (بشکریہ صدق جدید لکھنؤ)

پسندیدہ رومانی سماجی ناول

تشنہ کام — عفت موہانی — ۲۱/-
گناہ گار — 〃 — ۱۸/-
نیلوفر — شاہدہ بانو بلگرامی — ۱۳/-
بادل کا سایہ — شہناز کنول — ۲۰/-
صباحت — مشرف تمیتہ — ۲۸/۵
اکیلی — سلمیٰ کنول — ۱۸/-
چشمہ — اے آر خاتون — ۳۶/-
گردشیں — مسرور جہاں — ۱۵/-
ناظمہ — عطیہ پروین — ۲۲/۵۰
مہ لقا — 〃 — ۱۵/-
تمہارے لئے — 〃 — ۳۰/-
سارے جہاں کا درد — رفیعہ منظور الامین — ۲۱/-
عالم پناہ گاہ — 〃 — ۳۰/-
پناہ گاہ — سلمیٰ کنول — ۲۵/-
سوج نگر کی رانی — رضیہ جمیل — ۳۲/-
آہ — شہلا نرگس — ۳۵/-
بہار آنے تک — نسیمہ منظر — ۲۰/-
راضیہ — فریدہ جبیں — ۲۵/-
ایک لڑکی — وحیدہ نسیم — ۳۵/-
زرد چاندنی — عقیلہ ہما — ۲۲/-
واپسی — آمنہ ابوالحسن — ۱۸/-
لاروال (اول و دوم) — بشریٰ رحمٰن — ۸۰/-
جھوٹے سچے لوگ — فرحت جبیں — ۲۵/-
فرمینہ — فریدہ نزہت — ۱۲/-
نوبہار — زہرہ جبیں — ۱۵/-
کنوارا دامن — نکہت شاجاپوری — ۱۳/۵۰
آتش خاموش — صالحہ عابد حسین — ۲۵/-

ہمارے رسولؐ

دنیا میں عدل و مساوات قائم کرنے کیلئے تشریف لائے تھے

عبدالغنی شمس

سرکار کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے گمراہ انسانوں کو سیدھی راہ دکھانے، انسانی عقل وشعور کو اوہام و بےیقینی کی زنجیروں سے آزاد کرانے، بنی نوع بشر کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلانے، انسانوں کے درمیان عدل وانصاف اور کامل مساوات قائم کرنے کے لئے اس دنیائے آب وگل میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں پورے عرب میں قریش مکہ کی سرداری مسلم تھی۔ اس نامور قبیلے کا سب سے زیادہ باعزت وذی وقار خاندان بنی ہاشم کا تھا۔ اسی خاندان کی ایک بہت ہی بزرگ وبااثر شخصیت، جناب عبدالمطلب کی تھی جن کے دس بیٹے تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام عبداللہ تھا جن کی شادی آمنہ بنت وہب سے ہوئی تھی وہب قبیلہ بنی زہرا کے سردار تھے۔ حضرت آمنہ حاملہ ہوئیں۔ اس کے بعد ہی جناب عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو کھجور لانے کے لئے مدینہ بھیجا۔ وہیں ۲۵ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد ۹ یا ۱۲ ربیع الاول، ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو پیر کے دن ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام دادا عبدالمطلب نے "محمدؐ" رکھا۔ آپ کی ولادت باسعادت کیا تھی؟ دنیا کے خزاں دیدہ چمن میں دوڑتی ہوئی بہار آگئی۔ اندھیرے کے سینے کو چیر کر آفتاب تازہ طلوع ہوا اور دنیا ایک انسانِ کامل سے شرف یاب ہوئی۔ خواجہ الطاف حسین حالی یوں زمزمہ پرداز ہوئے ؎

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانبِ بو قبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

قدسی پکار اٹھے ؎

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی!
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

جیسا کہ معلوم ہوا کہ حضورؐ کے والد ماجد کا انتقال آپ کی پیدائش سے پہلے ہو گیا تھا۔ چھ برس کے ہوئے تو والدہ ماجدہ بھی رخصت ہو گئیں۔ والدہ کے انتقال کے ایک برس کے بعد آپ کے دادا جناب عبدالمطلب بھی چل بسے۔ اب آپ کے نہایت ہی پیارے چچا ابوطالب نے آپ کی پرورش اپنے ذمے لی۔ اس یتیمی اور کسمپرسی میں پرورش پانے والا بچہ آگے چل کر ساری دنیا کا ہادی ورہبر اعظم ثابت ہوا اتنا ہی نہیں بلکہ عبداللہ کا یہ یتیم ایک دن حکمرانِ عرب اور فرماں روائے عالم بن کر متعارف ہوا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچپن ہی سے صابر وشاکر، نیک دل، بہت ملنسار، پاکیزہ اخلاق، اور صادق وامین تھے۔ آپ کو بت پرستی سے نفرت تھی۔ مکہ کے قریب غار حرا میں جاکر، خدائے واحد ولاشریک کی عبادت کیا کرتے تھے۔ جب چالیس برس کے ہوئے تو اللہ تعالےٰ نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا۔ آپ نے اسی دن سے تبلیغ اسلام شروع کردی۔ قریش نے آپ کی سخت مخالفت کی، بڑی بڑی تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں۔ جن پاک فطرت لوگوں نے آپ کی اطاعت قبول کی اور آپ کی دعوت پر لبیک کہا ان کو بھی بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مصائب اور تکلیفوں کا زور اور دور بہت لمبا ہوگیا۔ لیکن حضور خدائے بزرگ وبرتر کا پیغام پہنچانے میں رات دن مصروف رہے۔ اور کسی رکاوٹ کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔

کلام اور آواز دونوں کی اثر انگیزی کی ساری دنیا قائل چلی آرہی ہے۔ اور اگر ایک ہی شخص میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہو جائیں پھر تو سونے پہ سہاگہ سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر کلام؟ وہ بھی خدائے قدوس وبرتر کا اور آواز، اس کے آخری پیغمبر کی۔ اس کی اثر آفرینی کا کیا پوچھنا؟ عرب والے بھی کلام اور آواز کی جادو اثری سے واقف تھے۔ اسی لئے کفار مکہ حتی الامکان آیات قرآنی اور اس کے ساتھ ساتھ رسول عربی کی آواز سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے تاکہ ان کی اثر انگیزیوں سے محفوظ رہیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ عوام تو عوام ہیں خواص فصحائے عرب اور وہاں کے شعرائے عظام بھی ان اثرات سے نہ بچ سکے۔

یہ انہیں دنوں کی بات ہے جب رسول پاک اپنے ہم وطنوں کے سامنے بڑے زور وشور سے دعوتِ اسلام پیش کر رہے تھے اور شہر مکہ کے گھر گھر میں حضورؐ کا چرچا تھا۔ انہیں دنوں ایک شخص جس کا نام طفیل تھا

تھا جو بلند پایہ ادیب اور مشہور شاعر بھی تھا۔ یمن سے مکہ وارد ہوا۔ جب طفیل دوسی کی ملاقات مکہ والوں سے ہوئی تو انہوں نے ازراہِ ہمدردی پہلی ہی ملاقات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پرکشش شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ سنو اور غور سے سنو! "محمدؐ نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ اس شخص کی زبان میں نہ جانے کیا اثر ہے اور کون سا جادو ہے جس کے زور سے بیٹے کو باپ سے بیٹی کو ماں سے، بھائی کو بھائی سے اور بیوی کو شوہر سے چھڑا دیتا ہے۔ تم ہمارے مہمان ہو، اس لئے تمہیں اس خطرے سے خبردار کر دینا ہمارا فرض ہے۔ دیکھو تم ہرگز ہرگز محمد سے نہ ملنا اور اس کی باتیں نہ سننا، ورنہ خوف ہے کہ کہیں تم بھی نہ پھنس جاؤ۔"

طفیل دوسی نے بڑے سکون و طمانیت سے اپنے دوستوں کی باتیں سنیں اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ ان کے مشورے پر ضرور عمل کرے گا۔ اب طفیل دوسی نے احتیاط کے طور پر یہ تدبیر اختیار کی کہ جب وہ باہر جاتا تو اپنے کانوں میں تھوڑی سی روئی ٹھونس لیتا تاکہ وہ رسول کریم کی آواز نہ سن سکے۔

ایک دن انجان پن میں طفیل دوسی کا ادھر سے گذر ہوا جہاں رسول پاک نماز میں کسی قدر جہر سے قرآن شریف کی قرأت فرما رہے تھے۔ اگرچہ اس وقت بھی طفیل دوسی کے کانوں میں روئی رکھی ہوئی تھی۔ پھر بھی رسول کریم کی آواز اس کے کانوں میں پہونچی۔ چلتے ہوئے قدم بے اختیار رک گئے اور اس کا دل ادھر کھنچنے لگا مگر فوراً اس کے ذہن میں یہ بات آئی، کہیں یہ آواز محمد کی تو نہیں؟ اس خیال کے آتے ہی طفیل دوسی وہاں سے جلد گذر جانا چاہتا تھا کہ اس نے سوچا۔ میں بھی عجیب دیوانہ ہوں، میں خود ہی ایک اچھا شاعر ہوں، کلام کے حسن و قبح سے کما حقہٗ واقف ہوں مجھ پر کسی کی باتوں کا کیا اثر ہوگا؟ کچھ دیر رک کر، سن ہی کیوں نہ لوں؟ طفیل دوسی نے اس طرح اپنے دل کو سمجھا لیا اور سننے کے لئے رک گیا اور سنتا رہا۔ یہاں تک کہ اس پر بے خودی کا عالم طاری ہو گیا جب رسول کریم تلاوت سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے تو طفیل دوسی بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ حضور نے آہٹ محسوس کی اور مڑ کر دیکھا تو وہ حضور کے بالکل قریب آگیا اور خود ہی رسول کریم کو وہ ساری باتیں کہہ سنائیں کہ کس طرح اس کو مکہ والوں نے حضور سے ملنے سے روکا تھا۔ اور وہ اس خوف سے کہ کہیں آپ کی آواز کانوں میں نہ پڑ جائے۔ اپنے دو کانوں میں روئی ڈالے پھر رہا ہے، اور اتنی احتیاط کے باوجود، اس کے کانوں میں تھوڑی بہت آواز پہنچ ہی گئی۔

حضور نے طفیل دوسی کی باتیں سن کر تبسم فرمایا۔ طفیل دوسی کے عمیق دل میں ایک ہیجان سا بپا ہو گیا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار حضور سے یہ فرمائش کی کہ حضور کچھ اور آیتیں تلاوت فرمائیں۔ حضورؐ نے اس کی فرمائش پوری کی۔ چند آیتیں سننے کے بعد وہ بول اٹھا۔

"اے محمد! تمہارے خدا کی قسم ہے، اس سے بہتر کلام میں نے کبھی نہیں سنا۔" اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ یہ ہے قرآن مجید کا معجزہ۔

یہ کون ہے؟ اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟ مچھلیاں پکڑتا ہے جال کی ڈوری ہاتھ میں ہے جال کو پانی میں ڈالا ہے اور اسے کھینچ رہا ہے۔ مچھلیاں بھاگتی ہیں مگر جال کے پھندوں میں الجھتی ہیں، پھنسی جاتی ہیں منہ کھول کھول کر کتنی تڑپتی ہیں۔ ہائے ہائے ان کے دم گھٹتے ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں بس مر جائیں گی۔ یہ ہماری طرح ہوا میں جی نہیں سکتیں۔ پانی سے باہر نکالیں تو ان کا ویسا ہی حال ہوتا ہے جیسا ہمارا حال پانی میں۔

(مولانا محمد حسین آزاد)

اگر مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا جائے کہ میں نے اس سے محبت کیوں کی تو میں یہی کہوں گی: "اس لیے وہ، وہ تھا اور میں، میں!" (مانرد)

جو شخص "عورت" "اور" پرندوں کی مترنم آواز سے محبت نہیں کرتا، وہ زندگی بھر بے وقوف بنا رہے گا۔ (لوتھر)

(ایک عورت کی محبت کی بنا پر شاہ ایڈورڈ ہشتم نے تخت و تاج کو لات مار دی اور اعلان کیا) میرے لیے یہ بات اب بڑی دشوار بن گئی ہے کہ اس عورت کے تعاون اور مدد کے بغیر، جس سے میں محبت کرتا ہوں، بحیثیت بادشاہ اپنی بھاری ذمہ داریوں کو پورا کر سکوں (شاہ ایڈورڈ ہشتم کی الوداعی تقریر سے اقتباس۔)

میری محبوبہ خوبصورت ہے اور ذہین بھی مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے اور میں اس کے ساتھ مرنے کے لئے تیار ہوں لیکن اسکے بغیر زندہ رہنا میرے لئے بیکار ہے۔ ملٹن

موت سے ملاقات

ایک جاپانی کہانی کا ترجمہ

یہ آج سے صدیوں پہلے کی بات ہے۔ جاپان کے دارالحکومت میں ایک ساموراٸی رہتا تھا۔ ساموراٸی جنگجو بہادروں کو کہا جاتا ہے اور قدیم زمانہ میں یہ لوگ مختلف حکمرانوں اور جاگیرداروں کے ہاں ملازم ہوتے تھے تاکہ وقت پڑنے پر اپنے آقا کی حفاظت کر سکیں۔ دارالحکومت میں رہنے والا یہ ساموراٸی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور بیروزگاری کے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملنے آیا اور باتوں باتوں میں بتایا۔

"تمہارا فلاں دوست ایک جگہ مقامی حاکم مقرر کیا گیا ہے اور اب وہ اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں یقیناً تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

یہ سُن کر ساموراٸی اچھل پڑا کیونکہ اس سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ چنانچہ وہ اسی وقت اپنے اس دوست کے گھر کی طرف چل دیا جو حاکم مقرر ہوا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس کا دوست اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ وہ اس سے بڑے تپاک سے ملا اور بولا۔

"میرے دوست میں جانتا ہوں تم ایک عرصہ سے دارالحکومت میں ملازمت حاصل کرنے اور اپنی حیثیت بحال کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہو۔ میں تمہارا قریبی اور مخلص دوست ہونے کی وجہ سے تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تم دارالحکومت چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔ میرا خیال ہے میں تمہیں کوئی نہ کوئی ملازمت دلانے میں مدد کر سکوں گا۔"

"مجھے تمہاری پیش کش قبول ہے اور میں اس کے لیے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اس طرح ساموراٸی نے اپنے دوست کی پیش کش قبول کر لی اور اس کی مہربانی اور ہمدردی کا شکریہ ادا کیا۔ ساموراٸی اگرچہ مفلسی میں گرفتار تھا لیکن وہ اپنی محبوب بیوی کے ساتھ بڑی پُرمسرت زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی بیوی جوان اور انتہائی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت رحم دل بھی تھی۔ بیوی کی جدائی برداشت کرنا اس کے لیے مشکل تھا لیکن مجبوری تھی، اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا

اس نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں ہم بہت جلد پھر مل جائیں گے۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ جہاں ہم نے اتنی مصیبتیں جھیلی ہیں وہاں یہ بھی سہی۔"

اس کی بیوی نے آنسو بہاتے ہوئے جواب دیا۔

اب مسئلہ ایک اور بھی تھا جس سے اس کی بیوی بے خبر تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ساموراٸی کو سفر کے خرچ کے لیے کچھ پیسے بھی درکار تھے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ جاتے وقت کچھ پیسے اپنی بیوی کو بھی دے جائے۔ اس کے لیے اس نے ادھر ادھر کوشش کی لیکن وہ پیسے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا چنانچہ اس نے چوری چھپے ایک ایسی عورت سے شادی کر لی جو دولت والی تھی اور اس کی بہت سی جائداد بھی تھی۔ اس عورت نے ساموراٸی سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تمہاری پہلی بیوی یہیں دارالحکومت میں رہے گی۔"

ساموراٸی نے اس کی بات مان لی، چنانچہ وہ اپنی وفادار بیوی سے رخصت ہو کر نئی دولت مند بیوی کے پاس گیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر سفر پر روانہ ہو گیا۔

ساموراٸی جس نئے شہر میں پہنچا تھا وہ دارالحکومت سے دور دراز ایک صوبے میں واقع تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے اچھی ملازمت بھی مل گئی تھی اور پھر اب تو اس کے ساتھ ایک نئی دولت مند بیوی بھی تھی اس لیے وہ اپنی مفلسی کو بھول گیا اور اس نئی بیوی کے ساتھ عیش کی زندگی گزارنے لگا۔ وہ اپنی پہلی وفادار بیوی کو اس طرح فراموش کر چکا تھا کہ اس نے نہ تو اسے کبھی پیسے بھیجے اور نہ ہی کوئی خط تحریر کیا۔

اس طرح کئی سال گزر گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز تنہائی میں بیٹھے بیٹھے اچانک اسے اپنی بیوی کا خیال آیا اور وہ پریشان سا ہو گیا۔ اسے اپنی بے وفائی کا احساس ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔

"نہ جانے اس بے چاری کا کیا حال ہو گا۔؟ میں جب سے یہاں آیا ہوں میں نے اسے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا نہ ہی اسے کوئی خط لکھا ہے۔ نہ جانے اس کی گزر بسر کیسے ہو رہی ہو گی؟"

اسے اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا اور وہ بے چین ہو گیا۔ اس کا جی

چاہتا تھا کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے اس کے پاس پہنچ جائے اور اس سے اپنی بے وفائی اور غلطی کی معافی مانگے۔ اس نے اسی وقت جلدی جلدی سامان باندھا اور واپس دارالحکومت کی طرف چل دیا۔

مختلف خیالات میں الجھا ہوا آخرکار وہ دارالحکومت پہنچ گیا وہاں پہنچتے ہی وہ سیدھا اپنے پرانے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی وفادار بیوی نہ جانے کس حال میں تھی۔ جب وہ اپنے گھر کے پاس پہونچا تو اس نے دیکھا۔ اس کا مکان اسی حالت میں کھڑا تھا جیسا وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ البتہ اس پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا گیٹ کھلا ہوا تھا جس کا دروازہ ہواؤں کے تھپیڑے کھا کھا کے بری حالت کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے کنڈے زنگ خوردہ ہو چکے تھے اور اس کا ایک پٹ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے محض اٹکا ہوا ہو اور دوسرا پٹ غائب تھا۔ مکان کی چھت پر گھاس پھوس اگا ہوا تھا اور ہر طرف کائی جمی ہوئی تھی! اس اُجاڑ مکان کو دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں آسیب بس رہے ہوں۔

جس وقت ساموراؤئی اپنے گھر پہنچا تھا، وہ رات کا وقت تھا یہ سال کا نواں مہینہ تھا اور چاند کی بیسویں رات تھی۔ اگرچہ چاند گھٹنا شروع ہو چکا تھا، پھر بھی ہر طرف ٹھنڈی اور خاموش چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا۔ اور خود بخود کھلنے والے دروازے کو کھول کر مکان میں داخل ہو گیا۔ اندر ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گیا اور پھر باری باری سارے کمروں میں سے ہوتا ہوا ڈرائنگ روم میں گیا تو یکایک ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا، سامنے اس کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ساموراؤئی کے سراپا پر نظر ڈالی اور پیار سے بولی۔

خوش آمدید میرے پیارے شوہر! میں ہر وقت تمہیں یاد کرتی تھی مگر تم مجھے بھول گئے۔

جب اس نے یہ الفاظ کہے۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کا حسین چہرہ تر و تازہ پھول کی طرح کھل گیا ساموراؤئی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی بیوی اس محبت سے اس کا استقبال کرے گی۔ اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔

میری پیاری بیوی! مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہے۔ واقعی میں گنہگار ہوں۔ تمہارا مجرم ہوں۔ بہرصورت جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب ہم دوبارہ اپنے گھر میں ایک ساتھ ہیں۔ اب میں کبھی تم سے جدا نہیں ہوں گا۔ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

رات کافی ہو گئی تھی اور وہ سفر کا تھکا ہوا بھی تھا اس لیے وہ دونوں اٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے جو ان کی خوابگاہ تھی۔

وہ تھکا ہوا تو تھا ہی، لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد ہی گہری نیند میں چلا گیا۔

صبح ساموراؤئی جب بیدار ہوا تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس کی کرنیں دروازے کی درزوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھا اور ساتھ ہی سوئی ہوئی اپنی بیوی کو پکار کر بولا۔

میری پیاری اب اٹھ جاؤ۔ سورج نکل آیا ہے۔

مگر اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا۔ اُف! یہ کیا؟ وہ خوف سے کانپ سا گیا۔ اس کے ساتھ رات کو جو اس کی بیوی سوئی تھی اس وقت وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی اور اس پر گوشت نام کو نہیں تھا۔ ہڈیوں کا پنجر پڑا ہوا تھا جس کے پاؤں کی ہڈیاں مسہری کے نیچے جھول رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ پاگل سا ہو گیا اور بدحواس ہو کر باہر کی طرف بھاگا۔ وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھولنے کے بجائے اسے توڑتا ہوا باہر نکل گیا اور اجڑے ہوئے باغیچے میں جا کھڑا ہو گیا۔ اس نے باہر جا کر ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے دیکھا تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس کے حواس درست ہوئے تو اپنے مکان کے پڑوس میں رہنے والے ایک آدمی کے پاس گیا اور اس سے پوچھا۔

کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ اس ساتھ والے مکان میں کون رہتا ہے؟

جواب میں اس آدمی نے کہنا شروع کیا۔

آج سے کئی برس پہلے ایک غریب ساموراؤئی اور اس کی حسین و جوان بیوی رہتے تھے۔ وہ دونوں غریب ہونے کے باوجود ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک روز ہوا یہ کہ ساموراؤئی ملازمت حاصل کرنے اور اپنی کھوئی ہوئی حیثیت بحال کرنے کی غرض سے ایک دور دراز صوبے میں چلا گیا۔ وہ اپنی بیوی کو یہیں چھوڑ گیا تھا جو اسے بہت پیار کرتی تھی اور جو بہت نیک دل عورت تھی۔ بہت سے سال گزر گئے

بقیہ صفحہ ۱۵۴ پر

آخری موتی

عفت موہانی

پروفیسر جگو ترانی نے بڑے مشفقانہ انداز میں تاجور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے نرم لہجے میں اسے سمجھانے لگے۔ کہ آئندہ زندگی گزارنے کے لئے اسے قسم کا لائحۂ عمل بنانا تھا۔

وہ یونیورسٹی کا آخری دن تھا۔ تاجور نے اپنی سند لی۔ اور بڑے دکھ سے ہال سے باہر آئی۔ کتنی مسرت آگیں یادیں اس گہوارۂ علم سے وابستہ تھیں۔ اس کے لئے یہ درس گاہ ایک پناہ گاہ تھی۔ جب تک یہاں رہتی۔ دنیا والوں کے طنز و تعریض سے محفوظ رہتی تھی۔ وہ کوریڈور کے سنگی ستون سے سر ٹیکے کھڑی دُور نیلگوں خلاؤں میں جانے کیا دیکھ رہی تھی دوسرے طلباء اونچی آوازوں میں بولتے قہقہے لگاتے اسکے پاس سے گزر رہے تھے۔ لڑکیاں سیاہ گاؤن پہنے بڑے باوقار انداز میں قدم اٹھا رہی تھیں۔ ان سب کے چہروں پر ایک روشن مستقبل کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ انہیں دنیا کے کسی دُکھ کسی فکر اور کسی خلش سے سروکار نہ تھا وہ بالکل بے فکر اور لاپرواہ تھے۔ !

ایم اے کی قیمتی سند ـــــ تاجور نے ٹھنڈی سانس لی امی کے سارے زیور آبا کے چھوٹے سے مکان کا پورا کرایہ چھ سال میں برباد کر کے اس نے یہ کاغذ کا قیمتی ٹکڑہ حاصل کیا تھا۔ اس کے حصول کے لئے اس نے سچ مچ انگلیوں پر دن گنے تھے۔ یہ کیا دے گی اُسے ؟؟

اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اس نے چہرہ پھیر لیا۔ دوسرے لوگ سندیں حاصل کر کے خوش ہو رہے تھے۔

لیکن یہ قنوطی روح آنسو کیوں بہا رہی تھی؟ اس نے جلدی سے آنسو صاف کر لیئے! لیکن دل سے امڈتی ہوئی اُن روح فرسا یادوں کو کیسے روک دیتی جو طوفان بلاخیز کی طرح اس کی ذات کی طرف بڑھتی آ رہی تھیں ـــ کیسی دُکھ پہونچانے والی یادیں تھیں۔

آبا چاہتے تھے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اکلوتی لڑکی تھی۔ امی کی بھی یہی مرضی تھی۔ وہ دنیا کا رنگ دیکھ رہی تھیں۔ آج کل لڑکیوں کی تعلیم بہت ضروری تھی۔ کبھی کبھار اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ شوہر کو بھی پالتو جانور کی طرح کھلانا پڑتا ہے تعلیم وہ موثر ہتھیار ہے جس سے دنیا کے ہر حملے کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ مگر۔ تقدیر۔ ابھی وہ انٹر ہی کر رہی تھی کہ اس کی امی چل بسیں آبا نے ہمت نہ ہاری۔ اس کے نام گھر لکھ دیا اور تسلی دی، مکان کا کرایہ ملتا رہے گا تعلیمی اخراجات پورے ہوا کریں گے۔ ابھی کچھ آنسو پنچھ نہ سکے تھے کہ آبا نے بھی اس کا منھ موڑ لیا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ لق و دق میدان میں کھڑی ہے۔ جہاں کوئی چھت نہیں کوئی ستون نہیں کوئی سہارا نہیں۔ مدتوں دیوانی سی رہی۔ پھر اچانک نام نہاد چچا چچی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اسے اپنے گھر لے آئے۔ اس کے خورد و نوش کا انتظام کیا۔ اور بدلے میں اس کے مکان کا کرایہ وصول کرنے لگے۔ قلیل سی رقم جیب خرچ کے طور پر ملتی رہی۔ جوں توں کر کے اس کی تعلیمی گاڑی پھر آگے بڑھنے لگی۔ ویسے اب اس کا دل اچاٹ رہنے لگا تھا کیا کرے گی پڑھ لکھ کے یکہ چچا نہ مانے۔ اسے برابر حوصلہ دیئے گئے۔ بہت کچھ پانے کی آس میں وہ بے حد صبر و سکون سے آنے والے دنوں کا انتظار کرنے لگے۔ وہ خود کسی آفس میں معمولی سے ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ پوری نہیں پڑتی تھی۔ کیا ان کی بھتیجی جو ان کے ٹکڑوں پر پل رہی ہے۔ وہ آگے نوکری کر کے ان کا احسان نہیں اُتارے گی؟ انہوں نے بیوی کی بارہ ہاتھ کی زبان پر بھی مصلحت کے پہرے لگا دیئے تھے وہ دل ہی دل میں تو آگ ہوتیں مگر زبان سے کچھ نہ کہتیں۔ دن گزرتے رہے۔ وہ اپنی ماں کا زیور چپکے چپکے بیچ کر پڑھتی رہی اور آج ـــ پورے چھ سال اس جانگسل لمحے میں سمٹ آئے تھے۔ !

سامنے یونیورسٹی کا لان تھا۔ سُرخ بجری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ دُور دُور مختلف شعبوں کی عمارتیں بکھری ہوئی تھیں۔ کیفے ٹیریا سے کافی اور چائے کی اشتہا خیز خوشبو آ رہی

تھی۔ باہر کی دنیا کتنی حسین، شوخ، اور زندہ تھی۔ اسکے دل کی دنیا اتنی ہی سوگوار، پژمردہ اور اُداس ۔۔۔

کاش وہ زمانہ گزرتا جس کے جلدی سے گزرنے کی وہ دُعائیں مانگا کرتی تھی۔ اب اسے ہمیشہ کے لئے اس درسگاہ سے گزرنا تھا۔ اسے خیرباد کہنا تھا۔ آج سب کچھ اس سے چھٹا ہو جائے گا۔ سب کچھ! یہ جدائی بڑی ہولناک ہوگی!

اب اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ کتنی بدنصیب تھی کتنی مفلس اور تہی دامن تھی نہ ماں باپ کی محبت نصیب تھی نہ بہن بھائیوں کا پیار ۔۔۔ نہ کوئی اپنا دوست۔ اکیلی اور اُداس۔ کاش اسے موت ہی آجاتی۔ لیکن موت اس سے منہ پھیر کر کسی مزور مند کے پاس چلی گئی تھی۔ کیا ملا اسے کیا پایا تھا اس نے۔ دُکھ، جلن، محرومی، راحت و آرام کا تصور اس کے لئے خواب تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا وہ ساری زندگی حرماں نصیبی اور محرومی کی بھٹی میں جلا کرے گی۔ کرونت انتظار اور صبر اس کا نصیب ہوگا۔ اسے کچھ بھی نہیں ملے گا کچھ بھی نہیں۔

اب اسکے سامنے ایک غیر یقینی مستقبل تھا۔ حیات بے مقصد کا ایک بے کنار صحرا، صحرا نوردی اس کا مقدر، آبلہ پائی اسکا نصیب، جدوجہد، کٹھن زندگی اور جانے کیا کیا کچھ۔

پھر وہ بھی اپنے راستے پر چل پڑی۔ اس کے کانوں میں پروفیسر صاحب کے حوصلہ افزا فقرے گونجنے لگے۔

"بس تاجور ابراہیم، تم ایم اے فرسٹ ان فرسٹ ہو۔ یونیورسٹی کو تم ایسی طالبات پر ناز ہے۔ خدا کرے کہ تمہاری جیسی باہمت اور خوبصورت طالبات یونیورسٹی کو اور بھی ملیں۔ میں تمہارے لئے دُعا گو ہوں اپنے اور تمہارے ساتھیوں کی طرف سے تمہیں نیک خواہشات کا تحفہ پیش کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ ہر ہر قدم پر تمہیں ایسی ہی کامیابیاں ملیں اور فخر و غرور سے ہمارا سر اونچا ہمیشہ رہے۔"

اور وقت کی اہم ترین سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتی چلی جارہی تھی کیونکہ اس کے پھٹے پرانے پرس میں بس کے ٹکٹ بھر کا کرایہ نہ تھا۔ لیکن پھر عزم و اُمید کی کرنیں جانے کہاں سے اسکی راہوں میں پھیل گئیں۔ وہ زندگی کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرے گی۔ ابھی اس میں اتنی طاقت ہے۔ وہ حالات کے سامنے سپر انداز نہیں ہوگی۔ جنہیں آگے چل کر کچھ بننا ہوتا ہے وہ شروع شروع میں ایسی ہی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں۔ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کو حصول مسرت و مقصد کا ذریعہ بنائے گی۔

اور وہ بزدلی وہ نکماپن وہ احساس محرومی جو کچھ دیر پہلے آنسو بن بن کے اس کی آنکھوں میں چھلک رہا تھا اب اس کے لبوں پر مسکراہٹوں کی چاندنی بن کر بکھر گیا۔

ملازمت کی تلاش۔ بس کل ہی سے۔ ایک رات بے فکری کی نیند اس کا حق ہے ابھی وہ گھر کی دہلیز بھی عبور نہ کر سکی تھی کہ چچا کی سرد اور بے رحم آواز سنائی دی۔ وہ شاید اپنی بیوی سے کچھ کہہ رہے تھے۔

"ارے اللہ کی بندی۔ کچھ تو صبر کرو۔ تاجور اپنی ڈگری لئے آتی ہوگی! ہمارے دن بھی اب پلٹ جائیں گے اسے یونہی تو بٹھال کے سونے کے نوالے نہیں کھلائے کہ وہ اپنے ہاتھ پیر کی ہو کر ہمارا احسان بھول جائے۔ میں تو حلق میں ہاتھ دے کے سارا اُگلوا لوں گا۔ اسے گھر کے کاموں میں نہیں اُلجھا کے بنائے رکھا۔ صرف اسی لئے کہ پڑھائی پوری کرے۔ اب وہ نوکری کر کے میرے ہاتھ مضبوط کرے گی! سمجھیں۔ تم بھی اب کچھ رو رعایت نہ کرنا۔ کس کے خدمت لینا!"

خیالی پلاؤ پکانا تو تمہاری عادت ہے۔" جواب میں بیوی تڑاخی تھیں۔" اتنی بزدل نکھٹو لڑکی ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر نوکری کر ہی نہیں سکتی۔ میں تو کہتی ہوں کہ کسی بھلے مانس کو دیکھ کر اسکے گلے چپکا دو! بے کار کا بوجھ۔ نہ جانے تمہارے بڑے بھائی نے کیسی تربیت کی ہے کہ بائیس تئیس برس کی ہونے کو آتی ہے مگر ڈرپوک اتنی ہے جیسے چار سال کی بچی۔ وہ بھلا نوکری کرے گی۔؟"

"نیک بخت۔ آخر اسے پڑھایا کس لئے ہے؟" چچا ہنسے "کیا اسی لئے کہ اپنی گرہ سے دس پانچ ہزار لگا کے اس کی شادی کر دوں؟ ابھی تو مجھے اس سے وہ سب کچھ وصول کرنا ہے جو میں نے اُسے دیا ہے۔!"

اور پھر تاجور کا دل بیٹھ گیا۔ چپ چاپ اس نے گھر میں

یکبارگی چچا چچی کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں!
"آ گئیں تم۔ آؤ۔ آؤ۔" چچا نے کہا۔
"مل گئی سند۔" چچی لہکیں
"جی۔!" سوکھے سوکھے ہونٹوں سے مری ہوئی آواز نکلی اس نے رول کی ہوئی سند چچا کی طرف بڑھا دی۔
"ماشاء اللہ۔ سبحان اللہ۔" چچا نے موقعہ محل دیکھ کر تعریف کی۔ "درجۂ اوّل۔ واہ۔ تمہیں تو سر آنکھوں پر نوکری ملے گی۔ ہزار بارہ سو ماہانہ تو کہیں گئے نہیں۔!"

نہ مبارک سلامت نہ تعریف و توصیف۔ اس نے آہ بھر کر سوچا کاش آج ابا ہوتے امی ہوتیں۔ ان کی خوشیوں کا عالم کیا ہوتا۔ اپنے درخت کو لگایا پھل کی آس میں کون ہے ـــ!

پھر سند اسے دے دی گئی۔ چچی نے گلفشانی کی۔ "بس اب کل ہی سے ملازمت کی تلاش شروع کر دو۔ گھر کی حالت تم سے پوشیدہ نہیں۔ آج کل تو دسویں پاس لڑکیاں اپنی چالاکی ہوشیاری سے اچھی اچھی نوکریاں ہتھیا لیتی ہیں ـــ اے بس ذرا بہادر اور ہمت والی بنو۔ تم کو ہوشیاری چالاکی نہیں آتی۔ صورت سے بھی نہیں لگتا کہ اتنی دگری تک پڑھی ہو۔ ارے کچھ فیشن ایبل بنو۔ کچھ میک اپ کرو۔ ذرا بن ٹھن کے رہا کرو۔ بات چیت کرنے کا ڈھنگ سیکھو۔

"ہاں۔ تمہاری چچی سب ٹھیک کہتی ہیں۔" چچا نے بھی تائید کی آج کل بدصورتی کا زمانہ نہیں۔ اسمارٹ، بولڈ بنو پھر دیکھو تم کہاں ہوتی ہو!"

اسی ہفتے سے اس نے نوکری کی تلاش میں دھکے کھانا شروع کر دیئے۔ ان کی رہی سہی ہمت جواب دیتی رہی۔ ہر طرف مایوسیوں اور ناامیدیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا نظر آتا۔ کیا ہوگا؟! ابھی تک کسی کمپنی، کسی مدرسہ، کسی فرم اور کسی بھی کالج نے حوصلہ افزا جواب نہیں دیا۔ سب نے منہ بنا کر معذرت چاہ لی تھی۔ تو پھر کیا کرنا چاہیئے اُدھر چچا چچی نے جان لے رکھی تھی۔ اسے بے حوصلہ، بزدل، نکمی، ڈرپوک اور جانے کیا کچھ کہتے اور اسے زیادہ سے زیادہ زندہ درگور کرتے رہتے۔ وہ روز بروز اور زیادہ بزدل ہوتی گئی۔
اس کے پاس اب کچھ نہ رہا تھا۔ یہاں وہاں آنے جانے میں

اس نے اپنا بچا کھچا اندوختہ بھی خرچ کر دیا تھا۔ اب چچا کے کے سامنے ہاتھ پھیلاتے بھی شرم آتی۔ ذلت و رسوائی! آخر کیا تھا ساری دنیا میں وہی ایک بدبخت اور لعنتی کیوں تھی آخر اس کی ساتھی لڑکیاں کیا کر رہی تھیں۔ آرام۔ انجوائے، تفریح، پکنک۔ ماں باپ کے سہارے مستقبل کے خاکے بنانا ان کا کام ہوگا ـــ"

ایک دن اُسے اپنی سہیلی مل گئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔
"ارے ایسے نہیں ڈارلنگ! اپنے میں کچھ attraction پیدا کرو۔ تمہارا پھیکا، بے رونق چہرہ، ڈری سہمی ادائیں، دبی دبی گفتگو appeal نہیں کر سکتی۔ تم روژ، نیل پالش، لپ اسٹک اور عمدہ پاؤڈر، حسین سی وگ اور چست لباس پہنو، مٹک کر، چمکنا منہ بنا کر باتیں کرنا اور انگریزی بولنا سیکھو، پھر دیکھو کہ نوکریاں برسیں گی تم پر۔"

"مجھے حسن کے مقابلے میں شرکت تھوڑی کرنی ہے" اسنا جھنجھلا کر بولی
"تو پھر جھک مارا کرو۔" سہیلی جل گئی: "مجھے دیکھو۔ حالانکہ بی اے میں تین دفعہ رہ چکی ہوں۔ لیکن اسٹیل کے برتن بنانے والی فیکٹری میں مجھے اسسٹنٹ منیجری مل گئی ہے۔ مزے میں ماہانہ سات سو روپے اٹھا رہی ہوں۔ میرے بے شمار دوست ہیں ان کے جسم میرے ہیں ان کے دل و دماغ میرے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پرس میرے ہیں۔ میں اپنے باس پر بھی حکومت کرتی ہوں۔ میں عیش کر رہی ہوں عیش، یہ تمہاری قدامت پسندی، مشرق پرستی، تمہارا حجاب یہ تمہارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ تم کبھی ترقی نہ کر سکو گی"

چچا بھی زبان کے تیر چلاتے۔
"خدا جانے یہ کب تک ہوتا رہے گا! تمہاری ساتھ والی لڑکیاں تو کہیں کی کہیں پہونچ چکی ہوں گی۔ تم نہ جانے کس خواب میں پڑی ہو!"
چچی کی باتیں۔ خدا کی پناہ۔
"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ شادی کر کے گھر سے نکالو۔ خدا بھلے بھائی بھابی سے ان کی گود میں انگارے بھر یہ باپ ہمارے سر لگا گئے۔ اسے ایسی گھر گھسنی لڑکی تو کہیں دیکھی نہ سنی ہم نے پھل کی آس میں نرا ایندھن سینچا ہے۔"

وہ بدحواس ہونے لگی۔ کون تھا جو کچھ دلاسا دیتا۔ امید بندھاتا، کوئی راہ دکھاتا۔ یہ کہتا کہ پریشان مت ہو۔ ابھی تمہارے لئے ہم زندہ ہیں۔ کوئی نہیں تھا ایسا۔ اب تو اسے چچا کے دسترخوان پر بیٹھتے حیا آتی تھی وہ بھوکوں مرنے لگی عقل چکر میں رہتی۔ کیا کرے کیا سچ مچ الٹرا موڈرن بن جائے۔ شرم و غیرت کو رکھ دے طاق پر۔ اول و آخر پیسہ، دین و ایمان پیسہ، پیسہ زندگی کی گاڑی کو چلانے والا پٹرول۔ یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کہاں سے لائے وہ ماہانہ ہزار بارہ سو جو چچا کے منھ پر دے مارے اور شان سے جی سکے۔

ناکارہ، بودی، جھینپو۔

یوں لگتا کہ سڑک پر چلنے والے بھی اسے یہ خطاب دے رہے ہیں۔ سب اس پر ہنس رہے ہیں! کبھی سے استہزائیہ قہقہے ہواؤں کے دوش پر آتے اور اسے مزید برباد کر دیتے

پھر وہ جھلا گئی۔ جھلاہٹ میں آدمی اپنے گلے پر آپ چھری پھیر سکتا ہے۔ اس نے بھی اپنے اعلیٰ اقدار کے گلے پر چھری چلا دی!

سولہ سنگھار کر کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود کو پہچان نہ سکی!

چست لباس، کندھوں پر ڈھیر سیاہ ریشم سے گھنے بال، لپ اسٹک سے شعلوں سے سرخ لب، سیاہ کاجل سے سجی آنکھیں، گلابی روژ سے تمتماتے چکنے چکنے ہوش ربا عارض، شاخِ گل کا سا بدن، اور مہین ساڑی سے نمایاں جسم کے نشیب و فراز ــ

اُف ــ اس کے بالوں کی جڑوں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹا اور سارے بدن پر برف کی لکیریں بناتا ایڑیوں میں جمع ہونے لگا ــــ!

یہ میں ہوں۔ تاجور ابراہیم ۔ او خدا۔

پہلے تو آٹو رکشہ ڈرائیور ہی اسے گھورتا رہا۔ پھر جب وہ اے جی آفس کے سامنے اتری تو جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے سب اسے دیکھنے لگے! وہ کیا جانتے تھے کہ مس تاجور ابراہیم کے بھڑکتے دہکتے جسم کے اندر کتنی چتائیں سلگ رہی تھیں کتنی حدت تھی دل کے اندر، روح جل رہی تھی۔ دل رگ رگ میں دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پیر سرد اور دماغ بھٹی بنا تھا۔

"ادھر تشریف لے آیئے۔!"

"کیا آپ انٹرویو کے لئے آئی ہیں۔"؟

ہر زبان شہد ٹپکا رہی تھی ہر آنکھ راہ میں بچھنے کو تیار تھی۔ ہر دل اسے آغوش میں لینے کو بے تاب تھا۔

اس نے زیر لب کچھ کہا۔

"آپ ایسے آیئے۔؟"

بڑے ادب احترام سے ایک کمرے میں پہونچا دیا گیا۔

وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا سکی تھی۔ ہر چہ بادا باد۔ کسی صورت ہاتھ پیر مار کے ساحلِ مراد تک تو پہنچنا ہے ہی۔!

وہ ایک گدگدے سے صوفہ کے کنارے ٹک گئی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر جانے کب کا پرانا ڈائجسٹ پڑھنے لگی اسے احساس تھا کہ درجنوں حریص اور ننگی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں!

پھر ایک بے حد اپٹوڈیٹ صاحب کمرے میں تشریف لائے عجیب اتفاق تھا کہ ان کی نظریں سب سے پہلے اسی پر پڑیں! اس کے چہرے پر پھر آگ سی جلنے لگی۔

تعلقدار نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اور پھر دوسروں سے مخاطب ہوگیا۔ سب کے آخر میں اس کی باری آئی!

"ہوں۔ اچھا" سند دیکھنے کے بعد اس نے کہا: "مس تاجور ابراہیم۔ خوب!"

"آپ نے کوئی درخواست تو دی ہی ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ پہلے درخواست" اس نے کھنکھار کر، کھانس کر مشکل سے کہا۔

"اچھا آیئے میرے ساتھ" ان صاحب نے بڑی فیاضی سے فرمایا" میں لکھواتا ہوں۔ یہ بہت بڑی فیکٹری ہے۔ یہاں مختلف کیمیکلز بنتے ہیں۔ میں یہاں کا انچارج ہوں!

"جی۔ جی۔" وہ نروس ہونے لگی۔ انچارج صاحب کو اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کہ وہ بالکل ناتجربہ کار، جھینپو گاؤدی ہے۔

وہ اسے ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔

"لولی Lovely" وہ گنگنایا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نجانے کیا کچھ سننے کے بعد وہ بولے۔ "چارمنگ"!

کیا مطلب تھا تاجور سمجھ نہ سکی۔
اس نے انچارج کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔

یہ خاص ان صاحب کا خاص چیمبر تھا۔ پرسکون، ٹھنڈک خوشبو دار سا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ انچارج صاحب نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کی دعوت دی۔!

"اس سے پہلے آپ کا کہاں کا تجربہ ہے؟"

"کس چیز کا تجربہ۔؟" تاجور نے بڑی معصومیت سے پوچھا

"ملازمت کا!"

"آ۔ ہا۔ اس طائر زیر دام پر جھپٹتے دیر کیا لگے گی۔
"آپ کچھ پئیں گی؟"
"جی۔ جی نہیں شکریہ۔"

"ملازمت آپ کو مل جائے گی۔!" انہوں نے کہا۔ "لیکن یہ بات آپ کسی سے کہئے گا نہیں۔ باہر کی بھیڑ بھاڑ آپ نے دیکھی ہے۔ جگہ یہاں ایک ہے۔ اور امیدوار دو ہزار ہیں۔"

"عجیب مصیبت ہے لیکن آپ۔ آپ کی بات دوسری ہے۔ ہمیں تو بس آپ کی سی لڑکی چاہیئے تھی۔!"

"کیا مطلب؟۔"

"مطلب یہ کہ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔" وہ ہنسے۔ "آپ کیا سمجھیں ــــ؟"

"اوہ ــــ!" بڑی دیر بعد وہ بھی ہنسی۔
"اچھا یہ بتایئے آپ مجھے کہاں مل سکیں گی؟"
"کیوں؟"

"تاکہ میں آپ کو سمجھا سکوں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آفس میں آپ سے خصوصیت کا سلوک سب کو مشکوک کر دے گا۔ کل آپ کو تقرری کا سرکاری مراسلہ مل جائے گا۔ تنخواہ پندرہ سو ماہانہ ملے گی۔ مگر اسی صورت میں جبکہ آپ یہاں کے تمام فرائض بخوبی سمجھ لیں۔"

"پندرہ سو" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔
"جی ہاں۔ دو چار ماہ بعد دو ہزار ہو جائے گی۔"
"اللہ۔ میرے خدا۔"
"کیوں کیوں۔"

"آپ کی مہربانی۔ میں نے خواب میں بھی نہ سوچا کہ مجھے اتنی اونچی تنخواہ مل سکتی ہے۔ میں کتنی پریشان تھی۔ چچا چچی نے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اب میں انھیں خوش خبری سناؤں گی۔ آہ! آپ کتنے اچھے!" اس کے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔

"ارے نہیں مس تاجور۔ پلیز۔ دل کو سنبھالئے!" انہوں نے کہا۔ "اس طرح بدہمت نہیں ہونا چاہیئے۔"

پھر انہوں نے اسے چائے آفر کی۔ اور بتایا کہ کل شام اسے ان سے کہاں ملنا ہے۔ پھر وہ کمرے سے نکلی تو ہواؤں پر اُڑ رہی تھی۔ واقعی سب سچ کہتے تھے۔ یہ زمانہ دقیانوسی بنے رہنے کا نہیں ہے۔ واہ۔ پندرہ سو ماہانہ۔ چچا کو صرف ہزار روپے بتائے جائیں گے۔ باقی وہ بینک میں جمع کرے گی۔

اب وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی بن چکی تھی۔ رات اس نے بڑے فخر و غرور سے انچارج صاحب سے ملاقات کا حال سنایا۔ ملازمت کی نوید دی۔ اور نہ جانے اس وقت چچا چچی نے اسے سچے یا جھوٹے منہ سے کتنی دعائیں دیں۔

"بیٹی یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کانٹوں سے ہاتھ زخمی کرے گا پھول اسی کو ملے گا۔ آج کل کی دنیا میں اگر تیز نہ دوڑا جائے تو آگے بڑھتے ہوئے لوگ پیچھے مڑ کے بھی نہیں دیکھتے تم اگر سمندر میں کود پڑو گی۔ طوفانی موجوں کا مقابلہ کرو گی گہری اُترو گی بس۔ ایک بیش قیمت موتی تمہی کو مل جائے گا! ساحل سے لہروں کا تماشہ دیکھنے والے ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں بیٹی!

"اب میری تاجور کے اونچے اونچے رشتے آئیں گے" چچی بے حد مسرور تھیں۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی تو دوسری تاجور تھی۔ امیدوں آرزوؤں اور نت نئی خواہشوں کے طوفان میں گھری ہوئی۔! آج اسے دنیا کے ظالم سے ظالم ترین آدمی سے بھی کوئی شکایت نہ رہی تھی۔ وہ پچھلی تلخیاں بھول چکی تھی۔ اب تو وہ مستقبل کے بڑے حسین اور خوش رنگ خواب دیکھ رہی تھی۔

پھر اسے انچارج صاحب یاد آئے۔ یا خدا۔ کیا آدمی تھا وہ بھی۔ اونچا پورا شاندار، کتنا قیمتی اور عمدہ سوٹ تھا ان کا۔ انگلیوں میں سچے نگینوں کی انگوٹھیاں، بات کرتے

کا انداز کیسا دلکش تھا۔ آخر انہوں نے سب پر کیوں ترجیح دی۔ تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے پسند کرنے لگے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کا ہاتھ طلب کریں۔ اور ایک دن وہ ان کی بیگم بن جائے۔ تو پھر ـــ ایک شاندار کوٹھی ـــ خوبصورت امپالا کار، درجنوں ملازم، اور جانے کیا کیا۔ تب اسے ملازمت کی ضرورت بھی کیا پڑے گی!

بلی نے کانچ کا گلاس لڑھکا دیا تب وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔

چچا اور چچی بھی دیر تک بیٹھے خیالی پلاؤ کی دیگیں اُتارتے چڑھاتے رہے۔ ان کے مکار چہروں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی! انکے سامنے پھلا پھولا درخت تھا جس کے پھل کھانے جس کے سائے میں آرام کرنے کی ہوس انہیں بے چین کر رہی تھی۔

دوسری صبح جو بڑی چمکیلی تھی۔ تاجور پورے میک اپ میں اپنے کمرے سے نکلی۔ چچا کے دیدے پھٹ گئے۔ یہ اتنی خوبصورت ہے۔ انھوں نے سوچا۔ تب تو حسن بھی ایک قاتل ہتھیار ہے اگر حسن والا اسے اچھی طرح استعمال کرنا جانے۔

انہوں نے اسے نصیحت کی۔

"بیٹی۔ پہاڑ کی چوٹی پر وہی لوگ پہنچتے ہیں جن کے سامنے کوئی بلندی اپنی حقیقت نہیں رکھتی۔ غوطہ خور اگر بپھرے ہوئے سمندر سے ڈر جائے تو اس کا دامن گوہر آبدار سے ہمیشہ خالی ہی رہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا بی بی، مسافر اگر راہ کی دشواریوں سے بد ہمت ہو جائے تو پھر ـــ" انہوں نے بے گنتی مثالیں دے ڈالیں۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" وہ جلدی سے باہر مڑ گئی۔ اور سوچتی رہی۔ چچا بے چارے اس کے بد خواہ نہ تھے۔ یہ تو اسی کا کم ہمتی تھی۔ انہوں نے تو ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔

اب تو اسے انچارج کو اُلّو بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا تھا۔ مگر اس کے اندر چھپی ڈرپوک مشرقی لڑکی بار بار لرز کر رہ جاتی دل دھڑک اٹھتا۔ یہ جو کچھ وہ صرف حصول زر کی خاطر کر رہی ہے۔ کیا وہ صحیح ہے۔

آج اسے بہت کچھ سیکھنا اور سمجھنا تھا!

لہٰذا اپنی ساری ہمت اور طاقت اکٹھا کر کے اس نے مقررہ جگہ پر قدم رکھ ہی دیا۔

انچارج صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور کچھ عجیب سے لگ رہے تھے جیسے ڈھیر سی پی رکھی ہو۔ آنکھیں سُرخ، ہونٹ مرتعش انداز بہکے ہوئے۔ اعصابی بیمار کی طرح ہاتھ مل رہے تھے ٹھیک ہے بھئی۔ بڑے آدمی ہیں۔ ان کے نزدیک پینا پلانا کچھ بُرا نہیں ـــ پی لی ہوگی۔ اُسے کیا ـــ ؟

انہوں نے بے حد خندہ پیشانی سے بہت لپک کر اس کا استقبال کیا۔ اور بڑی بے پروائی سے پوچھا "آپ نے کار کہاں پارک کی۔ ؟"

تاجور کا گلا رُندھ گیا" مجھ غریب کے پاس کار کہاں۔ جناب۔ چچا سے پانچ روپے اُدھار لے کر آئی ہوں۔ پہلی تنخواہ پر واپس کر دوں گی۔"

کتنی احمق کتنی سیدھی ہے۔ انچارج صاحب نے سوچا۔

پھر انہوں نے اسے ایک بے حد اپٹوڈیٹ چیف سے ملایا۔

تاجور اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ شان و شوکت۔ رکھ رکھاؤ اس پر ختم تھا۔ مگر اس کی شخصیت میں کوئی بات ایسی تھی کہ اسے اس کے قریب سے خوف لگ رہا تھا! وہ ہوش و حواس سے عاری ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں آدمی کس موضوع پر اور کس زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ آخر ایسا بھی کیا۔ اسے بس کام دے دیا جاتا۔ وہ تھوڑے دنوں میں خود سیکھ جاتی اسے کیا کرنا ہے!

نئے باس نے بے حد اخلاق سے اس سے بات کی اور پھر اسے ساتھ لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ انچارج صاحب وہیں رہ گئے۔

"آیئے چلیں" نئے چیف نے کہا۔

"کہاں۔ ؟"

"گھر !"

"گھر ـــ ؟!" تاجور حیران رہ گئی" مگر مجھے تو ابھی کچھ بتایا نہیں گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"آپ خود سب کچھ سیکھ جائیں گی۔ آیئے میرے ساتھ۔!" چیف نے کہا اور کھل کر مسکرائے۔ ان کا سونے کا دانت چمکا۔ اور تاجور کو بڑی گھن لگی۔

"پہلے کلب چلیں گے۔ کچھ دیر رقص دیکھیں گے۔ پھر رات

بھیگ جائے گی تو پھر—"

اس نے دفعتہً تاجور کی کمر میں بازو حمائل کر دیا۔ نجانے اس کے لمس میں کون سا طلسمی اثر تھا کہ تاجور ایک لاش کی طرح اس کے ساتھ متحرک ہو گئی۔ !

چیف کی کار تیزی سے سڑک پر پھسل گئی۔ پتہ نہیں۔ وہ کہاں کہاں گیا۔ کیا کیا کرتا رہا۔ تاجور کے سر پر سے تو شور مچاتے ہوائی جہاز گزر رہے تھے۔ اسے اب خوف محسوس ہو رہا تھا پرانا خوف۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسے کوئی کام کیوں نہیں بتایا جاتا۔ کیا سب ہی لڑکیوں کے ساتھ یہ لوگ اسی قسم کا رازدارانہ سلوک کرتے ہیں۔ یہ تو کوئی شریف آدمی نہیں لگتا۔ مگر وہ اس کا باس تھا اتنی اتنی مقدرت رکھتا تھا کہ اسے پندرہ سو روپے تنخواہ دے سکے اب مجال چوں چرا نہیں۔

پھر وہ اسے اپنی بے حد شاندار کوٹھی پر لے گیا۔ تاجور نے یہاں درجنوں حسین وطرحدار لڑکیاں دیکھیں، خوبصورت لباس نظر آئے۔ اس کی ہمت بندھی۔ بھلا اس روشن چمک دار ماحول میں ڈر کی کیا بات تھی اسے پتہ نہ تھا کہ بہت زیادہ خیرگی بھی بہت زیادہ تیرگی میں بدل جاتی ہے۔

اور پھر— اُسے وہ تندرست چھپکلی یاد آئی جو ایک ننھے سے پروانے پر جھپٹی تھی۔ وہ بے چارہ پروانہ روشنی کا طواف ہی کرنے تو آیا تھا۔ مگر اس کی قسمت میں روشنی نہ تھی۔ !وہ ایک تاریک قبر میں زندہ ہی دفن ہو گیا تھا!

نجانے وہ کس طرح اپنے گھر پہونچی۔ باس کی شاندار شنک اور تیز رفتار کار اسے گھر تک چھوڑ گئی تھی۔ اس کے پرس میں "پیشگی" ملے ہوئے پانچ سو روپے تھے اور اس کے دماغ میں باس کی دھمکی گونج رہی تھی !۔

"اب تمہیں یہی سب کچھ کرنا ہے۔ خبردار۔ اگر کسی کے سامنے کچھ کہا تو ہم تمہیں پاتال میں بھی چین نہ لینے دیں گے۔ ہمارا کچھ نہ بگڑے گا مگر تم کہیں کی نہ رہو گی۔" اسے "ملازمت" مل چکی تھی۔ کام بتا دیا گیا تھا۔ تنخواہ [illegible] ملنے والی تھی

دروازہ بند تھا!

اور بند دروازے سے سر ٹیک کر وہ بلک گئی۔

وہ سمندر جو موتی اگلتا ہے۔ وہ کہاں ہے ؟۔

یہ کیسا سمندر تھا۔ جس نے اس سے اس کا قیمتی گوہر بھی چھین لیا تھا۔ اس کا قیمتی اور آخری موتی — !

دروازہ جوں کا توں بند تھا!

بقیہ صفحہ ۸

مگر اس ساموارائی نے نہ تو اپنی بیوی کو کوئی پیسہ دھیلا بھیجا نہ ہی اسے کوئی خط تحریر کیا اور نہ اس کی خبر لی کہ وہ بیچاری کس حال میں ہے

کچھ عرصہ بعد پاس پڑوس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ساموارائی وہاں جا کر عیش و آرام میں پڑ گیا ہے۔ اس کو وہاں اچھی ملازمت مل گئی ہے اور ایک دوسری عورت کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا ہے۔ ساموائی کے بارے میں جب یہ خبر اس کی بیوی کو ملی تو وہ غم سے نڈھال ہو گئی اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئی۔ اس کی بیماری اس قدر شدید صورت اختیار کر گئی کہ آخر وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ بیچاری غریب عورت شوہر کی بے وفائی کی وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئی۔

"مرنے کے بعد کیا ہوا؟"

ساموارائی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

ہونا کیا تھا—؟"

اس آدمی نے سوالیہ نظروں سے ساموارائی کی جانب دیکھا اور بولا۔

اس بدنصیب کا نہ تو کوئی رشتہ دار تھا اور نہ کوئی دوست تھا جو اس کے کفن دفن کا انتظام کرتا۔ چنانچہ اس کی میت اسی اندھیرے گھر کے ایک کمرے میں پڑی رہی اور اسے کسی نے چھوا تک بھی نہیں۔ وہ اسی طرح پڑی رہی جس حالت میں اس کا انتقال ہوا تھا اس بات کو بھی کافی عرصہ گزر چکا ہے۔

اس زمانے کے لوگ ایک دوسرے سے یہ کہتے تھے کہ جب طویل عرصہ کے بعد ساموارائی واپس آیا تو اس کی بیوی کی روح اس کا استقبال کرنے کے لیے آ گئی تھی۔ چونکہ اسے اپنے شوہر سے ملنے کی بڑی تمنا تھی اس لیے جب اس کا شوہر آیا تو وہ اس سے ملنے کے لیے آ گئی تھی۔

(خبرنامہ جاپان سے)

محبّت کی ایک انوکھی داستان

شمیم اختر

(ہمارے ایک ساتھی نعیم آردی کا ایک افسانہ افکار کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔ محبّت کی یہ کہانی اسی افسانے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ محبت بھرے مکالمے اسی افسانے سے ماخوذ ہیں)۔

بھلے دلوں کی بات ہے خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میں محبت میں مبتلا ہو گئی۔ میری بلا سے، وہ بھی میری محبت میں مبتلا تھا یا نہیں۔ مجھے صرف اپنی محبت سے غرض تھی۔ میں اس سے کہتی "تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو، مگر مجھے اپنی رفاقت اور دوستی سے محروم نہ کرو۔ اس کے بغیر میں مرجاؤں گی، میں نے اپنے دل کے دروازے دوسرے مردوں کے لئے بند کر دیئے ہیں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں کاش تم میرے اندر جھانک سکتے۔ وہاں تمہارے سوا کوئی نہیں۔ تم میری زندگی کی کتاب کے پہلے اور آخری ورق ہو۔"

وہ کہتا، "تم شاعری کا اچھوتا خیال، فلسفے کا ایک اہم نکتہ اور زندگی کو اس کے اعلیٰ منصب تک پہنچانے والی ایک بے قرار روح ہو۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے محبت اور صرف محبت کی ضرورت ہے۔ اگر میں نے کبھی شادی کا ارادہ کیا تو تم کو ترجیح دوں گا لیکن اس کمزور اور ناقابل یقین وعدے پر تم اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کا خواب ہرگز نہ دیکھنا میں اندر باہر سے ایک ہوں، جو محسوس کرتا ہوں تمہارے منہ پر کہہ دیتا ہوں۔ میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ اپنے آپ کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔"

میں کہتی، "تم بھول جاؤ کہ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی اور آئے گا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے میں تمہاری دوستی اور رفاقت کی طلبگار ہوں۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں نے اس راستے پر اکیلے سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

وہ کہتا، "تم اپنے وعدوں کو توڑ دو۔ اس سے آگے بڑھو گی تو ٹوٹ پھوٹ جاؤ گی۔ تم وہ عورت نہیں ہو جو آئیڈیل آدرش گیت، شاعری، نرم ونازک پھولوں اور خوشبوؤں سے پیار کرنے کے لئے پیدا کی جاتی ہے۔"

میں کہتی، "میں نے تمہیں چن لیا ہے۔ مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔"

وہ کم بخت شاعر تھا اسی لئے اتنی لچھے دار باتیں کرتا تھا میرا جی چاہتا تھا کہ کاش میں کہانی نویس ہوتی۔ اس کی باتیں اپنی کہانی میں سموتی لیکن ایسی باتیں سن کر بھی تو جمالیاتی ذوق کی تسکین ہو سکتی ہے۔ میں پہروں اس کی باتوں کے جادو میں کھوئی رہتی۔ اس سے ملنے کی چاہ میں جیسے تیسے وقت گزارتی جوں ہی وہ مجھے اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیتا اسکی آواز کی گھنٹیاں میرے کانوں میں بجنے لگتیں۔ میرا وقت خوش اسلوبی سے گزر رہا تھا۔ گرمی ہو یا سردی۔ میرے لئے موسم سہانا ہی رہتا۔ دیوار پر سے اکھڑا ہوا پلستر میری نظروں کے سامنے مصوری کے رنگا رنگ نمونے پیش کرتا تھا۔

میں اپنی محبت میں مستغرق رواں دواں تھی کہ میری ماں نے مجھے آواز دے کر کہا، "کنگھی چوٹی کر کے بن ٹھن کر باہر کی طرف لپکتی رہتی ہو۔ ذرا دیر کے لئے گھر میں بھی رک جاؤ۔ آج وہ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔"

ماں کی بات سن کر میں سناٹے میں آگئی۔ سرپٹ دوڑتی ہوئی اپنے شاعر کے پاس پہنچی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولی، "کوئی مجھے پسند کرنے آرہے ہیں مگر مجھے تم سے محبت ہے۔ جلدی سے کچھ کرو۔"

وہ بولا، "دراصل میں تم سے کبھی شادی نہیں کر سکتا میں نے کبھی تم سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔"

میں نے کہا، "تم نے مجھے محبت کا جھوٹا خواب دکھایا۔"

وہ بولا، "محبّت کا خواب دکھایا تھا تمہاری ضرورتیں پوری کرنے کا ٹھیکہ نہیں لیا تھا۔ محبّت کا خواب دیکھنا اور

دکھانا جرم ہے تو بے شک میں مجرم ہوں۔ مگر اس جرم میں تم بھی برابر کی شریک ہو۔ تم نے مجھے یقین دلایا کہ تم مجھ سے بے اندازہ محبت کرتی ہو، بے غرض، بے لوث، بے فائدہ، لیکن تم نے محبت اور رفاقت کو شادی سے مشروط کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تم سے محبت ہے۔ اسی لئے تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے اپنا لو۔ رفاقت کی یہی ایک صورت ہے۔ آدھ گھنٹے کی اس ملاقات کو رفاقت کا نام دو گے تو لوگ مذاق اڑائیں گے۔ ہماری ضرورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔"

وہ بولا، "میں بہت ناتواں آدمی ہوں لیکن میرے دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے لئے کھلے ہیں۔"

میں نے کہا، "گویا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس مکالمے بازی کے بعد میں گھر آکر زار زار روئی ہوں گی ہرگز نہیں۔ ایک شریف آدمی میری تمام ضرورتیں پوری کرنے اور مجھے اپنی زوجیت میں قبول کرنے کے لئے بخوشی آمادہ تھا۔ اس نیک گھڑی کو میں رو دھو کر کیوں برباد کرتی۔ وقت کی بربادی تو وہ تھی جو میں نے آخری ملاقات میں اس کے ساتھ باتوں میں گنوائی تھی لیکن اسے بھی وقت کی بربادی نہ جانیئے۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ اپنے شوہر کا انتخاب کرنے کے بعد میرے ضمیر پر کسی کی محبت کا بوجھ نہیں ہے مجھے آج یہ خیال پریشان نہیں کر سکتا کہ بے چارے شاعر کو میں نے دھوکہ دیا اس کے ساتھ محبت کے گیت گائے اور شادی کہیں اور چالی۔

چلتے وقت میں نے اس کو جی بھر کر تسلی دی تھی کہ میری شادی ہونے والی ہے۔ اس سے تم پریشان مت ہونا تمہیں صرف محبت کی ضرورت ہے۔ وہ تاحیات میرے دل میں موجود رہے گی اٹھتے بیٹھتے ابھرتے جاگتے۔ میرے دل اور دماغ میں تمہاری محبت ہی محبت ہوگی۔ جہاں تک رفاقت کا تعلق ہے ایک شادی شدہ عورت کے لئے ممکن نہیں ہے کہ گھر بار چھوڑ کر پارکوں اور ریستورانوں میں دھکے کھاتی پھرے۔ آپ خود سوچئے اپنے بچوں کو چھوڑ کر میں ملاقاتوں کے لئے کیسے گھر سے باہر جا سکتی ہوں۔ خدا اس کے باپ کو سلامت رکھے۔ اس کے لئے کھانا پکانا ہوتا ہے کام سے تھکا ہارا آتا ہے۔ اسے بھوک لگی ہوتی ہے آتے ہی پوچھتا ہے "آج کیا پکایا ہے"۔ میں پرانی رفاقتیں نبھانے بیٹھ جاؤں تو بے چارے کو کھانا کون نکال کر دے۔

خدا اس شاعر کو خوش رکھے۔ زیادہ جھوٹ نہیں بولتا تھا مجھ سے کہتا تھا کہ میرے کندھوں پر سوار ہونے کا خواب مت دیکھنا۔ جب تک میرے لئے کوئی رشتہ نہیں آیا، میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اس کی باتوں کے مزے لوٹتی رہی۔ لیکن زندگی باتوں کے سہارے نہیں کٹ سکتی۔ آدمی کو کسی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساری عمر جوانی کا زور نہیں رہتا۔ عمر ڈھلتی ہے ادھر طرح طرح کی بیماریاں ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کر دیتی ہیں۔ اس وقت ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیوی سر باندھے لیٹی ہے۔ میاں پاؤں دبا رہا ہے۔ میاں پسلیاں پکڑے کھانس رہا ہے بیوی بیٹھ کو سہارا دیئے دوا کا گلاس منہ سے لگائے بیٹھی ہے۔ بھلا اس سے اچھی رفاقت کی تصویر اور کیا ہوگی۔ بیوقوف کہیں کا سمجھتا ہے کہ آدھ گھنٹے کے لئے کسی پارک کے بنچ پر بیٹھ کر یا کسی ریستوران میں چائے کی پیالی پی کر زندگی کٹ جاتی ہے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اٹھانے کا نام رفاقت ہے۔ آخر بچوں کو باپ کے نام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ شادی نہ کر کے عقلمندی کی ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ ہماری محبت میں کوئی جھوٹ شامل نہیں تھا۔ اس نے کہہ دیا کہ میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ میں نے کہا کہ بڑی اچھی بات ہے۔ مجھے تو تمہاری محبت کی بھی پرواہ نہیں ہے میں نے اس راستے پر اکیلے سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے میرا سفر جاری ہے۔ قدرت کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے محبت کرنے والا ایک شوہر اور تین ہنستے کھیلتے بچے دیئے ہیں۔ لیکن ان میں گڈو ذرا شریر ہے۔ بہت اودھم مچاتا ہے۔ اپنی چھوٹی بہن سے بہت ضد کرتا ہے۔ اس کے کھلونے توڑ ڈالتا ہے اس کے بال نوچ کر بھاگ جاتا ہے۔ منی بیٹی منہ پھاڑ کے روتی رہتی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ گڈو مجھے بہت پیارا ہے کیونکہ وہ اپنے ابو کا لاڈلا ہے۔ میں اس سے کہتی رہتی ہوں [illegible]

یہ ہماری کلاس فیلو ہے آج ہی ملی ہے اور دعوت دینے لگی ہے گھر آنے کی۔ ڈاکٹر یاسمین نے اپنی خفت مٹانے کو صرف کلاس فیلو ہی پر اکتفا کیا۔ اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے فریحہ نے سب سن لیا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ اب ڈاکٹر یاسمین اس خاتون سے اس کا تعارف کرائے گی کہ دیکھو یہ میری بڑی پرانی دوست ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے سامنے اس کا رویہ کتنا بدلا ہوا تھا۔ شاید میری دوستی سے اس کی شان میں کچھ کمی ہو جاتی۔ البتہ اس نے اتنا ضرور کیا تھا کہ فیس نہیں لی تھی۔

"تو بھئی رانو! اپنے بیٹے کو سنبھالو اور یہ اس کی دوائی ہے دھیان سے وقت پر دینا۔"

"بڑی مہربانی۔ بہت اچھا بی بی۔" رانو اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر چلی گئی تو وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ عماد سو رہے تھے اس نے بڑے پیار سے سوتے ہوئے عماد کو دیکھا اور دل ہی دل میں اپنی خدا ترسی پر فخر کرتے ہوئے ان کا ہاتھ کھینچا۔ پھر اس نے ڈرائنگ ٹیبل کا پردہ ہٹا کر خود کو دیکھا اور تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس لباس میں وہ واقعی بہت مظلوم اور غریب دکھائی دے رہی تھی۔ واقعی فریحہ عماد، ذات یا شخصیت سے عزت نہیں ہوتی دولت اور قیمتی لباس سے سب کچھ ملتا ہے۔ اس کا تو آج صحیح اندازہ ہوا ہے۔

فریحہ، یاسمین، نیلم، حنا، طلعت، دیبا۔ ایک دوسرے کی کلاس فیلوز اور بہترین ساتھی تھیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ان لڑکیوں کو کوئی فکر و غم نہ تھا۔ بس ہر وقت بہترین مستقبل کا سوچتی رہتی تھیں۔ ایف۔ ایس۔ سی کے امتحان ہونے والے تھے۔ سوائے فریحہ اور یاسمین کے ان کے گروپ کی بقیہ لڑکیاں منگنی ہو چکی تھیں اور بس امتحان کا انتظار تھا۔ اس روز یہ گروپ کالج کے لان میں ہنسی مذاق کر رہا تھا آج ان کا کالج میں آخری دن تھا۔ ۱۵ دن بعد امتحان تھے۔ پھر کہاں یہ سب کچھ۔ یاسمین ڈاکٹر بننا چاہتی تھی جب کہ فریحہ کا ارادہ ایم۔ ایس سی کرنے کا تھا۔

"دوستو! سنا ہے لوگ بڑے بن کر بدل جاتے ہیں کیا یہ سچ ہے۔" نیلم نے نیا موضوع چھیڑا۔

"جی ہاں۔ ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ لوگ پیسہ اور منصب دیکھ کر اپنے عزیزوں کو بھول جاتے ہیں۔" طلعت نے اس کی تائید کی۔

"تو پھر اپنی یاسمین بھی ڈاکٹر بن کر ہم سب کو بھول جائے گی سمجھے۔" نیلم نے یاسمین کو چھیڑا تو وہ ہنس کر بولی:

"تو۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ سچ میں چاہے کتنی بڑی ڈاکٹر بن جاؤں مگر تم لوگوں سے ملتی رہوں گی۔"

"ملتی رہوں گی کیسے؟ طلعت بیاہ کر انڈیا چلی جائے گی۔ دیبا، سندھ کی طرف۔ نیلم اور حنا بھی دوسرے شہر چلی جائیں گی۔ رہ گئی میں۔ اب یہ تو کل کلاں کو اپنا کوئی بال بچہ یا ہم خود تمہارے مریض بن کر آئیں تو یہ مت کہہ دینا کون ہے تو؟ بابا میں نہ جانوں تجھے۔"

فریحہ نے عجیب بے تکے مزاحیہ انداز میں کہا اور سب ہنسنے لگیں۔ اور یاسمین جھینپ سی گئی۔

"توبہ ہے فریحہ کیسی باتیں سوچتی ہو۔ تم اپنے کسی بچوں سمیت بھی آ جاؤ تو مفت دوائی میرا وعدہ ہے۔"

وعدہ۔ پکا وعدہ۔ فریحہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ تو بھئی سب کے سامنے وعدہ ہوا ہے۔ یہ ہمیں بھولے گی نہیں۔

"جناب جب تم قیمتی لباس پہنے اپنے ننھے منوں سمیت شیورلیٹ سے اترو گی تو ڈاکٹرنی جی خود ہی پہچان لیں گی۔ تم چاہے نہ پہچاننا۔" اب حنا نے یاسمین کو ستایا۔ وہ خفا ہونے لگی۔

"تم لوگ کیسی دوست ہو مجھے اس طرح کی سمجھ رہی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سب خاموش ہو گئیں۔

ایم۔ ایس سی کے بعد فریحہ نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ ۱۳ سال بیت گئے تھے۔ تمام دوستوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ اور ان سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ یاسمین نے لاہور میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا اور فریحہ خود بھی لاہور یونیورسٹی لاہور ہی میں پڑھتی رہی۔ لیکن ان دونوں کو کبھی ایک دوسرے کا حال احوال نہ مل سکا نہ ہی کسی نے ضرورت محسوس کی۔ اب دو سال ہوئے اس کی شادی ایک فرم کے مالک عماد کشمیری سے ہو چکی تھی۔ اولاد فی الحال کوئی نہ تھی۔ چند روز قبل اخبار میں اس نے یاسمین کی تصویر دیکھی، جو امریکہ سے بچوں کی ماہر ڈاکٹر بن کر لوٹی تھی۔ اور اس نے اپنا ایک شاندار کلینک بھی اسلام آباد میں کھولا تھا۔ فریحہ، یاسمین کو فوراً پہچان

بیوی

خان عزمی ردولوی

[illegible] ہے کہتا ہوں میں دل و جان ہے بیوی
[illegible] کہیں موت کا سامان ہے بیوی
شوہر کو عطا کرتی ہے یہ مہر و محبت
اک مملکتِ پیار کی سلطان ہے بیوی
سمجھو نہ اسے پاؤں کی جوتی کہ جہاں میں
انساں کی توقیر کا عنوان ہے بیوی
بیوی پہ کبھی طنز کے پتھر نہ چلاؤ
نازک ہے بہت شیشہ کا ایوان ہے بیوی
بیزار اگر ہو تو یہ ہے ریت کی دیوار
پر عزم ہو تو لوہے کی چٹان ہے بیوی
سچ ہے نہیں اولاد سے بڑھ کر کوئی دولت
اس دولتِ دنیا کی مگر کان ہے بیوی
شوہر کے ہر اک فعل کی رکھتی ہے یہ خبریں
لگتا ہے کہ ہر بات سے انجان ہے بیوی
سب کہتے ہیں بیوی کا نگہبان ہے شوہر
میں کہتا ہوں شوہر کی نگہبان ہے بیوی
جاسوسی جو بچوں سے کراتی ہے میاں کی
ذی عقل ہے ذی ہوش ہے ذیشان ہے بیوی
دیکھا ہے کبھی آپ نے؟ بے جرم کا مجرم
بس! بس!! وہی مجرم ہوں میں کہتا ہے بیوی
گھر میں نظر آتی ہے یہ چنگیز کی بیٹی
سکھیوں پہ سہیلی پہ مہربان ہے بیوی
وہ ڈانٹ کے کہتا ہیں اگر آم کو املی
میں چین کو کہتا ہوں کہ جاپان ہے بیوی
کہتی ہیں وہ جھلا کے ذرا شکل تو دیکھو
کہتا ہوں اگر ڈرتے ہوئے پان ہے بیوی
اس طرح گھسیٹی ہے رقم خرچ کی مد میں
میں مفلس و نادار ہوں ذی شان ہے بیوی
میں نام کا بس صاحب دیوان بنا ہوں
سچ پوچھئے تو صاحب دیوان ہے بیوی
دل میرا لرزتا ہے کہ اب دیکھئے کیا ہو
انجانے میں اس نظم کا عنوان ہے بیوی
عزمی تو پچھتر کے لپیٹے میں ہے لیکن
کم عمر ہے معصوم ہے نادان ہے بیوی

حریم

حرم میں محرم مریم اعلیٰ — زبان اردو کا یہ رسالا
یہی وہ مینار روشنی ہے — کہ جس سے ہر سمت ہے اجالا
یہ علم و فن اور ادب کا چشمہ — ہے اپنے ماحول میں نرالا
کلام معیار پر ہے قائم — نگاہ اس کی بلند و بالا
حدیث و قرآں کی موتیوں سے — یہ منسلک خوشنما ہے مالا
ادیب و شاعر کی کاوشوں سے — بہت ہے یہ تشنہ لب کو پیالا
حریم کی شمع کے پتنگے — قمر کے اطراف جیسے ہالا
فسانہ تسطیروں ہے اس کا — چمن میں جیسے کھلا ہو لالا
حریم کی جانتا ہے حرمت — حریم کو روز پڑھنے والا
پسند ہر اک کو اس کا مضموں — قبول خاطر ہے ہر مقالا
دعا کرن کی ہے اس کے حق میں — اُفق کو چھوتا رہے رسالا

چند اور قابل مطالعہ ناول

ناول	مصنف	قیمت
شگفتہ	نسیم انہولوی	۱۲/-
مہتاب	" "	۱۸/-
ننھا	" "	۱۴/-
انور	فیاض علی	۵۵/-
شبنم	سراج انور	۸/-
ڈولی	انیس مرزا	۸/-
گرہن	اسما اعجاز	۳۵/-
فانوس	بدرا انجم خاتون	۳۵/-
سوز و ساز	نجم اعزاز	۱۵/-
سپنوں کی راکھ	عادل رشید	۲۲/۵۰

• فرحت عزیز (جعفر رادتی) میری بھانجی فوزیہ اقبال (بنت محمد اقبال احمد بانا دار۔ ہاسن) کی شادی برخوردار امین پاشا عظیم صاحب کے ساتھ ۲۶ر فروری ۲۰۰۳ء بروز اتوار بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ دولہا دولہن ہمیشہ شاد وخرم رہیں۔

• عذرا انجم (ملکاپور۔ بلڈانہ) میرے بھائی مسعود علی بی۔ایچ ڈی۔ کی شادی فرحت جہاں بیگم کے ساتھ ۲۶ر فروری ۲۰۰۳ء بروز اتوار بوقت صبح ۸ بجے بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ مسعود بھائی اور فرحت بھابی کی ازدواجی زندگی ہمیشہ شاد وخرم گذرے

انتقال پرملال کی خبریں

حریم کی قدیم خریدار مس شمیم آرا صاحبہ لکچرار گورنمنٹ گرلس انٹر کالج رام پور کے بھائی سید سعید اختر جعفری سائنس ٹیچر اسلامیہ کالج لکھنؤ ۲۳ر فروری ۲۰۰۳ء کو قلبی دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ مرحوم بڑے ہردلعزیز ٹیچر تھے۔ ان کے انتقال پر کالج میں سوگ منایا گیا۔ مرحوم نے اپنی نشانی صرف اپنی جوان بیوہ چھوڑی ہے۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے (نسیم انہونوی)

• صفیہ لطیف (میسور) افسوس صد افسوس میرے بڑے بھائی سیٹھ یوسف عبدالرحیم سیٹھ (مدراس) طویل علالت کے بعد ۲ر فروری ۲۰۰۳ء کو بعد مغرب انتقال فرما گئے۔ مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور ہم سب پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(صفیہ بہن آپ کے بھائی صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر مجھے بھی افسوس ہوا۔ آپ کا شریک غم۔ نسیم انہونوی)

• قرۃ العین (سندیال) افسوس ہماری پھوپھی جان ۱۲ر فروری ۲۰۰۳ء کو آپریشن کے ناکام ہونے کے باعث رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ کی عمر صرف ۵۴ سال کی تھی۔ بڑی عبادت گذار، خلیق اور ملنسار تھیں دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

• عزرم نادر (کلب۔ ایوت محل) میرے استاد محمود میاں صاحب ۱۳ر مارچ ۲۰۰۳ء بروز جمعہ بوقت عصر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کی عمر بوقت انتقال ۸۰ سال کی تھی۔ درس وتدریس میں ماہر اور خوش اخلاق تھے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان خصوصاً ان کی بیوہ کو صبر جمیل عطا کرے۔

• **تصحیح**۔ مارچ ۲۰۰۳ء کے حریم میں پیغامات نشاط کے تحت جو خبر افضال احمد صاحب کے فرزند شاہد احمد سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں چھپی تھی اس میں کتابت کی غلطی سے شبانہ اختر سلمہا کا نام شباب چھپ گیا ہے۔ درست کرلیں۔ نسیم انہونوی

ناشر نسیم انہونوی نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

کہتے ہیں، دنیا میں سب سے خوبصورت چیز انسان کا چہرہ ہے۔ میں کہتی ہوں کہ سب سے زیادہ اہم چیز محبت کا جذبہ ہے اگر محبت کا جذبہ دیدہ ہو تو انسان کا چہرہ انتہائی نجاست کا مظہر ہوتا ہے۔ (خدیجہ مستور)

محبت حسن کی جھلک مرد کی زندگی میں ایک باب ہے عورت کی زندگی کی مکمل تاریخ ہے۔ (مادام اسٹیل)

با برکت ذات کا سایہ دنیا پر ڈالا ہے۔ نور کی وہ چمکتی دمکتی شعاع جو ہر تاریک
دور میں آتی ہے اور ساری کائنات کو منور کر دیتی ہے۔ ہر کس کی طرح میں
اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہوں کہ اس نور نے میری زندگی ہی میں ظہور
کیا۔ میں بوڑھا ہوں، کمزور ہوں مگر میں اُس بستی میں، مقدس بستی میں ضرور
جاؤں گا تاکہ اس ذات اقدس کے دیدار کروں۔ ہاں میں نے سنا ہے وہ پاکیزہ
نور اس مرتبہ صحرائے عرب میں اترا ہے۔ میں عرب جاؤں گا اور اس روشنی سے
اپنے دل و دماغ کو روشن کروں گا۔ میں اس شخص کا ساتھ دوں گا جس نے
سارے زمانے کی بدی کو للکارا ہے۔ اعلانِ حق میں میں کمزوری نہیں دکھاؤں گا
آپ سب پڑھنے والے گواہ رہنا آج بھی اور یوم حساب بھی۔ میں بوڑھا ستم
ہیروان جی راستے کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے ممکن ہے دوران سفر میں ہی
ختم ہو جاؤں مگر میں کھل کر اس بابرکت، مقدس ذات کی طرف داری اور
ہم نوائی کا اعلان کرتا ہوں۔ ہاں وہی ذات جس کا نام دنیا میں محمدؐ اور
آسمانوں میں احمدؐ ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

غیر مطبوعہ

شہناز کنول

آیا ہوں جس نے مجھے بے قرار، بے چین اور مضطرب کر رکھا ہے۔ میرا سارا وجود شعلوں
میں گھرا ہوا ہے میں جل کر بھسم ہو چکا ہوں۔ میری خیالی نیکیوں کا خرمن خاکستر میں
بدل گیا ہے، میں دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی کھو بیٹھا ہوں۔ آج میرے پاس سوائے
شرم و ندامت اور انفعال کے کچھ نہیں بچا۔ یزداں کے حضور میں اپنی بد عملیوں
اور گناہوں کا ایک انبار لے کر پہنچوں گا۔ یوم حساب مجھے وہ سزا ملنی چاہیئے جو کسی
بدکار کو بھی نہ ملے۔ میں اپنی ذہنی اذیت، اپنا درد اور تڑپ آپ کو کیسے دکھاؤں
میں ایک ازلی بد نصیب انسان ہر کسی کے برے سے برے عمل کا مستحق ہوں۔
مجھے زمین میں زندہ گاڑنا بھی کم ہے، مجھے آگ میں جلا دینا بھی کم ہے۔ مجھے
دُرّے مارنا بھی کم ہے۔ میرے سینے میں لوہے کی جلتی سیخ ٹھونک دینا بھی کم ہے
مجھے وہ سزا دیجئے جس سے میں وہ اذیت پاؤں جو مجھ جیسے انسان کیلئے ضروری
ہے۔ جس کے لئے میں فلاح اور سلامتی لے کر گیا تھا اس نے ایک اشارے میں
مجھے ذلت اور بد نصیبی کے اندھے غار میں پھینک دیا۔ میں اپنی قسمت کا ماتم کرتا
ہوا واپس آ گیا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں رہا سوائے اس ذلیل وجود کے اور
آپ یقین کریں میں اسے خود سزا دوں گا۔ میں کسی کا نہیں خود اپنا مجرم ہوں اس
لئے سزا بھی میں ہی دوں گا مگر اپنی اس قدم قدم پر نم داستان کا آخری حصہ
آپ تک پہونچانے کے بعد، تاکہ ہر زمانے کے لوگ مجھ سے عبرت پکڑیں میرے
حالات سے سبق لیں۔ میری خاموشی ایک عذاب بن کر مجھے کس طرح گھیر چکی ہے
اس سے کچھ سیکھیں اور حق کو حق کہنے میں اتنی دیر نہ لگائیں کہ اپنا سب کچھ لٹ جائے
بدی کے خلاف اپنی زبان بند نہ رکھیں۔ ذہن، زبان اور عمل تینوں طریقوں سے اس
کے خلاف جنگ کریں ورنہ زمانہ آپ سے ایسا انتقام لے گا کہ انسانیت کے رونگٹے
کھڑے ہو جائیں گے۔

آپ اس بات کا اعتراف ضرور کریں گے کہ میں نے اپنے ساتھ پیش آنے والا کوئی واقعہ بھی آپ سے ابھی تک نہیں چھپایا اور اب بھی میں حقیقت اور سچائی کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ جو زہر میں پی چکا ہوں یزداں نہ کرے کہ اس کا اثر کسی نیک انسان پر پڑے۔ مگر میں آپ کے سامنے سب کچھ اگل دوں گا خواہ آپ مجھے کتنا ہی کم ظرف اور کمینہ، ذلیل اور بدفطرت کیوں نہ سمجھیں۔ جب میں یزداں کے حضور ہی شرمندہ ہو چکا تو اب کسی سے کیا پردہ۔ میری فطرت کی کمزوری نے میرے ارادوں کی ناپختگی نے مجھے یہ دن دکھایا۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ میں نے اپنے عظیم استاد سے کیا ہوا عہد توڑا نہیں لیکن مجھے اقرار ہے کہ میں اس کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکا۔ اور اسی ناسمجھی میں ایسی ٹھوکر کھائی ہے کہ منہ کے بل گرا ہوں۔

اب کس کے لئے اٹھوں، کسے اپنی صورت دکھاؤں میری زندگی میں رہ ہی کیا گیا ہے میں لکھ چکا ہوں کہ میں عبادت گھر جا کر بریکا کو فلاح کی راہ دکھانا چاہتا تھا۔ روزانہ اپنی ساری ہمت جمع کرتا اور عین وقت پر حوصلہ ساتھ چھوڑ دیتا اور میں ارادہ ملتوی کر دیتا۔ پانچ سات دن تک اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ اور آخر کار پرسوں تیسرے پہر کے بعد زوال آفتاب سے کچھ قبل میں عبادت گھر جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر سے نکل کر کافی دیر بے مقصد گھومتا رہا جب ذرا اندھیرا ہو گیا تو میں عبادت گھر میں داخل ہوا۔ سب لوگ شام کی عبادت میں مصروف تھے۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ میں نے اس بات پر شکر ادا کیا اور سیدھا اپنے حجرے میں پہنچ گیا۔ وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میری بکھری ہوئی کتابوں تک کو کسی نے نہیں چھوا تھا۔ میں نے شمع روشن کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اندھیرے ہی میں بیٹھا پچھلے واقعات پر غور کرتا رہا۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا ہوگا کہ میں نے دروازے پر آہٹ محسوس کی۔ میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا دوسرا کوئی

کیا جائے، سارے معاشرے میں سادگی اور خوف یزداں کی فضا پیدا کی جائے حقوق و فرائض کا احساس دلوایا جائے۔ مگر یہ کام کرے کون؟ یہ کام ہوتا ہے مذہبی عالموں کا لیکن وہ خود سادگی، صبر و قناعت کا درس بھول چکے ہیں۔ ان کے گھر عشرت کدے ہیں اور انہیں کی ایما پر عبادت گاہوں میں دنیاوی رنگ آ گیا ہے۔ نام و نمود کے لئے سجاوٹ آ گئی ہے۔ عبادت گاہوں پر پرشوکت محلوں کا گمان ہوتا ہے مگر نفس عبادت کسی میں نہیں ہے۔ روحانیت اور ایمان کا فقدان ہے دنیاوی مفاد ہر لحظہ سامنے ہے۔ ایسا قانون اور ضابطۂ حیات جو ایک عام انسان کو ذہنی سکون نہ دے سکے، امن و سلامتی نہ دے سکے، کمزوروں کی حفاظت نہ کر سکے، وہ میری نظر میں باطل ہے۔

آج زرتشت کو اس دنیا سے رخصت ہوئے نو دس صدیاں بیت چکی ہیں۔ تاریخ اتنی یکسانیت سے خود کو دہراتی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ہر زمانہ کے لوگ اپنے حالات سے اسی طرح نپٹتے ہیں جیسے ان سے پچھلے نپٹ چکے ہیں۔ ہر کل آج سے جڑی ہوئی ہے۔ انسان جب دوسروں کے حالات پڑھتا دیکھتا یا سنتا ہے تو وہ مطالعہ یا مشاہدہ کہلاتا ہے لیکن جب اسی قسم کے حالات سے خود گزرتا ہے تو وہ تجربہ بن جاتا ہے اور تجربات ہی انسان کو کچھ نئی باتوں کی آگاہی دیتے ہیں اور وہ ان کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے۔ بردکس یعنی داستان گو نے اپنی زندگی کے تجربات سے کچھ نہیں سیکھا۔ کوئی نصیحت نہ حاصل کی کوئی سبق نہ لیا۔ لیکن اسی قسم کے حالات میں مبتلا ہو کر میں خود اس نصیحت پر ضرور عمل کروں گا جو بردکس کے استاد نے اسے کی تھی۔

میں نے سنا ہے اس مرتبہ گناہوں کے اندھیروں کو چاک کرنے والی کرن آسمان سے زمین پر آئی ہے۔ نیکی اور خیر کا بول بالا کرنے والی ذات نے اپنی

خوشبو نے مجھے بتا دیا کہ یہ بریکاہے۔ وہ اندر آئی اور دروازہ بند کرنے کے بعد شمع روشن کرنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ شمع روشن کر کے وہ مڑی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "کس کی یاد سے بے چین ہو کر آیا ہے؟"

"میں خود نہیں جانتا، مگر یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ میں آیا ہوں" میں نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

گردن جھکا کر بولی۔ "میں نے اوپر دریچے سے تجھے آتے دیکھ لیا تھا۔ میں تو کئی دن سے منتظر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تو ضرور آئے گا۔ اگرچہ میرا اب تجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں تیری زندگی سے دور جا چکی ہوں۔ لیکن ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم ماں بیٹے میری زندگی کو تباہ کیوں کرنا چاہتے ہو؟ خوشی میرا مقدر نہیں ہے مگر تم لوگ....

"ٹھہر بریکا" میں نے حیرت زدہ ہو کر اسے ٹوکا۔ مجھے اپنی زیادتی کا اعتراف ہے مگر تو نے میری ماں کا نام کیوں لیا؟ یزداں کی قسم، میں نے جو کچھ کیا اس میں میری ماں کا ہاتھ نہیں ہے۔"

اس نے بہت غور سے میری طرف دیکھا اور بولی "تو نے یزداں کی قسم کھائی ہے کیا تو نئے دین میں شامل ہو گیا ہے؟"

میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ بجانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل میں چور ہے میں نے سنبھل کر کہا:

"میں نیکی کا طرفدار ہوں اور نیکی یزداں کی صفت ہے لیکن اگر تجھے اعتراض ہے تو میں دیوتاؤں کی قسم کھاتا ہوں، سپہر کی قسم کھاتا ہوں تو میری بات پر یقین کر لے۔"

اس نے افسردگی سے کہا: "میرے دیوتاؤں اور تیرے یزداں نے میرے لئے تو کبھی نہیں کیا۔ میں نے اپنی آرزوؤں کا لالہ زار ان سے نہیں، تجھ سے چاہا تھا مگر

شاہ گشتاسپ کے بیٹے اسفندیار نے اس دین کو اقصائے عالم میں پھیلایا ــــ ہندوستان سے چین، توران، ترکستان، روم اور بغداد غرض ہر جگہ یہ روشنی پھیلی اور ساری کائنات نور سے بھر گئی ــــ لیکن آج جب کہ پارس پر شاہ فیروز یہ کسریٰ کی حکومت ہے یہ شاہ کسریٰ کے محل قصر ابیض کی شان و شوکت آسمانوں سے باتیں کر رہی ہے عالی شان محلوں کی بہتات ہے عیش و عشرت کی فراوانی ہے۔ پارس کے سیاسی حالات اور مذہبی معاملات کم و بیش ویسے ہی ہیں جیسے کہ بروکس کے عہد میں تھے۔ بادشاہ عیش طلب اور آرام پسند، خود نما مغرور، وزراء ظالم اور مطلق العنان۔ گورنر متکبر۔ حاکم اور محکوم کے درمیان طویل خلیج ملک میں عیش و آرام کے سامان کی بھرمار مگر عوام ان سے محروم محنت و مشقت کے بعد بھی خالی ہاتھ۔ امراء مذہبی رہنماؤں کے پشت پناہ بن کر ہر کام جائز کروا چکے ہیں۔ غریبوں پر سیاسی اور مذہبی دو طرفہ چوٹ پڑ رہی ہے۔ بادشاہ، وزیر گورنر بدلتے ہیں مگر ظلم ختم نہیں ہوتا۔ حکمراں کے بدل جانے سے عوام کی قسمت کیوں نہیں بدلتی آخر؟ دراصل جب قوی کا ظلم کمزور پر شروع ہو جائے، جب مغرور شہسوار پیادوں کو راہ کی دھول سمجھنے لگیں، جب امارت میں گم ہو کر غربت کو باعث نفرت سمجھا جانے لگے، جب مذہبی رہنما اپنی ذات سے محبت کرنے لگیں، اور مصیبتوں کو تقدیر الٰہی کا نام دے دیں، جب زندگی کے حقائق اور صداقت کے مطالعہ کو تضیع اوقات کہا جانے لگے، جب ضمیر پر سیاہ غلاف چڑھا دیا جائے، جب اعلیٰ طبقہ صرف اپنے دل کی سنے اپنی مرضی کی کرے اور عوام کی مشکلات کو غلام فطرت کہہ کر جھوٹی تسلیاں دے۔ تب حکمراں کے بدل جانے سے عوام کی قسمت نہیں بدلتی کیونکہ خرابی کہیں اور ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ طبقہ اعلیٰ کے ذہنوں سے ظلم و جبر، عیش پسندی اور خود نمائی کے جذبات کو ختم

پروکسس! مرد کا دل دنیا کی سخت ترین شے ہے۔ میرے تجربے نے بتایا کہ مرد وقت اور حالات کا غلام ہوتا ہے۔"

"تو یہ بات سب کے لئے کیسے کہی جا سکتی ہے؟" میں نے بات کو غیر اہم بنانے کے لئے کہا۔

اس لئے کہ میں نے اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں ہر مرد کو ظالم ہی پایا۔ ان میں سب سے بڑا ظالم میرا باپ تھا جس نے میری ماں پر اس لئے ظلم کئے کہ وہ لڑکی پیدا کرنے کی گنہگار تھی۔ اس کے ظلم و ستم نے اس نازک سی عورت کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ میرے باپ کو مجھ سے بھی کبھی کوئی لگاؤ نہیں ہوا۔ اس کی سخت نظریں اور اس سے بھی زیادہ سخت عمل مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ وہ ایک وحشی جانور تھا۔ شراب اور عورت کا رسیا۔ جس طرح اس نے دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنے لئے جائز سمجھ رکھا تھا اسی انداز پر وہ مجھے دوسروں کے عیش کے لئے جائز سمجھتا تھا۔ ایک رات جب خطرہ سر پر آ گیا تو میں گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ میرے پاس نہ کوئی ٹھکانہ تھا نہ راستہ۔ میں قریبی عبادت گھر میں پہونچی تاکہ عبادت گذار نیک مغان سے پناہ کی درخواست کروں۔ مجھے تنہا اور بے سہارا دیکھ کر وہ رکھنے کو تیار ہو گیا۔ مگر اگلے ہی روز اس کی آنکھوں میں ہوس کے سائے دیکھ کر میں کانپ اٹھی۔ وہ مجھے رجھانے کی کوشش میں مصروف تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ میرے پیروں تلے زمین نہیں ریت ہے جو رفتہ رفتہ پھسل رہی ہے۔ اسی شام کو میں بازار جانے کے بہانے سے نکلی اور قریب کے قصبہ تک بھاگتی چلی گئی۔ وہاں کے قدیم عبادت گھر میں جا کر بوڑھے مغان کو دیکھتے ہی میں خوشی سے بے حال ہو گئی کیوں کہ وہ بوڑھا مغان وہی تھا جس نے میری ماں کا علاج بھی کیا تھا۔ وہ ایک دو بار میرے گھر بھی آ چکا تھا اس کا کہنا تھا کہ میری ماں پر بہت سے شیاطین قبضہ کئے ہوئے ہیں اسی لئے وہ

کرنا مگر پروکسس اپنے استاد کے دیئے اشاروں کو ہدایتوں کو سمجھ ہی نہ سکا وہ بھائی کو اپنے دل ہی میں برائی سمجھتا رہا اس نے نیکی کی راہ کو صرف اپنے لئے سمجھا اگر وہ تھوڑی سی جرأت اور بہادری سے کام لے کر سپیتما یا زرتشت کا کھل کر ساتھ دیتا اور علم و عمل سے کام لے کر ان کی دی ہوئی روشنی کو پھیلانے میں لگ جاتا تو وہ دنیا سے یوں ناکام و نامراد نہ جاتا اور اتنی تعلیم و تربیت کے بعد اس طرح گمنامی کی موت نہ مرتا۔ مصلحت اندیشی اور بزدلی انسان کے سارے جوہر چھین لیتی ہے۔ حقیقت سے نظریں چرانے والا ذلیل و خوار ہو جاتا ہے حق گوئی اور نیک اعمال و افعال کے فروغ کے سلسلہ میں انسانوں کو اتنا باہمت مزدہ ہونا چاہئے کہ بے دھڑک سچ بات کہہ دے اور ان صفات مبارکہ کی اشاعت کا کام کرے اور کھل کر بدی کی مخالفت کرے خواہ اس میں وہ آپ ہی گرفتار کیوں نہ ہو۔ ہمارے دین زرتشت میں آتا ہے کہ یزداں دور اندیش ہے وہ ماضی سے سبق لیتا ہے اور مستقبل کے لئے نیکی، تقوی، طہارت، پرہیزگاری، سادگی اور صداقت کا درس دیتا ہے جب کہ اہرمن عارضی اور وقتی مسرت اور عیش و عشرت کے حصول کے لئے برے افعال، بدکاری، بداخلاقی، چوری، بدنیتی، جھوٹ، نمود و نمائش، دغا، بے ایمانی، حقوق و فرائض سے کوتاہی، ظلم و ستم جیسی سفلی حرکات کی طرف راغب کرتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اہورامزدا یعنی خداوند نور نے انسان کو ارادے کی آزادی دی اور پختہ شعور دے دیا تاکہ وہ اپنے لئے اپنے مستقبل کے لئے اور یوم آخرت کے لئے ان میں سے کسی ایک کو چن لے کیوں کہ وہ دن آنے والا ہے جب ہمیں بال سے باریک پل پر سے گزرنا ہے جو ہمارے اعمال کے مطابق ہمارا فیصلہ کر دے گا۔ اس وقت کے آنے سے پہلے ہمیں یزداں کا طرفدار بن جانا چاہئے۔

بے سہارا عورتیں میری غلط سوچ اور انداز فکر پر قربان ہوگئیں۔ میں نے نیکی کو صرف اپنی ذات تک محدود کر لیا اس سے اور کوئی کام نہ لیا۔ ایسی نیکی کس کام کی۔ میں حق و صداقت کے اظہار میں پس و پیش کرتا رہا ان کو کھلے عام قبول کرنے سے ڈرا۔ میں بزدل تھا ڈرپوک تھا۔ مصلحت اندیش تھا۔ مگر اب جب کہ میرا سب کچھ لٹ چکا ہے میں اِس معاشرے کے اس شخص کو سب سے پہلے سزا دوں گا جو مذہبی قوانین جاننے کا دعوے دار ہے جو نیکی اور سچائی کا علمبردار ہے، جو عوام کا رہنما ہے جس کے ذمے ہماری عزتوں کی حفاظت کا کام ہے۔ جن کے اوپر عوام کے ذہنوں میں پاکیزہ خیالات پیدا کرنے کی ذمہ داری ہے ___ اور پھر میں اپنے آپ کو سزا دوں گا۔ کیوں کہ میری ماں نے شرم و ندامت کے مارے خودکشی کر لی ہے اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مکان جس کی بنیاد میں گناہوں پر رکھی گئی اپنے ہی بوجھ سے بہت جلد زمین میں دھنس جائے گا۔ دفن ہو جائے گا ویران ہو جائے گا صدیوں صدیوں تک اس کے در و دیوار ہمارا ماتم کریں گے۔ ہماری بے عملی پر آہیں بھریں گے ___ اس لیے میں اپنی یہ ساری تحریر اسی مکان میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تاکہ آنے والی نسل کا کوئی نیک بندہ اگر اسے پائے تو میری مصلحت اندیش زندگی سے عبرت حاصل کرے۔

میں رستم مہروان جی داستان گو بروکس بن لیکس کے اس انجام پر بہت افسردہ ہوں ___ اس لیے کہ اسے اپنے ہی زمانہ میں اپنی ہی زندگی میں اس روشنی کا سراغ مل گیا تھا جس کی پیشین گوئی اس کے استاد نے کر دی تھی اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی تھی کہ تو اس روشنی کا استقبال

بیمار رہتی ہے۔ بہرحال وہ ماں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ مجھے یک گونہ تسلی ہوئی۔ میں اندھیرا ہونے پر وہاں پہونچی تھی۔ پہلے تو وہ مجھے پہچان نہ سکا۔ بچپن اور جوانی کی صورت میں کچھ فرق تو ہو ہی جاتا ہے۔ جب میں نے اسے پرانی باتیں یاد دلائیں تو اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا:

" تو ایک ایسی ماں کی بیٹی ہے جو شیطانوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ میں اس کا علاج کرنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھ سے خائف رہنے لگی تھی کیوں کہ میں ان شیاطین کو سزا دیتا تھا۔ بہرحال میں تجھے خوش آمدید کہتا ہوں تو یہاں بے خوف و خطر رہ سکتی ہے۔"

مجھے اس کی باتوں سے بڑا اطمینان ہوا۔ دو ماہ میں اس کے پاس رہی۔ وہ ویسا ہی بہت مہربان تھا مگر اس کا سلوک میرے ساتھ بڑا عجیب تھا۔ کبھی وہ مشفق ہو جاتا۔ اور میرے آرام کا خیال رکھتا مجھے نصیحتیں کرتا اور کبھی انتہائی وحشی بن جاتا میری بوٹیاں نوچتا میرے تھپڑ مارتا میرے گالوں پر چٹکیاں بھرتا۔ مجھے زمین میں ڈال کر لاتوں سے مارتا اور گالیاں بکتا۔ وہ کہتا تھا کہ تو عورت بدی کا دوسرا نام مرد کو گمراہ کرنے والی۔ اسے گناہ کا راستہ دکھانے والی۔ میں تیرے اس روپ کو سزا دے رہا ہوں ایسا کیوں؟ دیوتا مجھ سے خوش ہوں۔ وہ بے حد اذیت پسند تھا۔ میں اسے دیکھ کر سہم جاتی تھی بچانے کب اس پر وحشی پن کا دورہ پڑ جائے۔ مگر میں اور جاتی بھی کہاں۔ ہر جگہ مجھے انسانوں کے روپ میں درندے مل رہے تھے۔ دنیا میں خبیث اور ناپاک مردوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ ایسی بے بسی کی حالت میں دو ماہ وہاں گزارے۔ انہیں دنوں روبلو کے باپ کا انتقال ہوا۔ اور میدیا سے اکتباتا جاتے ہوئے اس نے راستہ میں قدیم عبادت گھر میں ایک رات قیام کیا۔ اور مجھے دیکھتے ہی بڈھے مغاں سے مجھے مانگ لیا۔ صبح سویرے بڈھے نے مجھ سے کہا کہ اب میں روبلو کی ہوں اور اس کے ساتھ مجھے جانا ہے۔ بڈھے نے کہا کہ روبلو ایک خود پرست اور مغرور انسان

ہے۔ اگر میں اس کے کہنے کے مطابق نہ چلی تو روبو میرے لئے ایک ظالم انسان ثابت
ہوگا۔ میں نے سوچا کہ بوڑھا کون سا نرم خو ہے جو روبو سے ڈرا رہا ہے۔ ویسے بھی میں
اس بوڑھے سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ روبو مجھے ایک نجات دہندہ لگا اور میں
فوراً روبو کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ میری سعادت مندی اور خوشی چلنے کی
خبر نے روبو کو خوش کر دیا۔ سارے راستے وہ بہت مہربانی سے پیش آتا رہا یہاں
آکر اس کی مہربانی اور محبت تو برقرار رہی مگر وہ مجھے بدی اور گناہ کا دوسرا روپ
کہتا رہا۔ مجھے کم عقل اور میرے دل کو شیطان کا گھر کہتا تھا۔ میں سب کچھ خاموشی
سے سنتی تھی۔ میں نے کبھی اس کی باتوں کی تردید نہیں کی بلکہ رفتہ رفتہ میں اس کی
ہر بات کی تائید کرنے لگی۔ میں خود یہی محسوس کرنے لگی تھی کہ درحقیقت عورت
سامان عیش و عشرت کا ایک حصہ ہے عفت و عصمت صرف کتابی باتیں ہیں اور
ان پر یقین کرنا حماقت۔ برعکس! تو نہیں جانتا روبو کے اندر ایک بھیڑیا چھپا
ہوا ہے۔ میں نے اتنے دن اس کے ساتھ رہ کر بس اتنا معلوم کر لیا کہ وہ بھیڑیا
اس وقت تک سوتا رہے گا جب تک میں اس کی ہر بات کی تائید کرتی رہوں گی۔
میں کتنے ہی دن سے اس کو تھپک رہی تھی کہ اچانک تجھ سے سامنا ہوا اور تیری
باتیں سن کر میں حیران بھی ہوئی اور خوش بھی کہ تو نے مجھے بدی کا روپ ماننے سے
انکار کر کے ایک انوکھی پاکیزگی کا احساس دیا۔ مجھے تیری ذات اور تیرے خیالات
نے بہت ڈھارس دی۔ میں حالات کا مقابلہ کرنے کی ایک نئی قوت پا کر ایک
امید کے ساتھ تیرے پاس پہنچی۔ مجھے یقین تھا تیرا دل نیکی سے معمور ہے۔ تو
جرأت مند ہے۔ بہادر بھی ہوگا اور مجھے اپنا کر ایک باعزت پناہ گاہ دے گا
مگر آہ تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ تیری کم ہمتی نے مجھ سے سارا حوصلہ چھین لیا تیری
بزدلی نے میری ساری امیدوں کو خاک میں ملا دیا مجھ سے پاکیزگی کا سارا

سزا دوں گا۔ اور پھر خود اپنے آپ کو سزا دے کر میں اپنا بھی قصہ پاک کر دوں گا
میں نے یہ سب کچھ لکھنے سے پہلے دو خنجر زہر میں بجھا کر رکھ لئے ہیں۔ آج رات
کو میں ایک خنجر روبو کے سینے میں اتار دوں گا۔ اور ایک سے اپنا دل و جگر
چاک کر دوں گا۔ میں نے کہا تھا کہ میں اپنے آپ کو بھی ضرور سزا دوں گا۔ میں جو
ساری زندگی اپنی پاکیزگی کی فکر کرتا رہا اپنی عزت کے لئے مرتا رہا۔ اپنی تعلیم و
تربیت پر فخر کرتا رہا۔ یہ نہیں سوچا کہ مجھے سب سے پہلے اپنی ماں کی عفت و عصمت
کا محافظ بننا چاہئے جو اس دنیا میں میرے علاوہ کوئی سرپرست نہیں رکھتی
نیکی کی راہ پر چلنے کی تلقین اسے کرنی چاہئے تھی۔ تاکہ خیر اور سلامتی کی جس روشنی
کو میں ڈھونڈ رہا تھا وہ بھی میرا ساتھ دیتی۔ مجھے جرأت اور ہمت کا مظاہرہ
کرتے ہوئے بریکا کی عزت اور جوانی کا محافظ بننا چاہئے تھا۔ اپنے معاشرہ
کے اس گھناؤنے اور گندے عہد میں جب کہ ہر طرف اہرمن کا بول بالا ہے
بدی غالب آنے کی کوشش کر رہی ہے کھل کر یزداں کی طرفداری کا اعلان کرنا
چاہئے تھا۔ نیکی کے پیغام کو عام کرنا تھا۔ حق گوئی میں نڈر بن کر برائیوں کے
خلاف میدان میں آ جانا چاہئے تھا۔ مگر میں نے اپنے علم سے کچھ بھی کام نہ لیا
میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور سب کچھ سمجھنے کے باوجود اپنی زبان نہیں کھولی
میری ماں رفتہ رفتہ اس دلدل میں اترتی رہی اور میں تماشائی بنا رہا وہ
گناہوں کے اندھے کنوئیں میں گرتی چلی گئی اور میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے
نہ روکا۔ اور زبان سے نہ ٹوکا۔ بریکا خود میرے پاس پناہ کے لئے آئی
اور میں نے اپنی عزت کی دہائی دے کر اسے دھتکار دیا۔ اس نے میرے
مضبوط بازوؤں کا سہارا چاہا اور میں نے انھیں بازوؤں سے اسے شعلوں
میں دھکیل دیا۔ میں نے اپنے علم کو عمل سے کوسوں دور رکھا اور معصوم

اف وہ منظر۔ میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھیں پتھرا سی گئیں میرا دماغ بھبھک اٹھا۔ میری ماں ہزار قسم کی آرائش کئے ردبو کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ ردبو کی بانہوں میں اس کا جسم ڈول رہا تھا۔ میری نظریں جھک گئیں اور ماں ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بریکا سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ عبادت گھر سے اپنے مکان تک کا راستہ میں نے کیسے طے کیا مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ گھر آکر میں چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔ اور دیواروں سے سر ٹکراؤں۔ اپنے بال نوچوں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں۔ اور اس دنیا میں آگ لگا دوں مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ میں بدقسمت اور حرماں نصیب کچھ بھی نہیں کر سکا۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں کتنا مجبور اور بے بس تھا۔ میں اس وقت کسے الزام دیتا۔ اپنی ماں کو، ردبو کو یا اپنے باپ کو یا پھر اس گندے معاشرے کو۔ لیکن یقین کیجئے میں نے کسی کو الزام نہیں دیا۔ مجرم تو میں خود تھا اور اب میں زندگی کی اس دہلیز پر کھڑا ہوں جہاں ایک طرف ذلتوں کے گہرے غار ہیں، اور ایک طرف موت!

آج کی رات فیصلے کی رات ہے۔ مجھے اپنے اور ردبو کے بارے میں کسی ایک فیصلے پر پہنچ جانا ہے۔ وہ خبیث انسان جس نے سارے معاشرے کو ایک ناسور میں تبدیل کر دیا ہے اس نے پہلے میری زندگی کو لوٹا اور پھر میرے ناموس پر ڈاکہ ڈالا۔ اس نے مذہب کی روح کو زخمی کیا ہے۔ بزرگوں کی تعلیم کا مذاق اڑایا ہے اس نے میری ہر خوشی کو پامال کیا ہے۔ میری ہر کامیابی کو پیروں تلے روندا ہے وہ میرا ہی نہیں میری ماں کا مجرم ہے، بریکا کا مجرم ہے، اپنے باپ کا مجرم ہے دین کا مجرم ہے۔ میرے نزدیک وہ ایک دوزخی عفریت ہے۔ اسے ہر جرم کی

تصور چھین لیا۔ میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اب میرے ہر طرف ایک مہیب سناٹا اور ہولناک اندھیرا تھا۔"

"بریکا۔ میں آج اسی لئے تیرے پاس آیا ہوں۔" میں نے شرمندگی سے کہا تو وہ فوراً بولی:

"اب تیرے آنے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ گوہر تو لٹ چکا جس کو میں بچاتی آئی تھی۔"

میں نے شرم سے گردن جھکا لی۔ میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ میں اسے تسلی دیتا یا اپنی ہمدردی پیش کرتا۔ وہ خود ہی میرے قریب آئی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی:

"جس رات پہلی بار میں تیرے پاس آئی تھی اس کا حال ردبو کو معلوم ہو گیا تھا اور پھر اس کے اندر کا درندہ جاگ اٹھا، اس کی خباثت بیدار ہو گئی اور اس نے مجھے وہ سزا دی کہ میری روح تک چیخ اٹھی۔ مگر تجھے حیرت ہو گی کہ جب اس عیاشی کے بعد میں نے تجھ سے بیزاری ظاہر کر کے ردبو سے یہ خواہش کی کہ وہ مذہبی طور پر مجھے اپنا لے تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔ اور تنہائی میں دیوتاؤں کے روبرو قول و قرار دہرا کر ایک دوسرے کو اپنا لیا۔ بس اب میرے پاس جینے کا ایک ہی بہانہ تھا کہ میں ردبو کی ہوں۔ وہ کتنا بھی برا سہی مگر مجھے اپنا چکا ہے۔"

"بریکا۔ تیری زندگی کی اس کہانی میں اگرچہ آنسو زیادہ ہیں مگر اس نشیب و فراز میں میری ماں کا کوئی کام نہیں ہے نہ تو نے کسی جگہ اس کا نام ہی لیا پھر تجھے اس سے شکوہ کیوں ہوا؟"

"برعکس! تیری ماں تاغذا نے ردبو کو مجھ سے چھین لیا ہے۔..."

میرا داہنا ہاتھ گھوما اور ایک زناٹے سے تھپڑ بریکا کے گال پر پڑا۔ اس کا منہ

بھر گیا۔ شدتِ تکلیف سے اس نے گال کو ہاتھ سے دبا لیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اور بائیں باچھ سے خون کی ایک مہین سی لکیر ٹھوڑی پر رینگ آئی ــــ میں اس کے منہ سے خون نکلتا دیکھ کر گھبرا گیا۔ مگر وہ چپ کھڑی رہی درد اور جذبات دونوں کی شدت سے بے حال ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں دو قطرے اس کی آنکھوں سے پھسل پڑے۔

میں نے آہستہ سے کہا: "تو نے کس بنیاد پر میری ماں کو اتنا بڑا الزام دیا ہے؟" اس نے آنکھیں کھولیں۔ ان میں ویرانیوں کا ایک جہاں سمایا ہوا تھا۔ میں لرز کر رہ گیا۔ اس نے دروازے کی طرف مڑ کر کہا: "میرے ساتھ آ۔"

میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔ رات کا اندھیرا مکمل طور پر پھیل چکا تھا۔ ہم دونوں عبادت گھر کی نچلی منزل میں آئے اور پہرے والوں اور غلام گردشوں سے گزرتے ہوئے اسی ہال کے پچھلے دروازے پر آ کر وہ رک گئی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا مگر اگلے لمحے مجھے روبو کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا:

"میں نے تو پہلے دن محسوس کر لیا تھا کہ بروکس کے سر پر سپتا کا جادو سوار ہے وہ شروع ہی سے میرا مخالف ہے اور اب وہ میرا ہی نہیں، تیرا بھی مخالف ہے۔"

دوسری آواز سن کر میں گنگ رہ گیا۔ وہ میری ماں ہی تھی جو کہہ رہی تھی: "روبو! میرے بیٹے پر صرف بریکا سوار ہے اگر تو اسے بریکا بخش دے تو یقین کر وہ تیری مخالفت چھوڑ دے گا۔ احساسِ محرومی نے اسے نیم پاگل کر رکھا ہے۔"

"نہیں! تو ماں ہو کر بھی اسے نہیں سمجھ سکی۔ اسے بریکا نے نہیں، میرے باپ کی تعلیم نے نیم پاگل کر رکھا ہے۔ وہ ساری دنیا میں نیکی پھیلانا چاہتا

ہے۔ نیکی جو صرف محرومیاں ہی دیتی ہے۔ تیرے بیٹے نے بھی دنیاوی محرومیوں سے سودا کر لیا ہے۔ اگر ہم اس کے ہم نوا بن جائیں تو نہ یہ پیار رہے نہ یہ پُرمسرت لمحات۔ نہ تیری میری یہ قربت نہ عیش و عشرت کے سامان۔ تو اس سال بھر میں میرے ساتھ رہ کر جس زندگی کی عادی ہو چکی ہے اس سے دست بردار ہونے کے لئے تیار ہے ــــ؟"

"تو کیسی باتیں کر رہا ہے روبو! میرا بیٹا اگر عیش و عشرت اور دنیاوی مسرتوں کا مخالف ہوتا تو کبھی تو مجھے ٹوکتا۔ نہیں۔ میں تیری بات کا یقین نہیں کروں گی۔" ماں کی آواز آئی۔

"مت کر۔ لیکن جو میں کہہ رہا ہوں وہی حقیقت ہے۔ تیرے بیٹے نے ناکامیوں کو پسند کیا ہے۔ ہم نے اس کا نام ناکاموں کی فہرست میں لکھ دیا ہے۔ اب وہ دیوتائی رین کے مقابلہ پر سپتا کے دین کا شیدائی ہے۔ وہ ہمارا باغی ہے اس لئے سزا کا حق دار ہے اور سزا اسے ملے گی۔"

"نہیں نہیں ــــ وہ سپتا کا شیدائی نہیں ہے ــــ" ماں نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔

"اسے بھول جا ــــ" روبو بولا۔ "اس کا انجام ہم سے متعلق ہو چکا ہے ــــ آ تو میرے قریب آ ــــ اور قریب آ ــــ اور قریب تیرا مدہوش کر دینے والا شباب ہمیں ہر کسی سے بے نیاز کر چکا ہے ــــ تیرا دلربا نہ بن ہم نے بریکا میں بھی نہیں پایا۔ ... تو ..."

میں نے بریکا کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی جسم کپکپا رہا تھا۔ خود میں ایک مہیب طوفان سے دوچار تھا غصہ سے میرا خون کھول رہا تھا میں نے بریکا کا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکے سے اندر داخل ہو گیا

سے چھوڑ دیا کچھ تو میری بیتابیٔ دل کا خیال کیا کرو۔ تم چاہتی ہو کہ بس تمہارے سامنے گھگھیایا ہی کروں۔ تین دن سے تم سے نہ ملا جا سکا بات نہیں کر سکا۔ مجبوراً یہ ننھا سا رقعہ ——— !"

بس تحریر اتنی ہی سی تھی۔ علوی صاحب بھونچکا سے ہو کر بیوی کو دیکھنے لگے اور پرچہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملا۔۔؟" انھوں نے پوچھا۔

بیگم نے بتایا۔ اور پھر کہا۔ "رقعہ اس کلموہی کو دیا نہیں ہو گا۔ پھینکنے کا موقعہ مل گیا ہو گا۔ آنکھیں اس کی دیدے سے سینک ہوں گی۔ اور کیا۔ ارے۔ میں معتصم کو اتنا بدمعاش اور اس کو اس قدر احسان فراموش نہیں سمجھتی تھی۔ اسے ماں باپ بن کر پالا۔ اسے اپنی اولاد کے برابر حق دیئے۔ کیا آج کل نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ جس کسی کو سکھ پہنچاؤ وہی کلیجے میں خنجر بھونک دیتا ہے۔ ارے۔ خدا غارت کرے۔ پتہ نہیں۔ یہ گندہ کھیل میرے گھر میں یہ دونوں ذلیل کب سے کھیل رہے ہیں۔ مجھے تو شبہ تک نہ گزرا۔ ورنہ میں ہی چار آنکھوں سے نگرانی کرتی۔ ہائے۔ اب کیا ہو گا۔ مار ڈالوں ایسی نابکار اولاد کو۔ گھر سے نکال باہر کروں اس موئے بے شرم حرامزادہ کو۔ صورت دیکھو تو جیسے دنیا کی کوئی بات معلوم نہ ہو۔ اور موت پڑے گُنا ایسے ہیں۔"

علوی صاحب دیر تک غوطے میں پڑے رہے۔ پھر بولے "بیگم۔ چیخ چلا کر بات مت خراب کرو۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ

[illegible]

"چچا میاں نے کیا کہا؟" نعمانی نے ان کی تقریر کے جواب میں پوچھا۔

"وہی روایتی بات، وہی روایتی غیظ و غضب، "نکل جاؤ میرے گھر سے ابھی اور اسی وقت!" معتصم نے کہا۔

"معتصم کیا تم سچ مچ اپنے ارادے میں اٹل ہو؟" نعمانی نے کہا۔

"سبحان اللہ۔ آپ کی معصومیت کے قربان!" معتصم نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "میں اپنے ارادے میں اٹل نہیں ہوں۔ ایک تماشہ کر رہا ہوں۔"

"اچھا تو اب میری سنو اور سنجیدگی سے سنو" نعمانی بولے۔

"سناؤ۔ روز کی نحوست۔ لاحول ولا قوۃ۔ موت بھی نہیں آ رہی۔"

"میاں یہ عورتوں کی طرح کوسنے سے کچھ حاصل نہیں۔ سمجھے" نعمانی بولے۔ "تمہاری راہ میں تو مزید ہمالیے کھڑے کئے جا رہے ہیں۔ تمہارا ساتھ دے کر میں تو اپنی ہونے والی سسرال کی نظروں میں گر گیا۔ تمہاری سنوں تو مصیبت، ان کی سنوں تو بھی مصیبت۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کہاں بھاگ جاؤں۔ ابا جان کو اگر بھنک مل گئی کہ تجھ سے چچا میاں یا چچی اماں ناراض ہیں تو وہ مجھے زندہ گاڑ دیں گے۔"

"کیوں کیا بات ہے۔ تم سے بھی کسی نے کچھ کہا ہے؟" بوکھلا کر معتصم نے پوچھا۔

"کہا نہیں ہے۔ حکم دیا ہے۔ فی الفور واجب التعمیل حکم" نعمانی

[illegible]

تاویل یا نصیحت سے ماننے والے نہیں۔ انہیں بغاوت پر آمادہ کرنا حماقت ہے۔ تم رومہ کو سمجھاؤ کہ ایک پُرسکون گھر کی خوشیاں برباد نہ کرے۔ میں تنہائی میں معتصم کو سمجھاؤں گا کہ وہ اپنے معیار کی بات کریں۔ اس طرح خاندان بھر میں رسوا ہونا اور سب کو انگشت نمائی کا موقعہ دینا اچھی بات نہیں!"

"اور اگر معتصم نے آپ کی بات نہ مانی۔؟"

"اگر نہ مانی۔ تب۔ پھر۔" علوی صاحب یکایک برہم ہو گئے۔ "سخت بننا ہمیں بھی آتا ہے۔ ہم سے وہ پیدا ہوا ہے۔ ہم اس سے پیدا نہیں ہوئے۔"

دیر تک دونوں میں شور ہوتے رہے کہ کیا کیا جائے جو یہ محبت کا ننھا سا پودا فساد کی جڑ بننے سے پہلے ہی اکھاڑ پھینکا جائے!

علوی صاحب جو انصاف کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ سراسر اپنے بیٹے کو قصوروار ٹھہرا رہے تھے لیکن بیگم علوی بالآخر عورت ہی کی فطرت پر گئی تھیں۔ ان کے نزدیک رومہ ہی خطاکار تھی۔ عورت جب تک مرد کو بڑھاوا نہ دے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کرتا۔ عورت کی صرف ایک دبی دبی سی مسکراہٹ صرف ایک نگاہ غلط انداز اس کے لئے اور مرد کے لئے بھی بہت بڑے فتنے پیدا کر دیتی ہے۔

رضا سہ پہر کو آئے۔ انہیں گھر میں پھیلے سناٹے کو محسوس کر کے بہت تعجب ہوا۔ انہوں نے بیگم علوی کو آواز دی۔ بوا جی نے کہا

علوی صاحب کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ "چلا جا ابھی اور اسی وقت چلا جا۔ دفع ہو۔ لے جا اپنی مکروہ شکل میری نظروں سے دُور۔ ناخلف، بے شرم، بے غیرت، حیا سے سر جھکانے کی بجائے مقابلہ پر آ رہا ہے۔ کمینے کہیں کے۔ نکل جا گھر سے!" وہ تو آپے سے باہر تھے معتصم نے دروازہ کھولا اور نکل آئے۔

نعمانی ان کے منتظر تھے۔ اور انتظار میں سگریٹ پی پی کر وقت کاٹ رہے تھے کہ دیکھئے کیا خبر لاتے ہیں معتصم کمرے میں آئے اور گم سم سے کرسی پر ٹک گئے۔ نعمانی چپ رہے۔

معلوم نہیں تھا کہ اس طرح بھی حالات بدلتے ہیں۔ معتصم نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "پہلے جن آنکھوں میں میرے لئے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا اب وہاں نفرت کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ اور اس بد نصیب پر سے تو غالباً لعن طعن کے سیلاب گزر رہے ہیں۔ نعمانی لوگ کتنے بڑے بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم اونچ نیچ کو مانتے مسلمان برادری میں سب ایک ہیں، ذات پات کے جھگڑے، مذہب کا خوف، انگشت نمائی کا ڈر، کنبہ میں ناک کٹ جانے کی وحشت، آدمی کتنی بہت سی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ موم کی زنجیریں ہیں جب ہم چاہیں پگھل سکتی ہیں۔ مگر وقت پڑنے پر ہم انہیں فولاد سے زیادہ مضبوط بنا دیتے ہیں۔ یہ سب جھوٹ، سب بیکار کی بکواس۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں۔ اس پر عمل نہیں کر سکتے!"

غصہ بھی آرہا تھا۔ حیرت بھی ہو رہی تھی۔

"یہ حرکتیں جو تم نے اختیار کر رکھی ہیں وہ تمہاری ماں کو زندہ درگور کر دیں گی سمجھے۔ میں پوچھتا ہوں۔ گھر میں گند گی پھیلانے کی جرأت تمہیں کیسے ہوئی۔ یہ چلن تم نے سیکھا کہاں سے؟ ارے تم تین سال امریکہ میں رہے۔ ہم خوش تھے کہ تمہارا کردار بے داغ ہے۔ کاش یہی عادات تم یہاں بھی اختیار کئے رہتے! تم نے آخر یہ قدم کیا سوچ کر اٹھایا ہے۔ جبکہ تمہیں بخوبی علم ہے کہ تمہارا سوچا ہوا پورا نہیں ہو سکتا! ہم اپنے خاندان میں ہرگز شبک ہونا پسند نہیں کرتے!"

معتصم نے بڑے ٹھنڈے پیٹوں کہا: "ابا جان۔ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ کہ شیخ صاحب کیسے انسان تھے۔ صرف اس عیب کے کہ وہ آپ کے ملازم تھے۔ وہ غالباً شریف آدمی کا کردار نبھا گئے۔ اب ان کی لڑکی۔ وہ۔ کیا آپ آج تک اسے اپنی بیٹی نہیں کہتے رہے؟ سوائے اس کے کہ وہ غریب ہے آپ کے گھر کا کام کاج کرتی رہتی ہے۔ اس میں کیا خرابی ہے؟ اسے اپنے کنبہ میں کیوں شامل نہیں کر سکتے؟"

"مجھ سے بحث کر رہا ہے۔ ناخلف، ذلیل، بدبخت کہیں کا!"

معتصم نے کہا: "آپ اسے اپنی بہو نہیں کہیں گے! امّی اسے اپنے برابر جگہ دینے میں اپنی توہین سمجھیں گی۔ بھیا اور بھابی اسے اپنی رشتہ دار کہتے شرمائیں گے۔ بس یہی نا۔ تو میں اسے لے کر کہیں چلا جاؤں گا۔"

کہ وہ وکیل صاحب کے کمرے میں ہیں۔ رضا کے قدم اُدھر ہی اٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے والدین کو عجیب حال میں دیکھا۔ والد صاحب کی تیوریوں پر بل، چہرہ سرخ، والدہ صاحبہ کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان، صورت حال دریافت کرنے پر بیگم علوی ضبط نہ کر سکیں اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اَن کہنے والی باتیں بھی کہہ دیں۔ رضا حیرت کے مارے بُت بن گئے!

پھر انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا: "اچھا ــــ اور یہ سب کے سب گئے کہاں ہیں۔ ابھی دوپہر کو سلمیٰ کا چھوٹا بھائی کینٹین ملا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ دونوں بچے بہت رو رہے ہیں۔ نجانے سلمیٰ کو احمد کہاں لے گئے ہیں! پتہ نہیں۔"

"پتہ نہیں" بیگم نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ کیا سلمیٰ میکے میں نہیں تھیں۔ احمد انہیں کہاں لے کے چلے گئے؟

"معلوم نہیں۔ اور یہ نینا اور روحمہ ــــ یہ کہاں ہیں؟"

رضا نے بھی پوچھا: "نینا کے کالج میں کوئی جلسہ تھا" بیگم نے جواب دیا: "میرے سر ہو رہی تھی۔ وہ اُدھر گئی ہے۔ میں نے سوچا اکیلی کیوں جائے اس حرّافہ کو ساتھ کر دیا۔"

"اچھا اور احمد اور معتصم؟" نہایت شک بھرے لہجہ میں رضا نے پھر دریافت کیا۔

اس پر بیگم نے بتایا کہ معتصم کا کوئی لاوارث دوست مر گیا وہ اور نعمانی جنازے میں شرکت کرنے گئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے وہ یکایک اُچھل سی پڑیں اور آنکھیں نکال کر بولیں: "اچھا مگر

نینا کو دکھ ہوا۔
سچی محبت کرتے ہوتے تو سب کو مجھ سے نفرت نہ کرا
دیتے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ میری بربادی کے وہی ذمہ دار
ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا۔ میں جس مقام پر ہوں مجھے وہیں
رہنے دیں۔ لاکھ تم سب مجھے برابری کا درجہ دو۔ مگر میں رہوں گی
تو وہی۔ شیخ صاحب کی بیٹی۔ جو تمہارے گھر کے خادم تھے۔"
پھر وہ اچانک بیتاب ہو گئی۔" اماں اور ابا جان نے مجھے کتنی
محبت دی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ میں اپنے ہی کنبہ میں ہوں۔ اب
دیکھو۔ تمہیں منع کر دیا گیا کہ میرے پاس مت آؤ۔ بھابی پاس
نہیں آتیں۔ سب کی نظریں پھر گئیں۔ بچے تک مجھ سے چھین لئے
گئے۔ رات انصار میرے پاس نہیں سویا۔ مجھے نیند نہیں آئی
نینا۔ یہ سب کیا ہوا۔ ہائے۔ تم عمی بھیا سے کہو۔ وہ سب
کے سامنے کہہ دیں۔ مجھے بدنصیب رومہ سے نفرت ہے سخت
نفرت۔ مجھے میرے سب چاہنے والے مل جائیں۔"
"چاہے تمہیں عمی بھیا نہ ملیں؟" نینا نے پوچھا۔
"ہاں۔ چاہے نہ ملیں۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔" اس
طرح کہہ رہی ہو جیسے میری قسمت میں وہ لکھے ہوئے ہیں!"
علوی صاحب نے دروازہ بند کر دیا اور معتصم کی طرف مڑے
"بیٹھ جاؤ۔!"
معتصم نے انہیں بغور تکتے ہوئے کرسی سنبھال لی۔
علوی صاحب کو ان کے اطمینان اور دیدہ دلیری پر بیک وقت

وہ۔ احمد سلمیٰ کو کہاں لے گئے؟ کسی غیر آدمی کی موت مٹی سے
اس کی جان سے دور سلمیٰ کا کیا سروکار۔؟"
"وہی تو میں آپ سے کہتا ہوں امی کہ آپ کے بے جا دُلار
اور جان بوجھ کر چشم پوشی نے معتصم کو اسقدر دلیر اور لاپرواہ
بنا دیا ہے وہ ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ سب کو انگوٹھے
پر مارتے۔ اب میں بتاؤں کہ ہوا کیا ہے؟ احمد اور معتصم
نے کہیں سیر سپاٹے کا پروگرام بنایا ہے۔ بہانہ کر کے ادھر سے
رومہ اور نینا کو لے گئے اور سلمیٰ کو ان کی والدہ کے گھر سے۔
سمجھیں آپ۔! اچھا اب ان سب کو آنے تو دیجئے۔ ایسی
سزا دوں گا کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔!" وہ بڑے طیش سے
پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے!

اور پھر جیسے اچانک ایک روشن دن کو کالی بدلی تاریک
کر دے۔ ان سب کی زندگی ایک تکلیف دہ انقلاب سے
دوچار ہو گئی۔ رضا نے واقعی بڑی سخت پرسش کی۔ اپنی
ازدواجی زندگی میں پہلی بار سلمیٰ کو رُلایا تھا۔ نینا کو بہت چاہتے
تھے۔ لیکن اسے بھی بہت خفا ہوئے! نعمانی کو بُرا بھلا کہا۔
اور سب سے زیادہ مصیبت آئی تھی معتصم اور رومہ پر۔ ان
سب کی چوری سب کے سامنے کھل گئی تھی۔ معتصم کا یہ حال تھا کہ
کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ رومہ گوشہ نشین ہو گئی۔ اس کی کوئی

صورت ہی نہ رہ گئی تھی۔ وہ خاتون جو اسے بیٹی کے برابر چاہتی تھیں۔ اس سے سخت بدگمان ہو گئی تھیں۔ اکیلے میں تو سے لعن طعن کی تھی۔

"تم نے خوب اپنے پیٹ سے پاؤں نکالے بی بی۔ ہماری محبت کا اچھا صلہ دیا۔ جس رکابی میں کھایا پیا۔ اسی میں چھید کر کے رکھ دیا ہے۔ ماشاء اللہ سارے گنوں پوری نکلیں۔ ارے تمہاری صورت ایسی ہے اور سیرت ایسی۔ تمہیں اس سے باتیں کرتے ذرا بھی لاج نہ لگی۔ منہ سے بھائی کہتی ہو اور دل میں سمجھتی ہو اپنا یار۔ کیوں۔ شریفوں کے کیا ایسے ہی لچھن ہوتے ہیں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھوں تمہارا گلا گھونٹ دوں۔ تمہاری عادت اگر نینا بھی اختیار کرے تو۔ تم نے تو خوب گلھیا میں گڑ پھوڑا۔ تم نے یہ کبھی نہ سوچا کہ جس سے دیدے لڑا رہی ہو وہ میرا بیٹا ہے۔ اچھا اب تم دیکھنا اپنا حشر۔!"

رومہ تھر تھر کانپتی رہی۔ سارا بدن برف، زبان بند، حواس مسلوب۔ عجیب عالم تھا۔ اور بیگم علوی بے ربط باتیں کر کر کے دل کا لاوا اگلتی رہیں۔ رومہ خود بھی انہیں عجیب رنگ میں دیکھ رہی تھی۔ اتنے غصے میں وہ شاید کبھی نہیں آئی تھیں۔ مگر اب۔ وہ ان کی طرف دیکھ نہ سکی۔

انہوں نے اپنی بیٹی کو منع کر دیا کہ وہ رومہ سے نہ ملے۔ خراب ہو جائے گی۔ اور معتصم کی تو ایسی تیسی ہو جاتی کہ ...

"چل ہٹ، دور، موئی۔" بیگم علوی بولیں "تو نے جدا کر دیا میرے بچے کو مجھ سے۔! اب کس منہ سے مجھے اماں پکار رہی ہے۔"

پھر اکیلے میں رومہ نینا کے ہاتھوں میں سر رکھ کر رونے لگی۔ نینا اس کے ساتھ روئی اور بولی "نہ رو۔ میری بہن۔ میں شروع ہی سے کہہ رہی تھی کہ معصمی بھیا کی جلد بازی اور ناسمجھی کوئی نہ کوئی گل کھلا کے رہے گی۔ وہی ہوا اب۔ تم اپنے حواس مت کھو۔ اس طرح رونے سے کیا حاصل۔ اللہ نے چاہا تو تم ضرور معصمی بھیا کی زندگی میں آؤ گی۔! کون سا گناہ تم لوگوں نے کیا ہے جس کی یہ سزا ہے۔"

"میں تمہاری خادمہ ہوں نینا۔" رومہ کا حال ابتر تھا۔ "مجھے کوئی بڑا مرتبہ مت دو۔"

"مرتبہ وغیرہ سب خدا دیتا ہے۔" نینا کچھ سوچتے ہوئے بولی "ایک بات کہوں۔ تم ڈر مت جانا۔"

"اب کیا ہے؟" رومہ سہم گئی۔

"امی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں باجی جان کے پاس بھجوا دیں گی۔!"

رومہ نے ٹھنڈی سانس لی "بہت اچھی بات ہے اسی طرح اس طوفان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خدا کرے کہ جلد بھجوا دیں۔ میں خود بھی اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ معصمی بھیا کی محبت اور سب کی نفرت مجھ سے سہی نہیں جا رہی ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ رومہ۔ معصمی بھیا تم سے سچی محبت کرتے ہیں۔"

دفعتاً پھر دروازہ کھلا اور دونوں اُچھل پڑے۔ نینا اندر
آئی اور ہانپتی ہوئی بولی: "عمی بھیا۔ جلدی سے برآمدے میں
بھاگ جائیے۔ امّی، ابّا جان اور بھائی جان ادھر ہی آ رہے ہیں
میرے خدا۔ عمی بھیا۔ آپ ان کے قدموں کی چاپ نہیں سُن رہے؟"
"میں کیوں بھاگوں؟" معتصم نے جواب دیا۔ "میں کون سا
گناہ کر رہا ہوں۔ آنے دو۔ جو کوئی بھی آئے!"
"خدا کے لئے جائیے۔" رومہ بولی: "آپ کو اللہ کی قسم۔
چلے جائیے۔" اور وہ ان کے قدموں پر گر گئی۔ معتصم لڑکھڑا کر اسے
اٹھانے جھکے ہی تھے کہ دھڑام سے دروازہ کھلا۔ اور ابّا جان،
امّی اور رضا دکھائی دیئے۔ معتصم پیچھے ہٹ گئے۔ رومہ لرز اٹھی۔
اور نینا چور کی طرح کونے میں دبک گئی۔
بیگم علوی کا غضبناک چہرہ۔ کم از کم معتصم میں اتنی سکت
نہ رہ گئی کہ وہ اس چہرے کی طرف دیکھتے۔ رضا نے اپنا نچلا لب
دانتوں میں دبا لیا تھا۔ اور علوی صاحب بس جیسے کوئی عبرتناک
منظر دیکھ رہے تھے۔
"دیکھ لیا آپ نے اپنے گھر میں یہ ناپاک ناٹک؟" بیگم
نے کہا۔ ان کے لہجے سے حقارت برس رہی تھی۔
"معتصم تمہیں شرم آنی چاہیئے۔" رضا بولے۔
"تم میرے ساتھ آؤ۔" علوی صاحب نے کہا اور معتصم کو
اپنے ساتھ لے گئے۔
"ابّا، بھائی جان!" رومہ تڑپ گئی۔ "مجھے قصوروار نہ سمجھئے۔"

انہیں خدا یاد آ گیا۔
بیگم علوی روئیں۔ علوی صاحب بند کمرے میں گرجے برسے
اور رضا نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر انہوں نے اپنی نام نہاد
محبت کی غلاظت ان کے گھر میں پھیلائی تو وہ انہیں گھر سے
نکال دیں گے۔
پھر وہ نعمانی پر برسے تھے: "صدیق احمد۔ میں تمہیں
اپنا نہیں سمجھتا تھا۔" اور نعمانی پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔
معتصم کے چہرے پر برہمی کی شکنیں تھیں۔ انہوں نے باپ
بھائی اور ماں کا مقابلہ کرتے ہوئے جواب دیا: "میں تو
نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی نامناسب، یا شرمناک فعل کیا ہے!
میں اپنے بچپن سے اسے دیکھتا آ رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی اسے
لڑکی سمجھتے ہیں۔ اس کا قصور صرف اسی قدر ہے کہ وہ آپ کے
ملازم کی لڑکی ہے۔ اور غالباً اتنی امیر نہیں ہے کہ آپ کے
اونچے خاندان میں کھپ سکے۔ لیکن میں اس کی پرواہ نہیں
کرتا۔ میرے نزدیک دولت کا اعتبار نہایت ناقص اور کمزور
اعتبار ہے۔ ہم کوئی بادشاہ، کہیں کے گورنر نہیں۔ کل ہماری
حالت اس سے بھی بدتر ہو سکتی ہے! مجھے قائل کیجئے کہ کیا
وجہ ہے جو وہ آپ کے خاندان میں شامل نہیں ہو سکتی؟"
بزرگ انگشت بدنداں تھے۔ ان کی دانست میں معتصم تو
شکست خوردہ اور نادم تھے۔ یہ تو ان کے وہم و گمان تک میں
نہ تھا کہ وہ اس دیدہ دلیری سے رومہ کی تائید کرنے لگیں گے۔

گویا کھلم کھلا انہوں نے اپنی محبت کا اقرار کر لیا۔

"خاندان کی ناک کٹادو گے؟" صدمہ کے مارے بیگم علوی کا برا حال تھا۔ "پاگل ہو گئے ہو تم" رضا نے کہا۔ "ہم کہاں کہتے ہیں کہ وہ بری لڑکی ہے۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ بس وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ تمہیں کہیں لڑکی ملتی نہ تھی جو تم نے گھر کی پروردہ سے شادی کر لی۔ سوچو معتصم کہ آخر ہماری بھی کوئی پوزیشن ہے۔"

"آپ کی بے شک ہے۔" معتصم نے جواب دیا۔ "لیکن میری کوئی پوزیشن نہیں۔ میں اونچی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے اپنے دل کا خون نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ میں چلا جاؤں گا۔ مگر اکیلا نہیں۔" وہ اٹھ کر چلے گئے۔ اور بہت دیر تک یہ تینوں خاموش بیٹھے رہے۔

"پانی سر سے گزر چکا ہے۔" آخر کار ایک طویل سانس لے کر رضا نے کہا۔ "اس کا تدارک بہت ضروری ہے۔" علوی صاحب نے کہا۔ "بہت عرصہ قبل رضوانہ نے کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ کسی جگہ رومہ کا بیاہ کر دینا چاہتی ہیں۔ میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ کسی طور رومہ کو ان کے پاس پہنچا دیا جائے اور اس سچوایشن سے انہیں آگاہ کر دیا جائے!"

"جو کچھ کیجئے۔ جلدی کیجئے۔ میرے دل میں پتنگے لگے ہیں۔" بیگم نے کہا۔

"سوچ رہا ہوں کہ ــــ!" رضا نے کہا اور کچھ سوچنے لگے۔

یہاں یہ بربادی کے مشورے ہو رہے تھے اور اپنے کمرے میں رومہ فرش پر پڑی زار و قطار رو رہی تھی۔ آج اس کا کوئی نہ تھا۔ کوئی نہیں آ رہا تھا اس کے پاس۔ نہ اسمیں ہمت کہ وہ سلمٰی یا مینا کے پاس جا سکتی۔ اپنا انجام اسے بہت المناک اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ خدا جانے اماں کیا کریں۔ خدا جانے اپنے جنون میں صاحبزادے معتصم کیا کر گزریں؟ گھر بھر میں ایک منحوس سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دفعتہً دروازہ بے آواز کھلا۔ اور کسی نے اندر قدم رکھے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ پھر اپنے سامنے معتصم کو دیکھ کر اسے سکتہ سا ہو گیا۔ ان میں اب بھی اتنی ہمت ہے؟ وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"رومہ۔ رو رو کر حواس مت کھونا۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "میں کسی حال میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ آخر کب تک؟ میرے اور میرے چاہنے والوں کی تمہارے دشمنوں کی جنگ کبھی تو اختتام کو پہونچے گی! میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اگر مجھے گھر سے نکلنا بھی پڑا تو میں اکیلا نہیں نکلوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو ــ!"

رومہ نے بلبلا کر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "خدا کا واسطہ آپ کو۔ آپ یہاں سے جائیے۔ اماں مجھے مار ڈالیں گی۔ مجھے کہیں پھنکوا دیں گی۔ اب آپ کون سا ستم میری جان پر ڈھانا چاہتے ہیں۔ اتنا سب تو کر لیا۔"

کسی بھابھی نے اپنا نام و پتہ نہ لکھتے ہوئے سوال کیا ہے۔

"آپ کے خطبات جو آپ جان زبردستی ہمیں پڑھاتی ہیں، یہ واضح کرتے ہیں کہ آپ لڑکیوں کی تعلیم کو پسند نہیں کرتے حالانکہ اسلام نے واضح طور پر یہ بات کہی ہے کہ علم حاصل کرو، چاہے اس کے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے، اور اس سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کا لفظ نہیں آیا ہے، جس سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی کو علم حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے"۔

جی ہاں علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ میں نے بھی پڑھی ہے اور اس سے مجھے انکار نہیں کہ علم حاصل کرنا مردوں اور عورتوں، دونوں کے لئے ضروری ہے۔ لیکن علم کا کیا صرف یہی مفہوم ہے کہ سائنس، تاریخ، جغرافیہ، حساب اور جیومیٹری وغیرہ کی تعلیم حاصل کی جائے۔ میرے خیال سے علم کا مفہوم معلومات حاصل کرنا ہے اور معلومات بہت سی باتوں کی ہو سکتی ہیں۔ آپ شاید علم کو اس حد تک تصور کرتی ہیں کہ لڑکیاں اسکول کالج اور یونیورسٹیز میں جا کر پڑھیں۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔ میں اس تعلیم کا بھی مخالف نہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی نجمہ اختر کو بھی انٹرمیڈیٹ تک لال باغ گرلس کالج میں پڑھایا تھا۔ تعلیم کا مخالف ہوتا تو گھر ہی پر قرآن شریف اور بہشتی زیور وغیرہ پڑھا لینا کافی سمجھتا۔ آپ کا یہ خیال زندگی سے قطعی دور ہے کہ میں تعلیم نسواں کا مخالف ہوں۔ لیکن ... عورتوں اور مردوں کی تعلیم میں تفریق کا قائل ...

کرتا رہا ہوں اور صرف اس لئے کہ میں اس بات کو کبھی مان نہیں سکتا کہ مردوں اور عورتوں کے فرائض میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اللہ پاک نے عورتوں اور مردوں کی تخلیق ان کے فرائض کے پیش نظر کی تھی۔ کیا اس کی قدرت سے بعید تھا کہ عورتوں ہی کی طرح مرد بھی بچے جنا کرتے اور عورتوں ہی کی طرح ان کے سینوں سے بھی دودھ پیدا ہوا کرتا۔ کیوں قدرت نے ایسا نہیں کیا اور کیوں یہ اہلیت صرف عورتوں ہی کو بخشی کہ وہ بچے کو جنم دیں، اسے اپنے خون سے سینچ دار دودھ پلائیں۔ کیوں انھیں ضبط و صبر کی ایسی صلاحیت بخشی کہ وہ زچگی کی روح فرسا تکالیف اٹھانے کے بعد بھی اس فرض کی ادائی سے گریز نہیں کرتیں۔ یقیناً یہ ساری قوتیں اور صلاحیتیں عورتوں کو قدرت ہی نے بخشی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی انھیں گھرداری کا سلیقہ بھی بخشا ہے۔ جس سے مرد محروم رکھا گیا ہے۔ کسی بھی ایسے گھر کو تصور میں لائیے جس میں عورت نہ ہو۔ پھر ایسے کسی گھر کو دیکھنے کی کوشش کیجئے جہاں عورت کا وجود ہو تو یقیناً آپ دیکھیں گی کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ اس لئے کہ گھرداری عورت کی فطرت میں شامل ہے اور مرد اس سے محروم ہے۔

نہ اتنے باریک لباس پہنو کہ جسم جھلکے نہ اتنے فٹ کہ جسم کے نشیب و فراز ظاہر ہوں

زندگی کو قدرت نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک تو ہے باہر کی دنیا۔ دوسری گھر کی سلطنت۔ دونوں ہی میں محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن محنت و مشقت بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ گھر کے اندر کی محنت مشقت باہر کی محنت مشقت سے مختلف ہوتی ہے اور اس اختلاف کے ...

قدرت نے عورتوں اور مردوں کے قوتِ جسمانی میں بھی فرق رکھا ہے۔ مردوں کو ایسی قوتیں بخشیں جن کی انھیں باہری زندگی میں ضرورت پڑتی ہے اور عورتوں کو مختلف قسم کی صلاحیتیں بخشیں۔ دونوں میں بڑا تضاد ہے۔ یہ ممکن تھا کہ فطرت کا یہ نظام نہ بدلے۔ اس نے جس کو جس بات کے لئے بنایا، ویسی ہی توفیق بھی عطا فرمائیں۔ باہری زندگی میں ایسی طاقتوں کی ضرورت تھی جن سے پہاڑ کھودے جا سکیں، جن سے دریاؤں کے دھارے بدلے جا سکیں جن سے شکار کھیلے جا سکیں، جن سے جنگیں لڑی جا سکیں۔ اس کے برخلاف عورتوں کو ایسی طاقتیں عطا کرکے صبر و تحمل، خدمت و محبت کے جذبات و احساسات سے نوازا۔ اس لئے گھریلو زندگی میں اسے بیٹی، بہو اور ماں بننا تھا، جن کے لئے اسے ایسی ہی طاقتوں کی ضرورت تھی۔ کیا کوئی مرد اپنے بچے کے لئے تمام رات جاگ سکتا ہے۔ کیا کوئی مرد اپنے بچے کے لئے ایسی قربانیاں دے سکتا ہے، جیسی ایک ماں دیتی رہتی ہے۔ جواب نفی میں ہوگا اور یہ اس لئے ہوگا کہ مرد کو فطرت نے ایسی قوت ہی نہیں بخشی جس سے وہ بچوں کی پرورش و پرداخت میں عورت جیسے مظاہرے کر سکے۔

میں نے کئی بار ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا تعلیمی نصاب جداگانہ ہونا چاہیئے۔ ایک ہی نصاب دونوں کے لئے یکساں مفید نہیں ہو سکتا۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ لڑکیوں کو ہوم سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے ــــ لیکن آپ یہ بھی جانتی ہوں گی یہ تعلیم کس طرح دی جاتی ہے۔ ہوم سائنس میں پاس ہونے والی ۹۰ فیصد لڑکیاں دوسروں کی سلائی کڑھائی کے نمونے سجا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کرنے کے بعد بھی جو لڑکیاں خانگی امور میں مہارت پیدا کرنا چاہتی ہیں وہ سلائی کڑھائی اور کھانا پکانے وغیرہ کے پرائیویٹ کلاسز میں جانے لگتی ہیں۔ آج تعلیم کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد ملازمت مل جائے۔ یہ چیز مردوں کے لئے بھی سو فیصدی اچھا نہیں کہا جا سکتا، عورتوں کے لئے تو میں اسے پانچ فی صدی سے زیادہ مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ پانچ فی صدی بھی ایسی لڑکیاں ہو سکتی ہیں جو یہ یقین رکھتی ہوں کہ ان کی شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔ مجبوریوں میں ملازمت کرنا معیوب نہیں ہوتا۔ مجبوری میں حرام بھی حلال ہو جایا کرتا ہے۔

آخر میں جو آپ نے لکھا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے حدیث ہے اس سے مجھے بھی انکار نہیں، لیکن اس حدیث کا سہارا لے کر عورتوں کی تعلیم کا ذکر کرنے والوں سے یہ ضرور دریافت کروں گا کہ کیا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئی تھیں جن میں لڑکیاں دنیوی علوم حاصل کرتی رہی ہوں۔ اگر نہیں تو کیوں۔ کیا اسلام کی عظیم الشان حکومت انھیں قائم نہیں کر سکتی تھی۔ کیا سوال کرنے والی بہن کسی صحابیہ کا جواب دے سکتی ہیں۔ تاریخ ہمیں ایسے تعلیمی اداروں کے ذکر سے خالی نظر آتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دور میں خواتین کے ملازمت کرنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس لئے میں اس بات کو نہیں مان سکتا کہ اسلام نے خواتین کو بھی ویسی ہی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی ہو، جیسی آج دی جا رہی ہے۔ دراصل یہ وقت کا تقاضہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی لڑکی کو جاہل نہیں رہنا چاہیے، لیکن تعلیم کا ایک جداگانہ معیار ہونا چاہئے جس میں امور خانہ داری کا کورس خصوصیت سے شامل ہو۔ گھر کی ملکہ کے فرائض کیا کیا ہیں، تعلیم میں ان کا خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ ایک مکمل خاتون بن جائے اور اپنا دنیاوی انتظام اسی خوبصورتی اور سلیقے سے کرے کہ ہر طرف اس کی واہ واہ ہو۔

سرسید رح کی ایک نصیحت

سرسید احمد خان مرحوم کو پنجاب کی مسلم خواتین نے ۲۴ فروری ۱۸۸۴ء کو ایک ایڈریس [illegible] جس کے جواب میں سرسید نے جو تقریر [illegible] دینی اخبار نے حال میں شائع کیا ہے [illegible] ان خواتین کو بڑی بیش بہا نصیحتیں کی [illegible]

رودادِ زمزم

مشتاق الکھیم پوری

وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ۔ بیشک یہ طاقت میرے رب میں ہی ہے وہ جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلت دے۔ اب مجھے ہی دیکھئے میری حقیقت کیا ہے محض ایک چشمہ آب۔ لیکن اس پاک بے نیاز نے مجھے جس عزت اور حرمت سے نوازا ہے وہ اس کی ادنیٰ نوازیوں کی ایک بے مثل دلیل ہے۔

مجھے دنیا زمزم کے نام سے پکارتی ہے۔ چاہ زمزم ــــ میرے وجود میں آنے کا دور عام طور پر خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے زمانہ سے مانا گیا ہے لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے۔ مجھے اس دنیا کے ناپائیدار میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السّلام کے لئے وجود میں لایا گیا لیکن اس کے بعد مجھے دنیا کی نظروں سے اس طرح چھپا لیا گیا کہ دنیا تو دنیا خود میں کبھی اپنا وجود فراموش کر بیٹھا۔

اب تو میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا اصل آغاز اسی وقت سے ہوا ہے جب قضا و قدر کی مصلحت کے تحت بی بی ہاجرہ کو لاکر عرب کے اس میدان میں تنہا چھوڑا گیا۔ ان کا صغیر السن بچہ جو ہونے والا پیغمبر تھا سخت دھوپ میں تپتی ہوئی زمین پر پڑا پیاس سے بلک رہا تھا اور وہ اس کی تشنگی سے بے چین ہو کر خود پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کے درمیان بھاگی پھر رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اس نے آنے والی امتوں کے لئے اس سعی کو فرض کر دیا۔

بی بی ہاجرہ کی بچے کے لئے یہ تڑپ اور ہونے والے پیغمبر کی تشنگی دیکھ کر رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس نے میرے چہرے پر پڑی ہوئے نقاب کو ہٹا دیا۔ میں تڑپ کر باہر آیا اور اپنے وجود کو پھیلانا شروع کیا۔ ممتا کی ماری ماں یہ سوچ کر کہیں پانی بہہ کر ختم نہ ہو جائے چلا آئی۔ زم زم، زمزم ٹھہر، ٹھہر، اور میں ٹھہر گیا۔ یہیں سے میرا نام زمزم پڑ گیا۔

ایک عرصہ اسی طرح گذر گیا لوگ مجھے اسی نام سے پہچانتے اور میرے پانی سے استفادہ حاصل کرتے رہے پھر قبیلہ جرہم کا دور آیا جس نے میرا وقار خاک میں ملا دیا اور مجھے [illegible] کر دیا۔ یہ کہانی بھی عجیب ہے۔

بنی جرہم ایک طرف میری عظمت مانتے اور کعبہ کو اللہ کا گھر تسلیم کرتے تھے دوسری طرف غلط اور برے کاموں کے لئے بھی بیت اللہ کی ہی طرف رخ کرتے تھے۔ اس زمانے میں قبیلہ کا سردار مضاض جرہمی تھا اس نے جب یہ بیہودگیاں دیکھیں تو پہلے تو لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہیں مانے تو ایک روز کعبے میں رکھتے ہوئے دور دراز ملکوں کے تحائف جس میں خالص سونے کی بنی ہوئی دو ہرنیاں، سال ورزرہ اور زرہ و تلواریں شامل تھیں نکال لئے اور انھیں میرے قلب میں بطور امانت رکھ کر مٹی سے پاٹ دیا پھر خود وہ علاقہ چھوڑ کر چلا گیا۔ تاکہ اس کی قوم پر جب عذاب نازل ہو تو وہ محفوظ رہ سکے۔

اس واقعہ کو زمانہ بیت گیا۔ عروج و زوال کی کہانی شروع ہوئی جرہمی قبیلہ پر ادبار آیا اور بنی خزاعہ نے انکی جگہ تسلط حاصل کر لیا۔ مفتوح لوگ فرار ہو گئے۔ لیکن ان سب انقلابات کے بعد بھی کسی نے میری طرف توجہ نہ دی اور میں نے اپنے مدفن ہی میں سوتا رہا۔

وقت اپنی منزل کی طرف بھاگتا رہا۔ بنی خزاعہ بھی اپنا زمانہ پورا کر کے چلے گئے اور قصی کا دور آگیا۔ اس زمانے میں مکہ میں پانی کی شدید کمی ہو گئی لیکن اب بھی لوگوں نے مجھے یاد نہ کیا بلکہ ایک دوسرا کنواں کھود ڈالا۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا عزت و ذلت دینا کسی انسان کے اختیار میں نہیں۔ میرے رب نے مجھے پھر سرفراز کیا اور جب عبدالمطلب کا دور آیا تو پھر میرے تن میں زندگی کی روح پھونکی گئی۔

ہوا یوں کہ ایک روز جب عبدالمطلب حجر اسود کے مقام پر سو رہے تھے انھوں نے خواب میں دیکھا کوئی [illegible] کہہ رہا ہے۔ طیبہ کھود و۔

حضرت عبدالمطلب کہتے ہیں۔ میری سمجھ میں [illegible] نہیں آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ طیبہ کیا ہے؟ مگر وہ [illegible] چلا گیا۔

دوسری رات پھر یہی خواب آیا اور اس شخص نے کہا زمزم کھودو۔ میں نے پھر پوچھا زمزم کیا ہے مگر وہ پھر کچھ بتائے بغیر چلا گیا۔ تیسری شب بھی یہی ہوا اس نے آتے ہی مجھ سے کہا مضنونہ کھودو۔ میں اس کا مطلب پوچھنے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آیا آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے اور یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا ہے اب میں نے طے کر لیا تھا کچھ بھی ہو ان باتوں کا مطلب پوچھ کر ہی رہوں گا چنانچہ چوتھی شب آکر جیسے ہی اس نے کہا: زمزم کھودو، میں فوراً پوچھ بیٹھا آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے اور تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔

اس شخص نے میری طرف ایک گہری نگاہ ڈالی اور بولا زمزم وہ ہے جس کا پانی کبھی خشک ہوتا ہے نہ کم۔ جو حاجیوں کے بڑے بڑے مجمع کو سیراب کرتا ہے اور جو اس جگہ پر ہے جہاں گندگی اور خون ہے نیز جہاں ایک سفید پیٹ والا کوا چونچیں مارتا ہے۔

عبدالمطلب اگلے دن اپنے بیٹے حرث کے ساتھ اس جگہ پر گئے۔ اطراف میں تلاش کیا تو دیکھا اساف اور نائلہ بتوں کے درمیان جہاں لوگ ان کو خوش کرنے کے لئے قربانی دیا کرتے تھے۔ کچھ خون اور آلائش پڑی ہوئی ہے اور اس کے بیچ میں ایک سفید پیٹ والا کوا بیٹھا ٹھونگیں مار رہا ہے۔ عبدالمطلب سمجھ گئے یہی وہ جگہ ہے جس کی خواب میں ان سے نشاندہی کی گئی تھی انھوں نے اپنے بیٹے حرث سے کدال لانے کو کہا تاکہ اس جگہ کی کھدائی کی جاسکے۔ حرث جب کدال لے کر آئے تو یہاں کافی اہل قریش جمع ہو چکے تھے انھوں نے عبدالمطلب کو روکا اور کہنے لگے۔

ہم تم کو اپنے ان دونوں بتوں کے درمیان کبھی کھدائی نہ کرنے دیں گے کیوں کہ یہ ہماری قربانی کی جگہ ہے۔ مگر عبدالمطلب نہ مانے اور انھوں نے حرث سے ان لوگوں کو ہٹانے کے لئے کہہ کر کھدائی شروع کر دی ابھی تھوڑی ہی مٹی نکلی تھی کہ انھیں وہ جگہ مل گئی جو میری اصل بنیاد تھی۔ عبدالمطلب نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اسی وقت تمام قریش بھی وہاں پر پہونچ گئے اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے

خدا کی قسم عبدالمطلب یہ تو ہمارے باپ اسمٰعیل کا کنواں ہے اس میں تو ہمارا بھی حق ہے۔

عبدالمطلب نے ان کا حق تسلیم کرنے سے انکار

کر دیا۔ جب یہ طے ہوا کہ کسی سے فیصلہ کرایا جائے۔ [illegible] جاکر فیصلہ کیا جائے چنانچہ دونوں فریق اپنے ہمراہیوں کو لیکر [illegible] کی طرف روانہ ہو گئے۔

قبل اس کے کہ میں آگے کے حالات بیان کروں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس الجھن سے نجات دلادوں جو عبدالمطلب کے خواب میں بولے گئے الفاظ سن کر آپ کے دل میں پیدا ہو رہی ہوگی حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام الفاظ اجنبی نے میرے لئے ہی استعمال کئے تھے۔

طیبہ سے مراد یہ تھی کہ یہ پانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پاک مردوں اور عورتوں کے لئے جاری ہوا اور مضنونہ کا مطلب تھا کہ یہ قیمتی ہے اس لئے غیر مومنوں کو دینے میں بخل کیا جائے۔

اب ادھر کا قصہ سنئے۔ عبدالمطلب جب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ حجاز اور شام کے درمیان پہنچے تو ان کے پاس پانی ختم ہو گیا۔ بے آب و گیاہ صحرا۔ چٹیل میدان پانی نہ ملا۔ قریش کے گروہ سے پانی حاصل کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کیا تم چاہتے ہو ہم بھی اس جگہ پیاس سے ہلاک ہو جائیں۔

حالات کی اس مجبوری کو دیکھتے ہوئے عبد مناف کے ان آدمیوں سے عبدالمطلب نے کہا میری رائے ہے ہم میں سے ہر شخص اپنے لئے ایک ایک گڈھا کھود کر تیار کرے تاکہ اگر اس کی موت ہو جائے تو اسی میں اس کو دفن کر دیا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے بعد میں نقاہت کسی کو اس کام کے قابل نہ رکھے اور اس کی لاش جانوروں اور گوشت خور پرندوں کی نذر ہو جائے سب نے اس بات پر صاد کیا اور اپنے اپنے گڈھے کھود لئے۔

عبدالمطلب نے جانوروں اور اونٹوں کو یکجا کرنا شروع کیا۔ جانوروں کو ہٹاتے ہوئے جب وہ اپنی اونٹنی کے قریب پہنچے جیسے اٹھانے کی قدرت خدا سے اس کے پیر کے نیچے سے پانی کا ایک چشمہ ابل پڑا۔ عبدالمطلب خدا کا شکر بجا لائے اور اپنے ہمراہیوں کو آواز دی سب نے سیر ہو کر پانی پیا مشکیزے بھرے اور پھر ان لوگوں کو بھی بلوانے

[illegible] دل ربا روشن ہو گئے۔

احمر نے بے قابو جذبات سے اس کی نرم و نازک کلائی [illegible]۔ صائمہ نے جیسے جیسے گھبرا کر اپنی کلائی آزاد کرانا چاہی اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوتی گئی اسے محسوس ہوا جیسے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو اور درد کی ایک تیز لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔

"جواب دو صائمہ۔" اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔

صائمہ کے لب ہلے: "میری سانس آپ کی ہے۔"

خوشی اور وفور جذبات سے احمر نے اس کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیئے۔ دو بے قرار دلوں کو قرار آ گیا۔ صائمہ کی روح تک سرشار ہو گئی۔ کمرے کی مکمل خاموشی میں صرف دونوں کی سانسیں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ یہ ایک لمحہ صائمہ کی تمام زندگی کا حاصل ہو گیا تھا۔

عورت اپنے دل و دماغ میں جب کسی مرد کا عکس منعکس کر لیتی ہے تو وہ تا زیست اس عکس سے آزاد نہیں ہو پاتی۔ چاہے حالات سازگار ہوں یا ناسازگار وہ اپنی تمام تر شدتوں سے اس کو چاہے جاتی ہے۔ پوجے جاتی ہے۔

ابھی وہ قرب کے سحر سے آزاد بھی نہ ہو پائے تھے کہ انہیں فرقان کی آواز سنائی دی۔

"بھائی جان آپ آپی کے کمرے میں کیا کر رہے ہیں؟"

صائمہ کے گھبرانے پر احمر نے مسکرا کر کہا: "بیٹے اپنی آپی سے پوچھئے ہم لوگ کیا کر رہے تھے؟"

صائمہ نے احمر کی جانب خفگی بھری نگاہوں سے دیکھا: "پلیز کچھ نہ کہیں۔" "آپ کو امی جان بلا رہی ہیں۔" فرقان نے [illegible] کہا۔

احمر ہنستا مسکراتا ہوا فرقان کے ساتھ چلا گیا۔

احمر کو آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تو اس نے واپسی کے لئے اجازت طلب کی۔

شاہ صاحب بولے: "کیوں صاحبزادے ابھی آپ کو آئے ہی کتنے دن ہوئے ہیں جو جانے کا ارادہ کر رہے ہیں؟"

[illegible] کی منتظر ہوں گی۔ اب اجازت دیجئے۔"

خالہ جان نے ٹوکا: "بیٹے ابھی تم ٹھیک سے رکے بھی نہیں۔ میں نے اس کو خط لکھ دیا ہے وہ کل تک آ جائے گی۔ اگر تم چلے گئے تو وہ ہم سب سے خفا ہو گی۔"

"خالہ جان میں ان سے پھر مل لوں گا۔ دل تو چاہتا ہے یہیں بس جاؤں لیکن مجبوری ہے۔" لہجہ شوخ تھا اور نگاہیں صائمہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

صائمہ کا نازک اندام جسم لرز گیا اور چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ اچھی طرح اس کی شوخ و شریر طبیعت سے واقف تھی کہ وہ کسی کے سامنے کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ صائمہ کی امی نے بغور دونوں کو دیکھا اور کسی نوعمر لڑکی کے مانند کھل اٹھیں۔

"خالہ جان اب اجازت دیں۔ میں بہت جلد کسی خاص مقصد کے لئے آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔"

صائمہ گھبرا کر اٹھی اور برق رفتاری سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے ہی احمر کا فلک شگاف قہقہہ گونجا۔ امی اور ابو نے بھی ساتھ دیا۔

اس کے بعد نہ جانے کیا گفتگو ہوئی کہ احمر فائقہ کی واپسی تک رک گیا۔ اور دوسرے دن فائقہ جو سیماب طبیعت کی مالکہ اور بلا کی شوخ تھی ان سب کے بیچ موجود تھی۔ اس کے آنے پر تو بہاریں شباب پر پہنچ گئیں۔ تمام گہما گہمیوں میں سب کے وجود گم ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ احمر نے صائمہ کے وجود کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ احمر اور فائقہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے رہتے ہوش و حواس سے بیگانہ ایک دوسرے سے چپکے رہتے۔ صائمہ حیرت و استعجاب کے عالم میں تمام بدلے ہوئے حالات سے کوئی معنی اخذ کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کا معصوم دل [illegible] کی بات کو اس کی شوخ و لاابالی طبیعت کا ہی ایک [illegible] اور اپنے کو تسلی و تشفی دے لیتی کہ احمر اس کے ہیں [illegible] میں صداقت ہے انھیں اپنے عہد کا [illegible] طبیعت ہے جو فائقہ کی جانب راغب [illegible]

کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جذبات کی شدت سے اس کے سارے بدن میں کپکپی طاری تھی۔ اس نے جیس کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ جیس نے اسے اپنی باہوں میں لے لیا اور اس کی پشت تھپتھپانے لگا۔

"جیس! میں نے زندگی میں صرف تم سے پیار کیا ہے۔ اور مجھے روما سے بھی بہت پیار ہے۔ لیکن میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ خون خوار غالوں سے جنگ کرنے تم مت جاؤ۔ تم شہر پناہ کا حفاظتی کام بھی کر سکتے ہو۔"

"ہاں کر سکتا ہوں۔ لیکن ایک معمولی سپاہی کو شہنشاہ نوما اپنا داماد کیوں بنائے گا۔ اور پھر میں خود بھی ایک معمولی سپاہی کی زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔ یہ میری بہادری کے امتحان کا وقت ہے۔ اسی موقعے پر میں کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔ اپنے خوابوں کو حقیقت بنا سکتا ہوں۔ یہی لیہ تو میری آرزو ہے۔ امید ہے۔ تمنا ہے۔ میرا جوش اور ولولہ ہے۔ میری بہادری اور شجاعت ہے۔ لیکن میں یہ بھی چاہوں گا کہ میری ہونے والی بیوی بھی بہادر ہو اور ثابت قدمی سے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا جانتی ہو۔ ہم دونوں کو ہمت اور صبر سے ایک خوش آئند نتیجے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"میں تمہیں کبھی بھی نا امید نہیں کروں گی۔" یہی لیہ ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہو کر بولی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرا کر جیس کی طرف دیکھا۔ "تم میرے حوصلے اور صبر کا امتحان چاہتے ہو تو یہی عورت ہر مرد سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والی ہوتی ہے۔ تم دیکھو گے کہ کسی بھی موقع پر میرے قدم نہیں لڑکھڑائیں گے۔ میں

موجودہ اطالیہ کے وسط میں دریائے ٹیبر کے کنارے قدیم روما آباد تھا۔ دریائے ٹیبر آگے چل کر بحیرۂ روم میں گرتا ہے۔ اس شہر کی بنیاد ۷۵۳ ق۔م میں رومیولس نامی شہنشاہ نے ڈالی تھی اور اپنے ہی نام پر شہر کا نام روما رکھا تھا۔ یہاں پر عہد قدیم میں "اطالی" نسل آباد تھی۔ جس کی پانچ شاخیں تھیں۔ "لاطینی"۔ "سبائنی"۔ "اُسکانی"۔ "امبری" اور "سبلی"۔ اطالیہ کے شمال میں چار بڑی قومیں اور تھیں۔ "اِٹرسکن"۔ "غال"۔ "لگوری" اور "وینے تی"۔ وسطی اطالیہ میں بسنے والی نسلوں اور شمالی قوموں میں ہمیشہ جنگ رہی۔ جس میں خصوصی طور پر وسطی قوم "سبائنی" اور شمالی قوم "غال" میں کبھی نہیں بنی۔

شہنشاہ رومیولس کے بعد اس کا جانشین سبائنی قوم کا باشندہ نوما پمپی لیس بنا۔ جو چالیس سال کی عمر میں جب کہ وہ درویشی اختیار کر چکا تھا قوم کے اصرار پر تخت و تاج سنبھالنے پر آمادہ ہوا۔ نوما پمپی لیس نیک، حلیم الطبع، منصف اور عادل بادشاہ تھا۔ وہ حکیم فیثا غورث کا شاگرد تھا اس لیے عملاً پہلا بادشاہ تھا جو اس کی تخت نشینی سے [illegible]

میں خدا کا پیش کیا جانا ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور اسی لیے کیوری نالیس پہاڑی
پر ایک عظیم معبد تعمیر کیا جس میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی۔ اور اس آگ کو
"ویسٹا" یعنی وحدت کا مظہر مانا گیا تھا۔ یہ عمارت ویسٹا مندر کہلاتی تھی۔

یہ زمانہ قبل تاریخ کا ہے۔ قدیم کتبوں اور شہادتوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ
نیوما کے زمانے میں روما میں جمہوری طرز حکومت تھا۔ بادشاہ کو عوام چنتے تھے جیسا
کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اطالیہ میں شمال کی طرف ایک بڑی قوم غال آباد تھی جسے اہل روما
"گیل" اور اہل یونان "گلیتی" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ یہ لوگ موجودہ فرانس کے
میدانی علاقوں کے باسی تھے۔ پھر وہاں سے شمالی اطالیہ آئے اور کوہ الپس (قدیم
الپس) آکا سرسبز وادیوں نے ایسا لبھایا کہ یہیں بس گئے۔

سلطنت روما کے موبد اعظم فلمن کیوری نے اپنے حجرے میں سے نکل
کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ویسٹا کا مندر جس کا وہ موبد اعظم تھا کیوری نالیس پہاڑی
کی چوٹی پر تھا اور نیچے سارا شہر اس وقت صبح کے دھندلکے میں ڈوبا ہوا تھا۔
ڈھول تاشے نیز جھانجھ اور دف کی آوازوں نے اس کی صبح کی عبادت میں خلل
ڈال دیا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ جو لوگ آ رہے ہیں ان کا استقبال ہر صورت میں اسی
کو کرنا ہے۔ اس نے پہاڑی سیڑھیوں پر آدمیوں کے اس غول کو دیکھ لیا تھا جو
آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے۔ اس نے مندر کے خادم کو اشارہ کیا جس نے مندر
کے صحن میں لگے عظیم گھنٹے پر تین بار ہتھوڑی مار کر گویا آنے والوں کو عظیم مہمک ہونے کی
کی اطلاع دے دی۔ لوگوں کا جوش و خروش بڑھ گیا جس کا اظہار انہوں نے
ڈھول تاشے بجا کر کیا۔ موبد اعظم مندر کے صدر دروازے سے باہر
[illegible]

"میں نے غالوں کے معرکے میں اپنے آپ کو شہنشاہ کے سامنے
پیش کر دیا ہے۔ میں اس عظیم اور فیصلہ کن جنگ میں فوج کی کمان
کرنے کی اجازت لے چکا ہوں۔ میں اس جنگ میں خصوصی طور پر
جاؤں گا۔"

"نے بیس ۔۔۔!" پمپی لیہ سہم سی گئی۔ "وہ قوم بڑی جابر اور
قاہر ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ اور یہ بات بھی طے ہے کہ اس جنگ میں یا تو
ہم دنیا کے نقشے سے مٹ جائیں گے یا ہمیشہ کے لیے کامران ہو کر ابھر
جائیں گے۔"

"نے بیس ۔۔۔" پمپی لیہ نڈھال سی ہو کر نے بیس کے شانے پر
سر ٹیک کر بولی: "زندگی بہت حسین چیز ہے اس سے یوں مت کھیلو
محض میری وجہ سے خود کو داؤ پر مت لگاؤ۔ میں ۔۔۔ میں تم سے بے
پناہ محبت کرتی ہوں۔ نہیں نہیں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میں تمہاری
راہ کی رکاوٹ بن کر تمہیں روک لوں گی ۔۔۔"

"پیاری شہزادی! اگر اس جنگ میں ہم جیت گئے تو تمہارا نے
بیس جو اپنے ملک اور بادشاہ کے لیے جان کی بازی لگائے گا تمہیں
بڑے وقار اور عزت کے ساتھ شہنشاہ سے مانگ سکے گا ۔۔۔ اور
دوسری صورت میں عظیم ویسٹا نہ کرے اگر ہم ہار گئے تو نہ روما ہوگا
نہ اہل روما اور نہ تمہارا نے بیس ۔۔۔ مگر یقین کرو میری محبت مجھے
فاتح بنائے گی۔"

"خدائے بزرگ و برتر ایسا ہی کرے ۔۔۔" پمپی لیہ کے حسین ہونٹ

"ہاں۔ بہر کرانے وقت میں ہمیں خدائے لازوال کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ وہ دونوں کی اعوال سننے والا ہے۔"

کیوری نالیس پہاڑی کے مشرقی دامن میں بہنے والے جھرنے کے پاس پھیلے سبزہ زار نے اس حصہ کے حسن کو اور بڑھا دیا تھا۔ خودرو بیلوں کے رنگ برنگے پھول زمین پر بکھرتے تو ہری ہری گھاس کے ساتھ مل کر کسی شاہی قالین کی طرح بچھ جاتے۔

ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں بچھپلیہ اور نے ہیس بیٹھے مستقبل کے خواب دیکھ رہے تھے۔ نے ہیس نے شہزادی کی شربتی آنکھوں میں جھانکا اور بولا:

"بچھپلیہ عظیم دلیسٹا نے ہم دونوں کو شاید ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہے۔ اب مجھے یقین ہے کہ میں ایک عام سپاہی شہنشاہ نیوما کی بیٹی کو اپنی زندگی کا ہم سفر بنا سکوں گا۔"

"بڑے اعتماد اور یقین سے یہ بات کہہ رہے ہو، کوئی خاص بات ہے؟"

"ہاں ــــ حالات نے ایسا رخ بدلا ہے کہ میں بہت ہی جلد شہنشاہ نیوما پمپی لیس کے لیے ایک اہم شخصیت بن جاؤں گا۔ میں اپنے مقام سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ پالوں گا اس کے بعد نیوما جیسے نیک سیرت بادشاہ کے لیے مجھے اپنا داماد بنانے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوگی۔"

"[illegible] کبھی نہیں۔"

کے بالکل قریب زیکا آتش کدہ روشن تھا۔ فیثا غورثی گروہ آگ کو وحدت کا مظہر مانتا تھا اور شہنشاہ نیوما فیثا غورث کا معتقد تھا۔ اس نے یہ مندر اسی لیے بنایا تھا کہ مقدس آگ ہمیشہ روشن رہے۔ اس مقدس آگ کی نگرانی اور حفاظت کے لیے مقدس کنواریاں تھیں۔ نوبدا اعظم ظےمن کیوری ان کنواریوں کا نگہبان تھا۔

ستر سالہ ظےمن کیوری مندر کے اندر پہونچا۔ سفید حریری سایوں میں ملبوس سر پر سفید رومال باندھے پندرہ بیس انتہائی حسین و جمیل لڑکیاں مقدس آگ کے گرد ہاتھ باندھے سر جھکائے مناجات میں مشغول تھیں۔ آگ کی تیزی اور حدت سے ان کے سرخ و سفید رنگ دہک رہے تھے۔ پیشانیاں عرق آلود تھیں ظےمن جا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ مناجات ختم ہوئی۔ تو ظےمن نے آگے بڑھ کر مقدس آگ کے گرد تین پھیرے لگائے اور پھر ہاتھ باندھ کر بولا:

"اے مقدس دیوتا! میں تیری ان کنواری اور اچھوتی خادماؤں کا نگہبان تجھ سے ہر لمحہ مدد چاہتا ہوں، تو میری بھی نگہبان ہے، اور خاصان خدا شہنشاہ نیوما کی بھی، تو اپنے ان گنہگار بندوں کی بھی نگہبان ہے جو تیرا نام لے کر منت مانتے ہیں اور اپنی پاک دامن بیٹیاں تیری خدمت کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ تو رحمت بھی ہے اور غیظ و غضب بھی۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے غیظ سے اے مقدس دیوتا ہمیں استقلال دے۔ ہمیں استقلال دے۔"

ڈھول اور جھانجھ کی آواز بہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ دعا سے فارغ ہو کر ظےمن نے ایک نظر ان لڑکیوں پر ڈالی اور بولا:

"محبوب خدا بننا ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو خدائے بزرگ و برتر اور خاصان خدا کے لیے اپنی خواہشات کو

قربان کرتے ہیں۔ اور فلاح ابدی پاتے ہیں۔ خداوند خدا اور عظیم
ویسٹا ہم پر مہربان ہو، جاؤ نذر و نیاز کا انتظام کرو۔"
لڑکیوں نے معبد اعظم کو جھک کر تعظیم دی اور آہستہ آہستہ دوسرے حصے
میں چلی گئیں۔

فلےمن بھی اس عظیم کمرے سے باہر نکلا اور اپنے حجرے میں پہنچ کر اس نے
خاص موقعوں پر پہنے جانے والا شاہی چغہ "مکلینا" پہنا اور لمبی مخروطی شکل کی
ٹوپی پہن کر مندر کے خادموں کے ساتھ باہر آیا۔

مندر آنے والوں کا ہجوم اب چالیس پچاس قدم دور تھا۔ فلےمن نے مندر کے
صحن میں کھڑے ہو کر اپنا عصا فضا میں بلند کیا۔ آنے والے ایک لمحے کو رکے اور
پھر سب کے سب دو زانو ہو گئے۔ مقدس کنواریاں چہروں پر باریک نقاب لگائے
فلےمن کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"اٹھو ۔۔۔ اور آگے بڑھو۔"

فلےمن کی آواز گونجی۔ "ویسٹا جو وحدت اور پاکیزگی کی مظہر ہے۔ جو خاموش
عبادت کی تکریم کا درس دیتی ہے۔ جو خدائے پاک کو جسمانی شکل دینے کی منکر
ہے۔ جو قول ربانی سے انسان کے پیچیدہ مسائل کا حل دیتی ہے۔ آؤ۔ اور اس
کے لیے قربانی دو ۔۔۔ اپنی نیک معصوم اور پاکیزہ لڑکیاں۔"

لوگ نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے اور مندر کے صحن میں آکر صف بستہ
کھڑے ہو گئے۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں، نگاہیں زمین پر تھیں کیونکہ
مقدس کنواریوں کو نظر بھر کر دیکھنے کی سزا سو کوڑے تھی اور اگر کوئی دانستہ
[illegible] تا تو زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا۔ چونکہ عظیم ویسٹا کی
پاک خادمائیں [illegible] جب بھی وہ باہر نکلتیں تو عام آدمی ان کی پاکی

پیار میری زندگی کی بہار ہے لیکن میں اپنے شہنشاہ کا [illegible] اور میری
غیرت گوارا نہیں کرے گی کہ وہ میری ذات سے ادنیٰ سا بھی [illegible]
متانت اور وقار کے ساتھ صابرہ بن کر اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب میں
تجھے خود آواز دوں۔"

"عظیم ویسٹا گواہ رہنا کہ میں نے جیس کی عزت اور حرمت بن کر اس کا انتظار
کروں گی۔" پیپی لیہ نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

فلےمن کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات ختم ہو چکے تھے۔ اس نے دونوں پر
پُرشفقت نظر ڈالی اور دوسرے حصے میں چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے آتش کدے میں عود و عنبر اور دیگر خوشبوئیں ڈال
کر اسے اور دہکایا۔ پھر نہایت خشوع و خضوع سے ان دونوں کے لیے دعا کی۔ ان کی
چاہت کے پھلنے پھولنے کی، ان کی آرزو کی حفاظت برقرار رہنے کی، ان کی خوشحالی کی،
اور روشن مستقبل کے لیے وہ دیر تک گڑگڑاتا رہا کیونکہ جیس کی اعلیٰ صفات،
شرافت اور نیکی کے باوجود وہ جانتا تھا کہ پیپی لیہ روما کی شہزادی ہے اور جیس
ایک معمولی سپاہی ۔۔۔ دونوں کا سنجوگ بظاہر ناممکن تھا۔

"کیا سوچنے لگے مقدس باپ؟" پیپی لیہ دیر سے انھیں چپ دیکھ کر بولی۔
فلےمن خفیف سا مسکرایا۔ پھر آہستہ سے بولا:
"کیا تو اس دن عظیم ویسٹا کی زیارت کو نہیں آئے گی جب شہنشاہ روما
اپنے غلاموں کا دامن مانگے گا۔ فتح اور نصرت کا خواستگار ہو گا۔"

"میں ضرور آؤں گی۔ سنا ہے اس دن پر عظمت ویسٹا، انتہائی جاہ و جلال
میں ہوتی ہے ۔۔۔ اور پھر روما کی سلامتی ہماری سلامتی ہے۔" اس نے جیس
کو یاد کر کے بولی۔ میں خود بھی ویسٹا کے حضور نذر دوں گی اور منت مانوں گی۔"

رہنے مخصوص ہوتے تھے۔
اس وقت سب کے چہروں پر خوشی اور اطمینان تھا اور سب اپنے بادشاہ
کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دربار شروع ہونے سے پہلے ولیشا
مندر کے خداوند سے سالگی نے کھڑے ہو کر خدا کی شان میں مناجات پڑھی پھر
بادشاہ اور ملک کی سلامتی کے لیے دعا کی اور عظیم ولیشا سے عوام کے لیے خوش
حالی مانگی۔ اور اس کے بعد بادشاہ کو دربار کرنے کی گویا اجازت مل گئی شہنشاہ
نیوما نے سب پر ایک نظر ڈالی اور بولا:
"میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں کہ جس کی نادیدہ ہستی حواس
انسانی سے نہیں، بلکہ عقل و تدبر سے پہچانی جاتی ہے۔ میں شہنشاہ نیوما
پمپیلیس جانتا ہوں کہ معزز بزرگ فلےمن کی خدمات، مقدس آتش
کدے کی روشن آگ اور پاک باطن کنواریوں کی زبان سے ولیشا کے
لیے مناجات ہی ہمارے ملک کو عظیم تر بنائیں گی۔ ملکات ربانی نے مجھے
یقین دلایا ہے کہ میں ملک و قوم کی نگہبانی اور خدمت کے لیے بھیجا گیا ہوں
میں قسم کھاتا ہوں اس ان دیکھی، ان چھوئی ہستی کی اور قسم کھاتا ہوں
ایمان کی جو دنیا میں متبرک ترین قسم ہے، کہ میں اپنے ملک میں امن و
امان، خوش حالی اور عوام کی حرمت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہوں گا اور
وہ قوانین بناؤں گا جو سب کو نیکی کی طرف راغب کرنے والے ہوں گے
مجھے اپنی فوج پر فخر ہے جو ایثار اور ہمدردی، ہمت و شجاعت میں
بے مثل ہے۔ اگرچہ دریائے ٹیبر کے اس پار فلاں پر فتح خدائے بزرگ
و برتر کے کرم سے ملی ہے لیکن اس میں [illegible] بازوؤں کا حوصلہ
[illegible] شامل ہے۔ لیکن [illegible] ہمت [illegible] ایک

بڑی جنگ سے متعلق رہنے کے لیے شہنشاہ نیوما قوانین [illegible]
ہے۔ اگلا مہینہ فروری کا ہے۔ جو اہل روما کے نزدیک [illegible] ہے
اس مہینے میں آسمانی دیوتا زمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس کی [illegible] کی
آٹھویں تاریخ کو شہنشاہ یہاں آنے والا ہے۔"
"میں سب کچھ جانتی ہوں مقدس باپ۔ لیکن عظیم ولیشا نے سارے روما
میں ایسا دلاور ایک ہی شخص پیدا کیا ہے۔"
"تیرا اشارہ فےبیس کی طرف ہے؟" وہ بولا
"ہاں ـــ" پمپیلیہ، فےبیس کے تصور میں ڈوب گئی۔
ستر سالہ فلےمن کیوری شاید سارے روما میں وہ واحد شخص تھا جو
شہزادی اور فےبیس کی محبت کے بارے میں جانتا تھا کیونکہ ان دونوں نے
اپنی محبت کی کامیابی اور ہمیشہ ساتھ رہنے کی قسم ولیشا کے سامنے ہی کھائی
تھی۔ اسے وہ شام یاد آئی جب سالانہ زیارت کے موقع پر سارے روما کے
لوگ ولیشا مندر آئے ہوئے تھے۔ تین روز کے لیے اس پہاڑی پر ایک میلہ سا
لگ جاتا پھر تین روزہ زیارت کے بعد ایک ہفتہ کے لیے مندر عوام کے لیے بند کر
دیا جاتا۔ تاکہ مندر کی دھلائی اور آتش کدے کی صفائی ہو سکے۔
مندر کی دھلائی اور صفائی کے بعد سارے خادم تھک کر اپنے حجروں
میں آرام کے لیے جا چکے تھے۔ فلےمن نے اپنا عصا اٹھایا اور صفائی کے معائنہ
کے لیے چل پڑا۔ مختلف دالانوں اور کمروں سے ہوتا ہوا وہ مرکزی ہال میں
داخل ہوا تو آتش کدے کے پاس کسی کی سرگوشی نے چونکا دیا۔ وہ آہستہ
آہستہ آواز کی طرف آگے بڑھا اور حیران رہ گیا۔ شہزادی پمپیلیہ آتش کدے کی جالی
سے لگی کھڑی تھی اور اس کا ہاتھ [illegible] فےبیس کے ہاتھ میں تھا

و نیاز کا گواہ ہے — تو بہادر بھی ہے اور موقع شناس بھی۔ ہم تجھے اس
مہم پر بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اور تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیری کامیابی
تجھے کتنا عظیم بنا دے گی۔ تو ملک کے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔ اور ہمارا
دستِ راست —!"

"شہنشاہ روما عظیم ہے۔" فے نیس ایک دفعہ اور اس کے سامنے جھک
گیا —!

"تو جا سکتا ہے۔ ہم کچھ دیر میرے ہی متعلق سوچنا چاہتے ہیں۔"

شہنشاہ نیوما پمپلیس کی بیٹی اور عظیم ویسٹا کی عقیدت مند شہزادی
ہیکالیہ ہر مہینے مقدس آگ کی زیارت کے لیے ویسٹا مندر جاتی تھی۔ محل سے
پہاڑی کے دامن تک وہ نفیس تام جھام میں بیٹھ کر جاتی لیکن وہاں سے مندر
تک سو سوا سو سیڑھیاں وہ خود چڑھتی تھی۔ اس کی ویسٹا سے یہ عقیدت
تھی کہ وہ بغیر کسی تکلف کے اوپر پہنچتی اور ویسٹا کی کنواری خادماؤں کے
ساتھ مناجات میں شرکت کرتی۔ پھر ظے من کی خصوصی دعا میں شریک ہوتی
اور عالم ہی آجاتی۔ وہ مقدس کنواریوں کے لیے مختلف تحائف لے جانا کبھی نہ
بھولتی تھی۔ اسی لیے وہ خدمت گزارانِ ویسٹا میں بھی ہر دل عزیز تھی۔ اس وقت
بھی وہ مناجات اور دعا سے فارغ ہو کر ظے من کے ذاتی حجرے میں پہنچی۔

"آ ہیکالیہ — میں تیرا ہی منتظر تھا۔ تیرے جیسی نیک دل اور پاک
باطن بیٹیاں روما ہی پیدا کر سکتا ہے۔ تیرے چہرے کی صباحت ظاہر کرتی
ہے تو خدائے بزرگ کی رحمتوں میں سے ایک ہے۔ عظیم ویسٹا تیری محافظ ہو
کیا عظیم ویسٹا قاتلوں سے اپنے بھتیجے کو آزاد کرانے کے لیے اور ایک

کڑا امتحان باقی ہے۔ یہ عظیم ملک روما جو عظیم شہنشاہ رومیولیس
نے بسایا تھا، اس لیے نہیں ہے کہ ملیچھ غال آکر اسے تاراج کر دیں
ہم محبت کرنے والوں کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ میری سبائنی قوم کو
رومیولیس نے خوش آمدید کہا تھا۔ میں اپنے شہنشاہ کے ساتھ دغا
نہیں کروں گا۔ کیا یہ بات ہمارے لیے باعثِ ذلت نہیں ہوگی کہ ہم
محض اپنی امن پسندی کی بنا پر غال قوم سے شکست کھا جائیں۔ آج
کی یہ مجلس میں نے اسی لیے بلوائی ہے کہ ہم ایک بڑی فتح کے لیے خود کو
تیار کر لیں۔ لیکن اس کے لیے ایک بڑی جنگ بھی ضروری ہے۔ وہ قوم
وحشت، بربریت، شقاوت میں اپنی مثال آپ ہے۔ تم میں وہ کون
ہے جو خدائے لازوال کے نزدیک محبوب اور عوام میں مقبول بننے کے
ابھی صرف خواب ہی دیکھتا ہو وہ آگے بڑھے اور اپنی بہادری، بے خوف جرأت
اور جانثار مندی سے مقصدِ زندگی حاصل کر لے۔ یاد رکھو کہ آسمانی
خدا زمین پر بسنے والے انسان کی طرف محبت اور ہمدردی، رحم اور کرم
کا جذبہ رکھتا ہے۔ تو پھر ہم انسان نیک ارادوں اور اچھے اعمال میں
کیوں پیچھے رہیں — میں مقدس بزرگ ظے من کیوری سے مخاطب
ہوں کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں ویسٹا کی بارگاہ میں آکر قبولِ ربانی
کے ذریعہ استخارہ کروں اور اس معاملے میں اس کی مدد اور مرضی طلب
کروں۔ اور میں حسبِ استطاعت نذر و نیاز پیش کروں کہ عظیم ویسٹا
لافانی ہے۔"

ظے من نے کھڑے ہو کر نیوما کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر نوما کا
۷۰ قدم کا دن شہنشاہ کی حاضری اور نذر و نیاز کے لیے مقرر کر دیا —

اس کے لیے دربار برخاست کر دیا۔

شہنشاہ نیوما کی فوج کا ایک سپاہی بڑے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ نیوما کے خصوصی ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا۔ اور بادشاہ کے آگے جھک کر اسے تعظیم دی۔ وہ ۲۰ سالہ خوبصورت، وجیہہ، بلند و بالا قد آور اور سجیلے نے تیس کے چہرے پر ایک پسندیدہ نظر ڈال کر شہنشاہ نیوما بولا:

"میں جانتا ہوں کہ تو بہت بہادر اور غیور ہے۔ شجاعت میں یکتا ہے۔ اور فنون سپہ گری میں بے مثل ہے۔ تیرے چہرے کی تابناکی تیری آنکھوں کی روشن چمک اور تیرے جسم کی مضبوطی بتاتی ہے کہ تو ہر کام کر گزرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ لیکن تو ابھی نوجوان ہے۔ تیرا خون اس ملک کے لیے بہت قیمتی ہے۔ میں مجبور ہوں۔ تجھے کو ظالم خالوں میں بھیجنا پسند نہ کروں گا جب کہ انہوں نے میرے جوان بھتیجے کو بھی قید کر رکھا ہے۔ مجھے کسی تجربہ کار کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم اس وقت ان کے ہاتھوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"خاصانِ خدا، محبوبِ ویسٹا شہنشاہ نیوما یہی بس اپنے آپ کو ملیچھ خالوں کے ہاتھوں مجبور و بے بس سمجھیں، یہ بات میرے لیے تکلیف دہ ہے۔"

نے تیس نے کہا۔

"دشمن کو کبھی حقیر مت جان۔ ابھی تو کم عمر ہے، ناتجربہ کار ہے۔ میں جانتا ہوں تیری بہادری اور جوش تجھ سے یہ کہلوا رہا ہے۔ لیکن مجھے اس عظیم مہم کے لیے کسی پختہ [illegible] ہوش اور پختہ عمر والے شخص کو منتخب کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ [illegible] پھر نا امید ہو سکے۔"

"شہنشاہ نیوما کی خدمت میں یہ معمولی سپاہی التماس کرتا ہے کہ روما کا بچہ اور بوڑھا شجاعت میں یکساں ہے۔ [illegible] جوش اور ہوش نے ایسے ہزاروں موقعوں پر مستقل مزاجی سے [illegible] فتح پائی ہے۔ میں آپ سے امید کروں گا کہ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔"

"خدائے بزرگ و برتر اور عظیم ویسٹا تجھے محفوظ رکھیں، تو اپنی جان سے کھیلنا کیوں چاہتا ہے؟" نیوما نے حیرت اور تجسس سے پوچھا تو نے تیس کی نگاہوں میں حسین و جمیل نازک ادا سپی لیہ گھوم گئی جو حسن و جوانی کا مجسمہ تھی، محبت کا سرچشمہ تھی، وفا اور جانِ وفا تھی۔ جس کے دل میں نے تیس کے لیے پیار کے پھول کھلتے تھے۔ جس کی روشن آنکھوں میں نے تیس کے لیے انتظار کے دیپ جلتے تھے۔ اور جس کے گلاب رنگ ہونٹوں سے نے تیس کے لیے محبت کے مدھر نغمات نکلتے تھے!

"تو چپ کیوں ہو گیا؟" نیوما نے اسے ٹوکا۔

نے تیس چونک پڑا۔

"شہنشاہ نیوما کا یہ ادنیٰ غلام عظیم ویسٹا کو گواہ بنا کر یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ میرے دل میں اہلِ روما کے لیے محبت کا ایک سمندر موجزن ہے۔ اور جو کوئی ان پر ظلم کرے گا میں اس کو نہیں بخشوں گا۔ پُر عظمت روما کے ہر ذرے کا میں محافظ ہوں۔ یہی میرا حلف ہے۔"

"ہم خوش ہیں کہ تیرا دل نیکی سے معمور ہے اور تو اپنے ملک کے تئیں اچھے جذبات رکھتا ہے۔" نیوما بولا۔ "اگلے ماہ نزدیکی ایام میں عظیم ویسٹا کے معبد میں حاضری دیں گے اور قربانی کے ذریعہ اس کی معرفت طلب کریں گے [illegible] گے کہ تو بھی اس دن ہمارے ساتھ ویسٹا کے معبد [illegible] حاضر ہو اور [illegible]

انہوں نے اسے تمہارے سر دے مارا۔ مجھے تو تم پر ترس آتا ہے۔ اگر پولیس نے تحقیقات کی تو پھر۔۔۔ وہ اور میجر صاحب تو اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر صاف الگ ہو جائیں۔ تم البتہ چور کو پناہ دینے پر بندھے بندھے پھرو گے! سمجھے!"

چوکیدار نے اس بے تکان جھوٹ کو سچ سمجھا۔ یہ تک نہ پوچھا۔ لڑکی نے کہاں چوری کی۔ کہاں سے بھاگی۔ کچھ نہیں۔ بس وہ نعمانی کو دیکھتا رہا

"اچھا بھائی۔ روپے میں نے تمہیں پہونچا دیئے۔ اب میں چلا۔" نعمانی نے اداکاری کی۔

"ٹھہر جائیے صاحب۔ اس لڑکی کا میں کیا کروں۔؟"

"وہ ہے کہاں؟"

"اسی گھر میں۔ ایک کوٹھری میں پڑی ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ سسری نے عذاب میں زندگی کر دی ہے۔ بخار اسے بہت تھا۔ اب کا پتہ نہیں۔ واہ کیا مالک ہے ہمارا بھی۔ غریبوں پر ترس کھانا تو جانتے ہی نہیں۔ اپنی جان چالی۔ ہمیں اٹکا دیا۔!"

"کہیں بھگا دو اسے۔" نعمانی نے کہا۔

"میں کہاں بھگا دوں صاحب۔ اسے آپ ہی کہیں لے جائیے۔"

"میں کہاں لے جاؤں۔ میں تو صرف روپئے پہونچانے آ گیا تھا۔"

"آپ اسے بھی لے جائیے اور بیگم صاحب کے روپئے بھی۔ مجھے پولیس تھانے کے نام سے چکر آتے ہیں۔ ایک دفعہ دس سال بھگت چکا ہوں۔ تب بھی کسی بے ایمان کی ضمانت میں ناحق کی جھیلی تھی۔ اب پھر دوسروں کی کرنی کا خمیازہ نہیں بھگتوں گا۔ میں باز آیا صاحب۔!"

اور پھر تقدیر بن کر بگڑ گئی۔ ہوا یوں کہ معتصم کے ماموں جان نے جو اپنی بہن اور بھانجہ وغیرہ سب سے ناراض تھے، اپنی صاحبزادی الماس کی شادی بیاہ میں مہمان بلایا تو صرف رضوانہ بیگم کو۔ اور کارڈ تک علوی صاحب کو نہیں بھیجا۔ باجی جان کی آمد کی خبر نعمانی کو لگی۔ وہ بھاگے آئے اور معتصم سے کہا:

"قسمت تم سے ناراض ہے۔ نجانے اب کیا ہوگا۔ باجی جان خود حیدر آباد آ گئی ہیں۔ الماس کی شادی ہے!۔ اب اگر وہ یہاں بھی آ گئیں تب۔ سارا قصہ انہیں معلوم ہو جائے گا۔!"

"میں اب نہیں ڈرتا کسی سے بھی۔" معتصم نے جواب دیا۔ "باجی جان پرائے گھر کی ہو گئیں۔ انہیں مجھ سے جواب طلبی کا حق کیا ہے؟"

گھر میں پچھلا قصہ نامرضیہ جو کچھ دب سا گیا تھا۔ اور بظاہر معتصم کی بے رخی نے بندو کو باور کرا دیا تھا کہ وہ ہنگامہ ان کی ہنگامی دلچسپی پر مبنی تھا۔ ایک دفعہ پھر سے تازہ ہو گیا۔ رضوانہ بیگم کی آمد آمد نے ایک کھلبلی سی مچا دی۔

رومہ کو ایک خطرہ سر پر منڈلاتا محسوس ہوا۔

الماس کی شادی کے بعد سرسری طور پر رضوانہ بیگم اپنے والدین سے ملنے آئیں۔ انہیں ساری تفصیل بیگم علوی نے لکھ بھیجی تھی۔ لہٰذا رضوانہ بیگم معتصم سے نہیں ملیں۔ سلام کا جواب تک نہ دیا۔ اس کے علاوہ رومہ کو ان نظروں سے دیکھا جیسے قصائی بکری کو دیکھتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اسے نہایت حیا سوز طعنے دینے لگیں۔ معتصم کی ساری بہادری پانی بن کر بہہ گئی۔ بہن کے سامنے منہ تک نہ کھول سکے۔ اب وہ رومہ کے سائے کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دل ہی دل میں کڑھتے اور پریشان ہوتے۔ جانے باجی جان اس سے کس قسم کا سلوک کرتی ہیں۔ جب بیتابی دل حد سے بڑھی تو ان سے پھر ایک [illegible]
[illegible]

منصور ڈھائی برس کا تھا۔ مگر چوں کہ بہت ذہین و فطین بچہ تھا اور اپنی عمر سے بڑھ کر سمجھداری کی باتیں کرتا تھا لہٰذا معتصم کو اس کی دانش مندی پر سو فیصدی بھروسہ تھا۔ انہوں نے اسے خوب اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

"چپکے سے رومی پھوپھی کے ہاتھ میں دے دینا۔ اور کسی کو مت دینا۔ اچھا۔ پھر میں تمہیں کیڈبری چوکلیٹ کا پورا پیکٹ دوں گا۔ بتاؤ تو شاباش یہ پرچہ۔ یہ کاغذ۔ تم کسے دو گے؟"

"رومی پھوپھی کو۔" منصور بولا۔ "ماموں جان چوکلیٹ کہاں ہیں؟"

"پہلے تم یہ کاغذ پھوپھی کو دے تو آؤ۔" معتصم نے کہا۔ پھر خوشامد کے مارے اس کا سر سہلایا، پیار کیا اور پھر سمجھایا۔ اس کے بعد اسے خوب بخثہ کرکے اندر بھجوا دیا۔ اور خود اچھلتے پھاندتے دل کو دبوچے برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔

منصور پرچہ مٹھی میں دبوچ کر اندر آیا۔ اس وقت دالان میں سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رضوانہ بیگم بڑی حسرت سے الماس کی شادی کی تفصیل سنا رہی تھیں۔ کس طرح ماموں جان نے ڈھیروں جہیز چھپر قسم کے زیور اور نجانے کتنا نقد دیا تھا۔ معتصم کے حواس پر بجلی نہ گرتی تو یہ سارا سامان انہی کو ملتا! بیگم علوی غم دیا اس کا مجسمہ بنی بیٹھی سن رہی تھیں۔

اتنے میں منصور چیختا ہوا اندر آیا۔ "رومی پھوپھی۔ رومی پھوپھی۔ ایک چیز لایا ہوں۔" خوب کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ اس کے لیے تو یہ ایک تماشہ تھا۔

رومی دالان کے سرے پر فرش کی چوکھٹ پر بیٹھی انصار کو چائے پلا رہی تھی اس نے سر اٹھا کر منصور کو دیکھا۔ اس کھلکھلا کر ہنسنے اور چیخنے پر سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ بیگم علوی نے پوچھا

"کیا لایا ہے میرا بیٹا۔ ہمیں دے دے۔!"

"بالکل بالکل۔" نعمانی خوشی کے مارے پاگل ہوتے ہوتے بہت ضبط کر کے بولے۔

"سردار خاں صاحب آپ کے اس طرح کہنے پر یاد آیا کہ بیگم صاحب نے سو روپے آپ کو بھیجے تھے، یہ لیجیے۔!"

ایک کرارا نوٹ دیکھ کر سردار خاں کا رہا سہا شبہ باطل ہو گیا۔ انھیں یقین آ گیا کہ یہ نیا آدمی بیگم صاحبہ کا فرستادہ ہے۔

"کھیلا کیا ہے صاحب؟" چوکیدار نے پوچھا

"کہیں بیٹھے تو بتاؤں۔" نعمانی نے کہا۔

"آئیے جناب۔ گھر قریب ہی ہے۔"

اس نے نعمانی کا ہلکا پھلکا سوٹ کیس خود لے لیا۔ اور دونوں آگے پیچھے ایک طرف ہو لیے۔ نعمانی کو سخت حیرت اور بے انتہا مسرت تھی۔ انہیں ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا کہ کامیابی اس قدر جلد ان کے قدم چومے گی!

سردار خاں نے اپنی چھوٹی سی بیٹھک میں نعمانی کو دری پر بٹھایا پھر بھاگ کر غالباً بیٹھانی کو کچھ ہدایت کی اور باہر آ کر نعمانی کے پاس ٹک گئے!

"آپ کو میجر صاحب کی بیگم نے بڑے گھپلے میں پھنسا دیا ہے۔ خان صاحب۔" نعمانی نے کہا۔ "یہ لڑکی شہر سے چوری کر کے بھاگی ہے۔ چونکہ ان کو پتہ نہیں۔ لہٰذا انھوں نے اسے پناہ دے دی۔"

"آہا۔ شاید اسی لیے اسے چار چوٹ کی مار پڑتی تھی۔"

نعمانی کے دل پر کسی نے گھونسہ مار دیا۔ لیکن وہ کھانس کر سرسری انداز میں بولے: "ہاں۔ اور پھر اس خیال سے کہ پولیس انھیں پریشان نہ کرے

تیور تو یہ کہہ رہے تھے کہ وہ مرعوب کرے گا۔! نعمانی نے اس سے بھی یہی
سوال کیا۔!

"آپ کا نام کیا ہے؟" سردار خاں نے انہیں گھورا۔

"رشید احمد — تم میری بات کا جواب دو۔!"

"آپ اس سے پہلے تو کبھی نہیں آئے۔!"

"ہاں۔ میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں۔" نعمانی نے کہا۔ "ابھی اپنے چچا
سے ملنے گیا تھا۔ وہ تمہاری بیگم صاحبہ سے پتہ چلا کہ وہ کسی لڑکی کو یہاں چھوڑ
گئی ہیں۔ اس کا حال معلوم کر آؤں۔ ان کے والد بیمار ہیں۔ ابھی وہ بہت دنوں
تک یہاں نہیں آسکیں گی۔ اس لیے۔ لڑکی کا حال معلوم کرنا تو فرض ہی ہے
کیا وہ گھر میں ہے؟۔"

"صاحب کیا بتاؤں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ کو بیگم صاحبہ نے بھجوایا ہے۔ مگر
وہ تو ہم سے کہہ گئی تھیں کہ اس لونڈیا کی خیر خبر کسی کو کانوں کان نہ لگے۔"

"اب لگ گئی ہے خان صاحب۔ ورنہ میرے فرشتے تو مجھے اس کی خبر نہ
دیتے۔" نعمانی شادی مرگ ہوتے ہوتے بال بال بچے۔

"صاحب وہ چھوکری کو میرے حوالے کر گئی تھیں۔" سردار خاں نے بہت
برا سا منہ بنا کر کہا۔ "لیکن اب کیا کہوں۔" اس نے ایک گالی دی۔ "چھوکری
نے جان ضیق میں ڈال دی ہے۔ بخار میں مر رہی ہے۔ اب دوا دارو کا
جھگڑا کون کرے سرکار۔ بیگم صاحب نے تو اس کے کھانے پینے کفن
دفن کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ ہم بھی بال بچے والے ہیں۔ سرکار۔
تری اپنے پتول سہاری۔ ایک زیادہ نفر کا بوجھ ہم غریب آدمی کیسے برداشت
کر سکتے ہیں۔"

بچے نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "نہیں دادی امان نہیں۔ آپ کی چیز نہیں ہے۔ یہ تو
ماموں جان نے دی ہے۔ رومی پھوپھی کے لیے۔!"

بیگم علوی کا ماتھا ٹھنکا۔ رضوانہ بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ رومہ کے ہاتھ سے
پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ چہرہ کاغذ سا سفید ہو گیا۔!
رضا وہیں بیٹھے تھے۔ انھوں نے منصور کو پکار لیا۔ اور جب وہ باپ کے پاس
گیا تب اس کے ہاتھ سے پرچہ لے لیا۔

"رومی پھوپھی کا ہے۔ رومی پھوپھی کا ہے۔" منصور چلانے لگا۔

"ہم انھیں دے دیں گے۔ تم جا کر کھیلو۔!" رضا بولے۔ منصور سب کچھ بھول بھال
کر پھر کھیل میں لگ گیا۔ رضا نے مڑا تڑا کاغذ کھولا۔ رضوانہ بیگم آگے سرک کر پرچے پر
جھک پڑیں۔ اور بیگم علوی کی آنکھیں تارہ بن کر دونوں بہن بھائی پر لگ گئیں۔

پردہ نشیں۔ مجتبیٰ۔

"جانتا ہوں کہ تم نہیں بدلیں۔ میری تقدیر بدلی ہے۔ ظرف ٹوٹتا ہے صدا
دیتا ہے۔ میرا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اس کی آواز کسی نے نہ سنی۔ بس دعا دے رہا
ہوں۔ اپنے مقدر کو اور اپنے بڑوں کو۔ تم حالات کی ستم ظریفی پر گھبرانا مت۔
ایک دن ایسا آئے گا جب ہم ملیں گے ...... یہ پرچہ ضائع کر دو۔ ورنہ پھر
ہمارے سروں سے طوفان گزر جائے گا۔ کاش۔ باجی جان جلد رخصت
ہوں تاکہ ملنے کی کوئی صورت نکلے۔!" م

آگ لگ گئی رضوانہ بیگم کے تن بدن میں۔ رضا کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے
لگیں اور بیگم علوی کو تو سانپ سونگھ گیا۔!

رضا نے جلدی سے کہا۔ "باجی جان۔ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا اور اب
بھی کہتا ہوں۔ سانپ جیسے ...
[illegible]

ہے۔ چیخنا چلانا محض بیکار ہے۔ آپ کو جو ہدایت میں نے دی تھی۔ خدا کے لیے اس پر عمل کیجئے۔ ورنہ میں نہیں کہہ سکتی کہ آئندہ کیا ہوگا۔"

"غضب خدا کا۔" رضوانہ بیگم نے کہا۔ "اس خدائی خوار بے شرم کے جوتے نہ مارو گے؟ اس بے حیا سے بھی کچھ نہ کہو گے؟؟"

"نہیں کچھ نہیں۔" رضا نے کہا۔ "اور آپ بھی کچھ مت کہئے۔ آپ کب جا رہی ہیں۔؟"

"اب تو جلد ہی چلی جاؤں گی۔ سب بچوں کو چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"بس تو پھر ــ!" رضا یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

رومہ بچے کو لے کر جا چکی تھی۔ اس نے کچھ سنا کچھ نہیں سنا۔ مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا اور جسم سنسنا رہا تھا۔ پروردگار۔ خیر کرے۔

معتصم منتظر تھے۔ کوئی جواب آئے گا۔ نہ جواب آیا نہ منصور نے ادھر کا رخ کیا۔ بس انہوں نے فرض کر لیا کہ خط رومہ کو پہونچ گیا ہے۔ جواب نہ دے سکی ہوگی۔ ان کے کالج میں اولڈ بوائز کا بہت بڑا جلسہ تھا۔ شام کو نعمانی نے بھی اصرار کیا۔ دونوں اُدھر گئے اور اِدھر رضوانہ بیگم نے رختِ سفر باندھا۔ رومہ کو حکم ملا۔ اپنے کپڑے رکھ لے۔ اسے ان کے ساتھ جانا ہے۔

صدائے احتجاج بلند کرنے کا اس میں بوتا کہاں تھا۔ اور یہ بے سود صدا بلند کر کے کرتی بھی کیا؟

کسی نے اسے نہیں روکا۔ نینا کو اجازت نہ ملی کہ وہ اسے رخصت تو کر دیتی۔

آٹھ بجے رات کو رضوانہ بیگم مع رومہ کے پٹنہ روانہ ہو گئیں۔!؟

اور تقریباً دو بجے رات کو معتصم اور نعمانی جلسے سے واپس آئے۔ انہیں کچھ پتا [illegible] آرزوؤں کے نشیمن پر بجلی گر چکی تھی۔! دونوں تھکے ہوئے تھے۔ پڑھ کے سو

علوی صاحب کے ہسپتال چلے جانے سے گھر پر ایک سوگوار سناٹا چھا گیا۔ اب بیگم علوی کو ایک مضبوط سہارا چھوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔!

نعمانی جب پٹنہ اسٹیشن پر اترے تو ان کا دل امید و بیم کے سنگم پر دم بخود تھا۔ کبھی سوچتے ممکن ہے وہ ختم ہی ہو چکی ہو۔ کبھی یہ سوچ کر وہ سر دھنتے کہ شاید اسے زندہ ہی پا لیں۔!

بھاڈلی پہونچ کر معلوم ہوا کہ میجر صاحب بھی ہفتہ بھر کی چھٹی پر کہیں جا چکے ہیں۔ ان کا چوکیدار یا ملازم نعمانی کو پہچانتے نہیں تھے۔ لیکن ان کی ظاہری شخصیت اور صورت شکل سے ملازم مرعوب ہو گئے۔!

"آپ کو کس سے ملنا ہے جناب؟" ملازم نے پوچھا۔

"بھائی صاحب" نعمانی نے ملازم کو خود بلند انداز میں مخاطب کر کے کہا "میں حیدرآباد سے آیا ہوں مجھے میجر صاحب کی بیگم صاحبہ نے بھجوایا ہے۔ وہ کسی لڑکی کو یہاں چھوڑ گئی تھیں۔" نعمانی نے دھڑکتے دل سے اندھیرے میں تیر چلایا اور یہ سمجھ کر چلایا کہ خطا کر جائے گا۔ یا اسے یہ جواب ملے گا کہ جی ہاں صاحب وہ بیچاری تو گزر گئی۔ لیکن ملازم نے ایک طرف رخ کر کے آواز دی۔

"اماں آو۔ سردار خاں۔ ذرا ادھر تو آنا۔ دیکھنا یہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا۔ اور نعمانی کے سامنے ایک چھ فٹ کا پٹھان چوکیدار آ کھڑا ہوا۔

"کیا ہے صاحب؟" انداز سے وہ مرعوب نہ ہو رہا تھا۔ بلکہ اس کے

دے سکی۔!

"چلا تو جاؤں" نعمانی نے کہا اور پھر چور نظر نینا پر ڈال کر بولے۔

"اخراجات کے لیے پیسے کہاں ہیں؟"

"نجانے آپ اور عصمی بھیا فقیر کیوں ہیں" نینا جل گئی۔ "آپ نے تو کہا تھا کہ ہر سرو سے میں آپ کو چار پانچ سو روپے مل جاتے ہیں۔ پھر وہ سب کہاں ہیں۔؟"

"آدھے میں رکھتا ہوں، آدھے معتصم کو دے دیتا ہوں" نعمانی نے معصومیت سے جواب دیا۔ "سب جانے پانی میں خرچ ہو جاتے ہیں۔"

"میرے پاس جمع ہیں کچھ روپے۔ میں لائے دیتی ہوں۔ آپ سروے کا بہانہ کر کے جائیے اور باجی کی خبریں لائیے۔ ورنہ۔ پتہ نہیں۔ اس طرح خاموش رہتے رہتے عصمی بھیا کا کیا حال ہوگا۔"

بڑی فراخ دلی سے نعمانی نے کہا:

"لے آؤ۔ روپے۔ میں چلا جاؤں۔"

نینا کا غصہ تو بہت آیا۔ لیکن اس نے کچھ بڑے نوٹ نعمانی کو دے دیئے۔ اور کسی سے کچھ کہے بغیر نعمانی اپنے مشن پر چل دیئے۔!

علوی صاحب کو بدرجہ مجبوری سول ہسپتال میں شریک کرا دیا گیا تھا معتصم کو پتہ نہ تھا کہ نعمانی پٹنہ چلے گئے ہیں۔ انھیں بہت دکھ ہوا۔ علوی صاحب کو اس حالت میں چھوڑ کر سروے پر جانا ایسا کون سا ضروری تھا۔؟ نینا نے بھی پوری خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ نعمانی اور وہ اس درجہ رازداری برتتے ہیں۔ باجی ان پر کوئی بہتان رکھ دیتیں!۔

گئے۔ ساری رات نینا روتی رہی۔ ساری رات تنہا انصار روتا رہا۔ اور سارے گھر پر عجیب سی مجرمانہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پہلے تو معتصم کو پتہ بھی نہ چلا۔ بے خبری میں ان پر کون سی قیامت ٹوٹ گئی تھی انہوں نے باجی جان کے رخصت ہونے پر سکھ کی سانس لی۔! اکیلے میں نینا سے پوچھا۔ اس بیوقوف کا کیا حال ہے؟۔ یہ کہہ کر وہ بے حد پیار سے مسکرائے تھے۔

جواب میں نینا رو پڑی اور اس نے سارا حال سنا دیا۔

"رو کر کو باجی جان لے گئیں۔!" معتصم آدھے پاتال میں اتر گئے!

"آپ نے کیا لکھا تھا اپنے رقعہ میں۔ وہ بھائی جان نے منصور سے لے لیا تھا۔" معتصم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔!

کسی سے پرسش کی ہمت نہ تھی۔ ان سے سیدھے منہ بولتا کون تھا؟ وہ تو بیمار ہو گئے۔ نعمانی کو بھی بے حد افسوس تھا۔ لیکن یہ تو ان کی سسرال تھی۔ وہ کسی سے بے تکلف نہیں تھے۔ بس دوست کی زبانی ہمدردی کر کے رہ گئے۔!

معتصم اس رات اکیلے میں بہت روئے۔

"نجانے باجی جان اس پر کتنا ظلم کر رہی ہیں۔ احمد۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔۔۔۔ آہ! یہ کیسے ماں باپ ہیں۔ جو اپنی اولاد کے حق میں ایسے فرعون بن جاتے ہیں۔ آہ، احمد۔ اب میں کیا کروں؟۔ کہاں جاؤں؟۔"

ان دنوں علوی صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ پرانے اختلاج کے مریض تھے۔ ان کا مرض شدید ہو گیا تھا۔ بیگم علوی ان کے پاس رہتیں۔ سلمیٰ چند روز کے لیے اپنے گھر گئی تھی

ان کے میکے میں کسی کا بیاہ تھا۔ تنہائی سے فائدہ اٹھا کر معتصم، نعمانی اور نینا
امکان بھر منصوبے بنایا کرتے۔! اور بس۔ اپنے منصوبوں کی عدم تکمیل پر کفِ
افسوس مل کر رہ جاتے۔ ان کے بس میں کچھ نہ تھا۔

معتصم کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرنے لگا۔ نعمانی پندرہ روز کے لیے اپنے
گروپ کے ساتھ چلے گئے۔! رضا بھی باہر ہی تھے۔ گھر کی وحشت ایسی تھی کہ سرِ شام
سے دل بیٹھنے لگتے۔!

معتصم کی دیوانگی اور شدید خاموشی نے علوی صاحب کا اختلاج دونا کر دیا
انھیں صدمہ تھا۔ معتصم ان کے پاس نہیں آئے تھے۔!

اب وہ پچھتا رہے تھے۔ عجیب عالم تھا۔ بیگم علوی یوں گم صم رہتیں جیسے نادانستگی
میں کسی معصوم کے قتل کی مرتکب ہوئی ہوں۔

روما گھر سے چلی گئی۔ اپنا سب کچھ سمیٹ لے گئی۔ یادیں، وجود کی مہک، خدمتیں
جاں نثاری، محبت، سب کچھ۔ نینا پہروں روتی تھی۔

اگر کسی کو روما کی تباہی کا غم تھا تو نینا اور سلمیٰ کو۔ مگر وہ لب ہلاتے ڈرتی تھیں
روما کا نام ممنوعہ تھا۔ رضا بڑے خفا ہو گئے تھے۔ دن رات معتصم کو برا بھلا کہتے
رہتے۔ تعلیم اس کی ضائع ہوئی۔ تربیت اسے بیکار کر گئی۔ اعلیٰ خاندان کا شریف لڑکا
ایسا بدمعاش ثابت ہوا۔ صد حیف۔ اب آوارہ پھرا کرتا ہے۔ نہ ماں باپ سے سروکار
نہ بہن کا ادراک، نہ مستقبل کی فکر ــــ انھیں صدمہ تھا۔ اور صدمہ نے بڑھ کر
غیظ و غضب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسے نابکار، ناہنجار، غنڈہ صفت بھائی کا
چھوٹا نہ ہونا بہتر۔ وہ معتصم سے بات تک نہیں کرتے تھے۔! اتنے خفا تھے۔

[illegible] عجیب سا سناٹا ہو گیا۔

[illegible] علوی صاحب [illegible] سے چلے اور کسی طرح ہانپتے کانپتے طعام خانہ میں

انھوں نے باپ کی علالت کی پرواہ کیے بغیر سچ مچ جھوٹ بولا اور ایسی قسم کی
اداکاری کی کہ سب کو یقین آ گیا۔ روما واقعی مر چکی تھی۔!
علوی صاحب کا علاج بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا لیکن افاقہ کی علامت
ہنوز نہ تھی۔!

معتصم اب رسمی طور پر علوی صاحب کے کمرے میں آتے تھے۔ ان کی خدمت
بھی کرتے تھے۔ مگر ایک خاموش ڈمی کی طرح۔ جیسے ہمیشہ کے لیے ان کی طاقتِ
گویائی ختم ہو چکی تھی۔

ایک عجیب سے کرب و اضطراب سے وہ سب گزر رہے تھے۔ لیکن رضوانہ
بیگم کو حیرت و تشویش کم، غصہ زیادہ تھا۔ ہزار بار کہہ چکی تھیں:
" ایسے ایسے کیڑے مکوڑے دن رات مرتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے
اس طرح جان سے گزرتے بس آپ ہی لوگوں کو دیکھا ہے۔"

معتصم نے بہن سے بات نہ کی۔

نعمانی بڑی گہری نظروں سے رضوانہ بیگم کا مطالعہ کر رہا تھا۔ نجانے کیوں
اسے یقین تھا کہ روما مری نہیں۔ وہ زندہ تھی۔
ایسا ہی پختہ یقین نینا کو بھی۔ اکثر بیمار کے کمرے میں انھیں گفتگو کا موقع
مل جاتا تھا اور وہاں افراتفری میں اتنا ہوش کسے تھا کہ وہ ان سب پر نگاہ
رکھتا۔

نینا نے ایک روز اکیلے میں نعمانی سے کہا تھا:
" آپ ایک مرتبہ پٹنہ چلے کیوں نہ جائیے۔ وہاں کسی نہ کسی سے پتہ چل جائے
گا کہ سچ مچ اصل واقعہ کیا ہے۔ مجھے اس کے مرنے کا یقین نہیں آتا۔ میں نے
نازنین سے اس کی موت کی تفصیل پوچھی تھی۔ وہ گڑبڑا گئی۔ صحیح جواب نہ

ہوئے تھے۔ لیکن چند ہی دنوں کی بیماری نے ان کی شکل و صورت بدل دی تھی۔ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ پسلیاں بھی نکل آئی تھیں۔ سب طعام خانے میں موجود تھے۔ افراتفری میں ایک انقلاب یہ بھی آیا تھا کہ نعمانی بھی اندر ہی طعام خانے میں سب کے ساتھ کھانے لگے تھے۔!

بڑی خاموشی سے گویا کوئی عبادت ہو رہی تھی، کھانا شروع ہوا۔

باہر صحن میں برسات کی پہلی ناگوار جھم جھم ہو رہی تھی۔ ایک تسلسل سے پھوار گر رہی تھی۔ موسم ناگوار اور افسردہ کن تھا!۔

معتصم الماری کے پاس کرسی سرکائے کھانے کے نام پر نہ جانے کیا کر رہے تھے۔ ان کا جسم یہاں تھا۔ روح کہیں۔ دماغ کہیں۔ رضا کی تنقیدی نظریں ان پر گڑی تھیں۔ تبھی ملازم نے آکر کہا۔

"سرکار کسی کا تار آیا ہے۔ باہر تار والا کھڑا ہے۔"

سب نے ہاتھ روک لیے۔ رضا دستر خوان سے انگلیاں پونچھ کر باہر بھاگے اور جلد ہی ٹیلی گرام لیے واپس آئے۔ باپ کی اختلاجی کیفیت سے ڈرتے ہی رہتے تھے۔

"کس کا تار ہے۔ کیا لکھا ہے۔ الٰہی سب خیر ہو۔" بیگم علوی پھولی سانسوں میں بولیں۔

رضا نے جلدی سے تار کی ادھوری سطروں پر نظریں دوڑائیں اور دھیمے سے بولے:

"باجی جان کی طرف سے ہے۔ روما۔۔ اچانک مر گئی!۔"

"مر گئی۔" یہ بہتیروں کے منہ سے نکلا۔

علوی صاحب کے سینے سے ایک آہ نکلی اور انھوں نے سر میز پر ٹکا دیا

مستزاد۔ غرضیکہ وہ خود بھی پاگل ہوتی جا رہی تھیں۔! رضوانہ کو تفصیلی خط لکھ کر روما کی ناگہانی موت کی اچانک دریافت کی تھی۔ انہوں نے بڑا تلخ جواب دیا جس سے بیگم علوی کی طبیعت اور مکدر ہو گئی۔ سب سے بڑا دکھ انہیں معتصم کے سلوک کا تھا۔ وہ گھر کے اندر نہیں آتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے اور خود بیگم علوی کو انہیں مخاطب کرتے شرم سی آتی تھی۔

علوی صاحب کا مرض سنجیدہ ہو گیا۔ اب ان پر غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس کی اطلاع رضوانہ بیگم کو بھی دی گئی۔ موقع ہی ایسا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے۔ ایسا نہ ہو کہیں الٹے آنتیں گلے پڑیں۔ نینا نے ماں کے حکم پر معتصم کی حالت بھی لکھ دی تھی۔ اور تاکید کی تھی کہ وہ ابا جان کو دیکھنے فوراً آئیں۔ ان کی حالت تشویشناک ہے۔!

رضوانہ بیگم کسی مصیبت سے گھبرانے والی نہ تھیں۔ لیکن نینا کا خط میجر صاحب نے پڑھ لیا۔ اور انھیں سخت حیرت ہوئی کہ روما کی موت کی بد خبری رضوانہ کی طرف سے کس نے پہنچائی تھی۔ جب کہ وہ زندہ سلامت موجود تھی۔ ویسے یہ اور بات تھی کہ مُردوں سے بدتر تھی۔ جب میجر صاحب چلے جاتے تب رضوانہ بیگم اس سے بدترین سلوک کرتیں۔ علوی صاحب کے پاس وہ ان کی بیٹی کی طرح رہتی تھی مگر یہاں۔۔۔ باجی جان کو اس کی صورت سے نفرت تھی۔ بچے اسے خادمہ سے بدتر سمجھتے۔ لڑکی تو اسے جوتی چپل سے مار بھی بیٹھتی غرضیکہ اس کی زندگی موت سے بدتر ہو رہی تھی۔

باجی جان جب علوی صاحب کی عیادت کے لیے ایک بار پھر نکوں سمت عازم سفر ہوئیں تو روما کو اپنے چوکیدار کے گھر پہنچا دیا اور خود حیدرآباد روانہ ہوگئیں!۔

نینا کی آنکھوں سے موتی برسنے لگے۔!
معتصم پھٹی پھٹی آنکھوں سے رضا کو دیکھنے لگے۔ ان کے لبوں پر بڑا سراسیمگی
"رومہ مر گئی۔ رومہ مر گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیا ہو گیا۔ اف۔" پلیٹ
انھوں نے میز پر رکھ دی۔ اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے پیچھے نعمانی بھی اٹھ گئے
اکیلے میں معتصم ضبط نہ کر سکے۔ ان کے آنسو بہہ نکلے۔ اور وہ ٹوٹے ہوئے لہجہ
میں بولے:
"اسے یقیناً باجی جان نے مارا ہے یا اس نے نت نئی مصیبتوں سے تنگ
آکر خود ہی زہر پی لیا ہے۔ کھیل گئی اپنی جان پر۔ آہ۔ احمد۔ مجھے پتہ ہوتا کہ میری محبت
اس کی موت کا پیغام لے آئے گی تو میں اس پر پیار کی ایک نظر بھی نہ ڈالتا۔ اب
میں کیا کروں گا۔ میں بھی خودکشی کر لوں گا۔ ان چاہنے والوں کو بھی پتہ چلے کہ
کسی کی زندگی کو تماشہ بنانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔"
نعمانی پر خود بھی سکتہ سا طاری تھا۔ رومہ کی صورت ان کی نظروں میں پھر
رہی تھی۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی جلدی مر بھی سکتی ہے۔ معتصم
چپکے چپکے آنسوؤں سے دل کا غبار دھوتے رہے اور نعمانی انہیں یک ٹک دیکھا
کئے۔
گھر کی فضا ایسی ماتمی تھی جیسے اسی گھر سے جنازہ اٹھا ہو۔ علوی صاحب
پر نہایت ناگوار اور عجیب سا رد عمل ہوا۔ پہلے تو وہ دل پکڑے گم صم بیٹھے رہے
پھر یکبارگی پھٹ پڑے۔
"اب قرار آگیا ہم سب کو۔ سکھ کی سانس لی ہم سب نے۔ دراصل اس کا
[illegible] ہے۔ میں نے اس مظلوم کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں جھونکا
[illegible]

کیوں نہ سوچا۔ تم لوگوں نے مجھے بہکا دیا۔ رضا، اور تم۔" وہ بیوی پر الٹ
پڑے۔ "تم لوگوں کو اپنی ناکیں پیاری تھیں۔ رضا کو اسے اپنی بیوی کے برابر
بٹھاتے شرم آتی تھی۔ اور تم اسے اپنی بہو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ میں پوچھتا ہوں
اب جواب دو مجھے اس بات کا۔ کیا ہوتا اگر اس کا نکاح میرے لڑکے سے ہو جاتا؟
وہ کوئی چوڑھی چمارن نہیں تھی۔ ہمیشہ سے شیخ اور سید کا میل ہوتا رہا ہے۔ اے
پروردگار! اب میں تجھے کیا جواب دوں گا۔!؟"
بیگم علوی اور رضا ان کی قلب ماہیت سے ہکا بکا رہ گئے۔ اب انھیں اپنی
زیادتی محسوس ہوئی۔ نینا کی گریہ وزاری مزید ہاتھ پاؤں پھلائے دیتی تھی
علوی صاحب از سر نو بیمار پڑ گئے۔ ان کا اختلاج بڑھ گیا۔ وہ بے حد پچھتا
رہے تھے۔ مضطرب تھے۔ کرب و اذیت کے مارے بے چین لہجے میں کہتے:
"تم سب کے اعمال کا جواب خدا مجھ سے لے گا۔ ارے۔ مجھے کیوں عقل نہ آئی
میں اس جاہل عورت اور کم ظرف بیٹے کی باتوں میں کیوں آگیا۔ ہائے اس معصوم
لڑکی نے کس طرح جان دی ہوگی۔ کس طرح اسے موت آئی ہوگی۔ اپنے گھر سے
دور پردیس میں اس کی قبر بنی ہے۔ ارے۔ رضوانہ ہی کا سلوک اس سے کون
سا اچھا تھا۔ اگر رومہ نے خودکشی کی ہے تو پھر میرے لیے جہنم تیار ہے۔"
وہ ضمیر کے کچوکوں سے حواس کھونے لگے تھے۔ رضا چور بن گئے۔ بیگم علوی
کو ایسا لگتا ان کے ہاتھ خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ انھیں یقین تھا
رومہ نے رضوانہ کی سختیوں سے تنگ آکر جان دی ہے۔ شاید رضوانہ نے کسی
ایسے ویسے آدمی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دینا چاہا ہو۔ اور اس نے موت ہی
میں اپنی نجات دیکھی ہو۔ کس سے پوچھیں۔ کیا کریں۔ ادھر سے شوہر کے
دل آزار طعنے [illegible] ادھر معتصم کی [illegible]

نسیم انہونوی

Rs. 20/- only

THE AREE

June 84
Rs. 1|50
ایڈیٹر

ٹیلیفون نمبر ۔ ۲۵۹۰۲۲

ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۲۵۹۰۲۲

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۲ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا
ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم اہنوی و شفیق النساء بیگم سلیم اہنوی مرحوم

جلد (۵۴) فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۸۴ء نمبر (۶)

اڈیٹر و نگراں :۔ نسیم اہنوی
معاونین :۔ شوکت جہاں بیگم غزالہ ——— جان بیگم ردولوی

— قیمت سالانہ —

منی آرڈر سے

اعزازی خریداری	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری	تیئیس روپیہ

وی پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

غیر ممالک سے

بحری ڈاک ہوائی ڈاک رجسٹری اور ایئر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔
• حریم ہر انگریزی ۵ تاریخ کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ کے بعد شکایت کریں ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا
• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔
خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آئندہ ترسیل زر کا پتہ۔ دفتر نسیم بکڈپو۔ ۱۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم اہنوی پرنٹر و پبلشر نے [illegible] پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم لکھنؤ سے شائع کیا

امریکہ میں جو آج دنیا کی عظیم ترین سلطنت ہے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک ایک انقلاب آیا تھا جو وہاں سے یورپ تک میں پھیل گیا تھا۔ یہ انقلاب امریکہ کی معاشرت میں پیدا ہوا تھا اس کے اسباب دیگر انقلابات پر مبنی تھے۔ معاشی ترقی سائنسی ارتقا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والا ماحول۔ یہ انقلاب "جنسی انقلاب" کہلایا تھا اور اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل تھیں۔

عورتوں کی آزادی
جنسی تعلقات کی عمومی سہولت
شادی کئے بغیر متاہل زندگی گزارنا
طلاق کو کھلونا بنا لینا۔
ہر طرح غیر فطری اور غیر اصولی جنسی حرکات

اس انقلاب نے انسانی محبت، اخوت اور قربانیوں کے جذبات کو ختم کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ صرف اپنے ذاتی مفاد وارتقا پر ہی نظر رکھنا چاہئیے۔ ماں باپ، میاں بیوی، بہن بھائی، اعزہ اقربا اور رشتے دار ذاتی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں، اس لئے انفرادی طور پر زندہ رہنا ہی زندگی کی معراج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اجتماعی زندگی تقریباً ختم ہو گئی۔ گھرانوں کے شیرازے منتشر ہو گئے۔ بچوں کی پیدائش گھٹی اور طلاقوں کی رفتار بڑھ گئی۔ لیکن اب اس جنسی انقلاب کی مشعل بجھ رہی ہے۔ اس نشے کا خمار اترنے لگا ہے۔ جسم اور ذہن ہر طرح کی جنسی لذتوں سے اکتا کر امراض خبیثہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق امریکہ کی پچاس فی صدی آبادی ان امراض میں مبتلا ہے اس جنسی انقلاب نے جو سنہ ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا تھا اب کروٹ لی ہے اور اب جو انقلاب شروع ہوا ہے وہ جنسی انقلاب کے بالکل برعکس ہے۔ لوگ بے کھیل جنسی تعلقات سے اکتا کر محبت کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت کرنے اور ایثار قربانی کو خود غرضی اور دولت پر ترجیح دینے لگے ہیں۔

وہی مرد اور لڑکیاں جو شادی کئے بغیر جنسی تعلقات پیدا کر کے آزاد زندگی گزارنے میں مست رہا کرتے تھے اور اب باضابطہ شادی کر کے بسر کرنے لگے ہیں۔ اس طرح طلاقوں میں کمی آ گئی ہے۔

باعث حیرت ہے وہی پیغمبران اور دانش ور جنہوں نے جنسی انقلاب کا نعرہ بلند کیا تھا اور عورتوں کو ایسی آزادی بخش دی تھی جس سے وہ مردوں کا کھلونا بن کر رہ گئی تھیں، اب اس انقلاب کو دفن کر کے اس انقلاب کی واپسی کو قبول کر رہے ہیں جو حقیقی محبت، شرافت، انسانی ہمدردی اور اجتماعی زندگی کا سبق دیتا ہے۔ آزادی کے نشے کا خمار تیزی کے ساتھ اتر رہا ہے۔ جنسی انقلاب کے پیرو اب اپنے آپ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ان کے جسم اور ان کے ذہن ان لذتوں سے اکتا گئے ہیں جو اس انقلاب نے انھیں بخشی تھیں۔ اب جو انقلاب شروع ہوا ہے اس کا ابھی کوئی نام نہیں پڑا ہے، لیکن رفتہ رفتہ لوگ حیوانی طرز کے جنسی تعلقات سے پریشان ہو کر محبت اور اخوت کو ترجیح دینے لگے ہیں اور ایک دوسرے سے فطری اور پاکیزہ محبت کرنے کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت کر کے قربانی اور ایثار انھیں اچھا لگنے لگا ہے۔ اب لڑکے اور لڑکیاں شادی کے مقدس بندھن میں بندھ کر گھر بسانا چاہتے ہیں۔ بچے پیدا کرنا چاہتے ہیں اور طلاق لینے دینے کو معیوب فعل سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس حیا سوز فحاشی کی ترغیب دینے والے اب اس نئے انقلاب کی ضرورت اور سچائی کو محسوس کر کے عوام میں مقبول کرانے کی جد و جہد کر رہے ہیں؛ جس کا نام ابھی طے نہیں پایا ہے۔ جنسی انقلاب کی سب سے بڑی دین امریکہ کے باشندوں کو ملی ہے کہ پچاس فی صدی مرد اور عورتیں امراض خبیثہ میں مبتلا ہیں۔ جس کے باعث ان کی زندگیاں برباد ہو گئی ہیں اور ان کے گھر اجڑ چکے ہیں اور انھیں معاشرے میں اچھا

طریقے سے اب نہیں دیکھا جاتا۔

ایسے جنسی انقلاب کا یہ بھی کارنامہ تھا کہ لوگوں کو تعلیم دی گئی تھی کہ بوڑھوں، مجبوروں اور لاچاروں کو گھروں میں رکھنا اپنی آزادی کو مجروح کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہوم بنائے گئے جہاں انھیں نرسوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اس جنسی بے راہ روی کو پسند نہ کرتے تھے ان کی تنقید سے بچنے کے لئے ان سے رشتے ہی ختم کر لئے جاتے تھے تاکہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اس طرح کے نہ جانے کتنے المیے تھے جن پر لکھا جائے تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

میں زیادہ تفصیلات لکھنے سے گریز کرتے ہوئے اس تحریک کی ایک نمایاں علمبردار خاتون جرمین گریر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ امریکی عورتیں اسے اپنا پیغمبر مانتی تھیں۔ اس نے بھی عورتوں کو مردوں جیسا درجہ دئے جانے، انھیں مردوں کے برابر ملازمتیں اور تنخواہیں ملنے پر ہی زور نہیں دیا تھا بلکہ یہ بھی سکھایا تھا کہ عورتوں کو ازدواجی رشتوں اور مادری ذمہ داریوں کو نہ اٹھانا چاہیے۔ اس نے ایک کتاب "زنانی عورت" یعنی ہیجڑی لکھی تھی جس نے اس زمانہ میں عالمگیر شہرت حاصل کی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ عورتیں مردوں کی بنائی ہوئی کٹھ پتلیاں ہیں اور ان کی بذات خود کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ وہی اصول اختیار کرنے پر مجبور ہیں جو مرد ان کے لئے متعین کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ عورتوں کو اپنے تئیں مردوں کے سائے سے نکال کر بحال کرنا چاہیے۔ وہ خود اپنی ذاتی زندگی میں بے حد آزاد و آوارہ تھی۔ شراب اس کی پسندیدہ چیز تھی اس کے نشے میں بے شمار مردوں سے جنسی تعلق پیدا کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا ـــــ لیکن اپنی آزاد زندگی سالہا سال گزار لینے کے بعد اب اس نے ایک دوسری کتاب لکھی "جنس اور مقدر" اور اس میں اس نے مغربی ماحول پر سخت تنقید کرتے ہوئے اپنے پرانے خیالات کی پرزور تردید کی ہے۔ کتاب کا موضوع بے حد وسیع ہے، لیکن اس کے چند خیالات و انکشافات حرم کی پالیسی سے متعلق ہیں اور انھیں پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے ان خیالات کو ہم تمام مشرقی بہنوں کے لئے اور خصوصاً ان ترقی پسند بہنوں کے لئے نقل کر رہے ہیں جو مغربی تہذیب کو گلے لگا کر فخر محسوس کرتی ہیں اور اپنی ان بہنوں کو حقیر، کمتر، جاہل اور دقیانوسی سمجھتی ہیں جو اسلامی تعلیم اور اسلامی معاشرے کی سختی سے پابندی کر رہی ہیں جس کی تلقین میں ملت کے ذریعہ کرتا رہتا ہوں۔

جرمین گریر نے اپنی کتاب "جنس اور مقدر" میں لکھا ہے "مردوں اور عورتوں کو ازدواجی رشتوں میں بندھ کر ہی جنسی تعلقات پیدا کرنا چاہئیں۔ آپس میں محبت کرنا، ایک دوسرے کا خیال رکھنا جنسی لذت سے کہیں اچھی چیزیں ہیں۔ عورتوں کو ملازمتیں تلاش کرکے دوسروں کی غلامی کرنے کے بجائے اپنے گھر بسانا چاہئے۔ اپنی محبت سے اپنائے ہوئے شوہر بچوں اور گھر کی غلامی کرنا چاہئے ملازمت کے سلسلہ میں افزائش نسل کو غیر فطری طریقوں سے روکنا نہ چاہئے۔ آج بھی خوشیاں بچوں ہی کے وجود سے قائم ہیں۔ اس لئے ان کی آمد کو روکنا اپنی مسرتوں کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔"

اس نے ثابت کیا ہے کہ مشرقی ماحول اور مشرقی تہذیب مغربی بد اخلاقیوں اور گمراہیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ اگر مغرب نے اپنی راہ نہ بدلی تو ایک دن اس کا زوال یقینی ہے۔

"مغربی ممالک کو چاہیے کہ وہ اپنی آوارہ قدروں، اپنے ذلیل طرز معاشرت اور سائنٹفک طریقہ فیملی پلاننگ (ضبط تولید) کو مشرقی ممالک پر نہ تھوپیں۔"

اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات جو اس نے لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام ہی دنیا کا سب سے اچھا مذہب ہے، جس نے عورتوں کو عظیم عزت و عظمت بخشی ہے۔ پردہ جسے عورتوں کی قید سمجھا جاتا ہے اور جسے جہالت تصور کیا جاتا ہے، عورت کی عظمت و تقدس کی نشانی ہے جو اسے اسلام نے بخشی ہے۔ اس لئے پردہ کرنے پر شرمانے کے بجائے عورتوں کو فخر محسوس کرنا چاہیے۔ اس سے عورت کا وقار بڑھتا ہے۔ اسلام نے [illegible]

ہے عطا کر کے ایک مقدس مقام عطا کیا ہے ان کی گرانقدری
پردہ پوشی کر کے ان کو عزت بخشی ہے۔"

جرمن گریر نے اپنی کتاب میں یہ بھی پیشین گوئی کی ہے
کہ آئندہ صدی میں اسلامی معاشرے کی عورتیں سب سے
زیادہ ذہین اور اس نئے انقلاب کی حامل ہوں گی
جو اس انقلاب سے بالکل مختلف ہوگا، جو امریکہ میں جنسی
انقلاب کے نام سے مشہور ہوا تھا۔

افسوس کہ ہندوستان میں مسلم خواتین پردے کو معیوب
اور حقیر چیز سمجھنے لگی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پردہ اب صرف
جاہل گھرانوں ہی میں کیا جاتا ہے۔ اسے یوں بھی سمجھا جاسکتا
ہے کہ پردہ کرنا جہالت ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پردہ کو
جہالت کہنا خود جہالت ہے۔ آج جو عورت پردہ کرتی ہے وہ
ایک پر اسرار حسن رکھتی ہے، ایک اعلیٰ تقدس رکھتی ہے اور
وہ ان دوسرے مختلف جسموں سے علیحدہ نظر آتی ہے جو سڑکوں
پر نیم عریاں لباسوں میں گھومتی رہتی ہیں جو بجائے عورت ہونے
کے جسم ہی جسم ہو کر رہ جاتی ہیں۔

دراصل پردے کو جہالت کا مترادف اس لئے بنا دیا گیا
ہے کہ اس کا سچا اور جائز استعمال نہیں ہوتا۔ پردے کا کیا مقصد
ہے اور پردہ کیسے کرنا چاہئے، اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔
اس طرح کا پردہ جو پردے کا مذاق اڑانے کے مترادف ہو لوگوں
کو طعنہ زنی کا موقع دیتا ہے۔ مثال کے طور پر برقع کی تراش اور
فٹنگ ایسی ہو جو جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرے یا اسے اس طرح
استعمال کیا جائے کہ اس سے عورت کا حسن دوبالا ہو کر اس طرح
نظر آئے، جیسے بدلی کی اوٹ سے چاند نظر آ رہا ہو۔ وغیرہ وغیرہ

عورت ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے مرد سے مختلف ہے اور
اس فرق کو دنیا کی کوئی طاقت یا ترکیب مٹا نہیں سکتی۔ اس
کے جسم کی ساخت، اس کے سوچنے سمجھنے کی نفسیات مردوں
سے بالکل مختلف ہیں، اگر عورت چاہے کہ وہ مردوں جیسی
ہو جائے تو یہ بالکل غیر فطری بات ہوگی۔

آج کی عورت سوچتی ہے کہ مرد کو ہر طرح کی آزادی میسر
ہے۔ وہ جہاں چاہے جائے، جس سے چاہے تعلق پیدا کرے۔ لیکن
عورت کا صرف شوہر ہی کا ہو کر رہنا ضروری ہے، اس لئے وہ چاہتی
ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی طرح آزاد ہو اور اسی کی طرح جو چاہے وہ
کرے۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ دوسرا چوری کرتا ہے اس
لئے ہمیں بھی چوری کرنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں اپنی کوئی رائے دینے کے بجائے امریکہ کے مشہور
سماجی مفکرین کی جو رائے ہے اسے پیش کر رہا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ
"عورت ہی ہمارے معاشرے کی جنسی اور اخلاقی قدروں کا محور
ہے۔ آج امریکہ میں پاکیزگی اور عفت کا جو انقلاب آ رہا ہے اس کی
محرک عورت ہی ہے، جسے اپنے اندر سوئی ہوئی شرافت نے جگا دیا
ہے، اس لئے کہ جنسی بے راہ روی کا سے عورت ہی نقصان اٹھاتی
ہے۔ وہی تن من سے مجروح ہوتی ہے۔ مرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔
چند ہی سال کے جنسی انقلاب نے اس حقیقت کو اس پر واضح کر دیا
ہے کہ پاکیزگی اور کسی ایک ہی کا ہو کر رہنے میں ہی اس کی عافیت ہے
"بے ہوش ہو کے جلد تمہیں ہوش آ گیا"

آخر میں یہ کہوں گا کہ معاشی ترقی ہی سے ماحول بگڑتے رہے
ہیں۔ آج ہمارا ہندوستان بھی اسی ترقی کی راہ پہ گامزن
ہے۔ ہمیں دوسروں سے سبق سیکھ کر اپنے آپ کو ان تجربوں سے
محفوظ رکھنا چاہئے جو دوسروں کے لئے عبرت ناک ثابت ہوئے ہیں۔

ایک اعلان

محکمہ ڈاک کی روز افزوں زبوں حالی سے عاجز آ کر یہ اعلان
کر رہا ہوں کہ جو بہنیں حریم بروقت نہ ملنے یا نہ ملنے کے سلسلہ میں ہمیں قصوروار
سمجھتی ہوں، انہیں چاہئے کہ وہ حریم کی خریداری کا سلسلہ ختم کر دیں
ہم عاجز آ گئے ہیں اور ایسی بہنوں کو یقین دلانے میں ناکام رہے ہیں
جو یہ سمجھتی ہیں کہ پرچہ نہ ملنے یا دیر سے ملنے میں ہماری ہی غلطی ہوتی ہے
ایسی نادان بہنیں یہ نہیں سوچتیں کہ اگر ہم انہیں حریم روانہ نہ
کرنا چاہیں گے تو شکایت آنے پر بھی نہ بھیجتے۔ حریم کی بہنوں کو اس کا
بھی یقین کرنا چاہئے کہ اکثر ان کے خطوط بھی دفتر تک نہیں پہنچتے اس
لئے کہ محکمہ پوسٹ کی کارکردگی بدترین ہو گئی ہے۔

• تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک دفتر میں آ جانا ضروری ہے
بہتر ہو کر جوابی کارڈ روانہ فرمائیں تاکہ آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ

بہن کا حریم

آپ یقین فرمائیں یا نہیں کہ صرف جنوبی ہند کے تقریباً دو سو ممبران کو اپریل ۸۴ء کا حریم ابھی تک نہیں ملا۔ شکایتیں اپریل کے بعد سے ہی آنا شروع ہو گئی تھیں اور مکرر پرچے روانہ کئے جاتے رہے تھے۔ ہر ماہ حریم کے ڈیڑھ سو پرچے زائد چھاپے جاتے ہیں تاکہ جن بہنوں کو پرچے نہ مل سکیں، انہیں دوبارہ بھجوا دئے جائیں۔ کبھی سو پچاس ہی کھوتے ہیں اور کبھی زیادہ، لیکن ایسا صرف ایک ہی بار ہوا تھا کہ جنوبی ہند ہی کے ۲۰۰ سے زائد خریداروں کو حریم نہیں ملا تھا۔ اس لیے جب ڈیڑھ سو پرچے ختم ہو گئے تو پھر مسلسل ناول کے صفحات بھیجے گئے تاکہ ناول تو کم سے کم مکمل ہو جائے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کیا جا رہا ہے۔ ڈیڑھ سو پرچوں کے ختم ہو جانے کے بعد اب جو شکایتیں آ رہی ہیں انہیں ناول "موم کی زنجیریں" کے صفحات بھیجے جا رہے ہیں۔

ڈاک کی اس بدنظمی کے تحت آپ کے حریم کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کا تصور فرمائیے۔ مستزاد اکثر بہنیں ایسے انداز سے شکایت لکھتی ہیں کہ مجھے دلی دکھ ہوتا ہے۔

ضروری نوٹ

مارچ کے حریم میں کاتب کی غلطی سے کچھ ناول عفت کا چھپنے سے رہ گیا تھا اس لئے "موم کی زنجیریں" کے آخری صفحہ کی آخری سطر کے یہ چار الفاظ کاٹ دیں۔ "یہ کب کیجئے کہ" اس کے بجائے مندرجہ ذیل عبارت پڑھیں۔ اس کے بعد حریم اپریل کے ناول سے اس کا تسلسل قائم ہو جائے گا۔

کیا غضب ہے۔ جھوٹ کی بھی حد ہے ——!

رات کیبل میں جی بھر کے حلق تک ٹھونس لینے کے بعد وہ سب بے ہوش ہو کر یا کیفے روانہ ہو گئے ——!

اب یہ خدا کی کرنی تھی کہ معتصم کی شامت نے آواز دی تھی اور تھا کہ گھر پر معتصم کی لانڈری والا آیا۔ اس نے دھلائی کے کپڑے مانگے بیگم نے سوچا کر دے ہی دیدیں۔ اس کے کمرے سے میلے کپڑے، چادریں، غلاف اور شال سب سمیٹ لائیں۔ گنتی کی اور احتیاطاً پتلون کی جیبیں ٹٹولیں کہ شاید کوئی نوٹ نہ رہ گیا ہو، واقعی انکے ہاتھ میں ایک کاغذ آگیا۔ وہ نوٹ تو نہیں تھا، خط تھا کہ وہ چونک گئی۔ پکڑے دے دوں اگر وہ خود پڑھنے لگیں۔ اسی میں انکے کسی برے ارادے کو دخل نہیں تھا، لیکن جوں جوں انکی نظریں آگے بڑھتی گئیں دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ اور ہر مسام سے پسینہ نکلنے لگا۔ اور آخر میں یہ ہوا کہ وہ عجیب سی سکتہ زدہ حالت میں جوں کی توں بیٹھی رہ گئیں ——!

گھر بھر میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نہ بچوں کی زندگی سے بھرپور چہچہاہٹیں تھیں نہ لڑکیوں کی مترنم آوازیں کچھ بجا نہیں۔ پواجی ——دری میں حصیر بچھائے سو رہی تھیں۔ اور اپنے کمرے میں بڑے علوی صاحب گو نجدار آواز میں کاغذ کھنکھار رہے تھے ——!

بڑی دیر بعد وہ اٹھیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میاں کے کمرے میں گئیں علوی صاحب نے آہٹ سن کر کوئی ضخیم قانونی کتاب چہرے کے سامنے سے ہٹائی اور سیدھے بیٹھ گئے۔ بیگم علوی کا چہرہ کسی خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا ——!

"کیوں —کیا بات ہے؟" وہ بولے۔

کچھ دیر وہ چپ رہیں۔ پھر بولیں "کچھ کہنا ہے آپ سے مگر آپ وعدہ کیجئے کہ"

چند منتخب ناول

زرد چاندنی	عقیلہ سیما	۲۴/-
واپسی	آمنہ ابوالحسن	۱۸/-
گردشِ دوراں	بیگم رقیہ سلیم	۲۵/-
جھوٹے سچے لوگ	سعیدیہ افضل	۲۵/-
بے درد	سلمی کنول	۲۵/-
کنول	نادرہ خاتون	۲۰/-
سرتاج	عادل رشید	۱۸/-
لرزتے آنسو	" "	۱۸/-
سپنوں کی راکھ	" "	۲۲/-
کوارا دامن	نکہت شاہجہاں پوری	۱۳/۵۰
مدلقا	عطیہ پروین	۱۸/-

واقعۂ معراج النبیؐ صلعم

راشد شکور

یوں تو اسلام میں ہر تہوار ایک روحانی پہلو لیے ہوئے ہے لیکن واقعہ معراج خالصتاً روحانی ہے اور اس کی حیثیت دیگر تہواروں سے جداگانہ ہے تاریخ انسانی میں یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر ملنا محال ہے۔ یہ حضور کا خصوصی اور امتیازی اعزاز ہے۔ جس طرح رسول اللہ بحیثیت نبی اپنی ذات میں منفرد ہیں اسی طرح اس اعزاز میں بھی منفرد ہیں۔ حضور چونکہ افضل الانبیاء ہیں اس لیے دیگر انبیا کی بہ نسبت ہر خصوصیت کا وافر حصہ آپ کو عنایت ہوا ہے اسی لیے اس خصوصیت میں آپؐ کا کوئی شریک نہیں۔ بعض علما کہتے ہیں کہ ہر نبی کو معراج ہوئی ہے لیکن اس باب میں سب متفق ہیں کہ جیسی معراج حضور کو ہوئی ہے ایسی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ جیسے معراج موسیٰ کے بارے میں ہے کہ جب وہ آگ لینے گئے تو آواز آئی "اے موسیٰ! میں خدا ہوں سب جہان کا پالنہار"۔ یہ حضرت موسیٰ کی معراج تھی۔ ایسے ہی حضرت یونس کو بطنِ حوت میں معراج ہوئی جسے مولانا روم نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

گفت پیغمبر کہ معراج مرا ٭ نیست از معراج یونس اجتبا،

اس طرح کی معراج دیگر انبیاء و رسل کو بھی ہوئی لیکن حضور کی معراج سب سے بلند تر ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے ترجمہ:۔ "پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے تو دو کمانوں کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔"

اسریٰ مکہ سے بیت المقدس تک ہوا اور پھر لامکاں تک۔ اسریٰ یعنی راتوں رات سفر کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے:

"پاک ہے وہ خدا تعالے جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔"

اور معراج کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

"قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے کہ تمہارا رفیق نہ تو بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے اور نہ وہ یہ باتیں اپنے دل سے بنا کر کہتا ہے بلکہ وہ تو وہی کہتا ہے جو اس کو بتایا جاتا ہے۔ اس کو تو بڑی طاقتوں والا اور بڑی عقل والا تعلیم دیتا ہے۔ وہ آسمان کے اونچے کناروں میں سیدھا ہو کر نمودار ہوا پھر قریب آیا اور جھکا تو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے کچھ کم پھر اس کے بندے نے جو باتیں کیں۔ دل نے جو دیکھا اس نے جھوٹ بیان نہیں کیا۔ اے لوگو! کیا وہ جو چیز دیکھتا ہے اس پر تم اس سے نزاع اور مناظرہ کرتے ہو۔ اس نے یقیناً دوبارہ اس کو اترتے دیکھا۔ منتہا کے درخت کے پاس جس کے قریب (نیک بندوں) کے رہنے کی بہشت ہے جب بیری کے درخت پر چھا رہا تھا نہ نظر بہکی نہ بڑھی اس نے یقیناً اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

(النجم ۱ تا ۱۸)

معراج کا واقعہ طائف کے سفر، حضرت خدیجہ کی وفات اور بعثت کے بعد اور ہجرت سے قبل پیش آیا۔ یہ واقعہ رات کے ایک حصے میں وقوع پذیر ہوا۔ لیکن اس کی ٹھیک ٹھیک تعیین میں سخت اختلاف ہے۔ "فتح الباری" میں ہے کہ ہجرت سے چھ ماہ سے آٹھ برس قبل پیش آیا۔ لیکن عروہ بن زبیر، امام زہری اور محدث حافظ عبد الغنی نے ۲۷ رجب کو جملہ اقوال پر ترجیح دی ہے کہ عملاً اسی تاریخ پر اتفاق کیا گیا ہے اور جمہور کے نزدیک یہی قول زیادہ معتبر ہے اور سید سلیمان منصور پوری کے مطابق معراج کی شب، شب چہار شنبہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج اس وقت ہوئی جب مسلمانوں کی کتاب زندگی میں ایک نیا باب کھلنے والا تھا۔ مسلمان مکہ مکرمہ کو الوداع کہہ کر مدینۃ النبی میں ڈیرے ڈالنے والے تھے اور اسلام کی پرخطر زندگی کا دور ختم ہونے والا تھا۔ آپ کی شفقت اور دشمنوں کی نفرت انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ خالق کائنات نے کائنات کے تمام مادی احکام تھوڑی دیر کے لیے معطل کر دیے گویا خدا خود چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کے اس اہم موڑ پر رسول اللہ کو ملکوت السمٰوات کی سیر کرائی جائے تاکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ راز و نیاز کی باتیں کریں۔ کچھ تشفی کچھ تسلی کچھ احکام

پہنچا دیا ہو۔

معراج کس طرح ہوئی؟ آپ سو رہے تھے کہ جبریل امین نمودار ہوئے۔ آپ کو بیدار کیا اور چاہ زمزم کے پاس لے گئے جہاں آپ کے سینہ مبارک کو صاف کیا اور حکمت سے بھرا۔ پھر آپ کے پاس ایک برق رفتار سواری لائی گئی جس کا نام براق تھا۔ جو منتہائے نظر پر ایک قدم رکھتا تھا۔ آپ اس پر سوار ہو کر ملائے اعلیٰ کی طرف تشریف لے گئے۔ راستے میں بیت المقدس میں آپ نے تمام انبیاء کی امامت کی یہاں آپ کو دو پیالے پیش کئے گئے ایک شراب کا دوسرا دودھ کا۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا اس پر جبریل نے کہا:

"تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جس نے آپ کو فطرت کی ہدایت کی۔ اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھا لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔" (تفہیم البخاری پ۱۹ ص۵)

ہر آسمان پر بمراتب تمام انبیاء ورسل سے ملاقات ہوئی جنت دوزخ کی سیر کی۔ یہ سب جزا وسزا حضور کو تمثیلی طور پر دکھائی گئی۔ پھر آپ اس سے اور آگے تشریف لے گئے یہاں تک کہ روایت کے مطابق حضرت جبریل نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور معذرت کیا کہ اگر میں بال برابر بھی آگے جاؤں تو جل جاؤں پھر آپ پیشے رف رف حاضر کیا گیا جو آپ کو رب العزت کے حضور لے گیا یہاں تک کہ دو کمانوں یا اس سے بھی زیادہ قریب۔ جب آپ وہاں سے مراجعت فرمانے لگے تو آپ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں جن میں بعد میں تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں۔ اس طرح آپ رات ہی رات واپس تشریف لے آئے۔

آپ کو معراج بیداری میں جسم وروح کے ساتھ ہوئی۔ یہ نہیں کہ آپ سو رہے تھے اور فرشتے آپ کو لے گئے تھے۔ اور ہر چیز کا مشاہدہ آپ نے بچشم خود کیا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کیوں کہ واقعہ اسریٰ کے شروع کرنے کا انداز "سبحٰن الذی"، لفظ "عبد" کا استعمال براق کی سواری، کفار کی تکذیب، ایک عیسائی عالم کا بیت المقدس کی سرزمین میں جہاں براق باندھا گیا تھا، براق کے پاؤں کے نشانات کا دیکھنا۔ یہ سب واقعات ثابت کرتے ہیں کہ معراج روح کے ساتھ ساتھ جسمانی بھی تھی۔

واقعہ اسریٰ ومعراج ایک ایسا عظیم الشان واقعہ ہے جو مسلمانوں کو آج بھی دعوت عمل دیتا ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس خالص روحانی واقعہ پر بھی مادی رنگ چڑھا دیا ہے۔ اور ایسی بابرکت اور عظیم رات کو عبادت میں گذارنے کے بجائے لہو ولعب میں اور کھانے پینے میں بسر کرنا شروع کر دیا ہے۔ معراج کی رات پکار پکار کر آج بھی مسلمانوں سے کہہ رہی ہے ؎

رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں
یہ کہہ رہی ہے مسلمان سے معراج کی رات

نعت

افسری خانم شبنم بنارسی

صبا پھر جانب بطحا چلی ہے ∴ فزوں تر دل کی اپنی بے کلی ہے
مدینے کی ہمیں اب لو لگی ہے ∴ مدینہ حاصل صد زندگی ہے
ہے واں کا ذرہ ذرہ مثل انجم ∴ زمیں سے تا فلک تابندگی ہے
نزول فضل رب ہر دم ہے جاری ∴ وہاں کا ہر قدم اک بندگی ہے
وہیں کے ذرے آنکھوں سے لگاؤں ∴ یہی ایماں، یہی دل کی لگی ہے
خوشا اے سوئے طیبہ جانے والو! ∴ کلید خلد تم کو مل گئی ہے
تمہارے ساتھ ہم کس طرح جائیں ∴ ہمارے ساتھ اپنی بے کسی ہے
دعاؤں میں مجھے بھی یاد کرنا ∴ کہ اک مجبور کاشی میں پڑی ہے

ملے شبنم کو بھی اذن حضوری
کہ قلب وروح میں اک تشنگی ہے

شبنم دعا: I AGREE WITH YOU مگر
یہ بتائیے تمام گرلز ہوسٹلوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑھیا
کلرکنیاں کیوں وارڈن بنائی جاتی ہیں؟
کسم: مس پردھان کا نام لسٹ میں ضرور ہوگا۔ ریٹائر ہونے
کے بعد وارڈن خوب تیار ملے گی۔
مینا کشی: شوہر نہیں ہوتا حکم چلانے کے لئے بچے نہیں ہوتے
لاڈ پیار جتانے کے لئے... بس لڑکیوں پر رعب جماتی ہیں۔
کسم: میری ممی نے کبھی مجھ پر اتنی روک ٹوک نہیں کی جتنی
یہ کھوسٹ بڑھیا مجھے ٹوکتی ہے۔ کاجل کیوں لگایا زلفیں کیوں نکالیں!
ٹخنے ... کر کیوں چلتی ہو....
ایسا نہ کرو.... ویسا نہ کرو۔
(پس منظر میں کسی کے پکارنے کی آواز... مینا کشی،
کسم... کہاں ہو تم لوگ؟)
شبنم دعا: مینا کشی کو دروازے کی طرف دھکیلتی ہوئی پشپا
دیدی آگئیں۔ جا بھاگ جا۔ کہیں اس جاسوس روزی کو آواز نہ
دے دیں۔ (کسم پہلے دوڑ جاتی ہے اور پشپا دیدی کو ساتھ لے کر
لوٹتی ہے)
پشپا دیدی: دیکھو کسم نے مجھے بتایا کہ تم لوگ میڈم کے
جانے کی....
کسم: (بات کاٹ کر) جانے کی نہیں دفع ہونے کی
پشپا دیدی: ... دفع ہونے کی خوشیاں منا رہی ہو۔
مگر خالی خولی خوشی: منہ میٹھا نہیں کراؤ گی؟
یاسمین: ہائے آج تو میرے پاس شکر بھی نہیں۔
دیدی: کوئی بات نہیں۔ لو مٹھائی میں لے آئی ہوں۔
(بیگ سے ایک لفافہ نکال کر کسم کو دیتی ہیں۔ لفافے سے
مٹھائی کا ایک ٹکڑا لے کر سب لفافہ آگے بڑھاتی جاتی ہیں)
یاسمین: (مٹھائی کھاتے ہوئے) اچھا دیدی میں بتاؤں؟
آپ ریسرچ کیوں کر رہی ہیں؟
دیدی: (حیرت سے) میں ریسرچ کیوں کر رہی ہوں، یہ
تم بتاؤ گی؟
یاسمین: (اطمینان سے) ہاں۔ اصل وجہ کا تو آپ کو بھی
پتہ نہ ہوگا۔ جب میں بتاؤں گی تب معلوم ہوگا۔
دیدی: بتاؤ.... بتاؤ۔ (کرسی کھینچ کر بیٹھ جاتی ہیں)
یاسمین: اس لئے کہ آپ کی اپنے شوہر سے پٹتی نہیں ہے۔
دیدی: ایں!
کسم: شوہر سے جھگڑ کر آپ ہوسٹل میں رہنے آئی ہیں۔
دیدی: کیا کہہ رہی ہو تم لوگ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔
یاسمین: شادی شدہ جتنی بھی لڑکیاں ریسرچ کرتی ہیں...
ہوسٹل میں آکر رہتی ہیں ان کے بارے میں میڈم یہی فرماتی ہیں...
یعنی کہ شوہر سے کھٹ پٹ ہے۔
(دیدی جھینپی ہنسی ہنستی ہیں)
مینا کشی: دیدی۔ اب پوچھو کہ ہم لوگ کیوں ریسرچ کر رہی ہیں۔
پوچھو.... پوچھو۔
دیدی: کیوں ریسرچ کر رہی ہو تم لوگ؟
آشا: اس لئے کہ ہماری شادی نہیں ہوئی۔
شبنم دعا: لڑکوں نے ہمیں پسند نہیں کیا۔ ہمیں پسند نہیں
کرتے ہیں۔
مینا کشی: لوگوں کے سوال و جواب سے بچنے کے لئے ماں
باپ ہمیں ہوسٹل میں بھیج دیتے ہیں۔
یاسمین: میں نے تو ایک بار چڑ کر کہہ دیا تھا میڈم مجھے بازار
میں کھڑا کر کے دیکھو کتنے لڑکے مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔
کسم: میڈم کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا ہوگا یہ سن کر...
بے چاری کے نصیب میں تو ایک بھی نہیں تھا۔
آشا: مجھ سے ایک بار یہی بات کہی میڈم نے تو میں نے کہا
ابھی تو صرف ایم فل کر رہی ہوں۔ اب پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ
بھی اسی ہوسٹل میں رہ کر کروں گی۔
کسم۔ مینا کشی: (ایک ساتھ) (تھری چیرس فار یاسمین
اینڈ آشا)... میڈم کو ترکی بہ ترکی جواب دینے والے تب ہی
منہ بند ہوتا ہے اس کا۔
دیدی: مگر میڈم کا کیا بگڑتا ہے کیسے آپ کی زندگی بے حال
کر لی ہے۔
کسم: سال بھر تو کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں رہی ہیں

کسم: مگر میڈم نے اس روز نیلے رنگ کی ساڑی نہیں پہنی تھی۔

آشا: پھر کون سے رنگ کی پہنی تھی؟

کسم: لال رنگ کی بلڈ ریڈ (BLOOD-RED) رنگ کی۔

آشا: نہیں نیلے رنگ کی تھی۔

کسم: میناکشی، شردھا... تم بتاؤ کون سے رنگ کی ساڑی تھی؟

میناکشی، شردھا: لال رنگ کی تھی جی۔

آشا: ٹھیک ہے لکھو... لال رنگ کی ساڑی میں تمہارا اُجلا روپ نئی دلہن کو شرمندہ کر رہا تھا۔

یاسمین: دیکھو بغیر شادی کے دلہن بنا تو غضب ہوا بیچاری کو۔

کسم: اس طرح لکھو یاسمین... جیسے پربتی کے ساتھ ستی ہونے کے لئے تیار دلہن کی طرح سجی دھجی تم دل کو بھا رہی تھیں۔

میناکشی: کسم کی بچی، کیوں وقت خراب کرنے پر تلی ہے؟

یاسمین: آگے بولو بھئی۔

آشا: (ٹہلتے ہوئے) تمہارے گجرے جیسے کالے بالوں میں کنول کا وہ سفید پھول۔

کسم: (کھلکھلا کر) لکھو یاسمین، تشبیہ الٹی ہو گئی.... گجرے کو اتارا ہے تو یوں جیسے سفید بالوں میں دو کالے گجرے جیسے کلپ... (سب ہنستی ہیں)

شیپا دیدی: (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) خوب سوجھتی ہے اس کسم کو۔

آشا: کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ جس سے محبت ہو جائے اس کی خامی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

یاسمین: بولو بابا آگے.... کیا رک رک کر بولتی ہو۔

آشا: تمہاری وہ مدبھری چنچل آنکھیں....

کسم: بھینس جیسی۔

آشا: خوبصورت ناک.....

کسم: پکوڑی جیسی.....

آشا: رسیلے ہونٹ۔

کسم: بھنڈی جیسے...

آشا: (کسم کو گھور کر دیکھتے ہوئے) وہ مورنی جیسا بدن...

کسم: اجنتا پہاڑ جیسا۔

(میناکشی، یاسمین، شردھا اور دیدی کی ہنسی)

آشا: (ڈانٹ کر) کسم، ٹھیک سے بیٹھو یا باہر چلی جا۔

(کسم ڈرامائی انداز میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے)

آشا: آگے لکھو... جب سے تمہیں دیکھا ہے۔

کسم: آنکھوں میں تم ہی تم ہو۔

آشا: پھر وہیں تم؟... یاسمین لکھو۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہیں میری چاہت منظور ہے تو بدھ کی شام گلابی ساڑی پہن کر امبا جھری گارڈن میں آ جانا۔

شردھا: یہ بھی لکھو کہ پیدل چل کر آنا۔ میں راستے میں کہیں پلکیں بچھائے کھڑا ملوں گا۔

میناکشی: دو کلومیٹر پیدل چل سکے گی وہ؟

شردھا: چلنا ہی پڑے گا پیدل، ایک عاشق بھی تو ملے گا۔ کیا اتنی آسانی سے چھوڑ دے گی۔

کسم: (آنکھیں بند کئے کئے) کچھ چربی بھی تو کم ہونی چاہئے۔

یاسمین: امبا جھری گارڈن کیا... آرڈننس فیکٹری بھی بلائے گا تو میڈم دوڑی چلی جائے گی۔

آشا: اچھا... یاسمین... پیار لکھ کر ختم کر دو مضمون...

یاسمین: نام کیا لکھوں؟

میناکشی: ... تمہارا اپنا لکھ دو۔

شردھا: ایسا غضب نہ کرنا۔ [illegible] میڈم کو بالکل پسند نہیں۔

آشا: راجیش لکھ دو۔

یاسمین: راجیش کا مارکٹ ڈاؤن چل رہا ہے۔

کسم: جتیندر پر مرتی ہے میڈم۔ (پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ لیتی ہے)

آشا: تمہارا جتیندر لکھ کر ختم کر دیں.... بس... بس

(آشا کا منہ دروازے کی طرف ہے۔ آخری الفاظ اس کے منہ

لڑکی نے سرخ سرخ ناخنوں سے اپنے بھیگے ہوئے پرانے کوٹ کا کالر برابر کر رکھا تھا۔ اس کے بدن میں کپکپاہٹ اور بڑی بڑی آنکھوں میں التجا تھی۔

"مادام؟" وہ جھجک کے بولی۔ "کیا آپ مجھے ایک کپ چائے کے پیسے دے سکتی ہیں؟"

"ایک کپ چائے! ارے!" روزمیری نے تعجب سے کہا۔ لڑکی کا لہجہ شائستہ تھا اور وہ کسی رخ سے فقیرنی نہیں لگ رہی تھی۔ "کیا تمہارے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" لڑکی بدستور سر جھکائے کھڑی رہی۔

"عجیب بات ہے" روزمیری نے اپنی کار کی جانب دیکھا۔ پھر اچانک اس کی مہم جو طبیعت بیدار ہو گئی۔ اسے دوستووسکی کے ناول کا ایک باب "اندھیرے میں ملاقات" یاد آ گیا اور متعدد فلموں اور کہانیوں کے مناظر اس کے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ اگر میں اس لڑکی کو اپنے گھر لے جاؤں تو کتنا مزا آئے گا۔ تصور میں اس نے خود کو دوستوں میں گھرا ہوا دیکھا وہ ان سے کہہ رہی تھی "اور پھر میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی۔" اس نے لڑکی کے سراپا پر نظر ڈالی اور کار کی طرف قدم بڑھایا۔

"آؤ — میرے ساتھ چلو۔"

لڑکی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا بدن ساکت ہو گیا۔ روزمیری نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "میں تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ خلوص و محبت سے لبریز ہے۔ "آؤ چلیں، تمہیں اپنے گھر کی چائے پلاؤں گی۔"

"آپ .... آپ واقعی مجھے اپنے گھر لے جائیں گی؟" لڑکی کے لہجے میں خدشات لرز رہے تھے۔

"یقیناً — اس میں کیا مضائقہ ہے؟ آؤ!"

لڑکی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے حیرت سے روزمیری کو دیکھا۔ "آپ... آپ مجھے تھانے تو نہیں ....؟"

روزمیری ہنس پڑی۔ "کیا میں تمہیں اتنی سنگ دل نظر آ رہی ہوں؟ آؤ مجھے اپنا دوست سمجھو، مجھ پر اعتماد کرو۔"

ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا۔ روزمیری لڑکی کو لے کر بیٹھ گئی۔ کار کی بتیاں روزمیری کے بنگلے کا راستہ روشن کرنے لگیں۔

ڈرائیور نے پھرتی سے اتر کر کار کا دروازہ کھولا۔ "یہ ہے میرا گھر" روزمیری نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ [illegible] قریب کھسک آئی۔ روزمیری خوشی سے سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکی ہمیشہ یاد کرے گی میں پرانی داستانوں کی پریوں کی طرح اسے مل گئی ہوں اور اپنے محل میں لے آئی ہوں۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ "امیروں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے اور جہاں تک عورت کا معاملہ ہے ہر عورت دوسری عورت کی بہن ہوتی ہے۔ ہم بھی بہنیں ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ تم اتفاق سے غریب ہو اور میں ...."

دور اندر گھنٹی بجی اور ایک بھاری دروازہ کھلا۔ روزمیری لڑکی کو اپنی نشست گاہ میں لے آئی۔ یہاں باہر سے مختلف ماحول تھا۔ نرم گرم خوشبودار اور آرام دہ جگہ۔ ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ آج روزمیری کو خود یہ ماحول بہت سحر انگیز معلوم ہوا۔ وہ ایک چھوٹی سی بچی کی طرح خوش تھی۔

"آؤ۔ اوپر میرے کمرے میں چلو۔" وہ نہایت فیاض اور سخی ہو رہی تھی۔ ملازم دور کھڑے اسے گھور رہے تھے۔ لڑکی سہمی جا رہی تھی۔

روزمیری کی خواب گاہ بہت شاندار تھی۔ آتش دان کی لپٹیں چمکدار فرنیچر پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔ لڑکی حیرت سے کھڑکیوں کے بھاری پردے اور کشادہ مسہری کے مخملی تکیے دیکھ رہی تھی۔

روزمیری آتش دان کے قریب کرسی کھینچتے ہوئے بولی۔ "اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ یہاں خاصی حرارت ہے، تم تو بالکل برف ہو رہی ہو۔"

"م ... میں۔" لڑکی کو اتنی شاندار کرسی پر اتنی دولت مند عورت کے قریب بیٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"آؤ بھئی!" روزمیری نے خوش دلی سے کہا۔ "فی الحال میں ذرا کپڑے بدل لوں پھر ہم دوسرے کمرے میں چل کر چائے پئیں گے۔" اس نے لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھا دیا۔ لڑکی بیٹھ کر اس کی صورت تکنے لگی۔ روزمیری نے کہا:

"اپنا ہیٹ اتار دو پلیز۔ تمہارے سارے بال گیلے ہو رہے ہیں بہت حسین ہیں تمہارے بال۔ ہیٹ اتار دینے سے تمہیں آرام بھی ملے گا۔"

"جی... جی اچھا۔" لڑکی نے اپنا بھیگا ہوا ہیٹ اتار کر فرش پر رکھ دیا۔

روزمیری نے کہا۔ "کوٹ بھی اتار دو۔" وہ نہیں تمہاری مدد کرتی ہوں۔ لڑکی کھڑی ہو گئی۔ روزمیری اس کا کوٹ کھینچنے لگی۔ [illegible]

تعارف نہیں کیا۔ وہ اس طرح بلکورے کھا رہی تھی جیسے ذرا سی بھی ہچکچاہٹ اس کا کوٹ زبردستی اتارا جا رہا ہو۔ روز میری نے کوٹ اتار کر ہیٹ کے قریب ڈال دیا اور میز سے سگریٹ اٹھانے کے لیے بڑھی مگر لڑکی کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی۔

لڑکی عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں... میں بہت شرمندہ ہوں لیکن... لیکن اگر مجھے فوراً کچھ کھانے کو نہ ملا تو...؟" اس کی آواز لڑکھڑا کے رہ گئی۔

"اوہ!" روز میری چلا اٹھی۔ "میں بھی کیسی بے پرواہ ہوں" اس نے گھنٹی بجائی، نوکرانی آگئی۔

"چائے لاؤ فوراً اور برانڈی بھی۔"

نوکرانی چلی گئی۔

لڑکی نے بیتابی سے کہا۔ "نہیں۔ میں برانڈی نہیں پیوں گی میں نے آج تک شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ مجھے صرف چائے چاہیے مادام!" وہ بری طرح رو پڑی۔

روز میری ہمدردی سے گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی "نہ نہ دوست۔" اس نے بڑی مامتا سے اسے سہلایا "رونے کی کیا بات ہے!" اپنا رومال اس نے لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا پھر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

لڑکی کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ "میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اب مجھ میں بالکل ہمت نہیں رہی۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ مر جاؤں گی میں۔"

"نہیں، فضول باتیں نہیں کرتے، تم میرے ساتھ رہنا۔ میں تمہاری دیکھ بھال کروں گی، تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔" روز میری انتہائی خلوص سے کہہ رہی تھی۔ "بس اب نہ رؤو، کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ تمہاری مجھ سے ملاقات ہو گئی؟ اب فکر کی کیا بات ہے۔ شاباش، اب ہم چائے پئیں گے، تم مجھے اپنے حالات سنانا۔ میں تمہارے لیے جو کچھ کر سکتی ہوں، ضرور کروں گی دوست پلیز، پہلے ہی بہت کمزور ہو رہی ہو تم۔"

نوکرانی نے چائے کی میز ان دونوں کے بیچ میں رکھ کے سارے لوازمات چن دیے۔ روز میری نے سینڈوچ، سلائس اور مکھن وغیرہ لڑکی کے سامنے کھسکا دیے۔ لڑکی خاموشی سے سلائس کھاتے

اور چائے پینے لگی۔ جیسے ہی اس کا کپ خالی ہوتا روز میری دوبارہ چائے، چینی اور کریم سے بھر دیتی۔ اس نے خود کچھ نہیں کھایا، بس سگریٹ پیتی اور آتش دان کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے احساس تھا کہ دیکھنے سے لڑکی شرما نہ جائے۔

لڑکی نے شکم سیر ہو کر اپنے آپ کو آرام کرسی میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب اس کا عالم ہی اور ہو گیا تھا۔ رخسار دمکنے لگے ہونٹوں پر شادابی آگئی۔ ایک شوخ لٹ رخسار چوم رہی تھی۔ آنکھوں میں کچھ دیر پہلے ویرانی تھی، اب ستارے سے رقص کر رہے تھے۔ روز میری نے نئی سگریٹ سلگائی اور کرسی پر آگے جھک گئی۔

"اب بتاؤ۔" اس نے پیار سے پوچھا۔ "تم نے آخری کھانا کب کھایا تھا؟"

اسی وقت دروازے کا ہینڈل گھوما۔ "میں اندر آ سکتا ہوں روزی ڈارلنگ" روز میری کا شوہر فلپ آگیا تھا۔

"ہاں۔ آجاؤ۔ آجاؤ۔"

فلپ اندر آ گیا مگر ٹھٹھک گیا۔ "اوہ! میں معذرت..."

"کوئی بات نہیں۔ فلپ۔ آجاؤ۔" روز میری مسکرائی "یہ میری دوست ہے مس..." اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

"مس اسمتھ مادام" لڑکی نے سکون سے اپنا نام بتایا

"ہاں، مس اسمتھ اور ہم ذرا باتیں کر رہے تھے" روز میری نے اپنے شوہر سے کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے"۔ فلپ کی نگاہیں فرش پر پڑے ہوئے کوٹ اور ہیٹ پر ٹھہر گئیں۔ وہ آتش دان کے قریب آیا اور آگ کے طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔

"بڑا خراب موسم ہے۔" وہ دھیمے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھیں لڑکی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لڑکی کو دیکھ کر وہ روز میری کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں بڑا واہیات موسم ہے ڈیر!" روز میری بولی۔

فلپ نے مسکراہٹ سے کہا "میں دراصل اس لیے آیا تھا کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ کیا تم چند منٹ کے لیے لائبریری میں آ سکتی ہو مس اسمتھ سے معذرت۔"

لڑکی نے بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے فلپ کی طرف دیکھا اور

بھی کہنے کے لیے اپنے ہونٹ کھولے مگر روزمیری بول پڑی:
"چلو، وہ نہا چکی۔" مس اسمتھ کو کوئی اعتراض [illegible]
میاں بیوی لائبریری میں آ گئے۔
"میں کہتا ہوں۔ وہ کون ہے؟ تم کہاں سے پکڑ لائیں؟"
روزمیری کرسی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہنستے ہنستے دہری ہو گئی
"وہ مجھے کرزن اسٹریٹ پر ملی تھی۔" اس نے بتایا۔ "میں واقعی اسے پکڑ لائی۔ بیچاری نے صرف ایک کپ چائے کے لیے پیسے مانگے تھے مگر رحم کھا کے میں اسے گھر لیتی آئی۔"
"ٹھیک ہے۔ مگر کیوں؟ اور اب تم اس کا کیا کرو گی؟" فلپ نے تشویش سے دریافت کیا۔
"بیچاری مصیبت کی ماری ہے، نہ معلوم کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ابھی میں اس سے پوری بات نہیں کر سکی ہوں مگر میں نے سوچ لیا ہے کہ ہر طرح اس کی مدد کروں گی۔ دیکھو فلپ! ہمیں کسی مظلوم کے ساتھ بہر طور اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔"
"ہاں ہاں ضرور کرنا چاہیے۔" فلپ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا
"ہمیں اپنا دل کشادہ رکھنا چاہیے۔"
"روزی! خدا کے لیے۔" فلپ احتجاجی لہجے میں بولا۔ "تم واقعی پاگل ہو۔ وہ مدد کی مستحق ہو سکتی ہے مگر تم کیوں مدد کرو گی اس کی؟ تمہی کیوں؟"
"میں جانتی تھی، تم یہی کہو گے۔" روزمیری ناگواری سے بولی۔ "مگر میں بس اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ اور ہم اس لائق ہیں کہ کسی کے کام آ سکیں۔"
"لیکن، لیکن وہ بہرحال ہمارے لیے اجنبی ہے۔" فلپ نے تردد سے کہا۔ "ہمیں اس پہ، میری مراد ہے ہمیں اس پہلو پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔"
"یقیناً وہ اجنبی ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کتنی سادہ اور معصوم ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ضرورت مند ہے۔" روزمیری جوشیلے لہجے میں بولی۔ "اجنبی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کی اعانت سے ہاتھ اٹھا لیں۔ ہم اسے دھتکار دیں۔"

"مگر روزی!" فلپ سگار نکال کے اس کی نوک چبانے لگا اور کسی قدر توقف کے بعد کسمساتے ہوئے بولا۔ "مگر [illegible] وہ بے حد حسین لڑکی ہے۔"
"حسین؟" روزمیری چونک پڑی۔ "ہاں ہاں بے شک وہ حسین لڑکی ہے۔" اس کے رخسار پر چند لمحوں کے لیے شفق آ گئی۔ "میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔" اچانک روزمیری کی آواز الجھ گئی۔ "اچھا لگتا بھی تو اس کی ایک خوبی ہے۔"
"خیر، جو تمہاری مرضی۔" فلپ نے مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ "تم [illegible] ساتھ نیکی کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو پھر بھی خیال رکھنا مجھے اندیشہ ہے کہ تم کوئی غلطی تو نہیں کر رہی ہو۔" وہ سگار کا دھواں روزمیری کے چہرے پر چھوڑتا ہوا بولا۔ "اندر آ کے تو پہلے میں یہی سمجھا کہ وہ تمہاری کوئی دوست ہے، تمہاری طرح تمہاری کوئی حسین دوست۔ [illegible] بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم اسے سڑک سے اٹھا کے لائی ہو۔ [illegible] ڈنر پر تو وہ ہمارے ساتھ ہو گی۔ اسے کچھ اور قریب سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ ڈنر پر اسے ساتھ ضرور رکھنا۔ میں اُدھر [illegible] کمرے میں اخبار پڑھ رہا ہوں، مجھے بلا لینا۔"
فلپ کے جانے کے بعد روزمیری دیر تک لائبریری میں چپ چاپ کھڑی رہی، پھر خود بخود چونک گئی اور تیزی سے باہر نکلی۔ اس کا رخ خواب گاہ کے بجائے ایک اور کمرے کی طرف تھا۔ [illegible] میں پہنچ کر وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ گئی اس نے جلدی سے [illegible] اور چیک بک نکالی مگر نہیں، وہ رک گئی۔ چیک دینے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس نے چیک بک دراز میں پھینک کر دوسری [illegible] اور پانچ پانچ ڈالر کے کئی نوٹ نکال لیے۔ نوٹ مٹھی میں دبا کر خواب گاہ میں آ گئی۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد روزمیری کا ڈیر کے کمرے میں [illegible] سے داخل ہوئی۔ وہ اپنا [illegible] کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔ "فلپ!" اس نے کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھ کے ترنم ریز لہجے میں کہا۔ "کھانا تیار ہے۔"
فلپ نے مڑ کے تیکھی نظروں سے پہلے گھڑی دیکھی پھر [illegible] کو دیکھا۔ "کیا آج کچھ جلدی نہیں ہے مگر ہاں، آج ایک مہمان [illegible]

نئی بوجھ ہے کہاں ہے تمہاری دوست مس ..... ؟"
"مجھے افسوس ہے قلب!" روز میری نے مسکرا کر کہا "مس
..... ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک نہیں ہو سکے گی۔"
قلب نے اخبار رکھ دیا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیوں
..... کیا ہوا؟" اس کی آواز میں بے تابی نمایاں تھی۔
روز میری ادا سے اس کے قریب آئی اور کرسی کے ہتھے پر
بیٹھ گئی۔ "وہ جانے پر اصرار کر رہی تھی، میں نے بیچاری کو کچھ
رقم دے دی۔ ظاہر ہے میں اسے اس کی مرضی کے خلاف کیسے
روک سکتی تھی۔"
روز میری خواب گاہ سے بال سنوار کے آئی تھی۔ رخسار لال
بھبھوکا، گلے میں موتیوں کے مالا، کانوں میں آویزے اور خوشبو کا
ایک ہالہ سا اسے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ قلب نے اس کی کمر
کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔

لطیفے

• بس اسٹاپ پر دو عورتیں اتریں ایک نے دوسری سے کہا
"ایک منٹ ٹھہریے میں بھیڑ کی وجہ سے ٹکٹ نہ لے سکی اس لئے میں
کنڈکٹر کو پیسے دے آؤں۔"
دوسری عورت نے لاپروائی سے کہا "ابھی اب جانے بھی دو سفر
ختم ہو چکا ہے بس چلنے والی ہے خواہ مخواہ ایک روپیہ ضائع کرو گی۔"
"وہ بہن توبہ توبہ کچھ بھی ہو میں تو ایک روپیہ ضرور دوں گی کیونکہ
نیکی کا اجر مل کر ہی رہتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بس کی طرف چل دی تھوڑی
دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں نو روپے تھے۔ پہلی خاتون سے
بولی "میں نہ کہتی تھی کہ نیکی کا اجر ملتا ہے۔"
• ایک شخص کی دوسری بیوی مر گئی۔ تعزیت کرنے کے بعد ایک
دوست نے پوچھا "تمہاری پہلی بیوی کا انتقال کیسے ہوا؟"
"زہریلا ساگ کھانے سے" اس شخص نے جواب دیا۔
دوست نے کہا "اور دوسری بیوی کی موت کیسے ہوئی؟"
"وہ سر پھٹ جانے سے۔ وہ کسی طرح ساگ کھانے پر
آمادہ ہی نہیں ہوتی تھی۔"

ایک حریمی بہن کا خط

ایک حریمی بہن کا خط آج ہی ملا ہے۔ لکھا ہے۔ حریم کی قیمت
آپ برابر بڑھاتے جاتے ہیں اور پرچوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی
قیمت کے سلسلہ میں تو اتنا ہی عرض کروں گا کہ کاش بہن صاحبہ
نے ہر چیز کے بڑھتے بھاؤ کو دیکھ کر سوچا ہوتا کہ کیا یہ اضافہ جو کیا
جاتا ہے نامناسب ہے۔ آپ یقین فرمائیں کہ اس وقت حریم پانچ
ہزار روپیہ سالانہ کے نقصان سے شایع کیا جا رہا ہے۔ میں اس
کی اشاعت صرف اپنے پردے والے مشن کے تحت کر رہا ہوں ورنہ
بند کر دیتا۔
رہا یہ کہ پرچہ دلچسپ نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی
ترتیب وغیرہ کا بار تنہا میرے سر ہے۔ اور میری خرابی صحت کا یہ
حال ہے کہ بمشکل تمام دس منٹ میں ٹھہر ٹھہر کر ۱۵ اسیڑھیاں چڑھتا
ہوں۔ جب سے بمبئی سے واپس آیا ہوں، طرح طرح کی تکالیف میں
مبتلا ہوں۔ کمزوری اتنی ہو گئی ہے کہ کلام کرنا دشوار ہے۔ دماغ
ماؤف رہتا ہے، یادداشت جواب دینے لگی ہے، اس لیے ہو سکتا
ہے کہ بہن صاحبہ کا یہ اعتراض درست ہو۔ البتہ انھیں یہ بھی سوچنا
چاہیے کہ میری ہی طرح حریم بھی بوڑھا ہو گیا ہے۔ مشرقی تہذیب و تمدن
میں بوڑھوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ کبھی حریم ہر دل عزیز
تھا۔ اب بھی ایسی شکایت سب ہی بہنوں کو نہیں ہے۔ صرف انھیں
بہنوں کو ہے جو اپنے دلوں میں ہمدردی اور خدمت کا جذبہ نہیں
رکھتیں۔ میں کس طرح دفتر آتا ہوں اور موجودہ حالات میں کس طرح
کام کرتا ہوں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

بجلی کا فقدان

پریسوں اور کاتبوں وغیرہ کی کمی کے ساتھ ہی بجلی کی کمی بھی مصیبت
بن گئی ہے۔ پریس مہینے میں صرف ۱۲ روز ہی کام کر سکتے ہیں۔ اور ان بارہ
دنوں میں بھی بجلی ہونے کی گارنٹی نہیں۔ محکمہ ڈاک، ٹیلیفون اور ریلے
ہی کی طرح بجلی کے ادارے کا بھی حال ہو رہا ہے۔ اس لیے ہو
سکتا ہے کہ حریم اب بروقت شایع نہ ہو سکے۔
• خط پوسٹ کرنے سے پہلے دیکھ لیں کہ آپ نے اس میں اپنا
نام و پتہ بھی لکھا ہے یا نہیں۔ دفتر میں ایسے خطوط بھی وصول ہوتے رہتا

[illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک انہیں اور دعا ہے زندگی [illegible] سے ہمکنار کرے۔

● [illegible] تسنیم (گرگیشوری) میرے خالہ زاد بھائی آر عبید اللہ [illegible] اور شہناز فاطمہ (ابن و بنت کے۔ ایس رحمت اللہ صاحب) کی شادیاں ہمراہ انیس جمیلہ بانو بی۔ اے بی ایڈ، و [illegible] احمد شریف ایم۔ ایس سی (دختر و فرزند جناب کے احمد شریف) حسب ترتیب ۱۵ر اپریل ۸۲ء بمقام گرگیشوری، بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

● رخشانہ یاسمین (اورنگ آباد) میرے بھائی سید کلب حیدر کی [illegible] ارجمند آرا بیگم سے ۱۲ر اپریل ۸۲ء کو راج پارک ہوٹل [illegible] بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک میرے بھائی اور بھابی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے (آمین)

● عنایت حسین صاحب (لنمو گر) کی صاحبزادی مہدیہ فاطمہ عرف جبین تاج سلمہا کی شادی ہمراہ میر شاہد علی سلمہ (ابن میر غلام علی صاحب مرحوم۔ مدراس) ۵ر مئی ۸۲ء کو بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● [illegible] حسن (سریاں۔ پیرزادگان۔ سلطانپور) کے فرزند سید [illegible] سلمہ کی شادی، سید امانت اللہ صاحب کی صاحبزادی (کرن [illegible] رائے بریلی) کے ہمراہ اور ان کی بیٹی سلمیٰ بانو سلمہا کی شادی سید مجتبیٰ سلمہٗ (پسر سید عبد الحیٔ مرحوم سیہہ۔ بارہ بنکی) کے ہمراہ ۲۲ر مئی ۸۲ء و ۲۳ر مئی ۸۲ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

رخصتی

پیش کردہ:۔ پنڈت کشن چند صاحب

بسلسلہ شادی طلعت فرید سلمہا دختر نیک اختر محسنہ قدوائی صاحبہ

سنو پیاری تمہیں اک رخصتی نغمہ سناتا ہوں
جو آئیں گی تمہارے کام وہ باتیں بتاتا ہوں
تمہارے سر پہ نذریں تاج رکھتا ہوں نصیحت کا
سبق دیتا ہوں تم کو پاسداری شریعت کا
خدا حافظ، سدا سعادت تم شریک زندگی بن کر
مسرت، شادمانی اور شوہر کی خوشی بن کر

جدا ماں باپ سے ہونا حقیقت میں قیامت ہے
مگر مجبور ہے انساں کہ یہ قانون قدرت ہے
نئے دن رات ہوں گے اور نیا ارض و سما ہوگا
نئے گھر اور نئے چھوٹے بڑوں سے واسطہ ہوگا
تمہارا سب سے پہلا فرض شوہر کی اطاعت ہے
اور اس کے بعد اپنے ساس اور سسر کی خدمت ہے
نصاب زندگی کی اک نئی تعلیم لازم ہے
تمہیں سسرال میں ہر ایک کی تعظیم لازم ہے
ہر ایک چھوٹے بڑے کو اپنا کر لینا اطاعت سے
رفاقت سے شرافت سے مروت سے محبت سے
تمہاری زندگی کی آب گویا آب گوہر ہے
تمہارے واسطے دنیا میں اب جو کچھ ہے شوہر ہے
تمہیں جب میکہ یاد آئے تو رنجیدہ نہ ہو جانا
علاج اس کا یہی ہے دھیان میں شوہر کے کھو جانا
جہاں تم جا رہی ہو اپنا مستقبل بنانے کو
وہاں سے آؤ گی ماں باپ کی عزت بڑھانے کو
تمہارا فرض ہے بچنا ہمیشہ جھوٹی راہوں سے
کہ یہ راہیں گرا دیتی ہیں انساں کو نگاہوں سے
وہاں ہر چھوٹی چھوٹی بات پر بھی امتحاں ہوگا
جو تم ثابت قدم اتریں تو ہر اک مہرباں ہوگا
اگر ان میری باتوں پر تمہاری کچھ نظر ہوگی
تمہاری زندگانی بھی مسرت سے بسر ہوگی
جدا ہو کر خوشی سے آج تم شوہر کے گھر جاؤ
اندھیرا کر کے اپنے گھر میں اے رشک قمر جاؤ
نہ چھوٹنے پائے ہاتھوں سے کبھی دامن اطاعت کا
صلہ تم کو ملے گا حشر میں شوہر کی خدمت کا

انتقال پرملال کی خبریں

● بمبئی سے واپسی پر یہ المناک خبر ملی کہ میرے مخلص دوست اور قدیم کرمفرما ڈاکٹر دادر حسین صاحب (ریٹائرڈ ڈاکٹر زولوجیکل گارڈن لکھنؤ) کی صاحبزادی کنیز فاطمہ (زوجہ عز الدین صدیقی

صاحب سندیلہ کا ۱۰ مئی کی صبح ۳ بجکر ۴۰ منٹ پر انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر فرید صاحب سے نہ جانے کتنے ڈاکٹروں سے بڑے اچھے تعلقات تھے اور سب نے پوری کوشش کی، لیکن وقت آجاتا ہے تو ساری تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور وہی ہو کر رہتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ مرحومہ بیحد مخیر اور شریف النفس خاتون تھیں لیکن موت اچھوں کو بھی نہیں بخشتی۔ رہے نام اللہ کا۔ میری دعا ہے کہ مرحومہ کو اللہ پاک اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (شریک غم۔ نسیم انہونوی)

● بڑے ہی غم و افسوس کے ساتھ یہ خبر شائع کر رہا ہوں کہ میرے پرستار اور مخلص ترین دوست سردار ہرچرن سنگھ صاحب جو این ریلوے کے ٹکنکل سکشن دہلی میں افسر تھے ۱۴ دسمبر ۸۳ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ یہ خبر میری بہن یعنی آنجہانی سردار ہرچرن سنگھ صاحب کی شریک حیات گلاجیت کور صاحبہ نے اپنے خط میں دی ہے جو مجھے اب ملا ہے۔ بہن موصوفہ اردو نہیں جانتیں۔ اب کسی سے اردو میں یہ خط لکھوایا ہے۔ کاش انہوں نے یہ اطلاع نہ دی ہوتی۔ سردار ہرچرن سنگھ صاحب اردو بڑی اچھی جانتے تھے۔ ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ میں ان کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا تھا۔ وہ سکھ تھے لیکن انہوں نے تمام مذاہب کی کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ قرآن پاک کے حوالے بھی دیا کرتے تھے۔ نہایت درجہ غیر متعصب اور شریف النفس انسان تھے۔ عزالہ کو انہوں نے بہن بنایا تھا اور وہ ہر سال انہیں راکھی بھیجا کرتی تھیں۔ ریلوے ورکشاپ کے معائنے کے لیے لکھنؤ آتے تو قیام میرے ہی یہاں کرتے۔ ان کی باتوں سے دفتر کا سارا عملہ متاثر ہوتا تھا۔ اس دور میں ایسے لوگ بس انگلیوں پر ہی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ میرا ایک سچا ہمدرد اور دوست جدا ہو گیا۔ سبب انتقال معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال میں انکی بیوی بچوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ نسیم انہونوی

● سیدہ النساء عرف جمیل (بنگلور) افسوس صد افسوس کہ میری والدہ نوجہاں بیگم عرف لبی جان صاحبہ ۱۷ فروری ۸۴ء بروز جمعہ بوقت صبح مختصر علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ وصیت کے مطابق انکی میت میسور لیجا کر بعد نماز ظہر سپرد خاک کر دی گئی۔ مرحومہ کی مغفرت کیلئے دعائیں... والی تمام بہنیں بھی دعا فرمائیں

کہ اللہ پاک انہیں غریق رحمت فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

● ایم شمشاد بیگم (دہلی کنڈا) یہ سطریں خون جگر سے اپنی لخت جگر زہرہ فرحین سلمہا کے انتقال کے سلسلہ میں لکھ رہی ہوں جو ۷ اگست ۸۳ء کو عالم وجود میں آئی تھی اور صرف ۹ ماہ بعد ۹ مئی ۸۴ء کو میری گود خالی کر گئی۔ کیسے صبر کروں۔ کیسے اسے بھولوں۔ آپ بہنیں دعا کریں کہ مجھے صبر آجائے۔ (اللہ پاک آپ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ نسیم انہونوی)

کوئی بھی مضمون یا تحریر نمبر خریداری کے بغیر نہ روانہ کریں۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شایع کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت لکھا گیا ہو۔ موزوں اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی جس ماہ میں اس کی اشاعت ہونا ہو اس سے پہلے مہینے کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ جولائی کے لیے مقررہ عنوان ہے "دامن" اگست کے لیے "شوق"۔

چاک دامن تو سِل بھی سکتا ہے
زخمِ دل کا سِیا نہیں جاتا

مرسلہ:۔ کشور سلطان (لال باغ لکھنؤ)

کتنے بیتے دنوں کے زخم ہیں دل میں
جی میں سوچا تو آنکھ بھر آئی

مرسلہ:۔ امروز جہاں (آرہ)

فتنوں کو جگاتی ہیں، یہ کاجل کی لکیریں
اس خنجرِ خاموش کا ہر زخم مٹا دے

مرسلہ:۔ مہر افروز (لکھنیا)

مجھے زخم دینے والے، تو رہے سدا شگفتہ
تجھے آنچ تک نہ آئے، مری بس یہی دعا ہے

مرسلہ: مس روبینہ شمسی (آگرہ)

زخم کو دیتے ہیں تشبیہ گلِ خنداں سے
دل کے ہر داغ کو ہم رشکِ قمر کہتے ہیں

مرسلہ:۔ عفنا فضل (رامپور۔ یو۔ پی)

دیکھی ہونٹوں کی ہنسی، زخم نہ دیکھا دل کا
آپ اوروں کی طرح کھا گئے دھوکا کیسے

مرسلہ:۔ جہاں آرا بیگم دین (باڑی سیتاپور)

زخم بھر جائیں گے پر داغ تو رہ جائیں گے
دوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

مرسلہ:۔ حفصہ رحمٰن (رامپور)

کیا تمہیں یہ چاہت ہے یا سبب، جب جب کہ زخم ابھرتے ہیں
اک مدت ہوئی جس کو ہم بھول گئے کیوں وہ کہانی یاد آئی

مرسلہ: سیدہ تنویر فاطمہ بیگم قادری (ارینگاٹ، مبئی)

مولانا صادق سردھنوی مرحوم کے وہ ناول جو مل سکتے ہیں

آفتاب عالم چوبیس روپیہ	معرکہ کربلا چوبیس روپیہ	نازنین عرب اٹھارہ روپیہ	محمود روزا بارہ روپیہ
جوش جہاد بیس روپیہ	جوش اسلام چوبیس روپیہ	عرب کا چاند بائیس روپیہ پچاس پیسے	عروس بغداد بیس روپیہ
فتوح الشام پچیس روپیہ	فتح یرموک بارہ روپیہ پچاس پیسے	محمد قاسم چوبیس روپیہ	مشرق کی حور بائیس روپیہ پچاس پیسے
ایران کی آئینہ بیس روپیہ	اندلس کے دو چاند چوبیس روپیہ	شریف مجاہد بیس روپیہ	طارق اکیس روپیہ
محبوبہ اورخان چودہ روپیہ	ماہ طلعت آٹھ روپیہ	بہادر عرب زیر طبع	محبوبہ حلب زیر طبع

ملنے کا پتہ: نسیم بکڈپو ۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ

میں تمہارے خیالات کا عکس بنکر تمہارے سامنے آؤں گی۔"

"تو ایک رومی سپاہی کی محبوبہ ہے جس کا ایمان بہادری سے جینا اور بہادری سے مرنا ہے ــــ میں تیرے لازوال پیار کا قدرداں ہوں۔ میری فتح یابی کی آرزو کر ہے"

"خداوند خدا اور عظیم ولیٹیا کے دربار میں ماہِ مبارک فروری کے آخری دن تمہاری منتظر رہوں گی تاکہ مقدس آگ کے سامنے تمہاری صحت یابی کے لئے قربانی دوں اور تمہاری سلامتی کیلئے منت مانوں۔ تمہاری سلامتی ہی میری زندگی کا حسن ہے اور ابد کی بقا بھی ہے۔"

پھر وہ دونوں ایک دوسرے میں ڈوبتے چلے گئے ــــ

۲۱، اپریل رومۃ الکبریٰ کی بنیاد کا دن مانا جاتا ہے۔ اسی دن [illegible] کی قیادت میں رومی فوج غالولیوں سے جنگ کے لئے نکلی ــــ یہ ایک عظیم جنگ تھی۔ روانگی سے قبل شہنشاہ نیوما نے سپاہیوں اور فوجی جرنیلوں کو ہمت اور بہادری سے لڑنے کی تلقین کی حوصلہ اور صبر [illegible] کو سنبھالنے کے لئے کہا اور حتی المقدور خون نہ بہانے کی بھی ہدایت کی۔ نیوما نے کہا کہ صورت دشمن کی ہو یا اپنی اس کا احترام لازم ہے اس بات کو کبھی مت بھولنا۔

عظیم موبد طلے من کیوری نے فتح کی دعا کی اور نیوما کے ساتھ شہر پناہ تک فوج کو رخصت کرنے آیا۔ ایمیلیا بھی بحیثیت شہزادی [illegible] نیک خواہشات کے ساتھ رخصت [illegible]

نے جیس کو الوداع کہنے آئی تھی۔

اس وقت نے جیس قرمزی رنگ کے اونچے دامن کے کوٹ میں تھا پتلی لمبی چمڑی پیٹی اس کی کمر میں کسی ہوئی تھی۔ بوندھوں پر پیتل کے چمکدار چھلے لگے ہوئے تھے کشادہ سینہ چاندی کے تمغوں سے سجا ہوا تھا۔ سر پر خود تھا جو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کا سرخ و سفید رنگت بلند و بالا قد اور مضبوط بازو، تنی ہوئی گردن کے ساتھ اسے سب سے نمایاں کر رہے تھے۔ وہ فوجی کمانڈر کے لباس میں سج رہا تھا۔ نے جیس نے دزدیدہ نظروں سے پالکی کی طرف دیکھا جہاں چہرے کے سے دو آنکھیں پرشوق انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں وہ ہلکے سے مسکرایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیام سلام ہوگیا لیکن یہ سب اتنے مختصر لمحوں میں ہوا کہ جتنی دیر میں ایکبار دوسری پلک جھپکتی ہے۔

ملا حن کیہی نے آگے بڑھ کر نے جیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "بہادر نوجوان! اس عظیم معرکے میں فتح تیری زندگی میں بہت سی کامیابیاں لائے گی۔ تو دیوتاؤں کا بھی محافظ ہے گا اور ہماری عزت و حرمت کا بھی۔ میں تیرے لئے خصوصی دعا کروں گا۔ جا خدائے لازوال تیرے ساتھ ہو۔ فتح کو اپنا مقدر بنا کر واپس آنا" اور پھر فوجی بگل سے میدان گونج اٹھا اور سمندر کی موجوں کی طرح فوج بہتی چلی گئی۔

ملا لیے شمال میں کوہ آئیس کے دامن میں رہنے والے خالد کیفیؔ
[illegible]

سوختہ دل

نہایت دلچسپ تاریخی افسانہ

شہناز کنول

حریم کے جولائی نمبر سے شروع ہوگا

ان کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ رعنا کی طرف سے بہت بڑی تعداد میں فوج ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کا جوش و خروش عجیب و غریب ہے انھیں اندازہ ہو گیا کہ تصادم زبردست ہوگا لیکن انھیں یہ بھی معلوم تھا رولیشی شہنشاہ نیوما کی امن پسندی اور نرم دلی نے فوج کو نرم خو اور معتدل مزاج بنا دیا ہے اور وہ لوگ وحشت و بربریت پر یقین نہیں رکھتے جبکہ ان کے برعکس غال قوم ان وحشیانہ صفتوں سے متصف تھی اور یہ بات ان کے لئے باعثِ اطمینان تھی۔

غالویوں کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں اب رومی فوج روم سے نکل کے اب دریائے ٹیبر پار کر رہی ہے۔ اب بحر روم کے کنارے کنارے آگے بڑھ رہی ہے اور اب کوہ آلپس کے قریب آ چکی ہے۔ آخر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ غال قوم کی فوج بہت زیادہ تھی ان کے چہرے ہیبت ناک اور قہر بھرا دوسرے وہ لوگ پہاڑی لوگ تھے اس لئے جفاکشی ان کی فطرت تھی اور تیسری بات یہ کہ ان کے دل رحم اور مروّت نام کے جذبوں سے نا آشنا تھے۔ رومی افسران ابھی اپنی فوج کو ترتیب دے رہے تھے کہ غالیوں نے اپنے منصوبے کے تحت اچانک حملہ کر دیا۔ ایک دم تو رومی فوج گھبرا گئی مگر نف جبیس نے کہا: "ہم اپنے وطن اور اہل وطن کی خاطر سر کٹانے کے لئے نکلے ہیں آگے بڑھو اور ان غالویوں کو بتا دو کہ تم کمزور یا بزدل نہیں ہو اور تمہاری رگوں میں غیرت دار ماؤں کا خون ہے۔" رومی فوج ایک جوش کے ساتھ غالویوں پر ٹوٹ پڑی۔ غال قوم نے جنگ مغلوب کی ابتدا کر دی تھی اور رومی فوج کو ہر حال [illegible] [illegible] کہ شہنشاہت کو اس کے [illegible] اور [illegible]

گناہ میں نف جبیس کے ساتھ شہزادی پمپی لیہ بھی شریک تھی۔ اس لئے جو سزا اس کے لئے تجویز کی جاتی ہے۔"

—:●:—

کہتے ہیں کہ پمپی لیہ اور نف جبیس کو کھو دینے کے بعد شہنشاہ نیوما نے بادشاہت کو تیاگ دیا۔ کیوری نالیس پہاڑی پر ایک جھونپڑی بنا کر وہ اس میں آ گیا لیکن ولیشا مندر آنے والوں نے کبھی اس کی آنکھ خشک نہیں دیکھی۔ وہ ساری عمر اس غم میں آنسو بہاتا رہا۔

ختم شد

گونج رہا تھا گویا آپس تماشائی کی طرح کھڑا تھا۔

دو روز متواتر یہ جنگ چلتی رہی یکساں جوش و خروش کے ساتھ شاید دونوں طرف سپاہی آج فیصلہ کن جنگ چاہتے تھے تاکہ کسی ایک کا وجود ختم ہو جائے۔ نے بیس بڑی بہادری سے میدان میں ڈٹا ہوا فوج کو کمانڈ کر رہا تھا اس نے انتہائی دانشمندی سے اس انداز کی جنگ کے دوران افراتفری میں بھی فوج کے حصے کر دیئے تھے۔ ایک حصہ لڑتا اور آگے بڑھتا دو حصے دائیں بائیں سے صرف مدافعت کرتے اور چوتھا حصہ سب سے پیچھے رہتا وہ برائے نام لڑتا تاکہ تازہ دم رہے اور جب سب سے آگے رہنے والا تھک جاتے تو انھیں رفتہ رفتہ پیچھے لے کر دائیں ہاتھ والا آگے آجاتا اور اس کی جگہ پیچھے والا حصہ پہنچتا۔

غال قوم کی بے حساب فوج میں لگاتار تازہ دم سپاہی آرہے تھے۔ اور یکساں جوش سے لڑ رہے تھے۔ تیسرے دن نے بیس نے محسوس کیا کہ رومی فوج آہستہ آہستہ سست پڑ رہی ہے۔ آج ہی اسے یہ اندازہ بھی ہوا کہ غال قوم بہت جری اور بے درد ہے۔

شہنشاہ نیوما کو جنگ کا سارا حال برق رفتار قاصدوں اور جاسوسوں سے معلوم ہو رہا تھا۔ دوپہر سے اسے یہ خبریں مل رہی تھیں رومی فوج سست پڑ رہی ہے۔ رومی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ رومی تھکن سے زخمی ہو ہو کر گر رہے ہیں رومی کٹ رہے ہیں ـــ لیکن اس کے باوجود اسے نے بیس [illegible]

کا سب سے بڑا عہدہ دے کر مزید طاقتور بنا دیا تھا لیکن اس بدقسمت نے عظیم دیوتا کی حرمت، عزت اور پاکیزگی سے کھیل کیا۔ عوام کے سامنے سپاہی گردن جھکا دی اب یہ سزا کا مستحق ہو چکا ہے ـــ عظیم معبد نے کس سزا کا اعلان کریں۔"

فوجیوں میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی چند بوڑھے افسروں نے بادشاہ کی تائید کی: "ہم سب منتظر ہیں۔ نے بیس کو فوراً سزا سنائی جائے۔" یہ وہ لوگ تھے جو نے بیس سے حسد کرنے لگے تھے۔ اس کی ترقی اس کی لیاقت پر کڑھتے تھے۔ وہ چیخے: "اس ناپاک شخص نے جان بوجھ کر شہزادی کی بے حرمتی کی ہے اس کی معصومیت کو داغ لگایا ہے۔ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو ان غلاموں سے بھی گیا گزرا ہے۔ جو دیوتاؤں کی حرمت پر سر کٹوا دیتے ہیں۔ مقدس باپ آپ اب کس انتظار میں ہیں۔؟"

بوڑھے موبد نے من کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھری پھر اس نے ایک محبت بھری نظر نے بیس کے نڈھال چہرے پر ڈالی اور بولا۔

"نے بیس ـــ تیرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ اہل روما کے ہاں جس کی کوئی معافی نہیں ہے۔ عظیم دیوتا کے دربار سے ایسے گنہگار کو زندہ درگور کیا جانے کی سزا دی جاتی ہے۔ اور تجھے بھی یہ سزا دی جانی ہے۔ اہل روما تیرا اس عظیم فتح کے ساتھ تیری یہ سزا بھی ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

نے من ایک لمحے کو رکا، سب کے چہروں پر رونق سی آگئی تھی اس نے سب کے بشاش چہروں کو بغور دیکھا اور بولا: "لیکن .... شہنشاہ روما نیوما پمپیلیس اور اہل روما کو فوراً جاننا چاہیے کہ اگر [illegible]

[illegible] میں آکر چلاّ اٹھے یہ کیا کیا تو نے او بدبخت انسان۔ مقدس کنواری [illegible] کو بیکار کر دیا ولیشا کی بے حرمتی کر دی، ہماری عزت پر ہاتھ ڈال [illegible] تھا یا یہ شیطان ہو گیا ہے کیا۔“

[illegible] غلاس نے آگے بڑھ کر پیپالیہ کو الگ کیا اور نے جیس سے بولا۔
”[illegible] پیپالیہ عظیم ولیشا کے حضور قربان کی جا چکی ہے۔ وہ اب اچھوتی اور مقدس کنواریوں میں شامل ہے۔ تو نے اسے ہاتھ لگا کر وہ عظیم گناہ کر ڈالا جس کی کوئی معافی نہیں ہے۔ ولیشا کے دربار سے ایسے انسان کے لئے عبرت ناک سزا ہے۔ یہ بد ترین گناہ ہے۔“

”گناہ ——— ! کیسا گناہ مقدس باپ ؟“ نے جیس کراہا۔ ”میں اور پیپالیہ اس آگ کو گواہ بنا کر پیار کی قسم کھا چکے ہیں۔ ہم نے اسی ولیشا کے حضور ایک دوسرے کے ہونے کا اقرار کیا تھا۔ میرا گواہ صرف خداوند اور عظیم ولیشا ہے۔ مقدس بزرگ کیا آپ بھی اسے گناہ سمجھ رہے ہیں۔ [illegible] اپنی زندگی سے جو یہ کھیل کیا تھا وہ صرف پیپالیہ کو پانے کے لئے مقدس آتش کدے کو روشن رکھنے کی خاطر میں کامیاب ہوا اور عظیم ولیشا کے پاک شعلے میرا مجبوبہ کو مجھ سے چھین لیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ قربانی نہیں ہو سکتی نہیں ہو سکتی۔ پیپالیہ میری ہے اور میری ہی رہے گی [illegible] ذات میں ہوکر جنون کی باتیں کر رہا ہے اور قربانی کی رسم پوری [illegible] کے ساتھ ادا کی گئی ہے۔ تیری کامیابی اس قربانی ہی کی دین ہے۔ [illegible] ہے [illegible]۔“ غلاس نے کہا۔

”[illegible] ——— شہنشاہ نیوما کی آواز گونجی۔ ”اس نوجوان کو ہم [illegible]

اچانک اس نے ایک فیصلہ کیا ——— فوج کے لئے مزید کمک منگوائی اور خود کیوری نالیس پہاڑی پر ولیشا مندر میں فوری طور پر پہنچا ہوا تھا۔ غلاس کیوری بھی اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔ شہنشاہ نیوما نے خصوصی مناجات اور دعا کا اعلان کیا اور مقدس آتش کدے کے قریب کرنے میں پہونچا۔ اِن مقدس آگ کے سامنے پیپالیہ دو زانو بیٹھی ہوئی رو رو کر دعا مانگ رہی تھی۔ نیوما کو خوشی ہوئی کہ شہزادی کو اپنے ملک اور عوام کی سلامتی سے کتنا پیار ہے۔ کتنا لگاؤ ہے۔

مقدس کنواریاں آکر ترتیب سے کھڑی ہو گئیں۔ غلاس بھی آکر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شہنشاہ نیوما نے وحدت کے مظہر ولیشا کے آگے سر جھکا دیا اور مناجات شروع ہو گئی۔ سب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور زبانیں خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی چاہ رہی تھیں۔ وہ گا رہی تھیں۔

تیرا نام سلامتی کا ضامن ہے
تیری ذات رحم کی خوگر ہے
عظیم ولیشا
کہ تیری ذات کی نمائندہ ہے
فنا اور بقا دینے والی ہے
نیکوں کی جزا نیکی ہے
ہم گناہوں کو بخشش دے
ہم سلامتی کے خواہاں ہیں
ہم اس کے طالب ہیں

ہم فتح کے خواہاں ہیں
ہمیں ازلی نیکی سے ہمکنار کر

مناجات ختم ہوئی پھر ظےمن کیوری نے دعا کروائی۔ اچانک کسی نے آکر اطلاع دی کہ رومی حوصلہ چھوڑ چکے ہیں اور شکست کے قریب ہیں لیکن ابھی نے بیس کا جوش اسی طرح برقرار ہے اور اب وہ خود بھی میدان میں آگیا ہے۔

نیوما آگے بڑھا اور بولا "ہاں میں جانتا ہوں سب کچھ جانتا ہوں۔ پھر اگر کوئی گناہ رومیوں کی فتح میں رکاوٹ بن رہا ہے اور میں اپنا زندگی کا سب سے بڑی قربانی عظیم ویسٹا کے حضور پیش کروں گا معزز بزرگ [illegible] اور پاک دوشیزگان ویسٹا تم گواہ رہنا کہ میں نیوما پمپی لئیس اپنی بیٹی پمپی لیہ کو عظیم ویسٹا کے سپرد کرتا ہوں... بخوشی و برغبت......

پمپی لیہ ایکدم غش کھا کر گر پڑی۔

[illegible] نے دہل کر کہا "یہ کیا کر دیا... یہ کیا کر دیا آپ نے...... سوچئے سوچئے ابھی وقت ہے.... یہ قربانی نہیں ہو سکتی، شہزادی قربان نہیں کی جا سکتی.... ناممکن ناممکن..." "کیوں نہیں ہو سکتی یہ قربانی؟"

نیوما نے اطمینان سے جواب دیا "کیا صرف اس لئے کہ وہ شہزادی ہے۔ میں اگر ملک کے جوانوں کو ملک کی اور اپنی سلامتی کیلئے کٹوا سکتا ہوں، قربان کر سکتا ہوں تو اس سلامتی کے لئے اپنی اولاد کو کیوں قربان نہیں کر سکتا۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں میرے عوام بھی میری اولاد جیسے ہیں۔ پمپی لیہ اب ہمیشہ [illegible] رہے گی عظیم ویسٹا کی خدمت کے لئے۔ [illegible] بزرگ [illegible]
[illegible]

اپنے لئے پسند کرے اور پرہیزگاری کے ساتھ راہ مستقیم پر چلے۔ آؤ آگے بڑھو۔ میرے بچے نے بیس حوصلہ اور عزم کے ساتھ آگے آؤ تاکہ ویسٹا کی یہ پاک خادمائیں تمہاری نظر اتار سکیں۔"

ظےمن نے یہ لمبی چوڑی تقریر اس لئے کی تھی کہ پمپی لیہ یہ سب سن لے اور نیوما کی ہدایت کے تحت نے بیس کی نظر اطمینان اور سکون سے اتار سکے۔ نیوما کی ہدایت تھی کہ نے بیس کی نظر پمپی لیہ اتارے۔ بوڑھے ظےمن نے پمپی لیہ کو اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھے۔ نے بیس فوجی لباس میں نظریں جھکائے کھڑا تھا اس کے چہرے پر مسرت اور خوشی کے سائے لہرا رہے تھے۔ پمپی لیہ نے جالی کی نقاب میں سے نے بیس کو بغور دیکھا۔ اور اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے تھالی اوپر کو اٹھائی تو ہاتھ بری طرح لرزنے لگے۔ ہاتھوں کی لرزش بڑھی تھالی میں رکھی چیزیں بجنے لگیں۔ پمپی لیہ نظریں اتار نہیں پا رہی تھی اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ہاتھوں کی لرزش پر نے بیس کی نظر پڑی اور وہ چونک اٹھا ــــ یہ ہاتھ...... یہ ہاتھ تو پمپی لیہ کے ہیں اس نے اضطراری طور پر نظریں اٹھائیں۔ جالی میں جانی پہچانی آنکھوں سے اشک رواں تھے دل کا خون بہہ رہا تھا۔

"پمپی لیہ ــــ" نے بیس کے منہ سے زور سے نکلا اور پھر تھالی زمین پر تھی اور پمپی لیہ نے بیس کی بانہوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔
"پمپی لیہ..... تم..... تم یہاں اس روپ میں کیسے آگئیں..... ویسٹا کی خادماؤں میں..... بتا پمپی لیہ....." نے بیس نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا ــــ سب حیران تھے۔ ظےمن [illegible] نظروں سے
[illegible]

معتصم کا دل کیوں دکھاؤں ؟ ! "

"میں سمجھا نہیں جناب عالی کس لڑکی کا تذکرہ آپ نے فرمایا؟" میجر صاحب نے کہا۔ اس وقت دالان میں سب موجود تھے حتی کہ بوا جی تک اور سب دم سادھے علوی صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ میجر صاحب کے استفسار پر علوی صاحب نے ایک نظر ایسی نظر جیسی تلوار کی کاٹ تھی خواتین پر ڈالی اور بولے: "بیٹی ۔ رومہ کا تذکرہ کر رہا ہوں ۔ وہ مجھے معتصم کے لئے بہت پسند ہے۔"

"جی ۔" میجر صاحب مسکرائے "کچھ سنا میں نے بھی تھا جزاک اللہ۔ آپ نے بڑی عمدہ بات سوچی ہے۔ بیٹی کو اسے بہت پسند کرتا ہوں لیکن آپ نے مجھ سے فرمایا نہیں۔ وہ تو میرے گھر کی بیٹی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ لیتا آتا صاحب ! "

دلنواز بیگم نے ایک بڑا اقدام میجر صاحب سے قطعی پوشیدہ رکھ کر کیا تھا میجر صاحب کو حقیقت کی خبر ہی نہ تھی۔ وہ جس جگہ گئے ہوئے تھے۔ ادھر ای سے سیدھے حیدرآباد چلے آئے تھے۔ انہیں دالان میں بیٹھے ہوئے لڑکے اور ان کے گھر دیکھ بھال کرنے کو وہیں رہ گئی ہے اور رضوانہ بیگم باپ کی عیادت وصحت کے لئے چلی آئی ہیں !

اس وقت معتصم اور نعمانی کی نظریں رضوانہ بیگم پر پڑیں۔ جن کے نق چہرے پر باری باری قوس قزح کے رنگ لہرا رہے تھے۔ حیرت کا مقام تھا کہ کوئی بھی دُر رہے معتصم نعمانی ان کا اس کیفیت سے بہت محظوظ ہو رہا تھا معتصم نے بے رخی سے نظریں ہٹالیں جس پر کے دل پہ کیا گزری کسی نے نہ جانا۔ وہ بیٹھا گیا — ؟

"پولیس کچھ نہ کچھ — !"

"نہیں صاحب پولیس کا نام مت لیجئے" چوکیدار نے کہا۔ "بیگم صاحب سے کچھ لوگ پریشان ہیں۔ سو کہاں رو پیوں پر ایمان اور غیرت کا نیلام نہیں کروں گا یہ ہے آئے سب لڑکیاں الیڈیہ خدا جانے کیا چکر ہے۔ خیر۔ آپ کو کس سے کیا سروکار۔ آپ اندر چلئے۔ دیکھئے اُسے ! "

وہ اندر گیا اور پھر واپس آ گیا "پٹھانی پردے میں ہو گئی ہے۔ آئیے۔" چھوٹا سا گھر تھا۔ ہتھیلی بھر کے صحن میں تیز چمکیلی دھوپ پھیلی تھی صحن سے متصل ایک کوٹھری تھی۔ برآمدے تک چوکیدار نے رہنمائی کی اور دروازے کی طرف اشارہ کر کے چلا گیا۔

"دال بھنگ روٹی کا بندوبست کروں آپ کے لئے جناب — ! "

نعمانی نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر خاصی تاریکی تھی چوکھٹ سے سر کو بچاتے ہوئے نعمانی نے اندر قدم رکھے۔

ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر رومہ پڑی تھی۔ اپنے سے بھی غافل۔ اسے پہلی نظر میں زندہ سمجھنا مشکل تھا!

وہ اس کے پاس آ بیٹھے اور اس پر جھکے۔ اسے آوازیں دیں لیکن رومہ نے نہ تو آنکھیں کھولیں نہ جواب دیا۔ نعمانی نے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا پیشانی جل رہی تھی۔

نعمانی ایک آہ بھر کر سوچنے لگے۔ ایک شریف خاندان کی خاتون ایسی حرکت بھلا کر سکتی ہیں — !

انہوں نے سردار خان کو آواز دے کر پانی منگوایا۔ رومہ کا منہ دھلا، چند قطرے اس کے لبوں میں ٹپکائے اور پھر اس پر جھک کر اسے پکارنے لگے۔

اب اس کی حالت میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کے لب کانپے، پلکیں جھپکیں، پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"رومہ۔۔ رومہ بہن۔ ہوش میں آؤ۔ آنکھیں کھولو۔ پہچانو مجھے۔" نعمانی نے جلدی سے کہا اور اس کا گرم گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

رومہ کے لب کپکپانے لگے۔ اس نے اچھی طرح نعمانی کو دیکھا لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ یہ خواب تھا۔ فریب تخیل۔ بچھڑے ہوئے خیالوں کا عکس۔ بھلا نعمانی یہاں کہاں آ سکتے ہیں۔ وہ اس سے سیکڑوں میل دور ہوں گے۔

"رومہ بہن۔ چلو ہم یہاں سے چلیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" نعمانی نے کہا۔ "تم نے مجھے پہچان لیا نا؟"

"ہاں" رومہ نے کہا اور پھر وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم لیٹی رہو۔"

"آپ۔۔ احمد بھائی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نعمانی کو تک رہی تھی۔

"خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے مل گئیں۔۔۔ بخار کب سے آ رہا ہے۔ چلو میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

"بھیا آپ آ گئے۔ اب میں کسی دوا کے بغیر اچھی ہو جاؤں گی۔" اس نے کہا۔ اور پھر رو پڑی۔

"اماں۔ بھیا۔ یہ سب کیسی ہیں۔ میرے ننھے منصور اور انصار۔"

"تم ان سب سے پھر ملو گی۔ اب خاموش ہو جاؤ۔۔۔!"

دیر تک نعمانی اس سے باتیں کرتے رہے۔ اس عرصہ میں سوار خاں نے نعمانی کو کچھ کھانے کے لئے بلایا تھا۔ وہ رومہ کو پریشان نہ ہونے

"چلا جاتا شاید۔ آج ہی کل میں آ جائیں گے۔ مگر آپ۔ میرا نام کسی کے سامنے نہ لیجئے گا۔"

"تم اطمینان رکھو بیٹی" علوی صاحب نے کہا اور پھر بولے۔ "خداوند کریم تمہیں سدا خوش رکھے۔ میں تو مر رہا تھا۔ میری بچی۔ میری نئی زندگی کا باعث تم ہو۔ اب جاؤ ذرا۔ صدیق احمد کے والد اور رضا کی والدہ کو میرے پاس بھیجو۔"

کسی کو پتہ نہ چلا کہ کیا ایک علوی صاحب نے نعمانی اور رضا کا نکاح ملتوی کر کے اگلے اتوار کو کیوں رکھ دیا؟ بہرحال ان کی یہ بات بھی سب نے مان لی۔ بیمار تھے۔ ان کا دل کون دکھاتا۔ مگر بیگم علوی سخت پریشان اور خوفزدہ تھیں۔ علوی صاحب بار بار غضبناک نظروں سے انہیں گھورنے لگتے تھے۔ وہ بیوی کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ وہی تو اکیلی گنہگار تھیں۔

میجر صاحب بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے خسر محترم کی مزاج پرسی کی اور جواب میں علوی صاحب بولے۔

"ہاں میاں۔ بیمار تھا مگر اب اچھا ہوں۔ سچ پوچھو تو مجھے ان ناقص العقل عورتوں اور بیوقوف لڑکے نے بیمار ڈالا تھا لیکن خدا بھلا کرے میری بچی کا۔ اس نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ اب میں انشاءاللہ اپنا مقصد پورا کر دوں گا میاں۔ بیمار ہوا تو اس عدالت کا خیال آیا جس کا منصف خالق کائنات ہو گا۔ وہ مجھ سے حساب لے گا۔ اس عدالت میں حاضری کا تجربہ ہو چکا ہے۔ مجھے اپنا اعمال نامہ لیکر جانا ہے۔ بیٹا۔ دل شکنی کسی حال میں معاف نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے بچے کا دل دکھایا ہے اور اس معصوم بچی کی زندگی برباد کی ہے جو مجھے اپنا باپ سمجھتی رہی۔ باپ کہتی رہی۔ میں چاہتا ہوں۔ وہ ہر طرح اس قابل ہے کہ میرے مختصر سے کنبہ میں شامل ہو سکے۔ تو پھر میں اس

اٹھا کر رکھ دی اور پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بہت آہستگی سے بولے
"بھابی۔ ایک بڑی خوشخبری ہے آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے
کہ آپ اسے راز میں رکھیں۔ ورنہ پھر ـــــ!"
"کہئے تو ـــ شرطیں بعد کو منگوا لیجئے گا" سلمیٰ نے کہا۔
"بھابی۔ آپ سب نے جسے مُردہ تصور کر لیا تھا۔ وہ ہستی زندہ موجود
ہے۔ بابا جان نے خاندان کی آبرو بچانے کی خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا
میں اعدہ سے ملاقات کر کے آ رہا ہوں۔ وہ ہر طرح بخیریت ہے۔ اب میں آپ سے یہ کہنا
چاہتا ہوں کہ ـــــ!"
نعمانی کی بات کاٹ کر معتصم نے بیقراری سے کہا "زندہ ہے ـــــ تو پھر
کہاں ہے۔ خدا کے لئے لمبی لمبی تمہیدیں بند کرو اور صاف صاف بات بتاؤ۔"
"تم مجھ سے خفا ہو اور میں اپنا بندوبست دوسرے کرے میں کر رہا ہوں"
نعمانی نے گال پھلائے۔
"پہلے ـــ میں تمہیں اپنے دل میں رکھ لوں گا۔ پہلے پوری بات بتاؤ"
معتصم نے کہا۔
سلمیٰ بھی حیرت سے نعمانی کا چہرہ تک رہی تھیں۔ بہرحال ان کی خواہش پر
رازداری کا وعدہ لے کر نعمانی نے بسم اللہ سے والسلام تک سارا قصہ سُنا دیا
معتصم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جیسے ایک نئی اُمید حیاتِ تازہ بن کر
اس کی رگوں میں گردش کرنے لگی ہو۔ سلمیٰ بھی مسرور تھیں۔ بولیں "احمد بھائی
ابا جان پچھتاووں کے مارے اس حال کو پہنچ گئے ہیں۔ آپ ان سے کیوں
نہیں کہہ دیتے۔ ان کی زندگی بہت قیمتی ہے اب وہ ہر طرح راضی ہیں اور ہزار
بار کہہ چکے ہیں کہ اگر وہ زندہ ہوتی تو اسے بہو بنا لیتے۔ نعمانی بھیا آخر خدا نخواستہ

معتصم نے انہیں دیکھا اور چہرہ پھیر لیا۔ علوی صاحب البتہ کھل اٹھے۔
"آؤ بیٹے آؤ۔ بڑے موقعہ سے آئے!"
معتصم سخت خفا تھے۔ اُٹھ کر چلے گئے! نعمانی علوی صاحب کے پاس
بیٹھ کر ان کی مزاجی حالت پوچھنے لگے!۔
اتنے میں سلمیٰ علوی صاحب کے لئے سوپ اور دلیہ لئے ہوئے آئیں اور
اجازت لے کر نعمانی باہر نکلے۔ شہ نشین کے پاس رُکا ملا۔ انہوں نے نعمانی
کو روک لیا "تم کہاں سے آ رہے ہو؟ کہاں گئے تھے؟"
نعمانی نے بہانہ بنایا "جواب کو بیدر کی طرف نکل گیا تھا۔"
"آج تمہارے والدین آ رہے ہیں۔ پتہ ہے تمہیں؟"
"جی نہیں" حیرت سے نعمانی نے کہا "کیوں؟"
"ابا جان نے ٹرنک کال کر کے بلایا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی طرف سے
کچھ مایوس ہو گئے ہیں۔ تم یہاں تھے نہیں۔ ورنہ دیکھتے کہ اختلاج کے
دوروں نے ان پر بڑے زبردست پڑے تھے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ خدا نہ
کرے.... دراصل اب تو میں خود کو بھی کچھ قصوروار سمجھنے لگا ہوں۔
جذباتیت اور حد سے گزر جانے کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ اگر ابا جان
خدانخواستہ جانبر نہ ہو سکے تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکوں گا۔"
"ہم۔ مگر۔ ابا اور اماں کیوں آ رہے ہیں۔" نعمانی ہکلائے۔ "سلمیٰ نے تم سے
کچھ نہیں کہا؟"
"جی نہیں۔"
"وہ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی میں نینا کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔
ماموں بھیا کا مزاج پرسی کا خط آیا تھا۔ وہ آ رہے ہیں اور شاید کل یا پرسوں

مجھ کو ـــ" رضا اتنا کہہ کر کچھ سوچنے لگے!"
نعمانی خاموش تھے۔

رضا کے وہاں جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئے عجیب سی کشمکش کی حالت ہو رہی تھی۔ اداس نہیں۔ دماغ نہیں۔

معتصم کرسی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ نعمانی کو دیکھ کر اس طرح انھوں نے سر جھکایا کہ نعمانی کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ معتصم کو شاید عمر بھر میں پہلی بار غصہ آیا۔ تلخ لہجے میں بولے۔

"اسی کو کہتے ہیں کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ سمجھے۔ دوستی کا دم بھرتے تھے۔ مجھے بھنور میں چھوڑ کر چلے گئے۔ معاوضہ مانا جاتا نہیں تھا کہاں فنا اور استقلال میں تم سے عمر بھر بات نہیں کروں گا تم اپنے لئے ایک کمرہ کا بندوبست کر لو۔ میرے ساتھ مت رہو۔ تمہارے اس دل شکن رویے سے مجھے بہت شدید صدمہ پہنچا ہے!"

"معاف کرو پیارے بھائی" نعمانی کو شرارت سوجھی انکے گلے میں باہیں ڈالیں اور گنگنائے "اب کی میں جان گیا تھا۔ وہاں مجھے بہت زیادہ معاوضہ ملا ہے۔ مجھے تو امید ہی نہیں تھی۔ پتہ چلا ہے کہ اس جگہ جہاں میں گیا تھا ـــ ہیرے جواہرات بھی ملتے ہیں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ کوئی قیمتی ہیرا مجھے ملے گا وہ میں تمہیں دیدوں گا ـــ!"

معتصم نے بانہوں کا ہار اپنے گلے سے نکال دیا۔ "یہ ہلکی ہلکی باتیں میں سننا پسند نہیں کرتا۔"

"اچھا بھائی ـــ کافی ـــ!" دروازے سے سلمیٰ نے کہا۔ "اب ملازموں کے [illegible] کی وجہ سے بے چاری کو اس طرح کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ نعمانی

نے جلدی سے بڑھ کر ان کے ہاتھوں سے ٹرے لی اور بولے "بھابی ـــ اگر آپ کو فرصت ہو تو براہ مہربانی چند منٹ کے لئے آپ اندر آئیے یہ حضرت ناراض ہو گئے ہیں مجھ سے۔ آپ کو درمیان میں رکھ کر میں ان سے انصاف چاہتا ہوں پلیز۔ آئیے۔ صرف دس پندرہ منٹ کے لئے ـــ!"

"یہ تو ساری دنیا سے خفا ہیں" سلمیٰ نے کہا۔ مگر کمرے میں آگئیں نعمانی نے کشتی تپائی پر رکھ دی اور دروازہ بند کر دیا۔ دونوں نے تعجب سے ان کی حرکت دیکھی۔

"بیٹھ جائیے بھابی" نعمانی نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ آپ بہت خوش معلوم ہوتے ہیں" سلمیٰ نے کہا اور دیوان پر ٹک گئیں۔

"لیجئے کافی پیجئے" نعمانی نے کافی بنائی اور بڑے ادب سے معتصم کو پیش کی۔ ان کا منھ اور کھنچ گیا۔

"نعمانی بھیا ـــ آپ کو خوشخبری ملی ـــ؟" سلمیٰ نے پوچھا

"ملی تو ہے" نعمانی نے کہا۔ "لیکن جب تک معتصم کا بیاہ نہ ہوگا ـــ میں بھی شادی وادی کا نام نہ لوں گا!"

"میرے زخموں کو مت کریدو ـــ ساتھ۔ مانا کہ تم بہت خوش ہو مگر میں نہ تمہاری خوشی برداشت کر سکتا ہوں نہ اپنے غم۔ ابّا جان اپنا فرض پورا کر دیں پھر۔ میں بھی کہیں چلا جاؤں گا۔" یہ کہتے کہتے معتصم کی آواز بھرا گئی۔

"بھابی" نعمانی نے معتصم کی طرف رخ پھیر کر کہا۔ "آپ کو معلوم ہے میں کہاں گیا تھا؟"

"نہیں۔ آپ نے کچھ کہا ہی نہیں" سلمیٰ بولیں۔ کافی کے بعد نعمانی نے بڑے

The Hareem, Lucknow June 1984 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP 32

نسیم انہونوی

Rs. 20/- only

THE HAREEM
July 84
Rs. 1|50
ایڈیٹر

سب سے پہلے تو میں تمام حریمی بہنوں اور بھانجیوں کو عید کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ گو یہ مبارکباد عید سے کافی دنوں بعد آپ سب کی نظروں سے گزر سکے گی، لیکن اس سے پہلی اشاعت میں مبارکباد پیش کرتا تو قبل از وقت ہوتی۔
امید ہے کہ اس کے باوجود آپ سب میری مبارکباد کو قبول کریں گی۔ حریمی بہنوں اور بھانجیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ علیحدہ سے انھیں عید کارڈ نہیں بھیج سکتا، اس لئے کہ میں اس خرچ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اسی سلسلہ میں ان حریمی بہنوں اور بھانجیوں کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں، جن کے قیمتی عید کارڈ مجھے مل گئے ہیں۔

اس مبارک باد اور عیدکارڈوں کے شکریہ کے بعد میں حریمی بہنوں اور بھانجیوں سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اپنی عید کی مسرتوں میں انھوں نے اپنے غریب اعزہ اور پاس پڑوس کے نادار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ کیا اپنی حیثیت کے مطابق ان کے لئے نئے کپڑے مہیا کر دیئے۔ کیا عید کے روز انھیں عیدی کے طور پر کچھ رقم دی یا کیا انھیں اپنے گھر بلا کر سوئیاں کھلائیں ـــــ اگر آپ نے ایسا کیا ہے تو صحیح طور پر آپنے عید منائی ہے۔ اور اللہ پاک آپ کو جزائے خیر دے گا۔ اللہ کی نظروں میں بہترین بندہ وہی ہوتا ہے جو اس کی مخلوق کا خیال رکھتا ہے۔ آپ روزے رکھتی ہیں۔ نمازیں پڑھتی ہیں اور وظائف ادا کرتی ہیں ـــــ یہ سب آپ خود اپنے لئے کرتی ہیں۔ اس سے جو بھی فائدے دینا دعاقبت میں پہنچیں گے، وہ آپ کی ذات کو پہنچیں گے، خلق خدا کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اور آپ جانتی ہیں کہ دوسروں کے ساتھ سلوک کرنا اپنے ساتھ سلوک کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔

جن بہنوں اور بھانجیوں نے ایسا نہیں کیا ہے انھیں چاہئے کہ آئندہ عید کے موقع پر ایسا ضرور کریں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہر اس مسلمان میں جو دوسروں کی مدد کرنے کی حیثیت رکھتا ہو یہ جذبہ پیدا کر دے کہ وہ اپنے غریب اعزہ اور پاس پڑوس کے صاحب احتیاج لوگوں کی مدد کرے۔ آپ یقین مانیں کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کا دل ایسی خوشی محسوس کرے گا جو اپنی ذاتی عید کی مسرتوں سے کہیں بہتر ہوگی۔

حریم نہ ملنے کے سلسلے میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ لکھنؤ سے قریب کے خریداروں کو اگر ۲۰ تاریخ تک اور دور کے خریداروں کو ۲۵ تاریخ تک حریم نہ ملے تو دفتر کو شکایتی خط لکھ دیں۔ لیکن جو حالات ہیں۔ ان کے تحت یہ اعلان بھی بیکار ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے کہ اب ڈاک کی بدنظمی کے تحت خصوصیت سے اخبارات و رسائل کی ڈاک غیر معمولی تاخیر سے تقسیم ہوتی ہے، اس لئے اگر حریم مقررہ تاریخ یعنی ۷ کو روانہ بھی ہو جاتا ہے تو اکثر خریداروں کو آخر ماہ میں ملتا ہے۔ اس طرح ہمیں شکایتی خط وصول ہو جاتے ہیں اور ہم دوسرا پرچہ روانہ کر دیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی پریس کی دشواریوں کے باعث حریم وقت مقررہ پر شائع بھی نہیں ہو پاتا، جیسا کہ جون میں ہوا۔ بجلی نہ آنے سے پریس کئی روز کام نہ کر سکا اور بمشکل تمام ہم ۱۱ تاریخ کو پرچہ سپرد ڈاک کر سکے۔ ظاہر ہے جب پرچہ ۴ روز تاخیر سے روانہ ہوگا تو اور زیادہ تاخیر سے خریداروں تک پہنچے گا ـــ لیکن ایسا کبھی کبھی اور مجبوراً ہوا کرتا ہے۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ حریم مقررہ وقت پر روانہ ہو جائے۔ آپ یہ بھی سوچیں کہ تاخیر ہونے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سب کو یہ علم اچھی طرح ہے کہ حریم آپ کو ملے یا نہ ملے، لیکن ہر ماہ شائع ضرور ہوتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کا کوئی شمارہ شائع نہ ہوا ہو ـــ اور جب شائع ہوگا تو بھیجا بھی ضرور جائے گا۔

چند حریمی بہنوں نے ہمیں لکھا ہے کہ ہم ایڈیٹر کے

[illegible]ات اور اجرت سر کے سوہان مقدر پر قبضہ کا مدوائی کے سلسلہ میں اپنی رائے لکھیں۔ ان بہنوں سے عرض ہے کہ حرم سیاسی بحث نہیں ہے کہ ایسے واقعات پر کچھ اظہار خیال کرے۔ اس کے لئے صد ہا اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ہم تو حریم کو صرف ایک مخصوص مقصد کے لئے کرتے ہیں جسے سب ہی بہنیں جانتی ہیں۔ ہم جو کچھ لکھتے رہے۔ اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

اپریل میں مجھے دہلی اور بمبئی کے سفر کرنا پڑے، جن کا صحت پر بہت خراب اثر ہوا اور میری حالت پہلے سے کہیں زیادہ ابتر ہو گئی ہے۔ خصوصیت سے کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ حریمی بہنیں اور بھائی بچیاں دعا کریں۔ (نسیم انہونوی)

تبصرا

● **لالہ زعفران زار** مجموعہ کلام پُر از مزاح جناب خان عزمی ردولوی پبلشر عزمی پبلیکیشن۔ ارشاد منزل ردولی۔ بارہ بنکی۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۰۴۔ قیمت بیس روپیہ۔

خان عزمی ردولوی کو میں ایک عرصہ سے جانتا ہوں اور انھیں عزمی کے بجائے ہمیشہ "ہر فن مولا" کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ اپنی ۴۵ سالہ علمی و ادبی زندگی میں بہت سے اپنی لائن کے لوگوں سے سابقہ پڑا، ان میں جو ذہین ترین اشخاص ملے ان میں عزمی ردولوی بھی ہیں۔ ان کی ذہانت کا اندازہ ان کے ان کاموں سے ہوتا ہے جو ایک [illegible] مشکل کر سکتا ہے۔ میں نے ان کی خوش نویسی دیکھی، نقشہ نویسی دیکھی، سازی دیکھی، افسانہ نگاری اور ناول نویسی دیکھی بلکہ ان کا ایک معاشرتی ناول شکیلہ بیگم ہی نے عرصہ ہوا نسیم بکڈپو سے شایع کیا تھا۔ اور اب ان کے مزاحیہ کلام کا یہ مجموعہ میرے سامنے ہے جس میں تعارف جناب مولانا سید شبیہ الحسن نونہروی نے تحریر فرمایا ہے۔ اسکے بعد خود شاعر نے اپنا تعارف اور اپنی باتیں مزاحیہ انداز میں لکھی ہیں۔

تقریباً ۹۳ مزاحیہ غزلیات و منظومات کا یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ اسے خرید کر لائبریری کی زینت بنایا جائے اور جب بھی کوئی غم ستائے، کوئی فکر پریشان کرے اسے پڑھنا شروع کر دے۔ فکر و غم و الم کے خیالات کو بھگانے کے لیے عزمی کا کلام لاحول سے کم ثابت نہ ہوگا۔ نمونۃً چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

جوانی انتہائے ظلم کی تھی لیکن | زباں گھس گئی مہرباں کہتے کہتے
کوئی جاتا نہیں خطرے کے ڈر سے | وہ بھر جاتے ہیں پانی نامہ بر سے
ترقی بہ نوعِ دگر ہو رہی ہے | جو مادہ تھی کل آج نر ہو رہی ہے
لڑکیاں ابا بنیں اس دور میں | جانے کتنے لاگ اماں ہو گئے

ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں مرہم اسلئے عزمی
سنا ہے رائیگاں دنیا میں قربانی نہیں جاتی
ابتدائے عشق میں جوتوں کی بارش ہو گئی
ورنہ عزمی ہم بھی انجامِ تمنا دیکھتے

غیر پر جب سے پڑی ان کی نظر | کچھ تینلکھی سی نگاہِ ناز ہے
ابر و بجلی نے کر دیا چوپٹ | شبِ فرقت سیاہ تھی پہلے

بس ایک بار لبِ بام ان کو دیکھا ہے
یہ خاکسار اسی دن سے تین تیرا ہے

● **ہمارے اسلاف** مؤلف مولانا عبدالعلی فاروقی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۵۲۔ قیمت آٹھ روپیہ۔ کتابت و طباعت اچھی۔ ناشر مکتبہ البدر کاکوری۔ لکھنؤ

کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے جو ۲۶ سال بعد مولف کی نظر ثانی کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ اس میں تیس صحابہ کرام کے مختصر لیکن جامع سوانح حیات نہایت سلیس اردو زبان میں شایع کی گئی ہیں تاکہ انھیں کم پڑھے لکھے مسلمان مرد و خواتین اور بچے بھی پڑھ کر ان مقدس اصحاب کے حالات سے واقف ہو سکیں، جنھیں صحبت رسول اللہ صلعم حاصل ہوئی تھی۔ بڑی بڑی ضخیم کتب کی خریداری بھی دشوار ہے اور ان کا پڑھنا بھی آج کل کی مصروف زندگی میں آسان نہیں۔ ہمارے اسلاف کی قیمت بھی کم ہے اور حالات کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ مختصر ہوتے ہوئے بھی ہر صحابی کی زندگی کے اہم واقعات کا علم ہو جاتا ہے۔ حریمی بہنوں کو چاہیے کہ اسے منگا کر خود پڑھیں علاوہ اپنے بچوں کو پڑھائیں یا سنائیں تاکہ انھیں اپنے مقدس اسلاف اور ان کے کارناموں کا علم ہو سکے۔

● ناشر:۔ نسیم انہونوی نے نامی پریس سے شائع کیا۔

پہلا قتل

مشتاق کلیم پوری

دنیا کے وجود میں آنے کے بعد سے اب تک ہر چیز اپنے وقت پر فنا کی منزل تک پہونچتی رہی ہے وہ جاندار ہو یا بے جان ہر شے کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ اپنا معینہ زمانہ پورا کر لیتی ہے، نابود ہو جاتی ہے۔ انسان، حیوان، درخت پہاڑ، دریا سب ہی اس نظام کے تابع ہیں۔ البتہ تبارک تعالیٰ کے اس نظام میں نہ کوئی تغیر آج تک ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک دن یہ دنیا، چاند ستارے، سورج اور سارے اجرام فلکی سب ہی آغوش فنا میں سو جائیں گے۔

فنا کی یہ منزل، موت کا یہ وقت، قضا و قدر کے تابع ہے لیکن اس کے باوجود دنیا میں نہ جانے کتنی موتیں ہیں جن کو انسان خود بلاتا ہے یا وہ اس پر خود نازل ہو جاتی ہیں۔

اس موقعہ پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ موت جب قضا و قدر کے تابع ہے تو کوئی خود اسے کیسے بلا سکتا ہے یا دوسرا اس پر کس طرح نازل کر سکتا ہے۔ آیئے اس کو اس طرح سمجھئے۔

ایک شخص گھڑیوں کا موجد ہے وہ مشینری پر پوری گرفت رکھتا ہے لیکن جب مارکیٹ میں مال پیش کرتا ہے تو مختلف قیمتوں میں لاتا ہے۔ گھڑیاں سب ہیں لیکن عمریں سب کی مختلف ہیں کسی کی گارنٹی ایک سال ہے تو کسی کی دس سال، موجد یا میکینک نے عمریں سب کی مقرر کی ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کبھی غصہ میں آ کر گھڑی کو دیوار یا فرش پر مار دیں یا دوسرا آپ کی گھڑی پر پتھر مار دے۔ ایسی صورت میں اسکے ٹوٹنے اور برباد ہو جانے کے باوجود آپ اس کا الزام موجد یا میکینک پر نہیں رکھ سکتے کیونکہ اگر اس پر یہ حادثہ نہ گزرتا تو وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے بند نہ ہوتی۔

بالکل یہی صورت انسان کے ساتھ بھی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مقررہ وقت کے لئے زندگی دی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خودکشی کر لے یا کسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے تو یہ موت تو ضرور ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہ ہوگی اس نے خودکشی کو حرام موت قرار دیا ہے۔

زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے وہ جس وقت چاہے گا واپس لے لیگا لیکن خود آپ اسے ختم کریں یا کوئی دوسرا اسے ضرر پہونچائے تو یہ خدا کی امانت سے ناشکری یا خیانت ہوگی جس کا خمیازہ دونوں کو قیامت کے روز بھگتنا ہوگا۔

دنیا میں قتل کی سب سے پہلی واردات سیدنا حضرت آدم علیہ السّلام کے دور میں ہوئی ایک بھائی نے دوسرے کو زندگی سے محروم کر دیا۔ دنیا کے اس اولین قاتل اور مقتول کی داستان صرف انتقام اور شر کی کہانی ہی نہیں ہے بلکہ عورت کے بنائے فساد بننے کی ناقابل تردید حقیقت بھی ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ـــــــــ

حضرت آدم علیہ السلام کے یہاں ہر مرتبہ دو بچے پیدا ہوتے تھے جن میں ایک لڑکا ہوتا تھا اور دوسری لڑکی۔ ان کی شادیاں اس طرح ہوتی تھیں پہلی دفعہ کا لڑکا دوسری دفعہ کی لڑکی سے اور دوسری دفعہ کا لڑکا پہلی دفعہ کی لڑکی سے بیاہ دیا جاتا تھا قابیل اور ہابیل دونوں آدم علیہ السّلام کے لڑکے تھے۔ قابیل بڑا تھا اور ہابیل چھوٹا ان کی شادیاں بھی اسی دستور کے تحت ہونا تھیں یعنی قابیل کو ہابیل کی بہن سے اور ہابیل کو قابیل کی بہن سے منسوب ہونا تھا۔

اتفاق سے قابیل کی بہن ہابیل کی بہن سے زیادہ خوبصورت تھی اس لئے قابیل نے اللہ کی شریعت کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا جس کے تحت اسے ہابیل کی بہن سے شادی کرنا پڑتی تھی۔

حضرت آدم علیہ السّلام نے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانا تب آدم علیہ السلام نے یہ طے کیا کہ دونوں اللہ تعالیٰ کے سامنے قربانی پیش

کہ جس کی نذر قبول ہو گی اس کی مرضی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا
چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی نذریں پیش کیں
ہابیل ایک عمدہ قسم کا دنبہ لایا اور قابیل کسی غلہ کے چند
خوشے۔

اس زمانہ میں قربانی کا یہ دستور تھا کہ قربانی کی چیز کو
کسی بلند جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا اور آسمان سے آگ نمودار
ہو کر جس کی چیز کو جلا دیتی تھی اسے مقبول سمجھ لیا جاتا تھا۔
ان دونوں نے بھی اپنی اپنی نذر ایک بلند پہاڑ پر رکھ دی۔
تھوڑی دیر میں ایک آگ نمودار ہوئی اور ہابیل کی نیاز کو
کھا گئی۔ قابیل کی نذر پڑی رہ گئی۔

اب بجائے اس کے کہ قابیل اس آسمانی فیصلہ کو تسلیم
کرتا ہابیل کا دشمن ہو گیا اور بولا میں تجھے قتل کر دوں گا کہ تو
میری بہن سے شادی نہ کر سکے۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک رات ہابیل کو چراگاہ سے آنے میں
دیر ہو گئی آدم علیہ السلام نے قابیل کو دریافت حال کے لئے
بھیجا۔ جب چراگاہ پہونچکر اس نے ہابیل کو پہاڑ کے نیچے آرام
سے بیٹھا دیکھا تو اسے ایک دم غصہ آگیا۔ اس نے کہا۔
تیری نیاز قبول ہو گئی اور میری نہیں ہوئی۔
ہابیل نے جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کی نذریں
قبول کرتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔
قابیل، ہابیل کے اس جواب سے اور غضبناک ہو گیا اور
ایک بڑا پتھر اس پر لڑھکا دیا جس کے نیچے دب کر وہ ہلاک ہو گیا۔
اب وہ گھبرایا کہ لاش کا کیا کیا جائے اس سے پہلے دنیا میں
کوئی ایسا سانحہ پیش نہ آیا تھا جس کی روشنی میں وہ کوئی قدم
اٹھاتا۔

ابھی وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ وہاں دو کوّے آئے اور
آپس میں لڑنے لگے پھر ایک نے دوسرے کو ہلاک کر دیا۔ اس کے
بعد اپنی چونچ سے اسی جگہ مٹی کھودی اور مردہ کوّے کو اس میں
دبا کر اڑ گیا۔
قابیل نے یہ دیکھ کر اپنا سر پیٹا اور بولا۔ لعنت ہے مجھ پر کہ
میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا پھر اس نے بھی وہاں گڑھا
کھود کر ہابیل کی لاش کو مٹی میں دبا کر چلا گیا اس طرح دنیا میں
سب سے پہلا دفن کا طریقہ وجود میں آیا۔

گویا ہابیل کا قتل دنیا کا سب سے پہلا قتل تھا اور
قابیل دنیا کا سب سے پہلا قاتل۔ اسی وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ
وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت تک دنیا میں جو مظلوم بھی قتل کیا
جائے گا اس کے قتل کا عذاب جتنا اس کے اصل قاتل پر ہو گا اتنا ہی
آدم کے بیٹے قابیل پر بھی ہو گا کیونکہ دنیا میں سب سے پہلا قتل اسی نے
کیا تھا۔

ساس کی مصیبت

از سہالوی

ایک صاحب کے والدین نہ ماں تھیں نہ باپ بہن بھائی بھی کوئی نہیں تھا تنہا گھر میں رہتے تھے۔ آدمی کفایت شعار تھے ہوٹل میں کھانا کھانے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے جس کی وجہ سے دفتر پہنچنے میں اکثر دیر ہو جاتی۔

ایک مرتبہ اتوار کے دن ایک ساتھی ان کے گھر آئے یہ چولہا پھونک رہے تھے گیلی لکڑیاں تھیں جلنے کا نام نہ لے رہی تھیں باورچی خانے میں دھواں ہی دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور یہ پھکنی منھ سے لگائے بڑی مستعدی سے پھونک رہے تھے۔

ان کے ساتھی نے ان کی یہ حالت دیکھی تو انھیں ان پر بڑا ترس آیا اور کہا بھائی کب تک یونہی چولہا پھونکا کروگے کہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر گھریلو قسم کی کوئی بیوی تلاش کرلو تاکہ تمہیں اس کھٹ راگ سے نجات ملے اور دونوں وقت کی روٹی مل سکے۔

ساتھی کی بات صحیح تھی انھوں نے کہا بھئی تم جو کہہ رہے ہو بالکل ٹھیک ہے مگر اتنا کرو کہ کوئی سگھڑ سلیقہ مند لڑکی تلاش کرنے میں میری مدد کرو۔

ان کے ساتھی نے کہا کہ میں اس نیک کام میں تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ دوسرے ہی دن وہ ایک پیغام لے کر آئے لڑکی ان کی چچا زاد بہن تھی اچھے خاندان کی تھی مالدار لوگ نہیں تھے لیکن سفید پوش اور شریف تھے لڑکی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی گھر ہی پر قرآن شریف اور بہشتی زیور پڑھ لیا تھا لکھنا پڑھنا کو بھی لیتی تھی ـــــ لیکن صورت شکل میں اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی سلیقہ مند تھی ہر قسم کا کھانا پکا لیتی تھی سینے پرونے میں ماہر تھی محلے بھر کی عورتیں فرمائش کروانے انہی کے پاس آتیں۔

لڑکی کے حالات معلوم کرکے یہ خوش ہوئے لیکن انھوں نے پوچھا لڑکی کی ماں زندہ ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کی ہونے والی ساس نہ صرف یہ کہ زندہ ہیں بلکہ تندرست بھی ہیں تو انھوں نے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ مجبوراً انھوں پر ان کی بات چیت چلی مگر ساس کی موجودگی کی وجہ سے انھوں نے ہر جگہ انکار کردیا۔

ایک لڑکی ان کے دفتر میں ان کے ساتھ کام کرتی تھی ان کو پسند بھی تھی۔ ساتھیوں کی مدد سے اس سے شادی کی بات چیت شروع کی گئی۔ بات قریب قریب طے ہوگئی۔ ایک دن وہ ان کا گھر دیکھنے آئی اس نے گھر دیکھتے ہی کہا یہ گھر تو چھوٹا ہے ہم تین آدمیوں کے لئے کافی نہ ہوگا۔

انھوں نے پوچھا تیسرا کون؟

لڑکی نے کہا آپ کی ساس

یہ سن کر انھوں نے ہاتھ جوڑ کر شادی سے معافی مانگ لی۔

ایک دن ان کے ایک ساتھی ان کے یہاں آئے جن کی شادی ہو چکی تھی انھوں نے ان سے پوچھا تمہاری ساس کہاں ہیں۔ انھوں نے پوچھا تمہارے یہاں آتی ہیں۔ ساتھی نے مسکراتے ہوئے کہا شادی کو چار سال ہو گئے وہ صرف ایک مرتبہ ہمارے یہاں آئیں۔

انھوں نے پوچھا یہ کیسے۔ ان کے ساتھی نے کہا شادی کے ایک ہفتہ بعد وہ آئیں پھر جب سے گئیں ہی نہیں۔

یہ سننے کے بعد انھوں نے شادی کا ارادہ ہی ترک کردیا۔

اشعار اکبر

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

نہیں ہوتی ہے پرسش الفت اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

فقط مصرع یہ سن کر بول اٹھی وہ شوخ مہوش
کیا احمق لوگ تھا، پاگل کو پھانسی کیوں دیا

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

— رفعت اعوان

دھانی چوڑیاں

ارے دلہن بیگم یہ کیا سرخ سرخ چوڑیوں سے ہاتھ بھر رکھے ہیں۔ یار ذرا ہمارا خیال کر لیں۔ ہمیں دھانی رنگ کی کانچ کی نازک نازک چوڑیاں پسند ہیں نا.... رحمان ناشتہ کرتے کرتے اس کی کلائیاں دیکھ کر شوخی سے بولا اور اس نے چہرے کے تاثرات چھپانے کے لیے سر نیچا کر لیا۔ رحمان سمجھا شرما رہی ہے۔

ارے بیگم رانی آج تو شادی کو پورے تین دن ہو چکے ہیں۔ پورے تین بھئی چھوڑو نہ شرمانا۔ رحمان نے چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے ہوئے اس کے قریب آ کر کہا، اور اس کا ہاتھ تھام کر غور سے دیکھا اور سرخ سرخ مہندی لگے ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ سچ مچ شرما گئی اور تیزی سے باہر نکل گیا اسے دفتر جانا تھا۔ اور نوشی سب کچھ بھول بھال کر اپنے ماضی میں گم ہو گئی۔ وہ اپنا ماضی یاد کرنے لگی دھانی چوڑیوں کے ذکر نے اسے تڑپا کر رکھ دیا اور وہ سوچنے لگی۔

ہشام جو اس کا محبوب تھا۔ جسے اس نے اپنے سے بھی بڑھ کر چاہا تھا۔ جس کے بغیر کبھی وہ جینے کا تصور بھی نہ کر سکی تھی۔ اسے دھانی چوڑیوں سے عشق کرنا ہشام ہی نے سکھایا تھا۔ اس وقت جب وہ میٹرک کا امتحان دے کر رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے ساتھ والے مکان میں پروفیسر علی آ کر آباد ہوئے ان کا ایک بیٹا تھا اور ایک ہی بیٹی اور نوشی کی خوش قسمتی تھی کہ راحیلہ اس کی کلاس فیلو نکلی۔ ہشام کو ہاؤس جاب شروع کیے چند ماہ ہوئے تھے۔ ہشام شہر کے سرکاری ہسپتال میں تھا۔ ہشام کو پہلی ہی نظر میں یہ سانولی سلونی بڑی بڑی آنکھوں والی نوشی اچھی لگی۔ دونوں گھرانوں میں سب کی دوستی ہو گئی، اور پھر جب ہشام کو نوشی کے قریب بیٹھا قرار حاصل ہونے لگا۔ تو اس نے سب کچھ نوشی کو بتا دیا اپنا دل کھول کر نوشی کے سامنے رکھ دیا اور نوشی جس کا دل شفاف آئینے کی طرح تھا۔ اپنے دل پر ہشام کی تصویر سجا بیٹھی۔

نوشی کو چوڑیوں کا بہت شوق تھا۔ ہر روز کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں کلائیوں میں سجائے پھرتی اور اسے اب وہ دن یاد آ رہا تھا جب ہشام ایک چھوٹا سا پیکٹ اٹھائے تیز تیز چلتا اسے آوازیں دیتا اس کے کمرے میں آ گیا اور وہ جو میز پر رکھی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ دونوں بازو میز پر رکھے تھے اسے پتہ بھی نہ چلا ہشام نے زور سے ہاتھ مار کر اس کی کلائی میں پڑی سرخ چوڑیاں توڑ دیں۔ وہ بغیر یہ دیکھے کہ اس کا سارا ہاتھ زخمی ہو چکا ہے۔ اپنی چوڑیاں ٹوٹنے کے غم میں رو پڑی۔

ہشام یہ کیا کر دیا آپ نے؟" وہ روتے ہوئے بولی اور ہشام اس کی کلائی پر سے بہتے خون کو دیکھ کر تڑپ اٹھا اور جلدی کہیں کچھ نہ ملا تو اپنے سفید رومال سے اس کی کلائی صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے پٹی باندھ دی اور اپنے رومال کو جیب میں رکھ لیا۔ لایئے دھو دوں گندہ ہو گیا ہے۔ نوشی آنسو پونچھتے ہوئے بولی، نہیں نوشی جان یہ تو میرے پاس رہے گا تمہاری محبت کی معصوم نشانی۔ وہ تھوڑی دیر رک کر بولا، ارے میں تو بھول گیا۔ تمہارے لیے تو میں کانچ کی دھانی چوڑیاں لایا ہوں ادھر لاؤ اپنا ہاتھ اور پھر وہ خود ہی اس کے ہاتھ میں چوڑیاں پہنانے لگا اور ساتھ ہی دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ نوشی یہ میری محبت کی پہلی نشانی ہے۔ آج کے بعد تمہاری کلائیوں میں کبھی رنگ برنگی چوڑیاں نہ دیکھوں اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو اپنی ہمیشہ اپنی کلائیوں کو ان کانچ کی دھانی چوڑیوں سے سجائے رکھنا۔ جس دن میں نے تمہاری کلائی میں کسی اور رنگ کی چوڑیاں دیکھیں سمجھ لوں گا کہ اب ہم ایک دوسرے کے کچھ نہیں لگتے۔ ہشام نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ دن گزرتے رہے۔

اب نوشی کے پاس سوائے دھانی کانچ کی چوڑیوں کے

کوئی چوڑی نہ تھی۔ راجیلہ اکثر ہنستی ارے نوشی جان تمہاری کلائیوں میں دھانی چوڑیاں دیکھ دیکھ کر اب تو مجھے ہر چیز سبز نظر آنے لگی ہے۔ کبھی تو کوئی اور رنگ پہنو مگر نوشی نے تو اپنے محبوب کے کہنے پر اپنی کلائیوں کو ہمیشہ سبز چوڑیوں سے سجائے رکھا اور اسی طرح تین سال گزر گئے۔ اب تو نوشی ہشام کے بغیر ایک دن نہ رہ سکتی تھی۔ کون سوچ سکتا تھا کہ کبھی دونوں جدا ہوں گے ان کے ملاپ میں تو کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ زندگی نام ہی نئی نئی تبدیلیوں اور انہونیوں کا اور یہی تبدیلی ہشام کی زندگی میں بھی آئی۔ اس کی کزن سائرہ ایک ماہ کے لیے ان کے گھر آئی ہشام نے اسے پانچ سالوں کے بعد دیکھا تھا اب تو وہ بہت ہی خوبصورت ہو گئی تھی اور نہ جانے ہشام کو کیا ہوا۔ معصوم سی نوشی کو بھلا کر سائرہ کی بے باک اداؤں میں کھو گیا اسے اب نوشی کی موجودگی پر غصہ آنے لگتا تھا۔ نوشی نے جب ہشام میں ڈھیروں تبدیلیاں محسوس کیں تو دکھی ہو گئی وہ ہشام کی سائرہ میں دلچسپی کو اچھی طرح سمجھ چکی تھی مگر پھر بھی دل کو تسلی دینے کے لیے سوچتی کہ شاید میں کچھ زیادہ محسوس کرنے لگی ہوں آخر وہ ہشام کی ماموں زاد بہن ہے کیا ہوا اگر وہ اس کے ساتھ ہنس بول لیتا ہے۔

ایک شام وہ ہشام کے گھر کی طرف چل دی کہ شاید اداسی کچھ کم ہو جائے۔ گھر میں بالکل خاموشی تھی۔ ہشام کے کمرے کے پاس سے گذرتے ہوئے اسے ہشام کی آواز سنائی دی وہ ٹھٹکی ہو گئی آواز ہلکی مگر جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی "سارہ میری جان یہ دھانی چوڑیاں میری محبت کی نشانی ہیں۔ اب کبھی میں تمہاری کلائی میں کسی اور رنگ کی چوڑیاں نہ دیکھوں تمہاری گوری گوری کلائیوں میں سچ بھی تو خوب رہی ہیں۔ آگے نہ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا مگر نوشی نے صرف اتنا سنا اور چکرا کر گرنے لگی تھی کہ دیوار کا سہارا لے لیا اور دیوار سے لگ کر اس کی کلائی کی تمام دھانی چوڑیاں ٹوٹ کر صاف فرش پر بکھر گئیں۔ چوڑیوں کی آواز سن کر ہشام اور سائرہ باہر آئے اور دیوار سے لگی زرد ہوتی نوشی کو دیکھا ہشام نے شرمندگی سے فرش پر بکھری چوڑیوں اور پھر نوشی کی زخمی کلائی کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں "نوشی جان کیا ہو گیا تھیں"۔ سائرہ اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر بولی کچھ نہیں تم سائرہ چکر سا آ گیا تھا نا جانے کیوں نوشی دھیرے سے بولی اور وہ سائرہ کو پریشان سا چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف چل دی پھر کبھی نہ آنے کے لیے

پھر نوشی جلد ہی نوشینہ رحمان بن گئی اس نے چپکے سے تمام درد اپنے اندر اتار لیے اور آج رحمان نے سبز چوڑیوں کا ذکر کر کے اسے پھر پرانی یادیں دہرانے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ تو کب کی انہیں اپنے دل میں دفن کر چکی تھی۔۔۔۔۔۔

حریمی بہنوں کے لئے بالکل نئے ناول

کشور	نسیم احتونوی	۱۲/-
بادل کا سایہ	شہناز کنول	۲۰/-
پیاسی	بشریٰ رحمٰن	۴۰/-
بے نشان راستے	بلقیس ظفر	۳۰/-
گوری	روحی معظم	۲۵/-
تعبیر	ثریا ملک شمع	۳۰/-
لیلیٰ تیری گلی میں	مینا ناز	۲۳/-
رافعیہ	فرحت جبیں	۴۲/-
پناہ گاہ	سلمیٰ کنول	۴۵/-
بہار آنے تک	نسیمہ مظہر	۲۵/-
آد	شہلا نرگس	۲۰/-
تشنہ کام	شفقت موہانی	۲۱/-
سارے جہاں کا درد	رضیہ منظور الامین	۲۱/-
عالم پناہ	"	۳۰/-
تمہارے لئے	عطیہ بدر دین	۳۰/-
آنگن	خدیجہ مستور	۴۰/-

• لڑکیوں کے باپ نے ایک نوجوان سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹیاں شادی کے بعد آرام و سکون سے زندگی بسر کر سکیں اسلئے میں نے اپنی پچیس سالہ لڑکی کے نام سے ۲۵ ہزار تیس سالہ لڑکی کے نام سے تیس ہزار اور پینتیس سالہ لڑکی کے لئے پینتیس ہزار روپئے بینک میں جمع کر دئے ہیں۔ نوجوان نے پوچھا "کیا آپ کی کوئی چالیس سالہ لڑکی نہیں ہے۔

شجرِ مُراد

ترجمہ۔ اخلاق احمد

اس نے سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا اور اپنی نوٹ بک پر خط لکھنے لگا:

"پیاری ممی! آپ کو جب یہ خط ملے گا شاید آپ بہت پریشان ہوں گی ڈیڈی گھر میں بڑبڑاتے پھریں گے۔ آپ کو یہ بدگمانی ہوگی کہ میں رات بھر اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہا اور ڈیڈی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں کسی لڑکی وڑکی کے چکر میں ہوں، اسی لیے رات بھر گھر نہیں آیا۔

بات سیدھی سی ہے پیاری ممی! میں گھر سے جا رہا ہوں۔ آج کل میری طرح کے اٹھارہ انیس سال کے لڑکے اکثر گھر سے بھاگ جاتے ہیں مگر ان میں اور مجھ میں ایک فرق ہے میں کسی خوف سے نہیں جا رہا ہوں اور نہ کوئی چیز چرا کر فرار ہو رہا ہوں بلکہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ رہا ہوں۔

ویسے بھی ایک نہ ایک دن مجھے گھر سے روانہ ہونا ہی تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ ایک فرض معلوم ہوتا تھا جس سے نظریں چرانا یا جسے نظر انداز کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ آدمی کو کبھی کبھی اپنے گھر سے جانا پڑتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ گھر سے باہر کی دنیا کیسی ہے؟ گھر سے باہر گزر بسر کرنا کیسا کام ہے؟ اور باہر کی زندگی میں کتنا دکھ اور کتنا لطف ہے؟

آپ اور ڈیڈی یہ سب باتیں مجھے تعلیم سے سکھانا چاہتے تھے، یہ سارا تجربہ اساتذہ اور امتحانات کے ذریعہ کروانا چاہتے تھے مگر پیاری ممی! میرا خیال ہے، آدمی زندگی ایسے نہیں سیکھ سکتا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں یہ قدم اندھیرے میں اٹھا رہا ہوں۔ نہ جانے یہ قدم یا اس سے اگلا قدم مجھے کس سمت لے جائے۔ لیکن کبھی نہ کبھی میں گھر ضرور آنا چاہوں گا بشرطیکہ ڈیڈی اس کی اجازت دیں۔ اور میں جانتا ہوں کہ وہ ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ میں ڈیڈی کے نقطۂ نظر سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا فضول ہے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا کہ "اگر تم نے کبھی گھر سے بھاگنے کی کوشش کی تو دوبارہ گھر لوٹنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔"

مجھے افسوس ہے کہ آپ خط کے ذریعہ مجھ سے رابطہ قائم نہ کرسکیں گی کیونکہ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں گا۔

البتہ چھ ماہ بعد میں اپنے گھر کے پاس سے گزروں گا۔ اگر ڈیڈی کسی طرح مجھے دوبارہ قبول کرنے، دوبارہ خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوجائیں تو ان سے کہیے گا کہ اپنے سیب کے درخت پر ایک سفید کپڑا باندھ دیں وہی درخت جو صحن کے آخری سرے پر ریل کی پٹری کے پاس واقع ہے۔ میں ریل میں آؤں گا۔ اگر سیب کے درخت پر مجھے کوئی سفید کپڑا نظر نہ آیا تو خاموشی سے کسی ناراضی کے بغیر آگے بڑھ جاؤں گا کہیں بھی، کسی طرف بھی، جہاں قسمت لے جائے۔

اپنی پیاری ممی کا بیٹا! ڈیوڈ۔"

لفافہ بند کرکے اس نے سڑک پار کی اور خط لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ یہ شہر سے باہر جانے والی سڑک تھی، گاڑیاں برابر جا رہی تھیں، اس نے گاڑیوں سے لفٹ لینے کی کوشش کی۔ چھ کاروں نے اس کے اشارے نظر انداز کر دیئے مگر ساتویں کار چند قدم آگے جا کے رک گئی۔ ڈیوڈ کار کی طرف بڑھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ... آپ کس طرف جا رہے ہیں؟" ڈیوڈ نے اپنا سوٹ کیس سنبھال لیا۔

"بالٹی مور۔"

ڈیوڈ نے بڑے اعتماد سے دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔ "مجھے بھی بالٹی مور ہی جانا ہے۔"

کار چل پڑی۔ ڈیوڈ نے مڑ کر اپنا سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر جمایا پھر ٹک کر سامنے کی سڑک دیکھنے لگا۔ سڑک دور تک ایک لہراتے ہوئے سانپ کی طرح نظر آ رہی تھی۔

"میرا نام جم ہے۔" کار چلانے والے نے دوستانہ لہجہ میں کہا "تیری لائن تک میرا کاروبار ہے در آمد و برآمد کرتا ہوں۔"

"میرا نام ڈیوڈ ہے۔"

"نوجوانی میں ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لئے میں بھی اسی طرح لفٹ لیا کرتا تھا۔" جم نے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے ہنس کر کہا۔ "میں جانتا

ہوں مگر نوجوان کیا ہوا تی... ایک لمحے کے لیے ڈیوڈ کو ایسا لگا جیسے یہ اجنبی میرے راز سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ میں گھر سے بھاگ رہا ہوں فرار ہو رہا ہوں مگر اجنبی جم نے اس سے پوچھا "گھر جا رہے ہو۔؟"

"ہاں" ڈیوڈ مسکرا دیا۔

"گھر جانے کا تصور بھی کتنا اچھا ہوتا ہے"۔ جم کی آواز میں اداسی تھی۔ "بیس بیس سال پہلے میں بھی گھر سے نکلا تھا اور اس طرح نکلا تھا جیسے سرکش اور شوریدہ سر نوجوان نکلتے ہیں محض نئے تجربات حاصل کرنے کے لیے دنیا دیکھنے اور دنیا والوں کو جاننے کے لیے۔" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔

"پھر؟" کچھ توقف سے ڈیوڈ نے دریافت کیا۔

"پھر کبھی میں واپس نہ جا سکا" جم نے کہا "میرا کوئی گھر ہی نہ رہا میرے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ اور مجھے گھر لوٹنے کے بجائے اپنا سفر جاری رکھنا پڑا۔ آگے اور آگے اور آگے۔" دونوں خاموش ہو گئے۔

"تم آرام سے سو جاؤ" بہت دیر بعد جم نے شفقت سے کہا۔ "سفر خاصا طویل ہے"۔ ڈیوڈ نے دور ڈوبتے سورج پر ایک نظر ڈالی اور سیٹ سے سر ٹکا کے آنکھیں بند کر لیں

"چہرے، سیکڑوں ہزاروں طرح کے چہرے چند مہینوں میں ڈیوڈ نے طرح طرح کے چہرے دیکھے، طرح طرح کے مناظر سے گزرا۔ مناظر نمودار ہوتے اور غائب ہو جاتے، جو لوگ ملتے وہ بھی وقت کے غبار میں تحلیل ہو جاتے محنت کش ڈرائیور، مسکراتی ویٹریسیں اور عیار سیلز مین، ہمدرد پولیس مین، نشے میں دھت شرابی، طرار طوائفیں، عورتیں، بچے اور بوڑھے چہروں کا ایک ہجوم تھا جس میں ڈیوڈ راستہ بناتا ٹکراتا لڑکھڑاتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ دنیا ایک کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھی۔ اب وہ دنیا کی چالوں سے رفتہ رفتہ واقف ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ہر قماش کے لوگ دیکھے اور طرح طرح کی نوکریاں کیں۔ وقت گزرتا رہا۔

ایک رات لکڑی کے فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے تصور میں جم کی سرگوشی سنی، رات کے گہرے سناٹے میں یہ سرگوشی اسے بالکل قریب محسوس ہوئی۔

"جو بیتے ہوئے ڈیوڈ" جم نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ "پھر میں کبھی واپس نہ جا سکا۔ میرا کوئی گھر ہی نہیں رہا، مجھے اپنا سفر جاری رکھنا پڑا۔ آگے اور آگے، اور آگے۔"

دوڑتی ریل کے شیشوں سے نظر آنے والے منظر پیچھے بھاگ رہے تھے۔

"پانچ ماہ۔" ڈیوڈ نے سوچا۔ بلکہ ساڑھے پانچ ماہ۔ جانے ممی کیسی ہوں؟ اور ڈیڈی کتنے مصروف رہتے ہوں؟ ڈیوڈ سے کچھ دور وہ کھڑکی تھی جس سے باہر کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اسی کھڑکی سے اسے اپنا گھر دکھائی دینے والا تھا۔ وہ تصویریں بار بار اس کے تصور میں ابھر رہی تھیں پہلی تصویر سیب کا وہ درخت تھی جس پر ایک سفید کپڑا لہرا رہا تھا اور دوسری تصویر میں وہ درخت تھا جس پر کچھ نہیں تھا۔ نہ سفید کپڑا نہ ہرا۔ وہ بار بار یہ تصور دل و دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کرتا مگر کامیاب نہیں ہوا۔

اس نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے گھر قریب آ رہا ہے اس کا حلق خشک ہوتا جا رہا ہے۔ اگر درخت پر کچھ نہ ہوا تو؟ اگر اسے خوش آمدید نہ کہا گیا تو اس صورت میں اسے اپنے عزم اور عہد کے مطابق خاموشی سے آگے بڑھ جانا ہو گا اور پھر اسے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اس دنیا میں گم ہو جانا پڑے گا۔

ریل اڑی چلی جا رہی تھی۔ ڈیوڈ کا گھر قریب آتا جا رہا تھا۔ آہنی پٹڑیوں پر بجلی کی رفتار سے گھومتے پہیے فاصلے روندتے رہے تھے۔ فیصلے کی گھڑی قریب سے قریب تر ہو رہی تھی۔

گھر سے چند فرلانگ دور ہی ڈیوڈ کو اندازہ ہو گیا کہ اب اس میں باہر دیکھنے کی ہمت نہیں ہے۔ ایک خوف کسی سائے کی طرح ہر طرف پھیلنے لگا۔ مختلف اندیشے اس کے گرد اپنا حصار تنگ کرنے لگے۔ کیا ہو گا؟ باہر کچھ نہ ہوا تو کیا ہو گا؟ اس کی ہمت پست ہو گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ اسے خوف تھا کہ سیب کے جانے پہچانے درخت پر سفید کپڑا نہیں ہو گا، بلکہ سفید کپڑے والے درخت کے بجائے وہاں ایک اجنبی، بے ثمر اور بے مروت درخت ہو گا جیسے ہر شہر میں ہر سڑک کے کنارے بے شمار درخت ہوتے ہیں ان میں محبت کی خوشبو نہیں ہوتی ان کی چھاؤں میں ملاوا نہیں ہوتا نہیں اس نے چلا کر کہنا چاہا۔ "میں باہر نہیں دیکھ سکتا"۔ (بقیہ صفحہ ۱۲۷ پر)

ایک انگریزی کہانی کا ترجمہ

ایک جام، اپنی دلہن کے نام

نعیم اچھونوی

ستمبر کے ایک خوشگوار دن، جب ہم دونوں جہاز کے تختے کے ذریعے اتر رہے تھے تو میں نے اپنے دادا اور دادی کو، جن کے فوٹوز میرے پاس تھے، دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اس سے پہلے جب میں نے انھیں دیکھا تھا۔ جب آخری بار میں بلجیم آیا تھا، تب میں چار سال کا بچہ تھا۔ آج میں ۲۶ سال کا ہو گیا تھا اور اپنی نئی دلہن کے ساتھ امریکہ سے ہنی مون منانے یہاں آیا تھا۔ ساتھ ہی ہم دونوں دادا اور دادی کی شادی کے ۵۰ ویں جشن سالگرہ میں بھی شرکت کرنا چاہتے تھے اور اس طرح ہماری خاندانی تاریخ میں یہ ایک سنگ میل سفر تھا۔

ساحل پر قدم رکھتے ہی میری دادی نے ہمیں گلے لگا کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ کسی مہارانی کی طرح پر وقار اور شگفتہ مسکراہٹ والی میری دادی نے میری دلہن کو اپنے سینے سے جدا کر کے اپنے سامنے کھڑا کیا تاکہ وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ ان کی آنکھوں سے تحسین کے جذبات عیاں تھے اور پھر انھوں نے دوبارہ اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ یہ دوسری بار چمٹانا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ انھیں بے حد پسند آئی تھی۔

میرے دادا اپنی تعریف اور خوشی کے اظہار میں دادی کی طرح نہ کھل سکے۔ ان کا خیر مقدم اس طرح کا تھا جیسا کہ شہر کا میئر کسی بڑے اہم سرکاری مہمان کا کرتا ہے۔ مناسب، پر شوکت اور حد کے اندر۔

لمبے اور دبلے سے میرے دادا کا قد دادی سے آدھ انچ کم تھا۔ شاید اسی لیے وہ اس قدر تن کر کھڑے ہوتے تھے۔ ان کا ڈبل بریسٹڈ کوٹ، ان کی ہیٹ، سرمئی چمڑے کے دستانے اور چاندی کی موٹھ والی چھڑی غالباً سب سے اعلیٰ دکانوں سے خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔

ہم نہایت چوڑی اور سایہ دار سڑکوں سے گذرتے ہوئے رنگ برنگے ملبوسات پہنے لوگوں کی بھیڑ اور سڑک پر لگے ہوئے کیفوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دادا کی رہائش گاہ پر پہونچے۔ بیچار منزلہ سادہ عمارت میرے دادا کی سادگی اور وقار کی علامت تھی۔ جیسے ہی ہم لوگ اپنے کمرے میں تنہا ہوئے، میری بیوی نے مجھ سے چپکے سے کہا "ہائے یہ دونوں تو بہت خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ خدا کرے ہم بھی انھیں کی طرح خوش ہوں، جب ہماری شادی کے ۵۰ سال پورے ہو جائیں"۔

"لیکن دادا تو کچھ بولے ہی نہیں!" میں نے اسے چڑھاتے ہوئے کہا "شاید یہی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز ہے۔ کہ شوہر اپنا منھ بند رکھے"۔

"نہیں، میں سمجھتی ہوں کہ دادا شرمیلے قسم کے بہت ہی سنجیدہ انسان ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں جب وہ ہم سے گھل مل جائیں گے تب دیکھنا کتنی باتیں کرتے ہیں" وہ بولی۔

لیکن اس کا خیال غلط تھا۔ کئی دن گذر جانے کے بعد بھی دادا ابا ظاہر تو ہم سے بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے لیکن ہم سے بے تکلف نہ ہو سکے۔

وہ ہیروں کے کاروباری تھے روزانہ وہ ہیروں کے تاجروں کے کلب ضرور جاتے۔ میرے قیام کے پانچویں روز وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ کلب میں کئی سو تاجر جمع تھے۔ سبھی اپنے اپنے محدب شیشوں سے ہیرے پرکھ رہے تھے۔ سارے ہال میں مول تول کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ وہ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ جس کے قریب سے بھی میرے دادا گذرتے وہ ان کے احترام میں کھڑا ہو کر جھک جاتا۔ میرے دادا کی لوگ کتنی عزت کرتے تھے اس کا اندازہ مجھے اسی روز ہوا۔

انھوں نے قدرے فخر سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ میرا پوتا ہے۔ نیو یارک سے آیا ہے۔ آپ لوگوں کو یاد ہیں اس کی کہانیاں جو اندد

میں شائع ہوئی تھیں "لڈ میری کچھ کہانیاں یہاں کے ایک مقامی رسالہ میں چھپ چکی تھیں" یہ مجھے اب معلوم ہوا کہ میرے دادا اپنے ملنے والوں کو میری کہانیاں پڑھوایا کرتے تھے یعنی بظاہر اس سخت انسان کے دل میں بھی کوئی نرم گوشہ تھا۔

بہرحال ان کی شخصیت / بے گانگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک روز کھانے پر میں نے ان کی شادی کی ۵۰ ویں سالگرہ کے ہونے والے جشن کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بات ٹال دی "بیکار کا ڈھونگ ہے۔ یہاں کے لوگوں کو ایسے موقعوں پر بہت زیادہ شہرت دینے اور اہتمام کرنے کی عادت سی ہے"۔

پھر جیسے جیسے سالگرہ کا دن قریب آتا گیا یہ بات ظاہر ہونے لگی کہ دادی کسی بات سے پریشان سی ہیں۔ جب دادا گھر میں ہوتے تو وہ اپنے اصلی روپ میں نظر آتیں، لیکن جب دادا چلے جاتے تو ان کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں ہونے لگتی۔ ہم دونوں میاں بیوی کو دادی سے بے لوث محبت ہو گئی تھی اور جو بھی بات ان کو پریشان کر رہی تھی ہم اس سے بے حد متاثر تھے۔

شادی کی سالگرہ کے جشن سے دو دن پہلے ہم لوگ دادی کے ساتھ ایک پارک کی سیر کرنے گئے اور ایک کیفے میں چائے پینے کے لیے بیٹھ گئے۔ ہمیں احساس ہوا کہ دادی ہم لوگوں کو بڑی پر تجسس اور گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر یکایک انھوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو شادی سے پہلے بھی کیا اچھی طرح جانتے تھے۔

"جی ہاں ہم لوگ شادی سے دو سال قبل ہی ایک ساتھ گھومنے پھرنے جایا کرتے تھے"۔ میں نے انھیں بتایا، "آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے"۔

"یہ تو تم دونوں کے لیے بڑی اچھی بات ہوگی"۔ دادی مسکرائیں "شادی ہونے تک تم دونوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت ہو گئی ہوگی"۔ اور اس کے بعد دادی نے ہمیں وہ بات بتائی جس کا علم ہمیں اس دن تک نہ ہوا تھا۔

"میری اور تمھارے دادا کی شادی ہمارے والدین نے اپنی پسند سے طے کر دی تھی۔ ہمارے زمانے میں یہی رواج تھا مجھے تمھارے

دادا کی ایک تصویر دکھا دی گئی تھی لیکن میں ان سے شادی کی صرف ایک ہفتہ قبل ہی ملی تھی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ دو اجنبیوں نے ایک دوسرے سے شادی کر لی تھی"۔

پھر دادی تھوڑا رک کر بولیں: "یہ کوئی بری بات نہیں تھی اگر اگر تمھارے دادا کو کسی اور لڑکی سے محبت نہ ہوتی"۔

دادی اپنے پیالے کو تکے جا رہی تھیں اور مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ یہ باتیں برسوں سے دادی کے ذہن میں سوئی ہوئی تھیں۔ شاید آنے والے جشن نے انھیں بیدار کر دیا تھا اور وہ یہ باتیں ہم سے اس لیے کہہ رہی تھیں کہ ان کو ہم پر اعتبار تھا۔ یا یہ کہہ کر وہ اپنا غم ہلکا کرنا چاہتی تھیں۔

"وہ اسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے بضد تھے"۔ انھوں نے قدرے وقفے کے بعد کہا: "لیکن ان کے والد بھی ضدی قسم کے انسان تھے۔ وہ بھی اڑے رہے۔ کیونکہ تمھارے دادا بہرحال ایک سعادتمند اولاد تھے، انھوں نے مجھ سے شادی کر لی۔ لیکن تم تصور کر سکتے ہو کہ یہ زبردستی ان کو کس قدر ناگوار گزری ہوگی، اور شاید ان گزرے ہوئے برسوں میں اکثر ان کو یہ خیال آتا رہا ہوگا کہ اگر اسی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی ہوتی تو ان کی زندگی اور کتنی زیادہ خوشگوار ہوتی"۔ میری بیوی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری دادی کے ہاتھ پر رکھ دیا "آپ ایسی باتوں پر یقین نہ رکھیں" وہ بولی "یہ سب پر ظاہر ہے کہ آپ دونوں کی زندگی کتنی خوشگوار اور پر مسرت گزری ہے"۔

"ہاں میں بے حد خوش ہوں۔ انھوں نے ہمیشہ میرا بڑا خیال رکھا، مجھے چاہا، لیکن اس کے باوجود تم لوگ خود ہی دیکھ سکتے ہو کہ تمھارے دادا کیسے علاحدہ علاحدہ سے اپنی کسی اور دنیا میں کھوئے رہتے ہیں"۔

میں نے کہا "لیکن دادی! اس طویل مدت میں وہ قطعی اس لڑکی کو بھول گئے ہوں گے، دنیا میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے"۔ لیکن دادی نے سر ہلا کر بتایا: "اس لڑکی کی شادی اسی شہر کے ایک بے حد دولت مند آدمی سے ہو گئی ہے وہ خود بھی بے حد خوش شکل ہے اکثر اس کی تصویریں اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی کسی شادی کی تقریب میں تو کبھی کسی غیر ملکی دورہ پر

جلتے ہوئے اس کے شوہر تمہارے دادا کے دوست تھے اور اکثر ہماری ملاقات ان لوگوں سے ہو جاتی ہے لیکن تم غلط نہ سمجھو تمہارے دادا کو اس سے اتنے برس بعد محبت نہیں رہی ہے۔ لیکن وہ اسے بھول بھی نہیں سکتے ہیں اور اب اپنی شادی کی ۵۰ ویں سالگرہ کا جشن ہے۔"

اتنا کہہ کر انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کو وہ بات کہنے کی ضرورت نہ تھی جس کا انھیں ڈر تھا لیکن میں نے ان سے کہا: "لیکن دادی آپ تو ان سے محبت کرتی ہیں"۔

"ہاں دل و جان سے"۔

"تو پھر کیوں نہ وہ بھی آپ سے محبت کرنے لگے ہوں گے"۔

"میں تو ان کی کھوئی ہوئی محبت کی علامت ہوں بیٹا ان کے غم کے دن کی یادگار"۔

یہ کیسا بھیانک خیال تھا کیا ہم لوگ محرومی اور شکست کے پچاس برسوں کا جشن منانے جا رہے تھے؟

بہرحال سالگرہ کا دن بڑی خوشگواری سے شروع ہوا پوری صبح پھولوں کے گلدستے اور مبارکباد کے تار آتے رہے دوپہر سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ دوست احباب پڑوسی اور رشتے دار۔ دادا نے بہت قیمتی دھاری دار پتلون اور شاندار کوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے پر متوقع مسکراہٹ بھی تھی۔ ان کی نوکیلی داڑھی صبح ہی نائی نے برابر کی تھی گلے میں ہیروں کا ہار اور زمین تک لٹکتا ہوا سرخ گاؤن پہنے دادی واقعی ایک ملکہ معلوم ہو رہی تھیں۔

چار بجے شام کو ۹۰ آدمیوں کا ایک بینڈ شہنائی بجاتا ہوا آ گیا بینڈ والے اپنی سرخ و سفید وردیوں میں جھلملا رہے تھے وہ مکان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ایک گھنٹہ تک دادا دادی کے جوڑے کو خوشی کا سنگیت سناتے رہے دادا دادی بالکونی پر نکل کر کھڑے ہو گئے تھے اور جاننے والوں کو گزرتے دیکھ کر سر ہلا دیتے یا مسکرا دیتے میری ایک خالہ نے مجھے بتایا کہ ایسا جشن منانا صرف بہت ہی معزز شہریوں کے لیے ہوتا ہے۔ بینڈ بھی دادا کے ملنے والوں نے بھیجا تھا۔"

لیکن یہ سب رات کو ہونے والی دعوت کا صرف پیش خیمہ تھا۔ رات کی دعوت پر صرف ۶۰ مخصوص مہمان مدعو تھے۔ شہر کا میئر، اعلیٰ افسران، معزز شہری اور ان کی بیگمات جو اپنے ہیروں کے مرصع زیورات پہنے جگمگا رہی تھیں۔

جب کھانا ختم ہوا تو میئر صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنا جام اونچا کرتے ہوئے کہا: "اس جوڑے کے نام جسے شہر کے سبھی لوگ چاہتے اور جانتے ہیں۔ اس جوڑے کے نام جن کی پر محبت اور خوشگوار زندگی دوسروں کے لیے مثال ہے ان کی ۵۰ سالہ شادی کی سالگرہ اور آگے کے برسوں کی خوشیوں کے نام"۔

ہم سب نے کھڑے ہو کر اپنے اپنے جام پئے۔ میئر صاحب پھر بولے "یہ میرے لیے ہمیشہ خوش قسمتی کی بات ہوئی ہے کہ ایسے موقعوں پر میں ۵۰ برسوں کے شوہر سے یہ درخواست کروں کہ وہ اپنی ۵۰ برسوں کی دلہن کے نام جام پئیں"۔ اتنا کہہ کر وہ میرے دادا کی طرف مڑ گئے۔ "جناب! ہم منتظر ہیں۔"

میرے دادا دھیرے دھیرے کھڑے ہوئے اور بولے: "میئر صاحب نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اپنی ۵۰ برسوں کی بیوی کے نام جام پیوں لیکن میں امید کرتا ہوں کہ وہ سمجھ جائیں گی اگر یہ جام میں کسی اور کے نام پیتا ہوں"۔

میں نے فوراً اپنی دادی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں کرب سے بند ہو گئی تھیں۔

دادا کہہ رہے تھے "میں نے کبھی اپنے جذبات کا اظہار کرنا نہیں سیکھا ہے۔ آج بھی میرے پاس اپنے جذبات ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں۔ یہ جام میں اپنی بیوی کے نام نہیں بلکہ اپنے اور اس کے والدین کے نام پیتا ہوں۔ انھیں کی حکمت تھی جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ میں آج ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک ایسی بیوی دی جس نے مجھے اتنی خوبصورت اتنی لاجواب اتنی محبت سے لبریز زندگی بخشی ہے جتنی کہ کوئی انسان چاہ سکتا ہے: اور اس کی محبت اتنی گہری! اپنے سارے دکھ ...." وہ رک گئے شرمائے شرمائے سے، آگے اور کچھ کہنے کو ان کے

پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ انھوں نے میری دادی کی طرف دیکھا ایک
پریشان سی نظر سے گویا کہہ رہے ہوں کہ میں کس مصیبت میں پھنس
گیا ہوں آؤ اور مجھے بچا لو۔
دادی نے ان کی طرف جو چہرہ اٹھایا اس میں ایسی شادابی
ایسی دمک اور ایسا اظہار تشکر تھا کہ سبھی لوگ بے ساختہ کھڑے
ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ دادا گھبرا کے بیٹھ گئے۔ انھوں نے
سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ شجر مراد)

وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے
ایک مسافر سے اس نے کہا "کیا آپ میرا ایک چھوٹا سا کام کر سکتے ہیں
کچھ دور بعد ریلوے لائن کے ساتھ سیب کا ایک درخت نظر آئے
گا اسے بڑے غور سے دیکھئے گا اور بتائیے گا کہ اس پر کوئی سفید
کپڑا تو بندھا ہوا نہیں تھا؟"
ڈیوڈ خاموش بیٹھا سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا دل کسی حبشیانہ
تال پر دھڑک رہا تھا اور پسینہ پورے جسم سے پانی کی طرح بہہ رہا
تھا۔ اسی اثنا میں ریل درخت کے سامنے سے نکل گئی۔
"کیا... کیا ہوا؟" آخر ڈیوڈ نے لرزتی آواز میں مسافر
سے پوچھا۔
"اوہ میرے خدا!" مسافر نے باہر جھانکتے ہوئے حیرت سے
کہا۔ "اس درخت کی تو ہر شاخ پر ایک سفید کپڑا بندھا ہے
پورے درخت پر کپڑے ہی کپڑے لہرا رہے ہیں۔"

حریمی دسترخوان

▫ آم کا اچار

اشیاء۔ • بڑے کچے آم ایک سیر۔ سُرخ مرچ ۴۰ گرام • کلونجی ۱۲ گرام • سرسوں کا تیل اتنا اچار میں ڈوب جائیں۔
• میتھی ۱۲ گرام • سونف ۱۲ گرام • نمک حسب ضرورت

ترکیب۔ ایسے کچے آموں کو جن میں جالی نہ پڑچکی ہو کسی بڑی چھری یا بڑے سروتے سے تراش کر چار پھانکیں کرلیں گٹھلی نکال کر پھینک دیں۔
کلونجی، میتھی اور سونف کو سل پر دردری کرلیں۔ مرچیں بھی کوٹ لیں، لیکن اس طرح کہ باریک نہ ہونے پائیں۔ مرچیں بھی کوٹ لیں، لیکن اس طرح کہ باریک نہ ہونے پائیں۔ اس کے بعد تمام مسالوں اور نمک کو آم کی پھانکوں میں ملا کر کسی مرتبان میں رکھیں اور سرسوں کا تیل اتنا ڈالدیں کہ آم کی پھانکیں ڈوب جائیں، اور تیل ایک سوا انچ اوپر تک آجائے۔ آٹھ دس روز بعد استعمال کے قابل ہو جائے گا۔ مسالے چمچے سے ملائیں اور چمچے سے ہی مرتبان میں رکھیں۔ ہاتھ نہ لگائیں، اسی طرح استعمال کرتے وقت بھی اچار کو چمچے سے ہی نکالنا چاہیئے۔

مرسلہ۔ نزہت آرا (بریلی)

▫ کباب کا سالن

اشیاء:۔ گوشت کا عمدہ باریک قیمہ ۲۵۰ گرام • ڈبل روٹی کا سلائس ایک • پیاز کی دو بڑی گانٹھیں۔ ٹماٹر ۵۰ گرام • پسا ہوا گرم مسالہ چائے کا ایک چمچہ۔ سرخ مرچ پسی ہوئی حسب خواہش • نمک اندازے سے، پسا ہوا دھنیا چائے کا ایک چمچہ، پسی ہوئی ہلدی چائے کا آدھا چمچہ۔ ہرا دھنیا ایک گڈی ہری مرچ حسب خواہش۔ گھی، ڈالڈا یا سرسوں کا تیل تلنے کے لئے۔

ترکیب:۔ پہلے ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ لیں۔ پیاز کے لچھے تراش لیں۔ تھوڑی سرخ مرچ اور گرم مسالہ اور نمک اندازے شامل کرکے قیمہ اور سلائس میں سب چیزیں ملا کر سب کو باریک پیس لیں اور ان کے اس شکل کے پانچ چھوٹے کباب بنا کر رکھ لیں اور انھیں فرائی پین میں گھی، تیل یا ڈالڈا میں ہلکی آنچ پر تل کر ڈش میں خوبصورتی کے ساتھ سجادیں۔

کباب تلنے کے بعد جو گھی یا تیل بچے اس میں تھوڑی سُرخ مرچ تھوڑا نمک، دھنیا اور ہلدی ڈال کر بھونیں اور ٹماٹر باریک کاٹ کر پکائیں۔ ٹماٹر گل جائیں تو انھیں ڈش میں رکھے ہوئے کبابوں پر اور چاروں طرف گرم گرم ڈالدیں اور نوش فرمائیں۔

خیال رہے کہ کباب کافی گھی یا تیل میں تلے جائیں اور آخر میں ٹماٹر پکانے کے لئے کم سے کم ۱۲۵ گرام تیل رہنا چاہیئے۔
ٹماٹر پک جانے پر نمک چکھ لیں۔ کم ہو تو اور ملالیں۔

صرف رومانی ناولیں ہی کیوں؟

عرصے سے یہ رواج ہوگیا ہے کہ عورتیں صرف خاتون ناول نگاروں کے لکھے ہوئے ناول ہی پڑھتی ہیں۔ صرف چند ہی مرد مصنف ایسے ہیں جن کے ناول وہ اب بھی پڑھنا گوارا کرتی ہیں۔ یہ وبا پاکستان سے شروع ہوئی اور اس درجہ عروج پر ہے کہ وہاں کئی مرد ناول نگار نسوانی نام رکھ کر اپنے ناول پیش کر رہے ہیں۔

بہرحال سردست میں حیران اس بات پر ہوں کہ ناول پڑھنے والوں میں ۸۰ فی صدی عورتیں ہوتی ہیں اور وہ سب کی سب تقریباً ایک ہی قسم کے یعنی رومانی معاشرتی ناول ہی کیوں پڑھتی ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی یہ پسند ان کی فطرت کا تقاضہ ہے، ایسے ناول جذبات نگاری اور رومان سے پُر ہوتے ہیں اور جنھیں خواتین مصنفین خاص طور پر عورتوں کے لئے لکھتی ہیں۔ صرف اردو ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی رومانی ناول عورتوں کے مطالعہ کا ۸۰ فی صدی حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی عورتوں کا مطالعہ صرف رومانی ناولوں تک ہی محدود رہتا ہے۔

اس بات کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے کہ عورتوں کو فطری طور پر ایسے ناول پسند آنے چاہئیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی فطرت صرف جذبات و رومان کی ہی نہیں بلکہ اسرار و تجسس کی بھی شائق ہوتی ہے۔ اس کے باوجود خواتین کی رغبت اردو میں چھپنے والے جاسوسی ناولوں کی طرف نہیں ہوتی۔ بہاتی دنیا کی ناولیں بھی وہ نہیں پڑھتیں۔

جاسوسی ناولوں سے — بشرطیکہ وہ معیاری ہوں — ذہن تیز ہوتا ہے اور ہماری بے فدشہ زندگی میں خطرات و مہم کی ہلکی سی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جاسوسی ناول میں جو معمہ ہوتا ہے، جو اسرار ہوتا ہے اس کے حل ہونے کی پوری کارروائی ہماری فطرت کی ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ پاکیزہ جاسوسی ناول عورتوں کو بھی پسند آنے چاہئیں۔ خواتین کو سوچنا چاہئیں۔ کہ صرف اتنا ہی اسرار کافی نہیں ہوتا کہ ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہوگی یا نہیں!

ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اردو میں پاکیزہ معیاری اور متمہ پیش کرنے والے جاسوسی ناول نہیں ہیں۔ جو ہیں بھی وہ یا تو ترجمے ہیں یا پھر انگریزی ناولوں کے چربے اور یہ صرف مردوں کو لحاظ میں رکھتے ہوئے پیش کئے جاتے ہیں خواتین کی پسند کا خیال ہی نہیں رکھا جاتا، اس بنا پر کہ وہ ایسے ناول پڑھتی ہی نہیں ہیں۔

بہرحال چند سالوں سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اب خواتین اپنے مطالعہ میں تنوع پسند کرنے لگی ہیں۔ پڑھنے والوں کی ایک نئی نسل تیار ہوگئی ہے۔ اسی لئے رومانی ناولوں میں بھی نئے موضوع، نئے انداز تلاش کئے گئے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں لیکن خواتین کے لئے ایک علیحدہ صنف کے ناول ابھی منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں، اس لئے ہم خواتین کے لئے ان کی دلچسپی کے جاسوسی ناول پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

چونکہ اردو میں ناول کی یہ صنف ناپید ہے لہٰذا ہم انگریزی کے ایک ایسے ناول کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو خواتین کی پسند کو سامنے رکھتے ہوئے چنا گیا ہے۔

اگاتھا کرسٹی دنیا کی سب سے زیادہ بکنے والی اور ترجمہ ہونے والی جاسوسی ناول نگار قرار پائی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے ناول انگلستان کی ہی نہیں ساری دنیا کی خواتین بڑے شوق سے پڑھتی ہیں

کیونکہ اس کے ناولوں

۱۔ اسرار و پہیلی کے ساتھ ساتھ رومان کی چاشنی ہوتی ہے۔

۲۔ کردار عام قسم کے انسان ہوتے ہیں اور اس کے ناولوں میں کسی قسم کی فحاشی، نہیں ہوتی۔ نہ ہی ان میں خون خرابہ ہوتا ہے۔ اور ان میں بے حد نفیس قسم کے معمے ہوتے ہیں۔

اردو میں شائع ہونے والے گھٹیا قسم کے جاسوسی ناول اس طوفانی رات کی طرح ہوتے ہیں جس میں بجلیاں چمک رہی ہوں اور بادل گرج رہے ہوں جبکہ اگاتھا کرسٹی کے ناول اس حسین چاندنی رات کی طرح ہیں جبکہ اڑتے ہوئے بادل کبھی چاند کو اوٹ میں لیتے ہیں اور کبھی اس کا گھونگھٹ اُلٹ دیتے ہیں

مجھے امید ہے کہ خواتین اس کے ناول ضرور پسند کریں گی میری گذارش ہے کہ وہ صرف تجربہ ہی کرنے کے لئے اس کا یہ ناول پڑھیں اس کے بعد مجھے امید ہے کہ وہ اس کے لئے جناب رہا کریں گی اور ناول

برُقعے کے فوائد

ایک مزاح نگار کے نقطۂ نظر سے

محمد فیاض زعیم

خواتین خواہ مخواہ برقعے کی مخالف ہیں۔ اس کی مخالفت میں لمبے لمبے مضامین لکھتی ہیں بلکہ دھواں دھار تقریریں بھی کرتی ہیں۔ یہ بے چارہ مظلوم تو خود خواتین سے تنگ ہے۔ کیونکہ خواتین نے اس کی صورت شکل ہی بگاڑ دی ہے وہ بھی اس حد تک کہ اب اس کا ٹھیک ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ خیر یہ ایک الگ داستان ہے۔ ہم تو دراصل پردے کی مخالفت کے بارے میں بات کر رہے تھے!

خواتین ایک بات بھول جاتی ہیں کہ برقع ان کی کئی ایسی باتوں کو چھپا لیتا ہے جو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتیں۔ (برقع پیٹ کا ہلکا نہیں ہوتا) اس لحاظ سے برقع خواتین کا محرم و ہمراز ہوا۔ دیکھئے آپ کپڑے میلے پہنے ہوئے ہیں اور جلدی میں کہیں جانا پڑ رہا ہے۔ گھبرائیے مت۔ برقع پوش ہو جائیے۔ کپڑوں کی ساری کثافت چھپا لے گا۔

آپ بازار جانے کے لئے کپڑے استری کر رہی ہیں اور عین اسی وقت بجلی چلی جاتی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کپڑے آدھے استری شدہ ہیں اور آدھے شکن شدہ۔ آپ نے میاں کو اتنی مشکل سے شاپنگ کے لئے راضی کیا ہے۔ کپڑے استری شدہ نہ ہونے کے باعث آپ کو پروگرام ملتوی کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ پریشان ہونے کے بجائے برقع پہن لیں۔ آپ کے کپڑوں کی شکنیں نظر سے اوجھل ہو جائیں گی۔ بالوں کی سیٹنگ دو مہینے سے نہیں کرائی۔ آپ کو فلم دیکھنے جانا ہے۔ جانا ضروری یوں ہے اچھی ہے اور پھر اس کی وجہ سے ٹکٹ بڑی مشکل سے ملے ہیں۔ راستے میں لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ یہ بال تو بس لے آوے۔ اتنی اچھی فلم نکلی جا رہی ہے۔ بھئی آپ ایسے موقعے پر برقع کا استعمال عمل میں لائیے۔ راستے میں برقع اور سینما ہال میں تاریکی آپ کے بالوں کو چھپالے گی۔ برقع آپ کی عمر کا راز رکھنے میں آپ کی مدد کرتا ہے۔

ارے آپ تو ان سب فائدوں کے باوجود خفا دکھائی دے رہی ہیں۔ اچھا میں سمجھا۔ آپ کو یہ خوف ہے کہ برقع آپ کو بالکل چھپالے گا۔ مگر محترم خواتین ذرا صبر کریں۔ میں بعد میں آپ کو برقع کے فائدے "اس رخ پر" بھی بتاؤں گا کہ آپ برقعے میں کس طرح زیادہ نمایاں اور واضح طور پر نظر آسکتی ہیں۔

ایک فائدہ میں آپ کو اور بتا دوں۔ ذرا رازکی بات ہے۔ اس لئے کان ادھر لائیے۔ میں نہیں چاہتا کہ مرد حضرات اس بات سے واقف ہو کر آپ کا برقع پہننا بالکل ہی بند کرا دیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ برقعے میں ملبوس ہیں تو کوئی کیا جانے کہ برقعے میں کون محترمہ تشریف رکھتی ہیں۔ آپ آزادی سے گھوم پھر سکتی ہیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ آپ کالج کی اسٹوڈنٹ ہیں تو پھر آپ بلا جھجک بس اسٹاپ پر کھڑے لڑکوں پر آوازے کس سکتی ہیں۔ بلا خوف بلند بانگ قہقہے لگا سکتی ہیں۔ بے باکانہ انداز میں ادھر اُدھر گھوم پھر کر بازار کی رونقوں سے لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ چاہے کتنے ہی لڑکوں کو الّو بنائیں۔ راز راز ہی رہے گا۔

بعض خواتین کو اعتراض ہے کہ برقع ان کی بیرون در سرگرمیوں میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ واہ دوستو خواتین بھی کیسی سادہ لوح ہیں۔ بھلا برقع ان کی بیرون در سرگرمیوں میں رکاوٹ کہاں ہے۔ یہ تو سرگرمیوں میں ان کا ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

جب کبھی ہمیں بدقسمتی سے بل جمع کرانے بنک جانا پڑتا ہے تو ہم بے چارے بنک کی کھڑکی سے دو سو گز دور کھڑے اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے سوکھ جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بعض چالاک مرد برقعے میں ملبوس آتے ہیں اور جلد ہی بل جمع کرا کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اب بینک والے بھلا کہاں برقعے کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں۔ انہیں تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ سو محترم خواتین جب مرد حضرات برقعے کی مدد سے ایسے کام نکلوا سکتے ہیں تو آپ برقعے سے اور بھی کئی فائدے حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ تو ایک حالیہ نمونہ آئیٹم ہے ایک

مثال عرض کرتا ہوں شاید آپ متاثر ہو جائیں۔

چند دن پہلے کی بات ہے۔ میں کتابوں کی ایک دکان میں گیا۔ ابھی کتابیں دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک محترمہ دکان میں بڑا سا نینٹ نما برقع اوڑھے داخل ہوئیں۔ برقعے کا نقاب اوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے مت چوکی ان برقعوں کو تو بڑی بوڑھیوں نے بھی پہننا ترک کر دیا ہے۔ پھر یہ جوان چہرہ اس بھاری برقعے میں کیوں۔ خیر جی۔ اب صاحبہ نے کتابیں الٹ پلٹ کرنی شروع کر دیں پہلے تو انھوں نے عصمت چغتائی کی لحاف "اٹھائی اور لحاف کو برقعے میں گم کر دیا۔ اب فراز کی ایک کتاب اٹھائی "جاناں جاناں" اس کے بعد کچھ اور کتابیں ادھر ادھر کرنے کے بعد انھیں بالآخر فہمیدہ ریاض کی "بدن دریدہ" پسند آگئی۔ تینوں کتابوں کے ساتھ وہ کاؤنٹر پر گئیں اور جلدی سے قیمت ادا کر کے باہر نکل گئیں۔ مجھے شک ہوا کہ موصوفہ لحاف کی قیمت گول کر گئی ہیں۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی سے پوچھا صاحب کیا خرید کے لے گئی ہیں؟ بولا شعر زدہ معلوم ہوتی ہیں۔ دو شعری مجموعے خرید کر لے گئی ہیں۔ میں نے پوچھا تو کیا انھوں نے صرف دو ہی کتابیں خریدی ہیں۔ ایک دم بولا "کیا آپکو اعتراض ہے؟ میں نے بوکھلا کر سر ہلا دیا۔

اب ذرا غور کریں محترم خواتین اگر موصوفہ کے پاس برقعہ نہ ہوتا تو وہ بھلا "لحاف" کیسے غائب کرتیں آپ خود فیصلہ کریں کہ برقعہ آپ کے پیچیدہ درکاموں میں آپ کی مدد کرتا ہے کہ رکاوٹ ڈالتا ہے۔

میں برقعے کی افادیت کے بارے میں عرض کر رہا تھا آپ کو برقعے پر یہ بھی تو اعتراض ہے نا کہ برقع آپ کی "خود نمائی" اور آپ کے "اظہار حسن" میں مانع ہے۔ میرا خیال ہے کہ برقع اس نازک معاملے میں بھی آپ کا مددگار ہے ـــــ جو خواتین برقع پہنتی ہیں اور جو نہیں پہنتیں سبھی جانتی ہیں کہ آج زمانہ برقعے کی وضع قطع کیا ہے۔ آپ بھی اسی قسم کا ایک برقع سلا لیجئے یعنی چونٹیوں والا ہو بلکہ بیلٹ ہو تو اور بھی اچھا ہے جیسے کہ آج کل برقعے نظر آتے ہیں۔ ایک اہم خصوصیات اس میں یہ ہونی چاہیئے کہ وہ جدید طرز کے مطابق اتنا ٹائیٹ ہو کہ آپ کا جسم انگ انگ اس میں نمایاں ہو جائے کہ آگے کیا کہوں۔ ماشاءاللہ سمجھدار ہیں خود ہی جان لیجئے۔ اس کے بعد باریک ململ کا نقاب چہرے پر گرا لیں مگر دیکھیں یہ نقاب اتنا باریک ہو کہ آپ کا چہرہ اس نقاب کے پیچھے اس مصرعے کی تصویر ہو سکے

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

لیجئے آپ کا برقع مکمل ہوا۔ اب مرد حضرات آپ پر بھلا کیا الزام کر سکتے ہیں۔ برقع آپ پہنے ہیں اب بھلا کسی مائی کے لال کی کیا جرأت ہے کہ آپ کو بے پردہ کہہ سکیں۔

ایک طرف تو یہ فوائد اور دوسری خود نمائی اور اظہار حسن جیسے مقاصد بھی حاصل، آپ نے روشنی پر کبھی غور کیا ہے؟ آنکھ کو زیادہ روشنی سے اندھیرا ایسا لگتا ہے بلکہ ہلکی روشنی آنکھ کو زیادہ اچھی لگتی ہے۔ یہی عالم اس برقعے میں آپ کا ہوگا اگر آپ حسین ہیں تو حسین ترین نظر آئیں گی۔ جو چیز سامنے ہو یا جو چیز مکمل چھپی ہوئی ہو۔ اس کے بارے میں زیادہ تجسس کسی کو نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو چیز نیم ظاہر نیم پوشیدہ ہو۔ اس کے بارے میں تجسس زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات یہ برقع پیدا کرتا ہے یعنی آپ کو ہر لحاظ سے فائدے ہی فائدے حاصل رہیں گے۔

حریمی بہنوں کے لئے ادارے کے منتخب کردہ عمدہ ناول

ناول	مصنفہ	قیمت
لازوال	بشریٰ رحمٰن	۸۰/-
ناظمہ	عطیہ پروین	۲۲/۵۰
بے درد	سلمیٰ کنول	۲۵/-
پیاسا	اسما اعواز	۲۵/-
ایک لڑکی	وحیدہ نسیم	۳۵/-
نئی صبح	مسرور جہاں	۱۸/-
مرلقا	عطیہ پروین	۱۵/-
چشمہ	اے آر خاتون	۳۶/-
تصویر	" " "	۲۵/-
نجم السحر	نسیم انہونوی	۲۵/-
شگفتہ	" "	۱۲/-
اکیلی	سلمیٰ کنول	۱۸/-
صباحت	مشرف تمیز	۲۸/-

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ روانہ فرمائیں۔ جو خبریں ۲۰ر تاریخ کے بعد دفتر میں وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کی ذمہ داری ادارے پر نہ ہوگی، البتہ شکایت ملنے پر اس کی صحت شائع کردی جائیگی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• شاہینہ بیگم۔ ساجدہ بانو (کانپور) ہماری بہن قیصر جہاں اور بہنوئی مقبول احمد کو اللہ پاک نے ۵ رجون ۱۹۸۴ء بروز منگل بوقت ۶ بجے شام جڑواں بچوں سے نوازا۔ لڑکی کا نام آفرین فاطمہ اور لڑکے کا نام محمد نوید قرار پایا۔ اللہ پاک انھیں عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• شمع جبیں روبینہ (گیا) ہمارے چھوٹے چچا سید ابوالارشد ارمانی اور چچی صفورہ بیگم آستانہ امیٹھیہ، بیتیا کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۷ر اپریل ۱۹۸۴ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام سید صبیح الحسن ارمانی عرف اسد تجویز کیا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• ثروت نازلی (پرنام بٹ) میری بہن حامدہ تبسم اور نثار احمد کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲۴ر اپریل ۱۹۸۴ء بروز منگل ایک فرزند عطا فرمایا۔ دعا ہے کہ وہ فخر خاندان بنے۔

پیغامات نشاط

• رفیعہ یاسمین، ذکیہ اشفاق: میرے بھائی سید محمد محسن (پسر شاہ محمد حسین صاحب) کی شادی۔ فردوسیہ بیگم (دختر رضوان احمد) کے ہمراہ ۳ر مارچ ۱۹۸۴ء بمقام چھپرہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور بھیا و بھابی ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• جناب [illegible] صاحب [illegible] شفاعت منزل محلہ پنجابیاں، پیلی بھیت کے فرزند دلبند اطہر الحسن شمسی سلمہ عرف مولانا میاں کی شادی ہمراہ فرید النساء شائستہ سلمہا بنت جناب باب الرحمٰن شمسی۔ پنجابیاں۔ پیلی بھیت بحسن و خوبی ۲۸ر مئی ۱۹۸۴ء کو انجام پائی۔ ۲۹ر مئی کو ایک عظیم الشان دعوت ولیمہ دی گئی۔ افسوس کہ شادی کی اطلاع اتنی تاخیر سے ملی کہ میں کوشش کے باوجود شرکت نہ کر سکا۔ بہرحال میں محترمہ اہلیہ صاحبہ لیئق حق صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ شائستہ سلمہا اور مولانا میاں سلمہ کی ازدواجی زندگی شاد و خرم گزرے (نسیم انہونوی)

• روح رواں نسیم بکڈپو سید جمیل الحسن صاحب ردولوی کی صاحبزادی عزیزی عزا سلمہا کی دختر ممتاز سلمہا (دختر نیک اختر جناب عباس علی رضوی صاحب) کی شادی ہمراہ پرویز سلمہٗ (فرزند جناب ریاض حسین نقوی (منڈوا سادات، فتحپور) ۷ر جون ۱۹۸۴ء کی شام کو احاطہ مرزا علی خاں لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور ممتاز و پرویز سلمہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ شاد و خرم رہیں (نسیم انہونوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

• موت کا بازار تو گرم رہتا ہی ہے۔ روزانہ لوگ مرتے رہتے ہیں لیکن ایسے لوگ کبھی کبھی ہی مرتے ہیں جن کے لئے اپنے تو اپنے ہیں، غیر بھی آنسو بہاتے ہیں۔ ۱۶ر مئی ۱۹۸۴ء کو ایسی ہی ایک ہر دل عزیز ہستی جسے سب سید اسد حسین کہتے تھے اور جو سید اصغر حسین صاحب نگرامی مرحوم کے فرزند تھے، اپنی کوٹھی محمد منزل لکھنؤ میں رحلت فرما گئے۔ اسد صاحب مرحوم جتنے وجیہہ و شکیل تھے، اتنے ہی منکسر المزاج شریف الطبع اور خوش اخلاق بھی تھے۔ لکھنؤ کی ہر بڑی محفل میں اسد صاحب سب سے نمایاں نظر آتے، سلام کے لئے پہلے ہاتھ اٹھاتے بڑے خلوص و محبت سے ملتے افسوس ایک عرصہ سے ان کی صحت خراب ہوگئی تھی اور آخر ۱۲ ماہ شبرات کے مبارک روز سفر آخرت اختیار کر گئے۔ نماز جنازہ مولانا منظور نعمانی صاحب نے پڑھائی اور اسی شب عیش باغ کے بنگلے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اللہ پاک مرحوم کی بیوہ اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (شریک غم۔ نسیم انہونوی)

• شیخ نور الصبح (پوری اڑیسہ) افسوس میرے بھائی [illegible] ۳۰ سال قبل مشرقی پاکستان گئے تھے۔ وہاں سے انقلاب کے [illegible]

راولپنڈی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۵ رمئی [illegible] کو قلبی دورہ پڑنے سے اس عالم فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کی یادگار ایک ننھی بچی انھیں کے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا میرے پاس رہ گیا تھا جو اب تک یہیں ہے۔ ہم سب کو مرحوم کا آخری دیدار بھی میسر نہ ہو سکا۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• اوناؤ کی ہر دل عزیز اور مشہور شخصیت قاسم حسین زیدی صاحب ۹ رجون [illegible] کو رحلت فرما گئے۔ زیدی صاحب ایک تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ مرحوم کی ہر دل عزیزی کا اندازہ اس سے ہی کیا جا سکتا ہے کہ وہ [illegible] سے [illegible] تک مسلسل میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے تھے۔ بڑے نیک نفس اور ہر ایک کے کام آنے والے انسان تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سے سارا اوناؤ سوگوار نظر آرہا تھا۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(نسیم انہولوی)

• افسوس صد افسوس کہ ادارہ نسیم بکڈپو کے بہت ہی قدیم کارکن عزیز الرحمٰن صاحب (بھیکم پور۔ لکھنؤ) بھی ۲۵ / ۲۶ رجون [illegible] کی درمیانی شب میں قلبی دورہ پڑنے سے انتقال فرما گئے۔ موصوف مجھے بہت عزیز تھے، انھوں نے ہمیشہ ادارہ کو اپنا سمجھ کر کام کیا تھا۔ کاپی اور پروف ریڈنگ کا شعبہ ان کے سپرد تھا۔ صحت کی خرابی کے باعث تقریباً دو سال سے انھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مجھ سے ملنے برابر آتے رہتے تھے۔ ۲۳ رجون کو بھی آئے تھے، لیکن اس روز میں یہ سوچ بھی نہ سکا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ افسوس کہ تین ہی روز بعد وہ ۲۶ رجون کو نشاط گنج لکھنؤ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دئے گئے۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہولوی)

• ایک عورت۔ میں حیران ہوں کہ آخر عورتیں بیوٹی پارلر کیوں جاتی ہیں۔

دوسری عورت۔ اسلئے کہ وہ معجزوں پر یقین رکھتی ہیں (اگاتھا)

• عورتیں صنف نازک کہلاتی ہیں۔ لیکن ان کے نازک کاندھوں پر بے شمار ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔

شادی کے گیت

شادی بیاہ کے موقع پر اب بھی خواتین ایسے ہی بے تکے گانے گایا کرتی ہیں، حالانکہ یہ گانے اس زمانے میں گڑھے گئے تھے، جب خواتین تعلیم یافتہ نہ تھیں، بہرحال اب بھی فلمی گانوں کے ساتھ ہی ایسے ناموزوں گیت گائے جاتے ہیں۔ لیجئے ایک گیت پیش ہے۔ ہماری بہنیں اسی طرح کے گیت اور سہرے وغیرہ بھیج سکتی ہیں۔ ہم انھیں، اگر پسند کیا گیا تو ان کے نام کے ساتھ برابر شائع کرتے رہیں گے۔

رسولؐ پاک کا سایہ مبارک ہو مبارک ہو
بلاؤ درزی کو سیئے جوڑا جو دلہن پہن کر آئے
دولہا کی اماں سے کہہ دینا! مبارک ہو مبارک ہو
رسولؐ پاک کا سایہ مبارک ہو مبارک ہو
بلاؤ جیولر کو بنائے زیور جو دلہن پہن کر آئے
دولہا کی بہنوں سے کہہ دینا! مبارک ہو مبارک ہو
رسولؐ پاک کا سایہ مبارک ہو مبارک ہو
بلاؤ مالی کو بنائے سہرا جو دلہن پہن کر آئے
دولہا کے بھائیوں سے کہہ دینا! مبارک ہو مبارک ہو
رسولؐ پاک کا سایہ مبارک ہو مبارک ہو
بلاؤ ڈرائیور کو سجائے گاڑی جو دلہن بیٹھ کر آئے
دولہا کے ابا سے کہہ دینا! مبارک ہو مبارک ہو

• عہد سے لے کر لحد تک عورت مظلومیت کی ایک خاموش داستان ہے (مارتر)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری بھی لکھا گیا ہو۔ جس ماہ کے پرچے میں شعر چھپنا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک شعر کا وصول ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔ اگست کے لئے عنوان ہے "شوق" اور ستمبر کے لئے "وعدہ" یا "وعدے"۔

رفیقوں سے رقیب اچھے جو جل کر نام لیتے ہیں۔
گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں

مرسلہ:۔ شاہینہ بیگم، سائرہ بانو (کانپور)

مرسلہ:۔ عالم آرا (آرہ۔ بہار)

ہزاروں عظمتیں قربان اس دامن کی عظمت پر
جو مجبوری کے عالم میں بھی پھیلایا نہیں جاتا

مرسلہ:۔ طاہرہ تبسم اعظمی۔ راجہ پور سکرور

اشکوں سے تر ہے پھول کی ہر ایک پنکھڑی
رویا ہے کون تھام کے دامن بہار کا

مرسلہ:۔ اے۔ ایم بسملا (آسن)

اب ان کا حسین دامن قسمت میں نہیں شاید
آنسو بھی ہمارے ہیں، دامن بھی ہمارا ہے

مرسلہ:۔ سیدہ عزیز فاطمہ بیگم قادری (بھوپال)

میرے آنسو نہ پونچھو خدا کے لئے
ورنہ دامن تمہارا بھی جل جائیگا

مرسلہ:۔ آنسہ ابراہیم (بنگلور)

ہوش میں آئے تو وہ بھی چاک تھا
بے خودی میں ہم نے جو دامن سیا

مرسلہ:۔ امروز جہاں (آرہ۔ بہار)

توصیف بیاں لالۂ صحرا کی کروں کیا
اک دیپ ہے جو دامن صرصر میں جلا ہو۔

مرسلہ:۔ نجم انصار (بھٹکل)

بارہویں قسط

موم کی زنجیریں

اچانک پھر سناٹے میں علوی صاحب کی بھاری آواز گونجی: "خدا کا شکر ہے بیٹے کہ تم نے میرے اس اقدام کو نامناسب نہ جانا۔ فکر نہ کرو۔ وہ آرہی ہے۔! شاید آ بھی چکی ہو۔!"

"آرہی ہے؟" بے ساختہ رضا کے لبوں سے نکلا: "میں نہیں سمجھا یہ معمہ کیا ہے باجی جان نے تو کہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔!"

"اے بیٹی۔ کیا تم نے جھوٹ کہا تھا؟" بیگم علوی بھی دھک سے رہ گئیں۔ "کس نے کہا تھا کہ وہ مر گئی۔!" میجر صاحب نے حیرت سے پوچھا: "رضوانہ نے؟ کیا معاملہ ہے۔ بتائیے مجھے!"

"اسے اب تو سب مجھے کہیں گے:" اچانک رضوانہ بیگم بری طرح رو پڑیں: "ایک روز سب کو خاندان کی ناک کی پڑی تھی۔ امی اسے نوکر بچی کہتی تھیں۔ رضا بگڑ رہے تھے۔ ابا جان نے خود کہا تھا کہ اپنے کسی ملازم سے اس کا نکاح کر دینا اب ابا جان کا دل پلٹ گیا ہے۔ قصوروار میں ٹھہرائی جا رہی ہوں:"

کسی نے دروازے پر آواز دی: "اجازت ہو تو حاضر ہو جائیں۔ مدنی صاحب ہیں:" نعمانی نے بے ساختہ کہا: "شاید وہ رومہ کو لے آئے:"

"آؤ میاں آؤ۔!" فوراً علوی صاحب کے منہ سے نکلا۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ مدنی صاحب ان کی بیوی شہلا کے ساتھ رومہ آرہی ہے وہ رومہ جو سب کے لیے مر چکی تھی۔ علوی صاحب جس کے سوگ میں بیمار ہو گئے تھے۔! بیگم علوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تک رہی تھیں۔ رضوانہ بیگم طیش اور خجالت کے مارے دم بخود تھیں۔!

"میری بچی آؤ میرے پاس۔" علوی صاحب نے رومہ سے کہا۔ وہ سب کی موجودگی میں گھبرا رہی تھی۔ لیکن وہ آگے بڑھی اور سسک کر علوی صاحب کے

چاک دامن تو سل بھی سکتا ہے
زخم دل کا سیا نہیں جاتا

مرسلہ: کشور سلطانہ لال باغ۔ لکھنؤ

میرے دامن کے مقدر میں ہے خالی رہنا
آپ شرمندہ نہ ہوں دست کرم سے اپنے

مرسلہ: مسز نسیمہ عزیز (برہ پورہ۔ بھاگلپور)

پھولوں کے تو قابل نہیں شاید مرا دامن
اے صاحب گلشن اسے کانٹوں ہی سے بھر دے

مرسلہ: مہناز پروین (باڑی۔ سیتا پور)

تا زیست جس کے گریباں کا سلامت رہا
اس سے کہتے ہو کہ دامن کو بچائے چلنا

مرسلہ: نسرین بانو (بیتیا)

یہی کانٹے تو کچھ خوددار ہیں صحن گلستاں میں
کہ شبنم کے لئے دامن کو پھیلایا نہیں کرتے

مرسلہ: عذرا فضلی (رامپور)

چاندنی رات ہے اور عالم تنہائی ہے
زندگی یاد کے دامن میں سمٹ آئی ہے

مرسلہ: عذرا رحمان (آمبور)

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

مرسلہ: نیلوفر (پٹنہ)

کب تک کریں گے دامن شب میں سحر تلاش
کب تک کریں گے نور طلب تیرگی سے ہم

مرسلہ: ثریا ہدی (پٹنہ)

نہ چھٹنے پائے ہاتھوں سے کبھی دامن اطاعت کا
صلہ تم کو ملے گا حشر میں شوہر کی خدمت کا

مرسلہ: مہر افروز (لکھنیا)

سینے پر سر رکھ دیا۔

"ابا جان۔!" اس کے آنسو علوی صاحب کا سینہ بھگونے لگے!

علوی صاحب بھی بے حد متاثر تھے۔ رومہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "اگر مجھے خدا نے کل تک اور سانس لینے کی مہلت عطا کی تو۔ میں نعمانی اور نینا کے ساتھ ساتھ معظم اور رومہ کو بھی ہمیشہ کے لیے ایک کر دوں گا۔ میرے دل کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ اب میرے سامنے روشنی ہی روشنی ہے۔"

میجر صاحب نے ایک پر نفرت نظر اپنی بیوی پر ڈالی اور چہرہ پھیر لیا۔

نعمانی اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

اور معظم سوچ رہے تھے۔ بے لوث محبت ضرور رنگ لاتی ہے حسب نسب کی بڑائی، اونچ نیچ کا فرق، آقا و خادم کا اعتبار، ذات پات کا جھگڑا۔ یہ سب وہ زنجیریں ہیں جو سچی محبت کی گرمی سے بالآخر پگھل جاتی ہیں۔ یہ موم کی زنجیریں ہیں!!!

تمام شد

وہ پھر جھینپ کر چپ ہو گئے۔

"فرمائیے!" انھوں نے اپنے مخصوص پر اثر مدھم لہجے میں کہا۔ "اس کی آرزو ہے کہ اپنی تمام کتابوں پر آپ اپنے دستخط کر دیں۔" وہ بے حد لجتی لہجے میں بولیں۔

"لیکن یہ تو نا انصافی ہوگی محترمہ!" وہ مسکرائے! چہرے پر ایک خاص حسن چمک اٹھا مگر اس کا اثر دیکھنے کے لیے انھوں نے ایک نظر بھی اس لڑکی کی طرف نہ دیکھا جو پتھر کے بت کی طرح اپنی انٹی کے پہلو میں بیٹھی تھی اور والہانہ بے خودی کے انداز میں انھیں تکے جا رہی تھی۔ اب وہ اتنی مسحور ہو چکی تھی کہ اگر چاہتی بھی تو نظریں نہ ہٹا سکتی پرنسپل صاحب کو اس بات کا خوب احساس تھا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ منکسر خلیق اور سادہ ظاہر کرنے لگے! سر جھکایا اور قلم کا کور کھولنے بند کرنے لگے۔

"نا انصافی کیسی۔ جناب۔ میں سمجھی نہیں" مسز شکیل نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"کتابیں انھوں نے بازار سے خریدی ہیں۔ میں اگر خود ان کی خدمت میں پیش کرتا تو ان پر اپنے دستخط بھی کر دیتا۔ لیکن اس صورت میں!" لمحہ بھر کے لیے ان کے چمکیلے دانت خوبصورت ہونٹوں پر جگمگاہٹ سی پیدا کرتے پھر چھپ گئے۔

"اوہ۔ جناب۔ یہ بات ہے" مسز شکیل بھی مسکرا دیں۔ "لیکن آپ یقین کیجیے کہ اس کے لیے یہی بڑا اعزاز ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ـــــ" (باقی آئندہ)

تاوان

ایک نہایت دلچسپ رومانی ناول

عفت موہانی

ناشر

نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

فون { آفس :- ۲۴۵۵۹
رہائش :- ۴۵۲۲۴۴

باہتمام نسیم انہونوی (بار اوّل) تاج پریس لکھنؤ

نہایت درجہ عورت بیزار مشہور ہو گئے۔ تسکین و طمانیت اور شہرت کا ایک اور طریقہ۔ جیسے جیسے وہ عورت بیزار مشہور ہوئے۔ اسی قدر صنف نازک ان کے قرب کے لیے بے تاب رہنے لگیں!

انھیں در پردہ سب خبر تھی۔ کون کس بہانے ان کے پاس آتا ہے؟ لیکچرر خاتون، طالبات، کسی پرچے کی لیڈی ایڈیٹر، کسی جلسے کی سکریٹری اور جانے کون کون تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ملتے بڑی خندہ پیشانی سے تھے پہلی بار میں تو ملنے والی ان کی دلفریب شکل ہی کی دید میں کھو جاتی کیسا سیدھا سادھا مگر کتنا اثر انگیز حسن دیا تھا قدرت نے۔ اور پھر وہ پرکشش سراپا۔ گفتگو کا دلنشین انداز، وہ دل موہ لینے والی سیدھی سادی مسکراہٹ۔! خواتین تو دم بخود رہ جاتی تھیں۔ ان سے تو ان کے دوست احباب تک متاثر تھے۔

لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنی ذات سے بیزار رہنے لگے۔ جیسے یہ کھوکھلی دلچسپیاں انھیں مطمئن نہ کر سکیں ہوں۔ وہ نہ جانے کیا چاہنے لگے تھے انھیں تنہائی اب بھی عزیز تھی۔ مگر وہ بے چینی اور اضطراب۔ وہ کیا تھا۔

محفل سخن میں ان کی ایک ساتھی لیکچرر نے اپنی بھانجی کا ان سے تعارف کرایا تھا۔

آپ کی شاعری کی پرستار ہے۔ شاید آپ کی تمام کتابیں اس نے خرید رکھی ہیں۔ انھیں کو حفظ کرتی رہتی ہیں۔ وہ جب سے آپ سے ملنے کی مشتاق تھی۔ آج کی محفل میں مدعو نہ تھی مگر زبردستی آئی ہے اب آپ سے ایک التجا کرنا چاہتی ہے۔ اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو۔!"

عزت اور ناموری ملی تھی۔ لوگ بڑی عقیدت سے ان سے ملتے تھے اور ان کے شناسا حلقوں میں علمی و ادبی گفتگو سے ہٹ کر کوئی دوسری بات تو ہوتی ہی نہ تھی۔!

تو کیا یہ علمیت یہ ادبیت اور یہ شہرت ان کے حق میں سمِ قاتل نہیں بن گئی تھی۔؟

ان کی شاعری کے پرستاروں میں بہت سی خواتین بھی شامل تھیں۔ جانے کتنے خط انہیں روز ملتے تھے۔ عجیب و غریب تاثرات سے معمور خط۔ جو کبھی کبھی ان کے آہنی اعصاب کو بھی جھنجھنا دیتے ان کے محسوسات کو بھی متحرک کر دیتے۔ اور دل و دماغ کی کائنات میں زلزلہ ڈال دیتے۔ لیکن انھوں نے ہنگامی تاثر کے سوا کبھی سنجیدگی سے کسی خط کو نہیں لیا۔ پڑھا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھیں۔ یاد نہ تھا کہ انھوں نے کسی خاتون یا صاحبزادی کو خط کا جواب دیا ہو۔ اپنی صورت، سیرت، شہرت، علمیت اور دولت کا انھیں در پردہ اتنا زبردست احساس تھا کہ وہ اپنی لاپرواہی کو کسی کے لیے بے کلی اور بے تابی بنا کر تسکین محسوس کرتے تھے۔!

وہ انانیت یا نرگسیت ہی تو تھی جس نے انھیں حد درجہ خاموش، سنجیدہ اور کم سخن بنا رکھا تھا! علمیت کے بل بوتے پر شہرت گھر بیٹھے مل رہی تھی ویسے وہ خانہ نشین ہی تھے۔ کالج سے آئے اور اپنی لائبریری میں بند ہو گئے! ملنے والے گھر ہی پر آتے۔ بزمِ سخن یہیں آراستہ ہوتی۔ یہیں داخلے کی اجازت صرف اصحاب ہی کو تھی: صحابیات کا گزر نہ تھا جو اس محفل سے دور تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ بیل منڈھے چڑھ گئی اصحاب

خدا خدا کر کے اتنی بڑی خوشی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اماں بی تو یہی سمجھے بیٹھی تھیں کہ وہ کسی بہو یا پوتے کی شکل دیکھے بغیر جانے کتنی حسرتوں کی گٹھری اٹھائے اس دنیا سے گزر جائیں گی۔ اب تو اپنے پہاڑ سے چاند کو گھر میں دندناتے دیکھ کر فرطِ مسرت سے ان کا دل بھر آتا تھا بلکہ وہ کلیجا کو منہ بھر لیتیں۔

"نگوڑے بجا گر۔ ان کا کہا اتنا تو کم بختوں کو کسی نے سکھایا ہی نہیں۔ یا تجھیں پہاڑ کر رہا دبے ملتے ہیں۔ ان کو تماشا بنا رکھا ہے۔ میرا ہی کلیجہ ہے جو سلگائے رکھیں گے تو بھلا کیا پنپیں گے دنیا میں۔" ان کی زبان پر نرم نازک گالیوں کے ساتھ ساتھ بے اثر کوسنے بھی آنے لگے تھے۔ جگریاں کو پیتے چوسے دانت پیس کر بد دعائیں دیتے سن کر وہ سب بڑے پیار سے ہنستے تھے۔ بڑے سے چھوٹے صاحبزادے خاصے بذلہ سنج تھے۔ وہ تاویل پیش کرتے۔

"اماں ابھی ہم سو دو سو برس کے نہیں ہوئے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ ایک نہ ایک دن بہوئیں بھی آ ہی جائیں گی۔ جب تک وہ نہ آئیں آپ ہرے پیچھے ورنہ پھر چار عدد بلائیں آپ پر اور ہم پر مسلط ہو گئیں تو بچے اپنے کر پھر آپ سکون کی سانس لینے کو ترس جائیں گی!"

جوابات بھی وہ ہوتی ایسی ہی بے تکی: "آں بگڑیں نہ آپا سکینہ کی اشارہ کیے

ایک نہ دو پوری سات بہویں ہیں۔ گھر چھلکا پڑتا ہے۔ چھم چھم کرتی بہویں ننھے کھیلتے بچے۔ وہ نہیں ترس جائیں سکھ کی ایک سانس کو۔ یہ مجھوکر تم اللہ ماروں کو میری خوشی ہی منظور نہیں ہے۔ ارے "ان کے گزرنے کے بعد تمہیں بیچاروں سے آس لگائی تھی کہ ایک روز سارے دکھوں کا بدل ہو جائے گا۔ مگر میں نے اولاد کہاں پیدا کی ہے۔ چار کندھا بندار پیدا کر دیے ہیں۔ ایک دن یونہی مجھے توپ آتا اور پھر کرنا من اللہ قسم کھا جاؤں گی کہ پھر تم کم بختوں کے بیاہ کا تذکرہ بھی زبان پر لاؤں گی اور روز حشر کے دن بخشی نہ جاؤں ؟"

"اماں پلیز۔ رونے کی شرط نہیں ہے" شمعون نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "آپ بھی تو ہیں نہیں۔ بھلا بتایئے تو بڑے بھائی کے یونہی بیٹھے رہنے پر سہرا اپنے سر پر کیسے سہرا لپیٹ لیں۔ کیا کہے گی دنیا کہ تو صاحب بڑا ارمان تھا۔ لے آئے اپنی بیوی اور سب سے بڑے بھائی کو پوچھا بھی نہیں۔ آپ پہلے بھائی صاحب کو راضی کیجئے۔ اصلی ہمالیہ تو وہ ہیں جسے آپ عبور نہیں کر رہی ہیں۔ ہم تو چھوٹے موٹے پہاڑ ہیں۔ بار اکیا۔ آپ ایک چھلانگ میں ہمیں ختم کر لیں گی"

"چھلانگیں ہی لگانے کی تو عمر ہے میری۔۔!" اماں نے برا مانا۔ "مطلب تمہارا یہ ہے کہ پھر ادھر ادھر کی بکواس میں ضروری بات ٹل جائے!"

سب سے آخری جن کی عمر دو تین سال ہضم کرنے کے بعد بھی کسی طرح پچیس سے کم نہ تھی۔ بولے: "بھائی صاحب بیچ تیسری اور آخری جنگ ایک عرصہ تمہارا در ہو جائے۔ میدان ان کے ہاتھ رہے یا آپ کے۔ بس پھر آپ ہی اللہ کرنے کے لیے تیار رہیں۔" دراصل ان کے سامنے شادی کرتے شرم

نہیں اماں۔ بیچ بیچے۔ آخر بات کب روانہ ہوگی۔ سات تو بہیں بج گئے اور بعد نماز مغرب عقد مقرر تھا! ایک سالڑکا کا پوچھا۔

جاؤں۔۔؟" وہ ان کی طرف مڑیں اور گلو گیر لہجے میں پوچھا۔

"خدا حافظ۔۔!"

"توبہ" اماں بی بڑبڑائیں اور زینوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔ باما کا بے تحاشا شور آہستہ آہستہ معدوم ہوتا گیا۔ اب دور دور نزدیک سناٹا تھا۔ بڑا روح فرسا سناٹا۔

شباہت نے کتاب پاس پڑی چھوٹی تپائی پر رکھ دی اور آرام کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹیک کے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار پھر ان کے چہرے پر دکھ کے آثار ابھر آئے۔ لب سوکھنے لگے۔ ادھ سانسوں کے تکلیف وہ زیر و بم سے سینے میں ٹیسیں ہونے لگیں۔

کسی شریف آدمی کے لیے کوئی بیزار ادی غلطی عمر بھر کا ناسور اور ضمیر کا تازیانہ بن جاتی ہے۔

ایک بڑا پردہ پڑا ہوا ہے ان کی شخصیت پر۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک شریف ترین پیشے سے وابستہ ہیں۔ پرنسپل صاحب کی علمی قابلیت اور فضیلت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ وہ تین چار زبانوں پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ وہ علم دوست آدمی ہیں۔ ان کے مقالے ان کی شاعری ایک نئے نہج کی طرف اشارہ کرتے ہیں کتنے بڑے سکالر ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے ہیں۔ مشہور تھا کہ ان کی ذاتی لائبریری کے پائے کی کوئی اور لائبریری کسی اور پروفیسر کے پاس نہ تھی کتنی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی انہیں۔ اپنے ہمعصروں میں انہیں کیسی

رضا یہ بولی تھی کہ آپ جا رہی ہیں نا اسی گھر کی بہو بن کر۔ دیکھ لیجیے گا میں بھی زندہ رہوں۔ ان کی یہ تعریف نہیں کر سکتی!۔

ان دنوں رضیہ نانا بیمار تھی۔ نوشابہ کی شادی میں بھی شرکت نہ کر سکی اور نوشابہ کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ تھی! شادی کا ہنگامہ مچا ہوا تھا دور نزدیک سے مہمان آ رہے تھے شاپنگ جاری تھی۔ لڑکے لڑکیاں گھر کی سجاوٹ میں لگے تھے! اور وہ اپنے کمرے تک محدود تھی!۔

ایک ناشپاں بڑی زوردار آواز کے ساتھ فضا میں پھٹا۔ متعدد رنگین پھول دودھیا چاندنی میں بکھرے اور نشیب میں لڑھکنے لگے! ایک عجیب منظر تھا۔ بارات دلہن کو لے کر واپس آ رہی تھی۔ اور تیسری منزل کے آخری کونے میں لگا لاؤڈ اسپیکر حلق پھاڑ رہا تھا۔ دو ستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات ہے!

لاحول ولا قوۃ حماقت اور جہالت کی بھی کوئی حد ہے؟۔ وجاہت نے بڑی ناگواری سے سوچا، اماں صدیوں پرانی ہیں۔ اس روشن زمانے میں بھی شادی بیاہ کے فضول دھوم دھڑکوں پر جان دیتی ہیں۔ ان کا اشارہ نہ ہوتا تو بھلا کس کی مجال تھی کہ عین ان کی کھڑکی پر لاؤڈ اسپیکر لا لگا دیتا۔ وہ خود بھی کچھ چشم پوشی کر گئے تھے۔! اماں تو نہایت قیمتی لباس میں ملبوس کلائیوں میں ٹھوس سونے کے کنگن اور گلے میں چمپاکلی پہنے انھیں پھولوں کی طرح لیے تو دیتے آ رہی تھیں۔ اور رات انھیں سرِ شام سے دھند گھون

اور بتا رنگ، جیسے مکتی کی تلاش میں گوتم نے برگد کے نیچے ڈیرا جمایا تھا اسی طرح کسی نہ ملنے والی چیز کی تلاش میں انھوں نے خود کو اپنے کمرے میں مقید کر لیا تھا ان کے چہرے پر گہرے تفکر کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں کوئی غم پنہاں تھا۔ اور روزمرہ کے طور طریقوں سے یوں لگتا تھا کہ جیسے ماحول میں موجود تو ہوں مگر خود کو کہیں بڑی دور سمجھ رہے ہوں۔ اماں نے انھیں تنہائی میں آہیں بھرتے اور کبھی کبھی دیر تک راتوں کو ٹہلتے دیکھا تھا۔ ان کا دل ماں کا دل تھا ان کی بیقراری پر وہ سرسری طرح سے بولے تھے۔

'وہم ہے آپ کا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں'

اپنی طرف سے انھوں نے بات ختم کر دی تھی لیکن اماں کو اطمینان نہیں ہوا بے حد کراہیت اور نفرت سے انھوں نے سوچا تھا کہ کالج میں نگوڑ ماری لڑکیاں ملیں تو جھک مار نے جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈوم کی چھچھوندر پسند آ گئی ہو اور بات بن نہ سکی ہو۔ لہٰذا مجذوب سے بولنا بھول گئے ہیں۔ کالج کی لڑکیاں اماں کو کبھی بھی ایک آنکھ بلکہ پھوٹی آنکھ نہ بھائیں۔ نت نئی داستانیں سن سن کر اماں اس طرح بھڑک اٹھی تھیں کہ کالج کی لڑکی کا نام سن کر ان کا دل لگڑوں اچھلنے لگتا!۔ اب جو بہو انھیں مل رہی تھی۔ وہ گریجویٹ تھی۔ سوا اماں کو معلوم ہی نہ تھا کہ گریجویشن کیا بلا ہے۔ وجاہت نے کہا تھا کہ سوزن کاری کی ایک بڑی ڈگری ہوتی ہے۔ اماں نہال ہو گئی تھیں۔ تو بھلا جو لڑکی ہمیشہ سوئی تاگا ہاتھ میں لیے کپڑے پر سر جھکائے دن رات کشیدہ کاری کر کے لیتی ہو اسے دیدے لڑا کر بات کرنے کی فرصت ہی کہاں ہو گی۔ بیچاری ہمیشہ سر جھکائے ہی بیٹھی گی!۔

وجاہت جو مدبر خیال کہاں بھی ڈھیٹ بن کر گھس جاتا تھا اس دن

نوشابہ سے کہہ دیا تھا۔

"آپ نے اگر ہمارے گھر میں اقبال، غالب یا مومن وغیرہ کا نام لیا تو بس کچھ نہیں سمجھا کہ پھر آپ کو میکے کا رستہ نا پنے میں کتنی دیر لگے گی؟ آپ میری بات تو سمجھیں نا؟"

"فضول بکواس مت کیا کرو۔"

"یہ اور بری بات ہے۔" وجاہت نے کہا۔ "بہرحال ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک دفعہ ڈاکٹر اقبال کے تذکرے پر اماں نے بڑا سا منہ بنا کر کہا تھا کہ نجانے کتنے قبرستان آباد کیے ہوں گے۔ پرانے حکیموں کی بات اور تھی آج کل کے موئے ڈاکٹر تو نبض دیکھنا بھی نہیں جانتے!"

"چلو ہٹو۔!"

میں کہتا۔ "آپ بری طرح ہمارے گھرانے میں فٹ ہونا چاہتی ہیں!"

"تم گدھے ہو۔!"

"بس۔ آپ کا دیور ہوں۔ جو کچھ بھی ہوں۔" وہ خاکساری سے ہنسا۔

"وجاہت!۔!"

"فرمائیے!۔"

"کیا سچ مچ۔ بھیا۔!"

"بے پرواہ مت کیجئے۔ میں آپ کو لائبریری لگوا دوں گا۔ کمرہ بند کر کے پڑھ لیا کیجئے اور بتاؤں کہ اماں قصے کہانیوں پر بری طرح جان دیتی ہیں۔ آپ انہیں کوئی سا قصہ جو سبق قسطوں میں چار روز چلے۔ پڑھ کر سنایا کیجئے وہ آپ کو سر پر بٹھا لیں گی!"

نوشابہ نے گہری سانس لی! کیسے نبھے گی جاہل مطلق ساس سے۔ وہ

ہے سچ مچ پریشان تھی۔!

لیکن یہ بات کوئی ڈھکی چھپی تو نہیں کہ میں نے بی۔ اے کیا ہے۔؟"

وہ بولی۔ "آپ لاکھ بار بلا ہے کریں۔ میں نے اماں سے کہا تھا کہ بیٹیوں کی بڑی سند ہے۔" وجاہت نے جواب دیا۔

اسے ہنسی آ گئی۔ "نجانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ میں تو مینربلاش کے ایک کونے پر ننھا سا پھول بھی نہیں کاڑھ سکتی!۔"

"خدا آپ کے حال پر رحم کرے۔" وجاہت نے کہا۔ "ہانڈی بھی بھون سکتی ہیں کہ نہیں!۔"

قورمہ پسندے اور کوفتے مطلب یہ کہ۔!" اس نے گھبرا کے ماتھے پر کا پسینہ پونچھا۔

"بریانی۔؟" وجاہت نے بے حد فراغت سے سوال کیا۔

"کچھ کچھ۔!"

"فکر مت کیجئے۔!" وجاہت نے کہا۔ "اگر آپ باورچی خانے کی ملکہ ہیں تو اماں کے دل کی ملکہ بھی ہیں۔!"

نوشابہ الجھنی ہی رہ گئی اس کی شادی کا دن آ پہونچا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کی سسرال کے لوگ بڑے تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں لیکن وجاہت کی باتیں اسے پریشان کر رہی تھیں۔!

ایک الجھن اور بھی تھی۔ اس کی بچپن کی سہیلی صنوبر کی چھوٹی بہن نے ایک روز اس کے سامنے پرنسپل وجاہت صاحب کی ان گنت برائیاں بیان کی تھیں!۔ انہیں بعیر کی کھال میں بھیڑیا، درندہ، اور جانے کیا کیا تھا۔ پھر نوشابہ پوچھتی ہی رہ گئی تھی کہ وجاہت صاحب نے کیا کیا تھا جو مورد عتاب بن رہے تھے لیکن اس نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا

لیکن نوشینہ کو دہلی کی طرف نہیں جانا چاہیئے تھا وہاں قدم قدم پر خطرہ ہے۔ نواب شاہی غلاموں کے ہر فرد کو چن چن کر مارا جا رہا ہے۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بچوں اور عورتوں کو بھی نہیں بخشا جا رہا ہے۔ لیکن تم کدھر جا نکلی تھیں؟"

"اسلام خاں! میں نے اور اتا بھن نے دہلی میں اپنوں پر جو ظلم دیکھے کیا انہوں نے ہمارے دلوں کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ کیا وفاداری اتنا بڑا جرم ہے۔ اسلام خاں ہمارا خون اتنا ارزاں کیوں ہو گیا۔ ہماری شجاعت کا یہ کیسا انعام ہے۔ ایسا بہیمانہ سلوک....؟ خدا کے لیے مجھے بتاؤ....

"آؤ میرے ساتھ۔ تم اس وقت پریشان بھی ہو غم زدہ بھی اور جذباتی بھی ہو رہی ہو۔ دراصل ایسے ہی موقعوں پر صبر اور ہمت سے کام لینا چاہیے جب تک تم حالات کو سمجھو گی نہیں کوئی قدم کیسے اٹھاؤ گی۔ گھوڑے کو واپس سمت موڑو وہ سپاہی نگر کوٹ کی طرف گئے ہیں ہم راستہ کاٹ کر سامنے چلیں گے۔ اس کے بعد کچھ سوچیں گے!"

شبینہ نے بغیر کچھ کہے گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔ دونوں نے ساتھ ہی ایڑ لگائی:

"رفتار تیز ہی رکھو ہمیں ساٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنا ہے اور ہمارے پاس وقت کم ہے:

"مطمئن رہو میرا گھوڑا یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے کر لے گا:

شام ہوتے ہی اسلام خاں نے ایک مکان میں شبینہ کو ٹھہرا دیا اور خود ... کر چلا گیا۔ شبینہ نے ادھر ادھر گھوم کر مکان کا جائزہ ... یہ خستہ سا مکان تھا۔ (باقی ...)

سوختہ دل

شہناز کنول

شام کا جھٹ پٹا پھیل چکا تھا۔ موسم سرما جا رہا تھا اور خزاں کی آمد آمد تھی۔ بدلتے موسم نے درختوں کو ننگا کر دیا تھا سوکھے ہوئے پتے ہوا سے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ جنگل کی شام نے موسم کی بے کیفی کو اور واضح کر دیا تھا۔ اسی وقت مٹی کے ایک ٹیلے کی آڑ سے ایک مختصر سا قافلہ جنگل میں داخل ہوا۔ یہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ تین گھوڑوں پر یہ چار نفوس سوار تھے ایک گھوڑے پر دو نوجوان اور نوخیز لڑکیاں تھیں ایک پر ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک گھوڑے پر اس خاندان کا بزرگ مرد سوار تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت کے چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار تھے۔ جبکہ بوڑھے کے چہرے پر پریشانی سی تھی۔ البتہ دونوں لڑکیاں جو آگے پیچھے ایک ہی گھوڑے پر سوار تھیں ایک دوسرے سے ہنس بول رہی تھیں۔ ان کا اس طرح بے فکری سے ہنسنا بولنا عورت کو شاید پسند نہیں آ رہا تھا۔ وہ ان پر نظر ڈالتی تو تیوریوں پر بل پڑ جاتے۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ ناگواری سے بولی "نوشینہ۔ اتم اس وقت اپنے گھر کے دیوان خانے میں نہیں ہو، کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ تمہارے باباجان کتنے پریشان ہیں تمہیں خود حالات کی نزاکت کا احساس ہونا چاہیے؟

دونوں کی ہنسی یک لخت رک گئی۔ نوشینہ نام کی لڑکی کے چہرے پر پشیمانی کے آثار تھے۔ نوشینہ کے پیچھے بیٹھی لڑکی نے ایک نظر بوڑھے پر ڈالی اور پھر بولی۔

"بابا جان۔ آپ کیوں اس قدر ہراساں ہیں۔ آپ نے ہم دونوں بہنوں کو جو تعلیم و تربیت دی ہے اس کے بعد آپ کا اس طرح گھبرانا میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"بیٹی شینہ۔" بوڑھا بولا: "بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں امراء اور فوج کے سپاہی یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کس پر کیا ظلم کر رہے ہیں۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے، میں تم تینوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔ تم سب کو کسی محفوظ جگہ پہنچا کر پھر میں ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ یہ کیوں بھول گئے کہ میں اور اکا بہن تلوار بازی میں ماہر ہیں۔ تیغ زنی میں ہمارے نشانوں نے خطا ہونا نہیں سیکھا۔ لڑائی کے داؤں پیچ سے ہم واقف ہیں۔ اگر کوئی ہم تک پہنچا تو ہم بہنوں اس کے لیے کافی ہوں گے۔ چلیے آج آپ سمجھ لیجئے کہ اپنی بیٹیوں کو آپ نے جو جوہر سکھائے ہیں ان کا امتحان ہو رہا ہے۔ ہار جیت تو خدا کے ہاتھ ہے لیکن مقابلے میں آپ ہم دونوں کو کمزور نہ پائیں گے۔"

"شاباش بیٹی۔" بوڑھے کے چہرے پر رونق آ گئی، "مجھے تو تم دونوں پر فخر ہونا چاہیے۔ تم دونوں کی ذہانت، شجاعت اور بلند ہمتی نے مجھے کبھی بیٹے کی کمی نہیں محسوس ہونے دی مگر میری آنکھوں کے نور تم دو ہو کم عمر ہو میں بوڑھا ہوں اگر چالیس پچاس سپاہی آ گئے تب... بوڑھا کچھ [illegible]

"نوشینہ کہاں ہے۔" اسلام خاں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے لہجے کی بے قراری اور اضطراب شینہ سے چھپا نہ رہا۔

"کہاں ہے وہ بولتی کیوں نہیں۔"

"اکا بہن۔" اسے بہن کے الوداعی الفاظ یاد آ گئے اس نے افسردگی سے اسلام خاں کو دیکھا اور بولی "وہ دہلی واپس چلی گئیں۔ ہمارے دل زخموں سے چور ہیں اسلام خاں، ہماری آنکھوں سے دل کا لہو آنسو بن کر بہہ نکلنا چاہتا ہے۔ ہمارا وجود کسی بھٹی کی طرح دہک رہا ہے۔ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے وہ دیکھا ہے اسلام خاں جو کوئی اولاد نہیں دیکھ سکتی۔ میرے ماں باپ۔۔۔۔"

"میں جانتا ہوں۔۔۔۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہے اسی لیے میں تم دونوں کا یہاں منتظر تھا۔"

شینہ نے اس کے فوجی لباس کو غور سے دیکھا اور بولی "تم شاید دوسری بار آنے والے سپاہیوں میں تھے۔ تم نے بھی میرے باباجان کو نہ بچایا۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی "میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکوں گی کبھی نہیں۔"

اسلام خاں نے اس کا سر تھپتھپایا اور بولا: "اس وقت میں بھی مجبور تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ تم دونوں کہیں آس پاس ہی ہو، میں اتنا کر سکتا تھا کہ ان سپاہیوں کو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہٹا دوں۔"

"لیکن تم یہاں تنہا کیسے ہو؟ تمہارے ساتھی؟"

"میں نے ان کو راستے کی نگرانی کے لیے اپنے ماتحت دو سپاہی روک کر باقی کو لشکر کی طرف بھیجا۔ اور وہاں دو بار اگر میں نے کسی طرف پلٹ لیا

"نہیں بابا جان ٹاپوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ سوار زیادہ نہیں ہیں ہم مقابلہ ہی کیوں نہ کریں: نوشینہ نے خود کو چست کرتے ہوئے کہا اور اسی وقت ناشینہ گھوڑے سے کود کر سوکھی جھاڑیوں میں دوڑتی چلی گئی۔

نوشینہ نے حیرت سے ادھر دیکھا مگر خاموش رہی آواز دے کر وہ اسے مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتی تھی۔ گھوڑے قریب آچکے تھے انھوں نے دیکھا وہ چار سوار تھے۔ بادشاہ کی خصوصی سپاہ کے نوجوان۔ بوڑھے کے ساتھ دو عورتوں کو دیکھ کر وہ رُک گئے ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

ایک بولا بہت خوب! بھاگنے کو تیار کھڑے ہو مگر ہمارے آقا کی نظر سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ دوسرا جوان قہقہہ مار کر بولا: انھیں دنیا سے بھگانے کا حکم تو مل ہی چکا ہے۔ آؤ ہم ان کی مدد کریں۔

پھر تیسرا سپاہی کے چہرے پر کرختگی کے ساتھ سنجیدگی بھی تھی وہ تنبیہہ کے لہجہ میں بولا: تمہارا تعلق بھی فیروز شاہی غلاموں کے اس گروہ سے ہے جو غداری کا مرتکب ہوا۔ جب تم ہمارے آقائے جہاں ظل سبحانی ناصر الدین محمد تغلق سے دغا کر رہے تھے اس وقت یہ سوچا کیوں نہیں کہ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔؟

"دانا سپاہی۔! تیری بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ بوڑھا بولا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتا کہ آج تو ناصر الدین محمد کا وفادار ہے لیکن فرض کر کہ کل ہی کوئی اور شخص اس تخت و تاج کا مالک بن جائے تب تو اس کی نظر میں مشکوک، دغا باز اور بے وفا نہیں کہلائے گا؟ بلکہ اپنی جگہ یہ سمجھ [illegible] اپنے مالک کا وفادار ہے۔ بس یہی [illegible]

[illegible]

"اچھی طرح۔ نوشینہ نے گردن جھکالی۔

"تمہارے چہرے کی معصومیت شاید۔ مجھ سے پناہ کی طالب ہے کیا میرا گمان درست ہے؟"

"نہیں۔؟

"تب پھر..."

"ٹھہریے۔ نوشینہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ میں آپ سے ایک سودا کرنے آئی ہوں۔"

"اچھا۔! عورت زور سے ہنسی۔ مجھے فیضی بیگم کہتے ہیں اور آج تک کسی ننھی منی بچی نے میرے ساتھ سودا کرنے کی ہمت نہیں کی تھی بولی بھی ہم ہی لگاتے ہیں اور سودا بھی ہم ہی کرتے ہیں۔

کیا آپ کے نزدیک یہ بات اہم نہیں کہ ایک نوخیز لڑکی آپ سے خود سودے کی بات کر رہی ہے؟"

"حسن و جوانی کے علاوہ اور کوئی خاص بات۔؟

"یہی کچھ لیجیے۔ نوشینہ نے فیضی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو پھر ٹھہرو۔ ہم اطمینان سے بات کریں گے۔ تمہارے چہرے پر تھکن کے آثار ہیں شاید رات بھر سوئی نہیں ہو۔ نہا دھو کر کچھ دیر آرام کرنا پسند کرو گی: نوشینہ نے اقرار میں گردن ہلائی تو فیضی بیگم نے تالی بجا کر ملازمہ کو طلب کیا اور اسے مختلف ہدایات دیں۔ وہ نوشینہ کو ساتھ لے کر چلی گئی فیضی بیگم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

[illegible]

نوشینہ ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لڑکھڑا کر پھر بیٹھ گئی۔

آئیے۔ خادمہ نے اپنا ہاتھ پیش کیا۔

نوشینہ نے شکرگزار نظروں سے اسے دیکھا اور اس کے سہارے آگے بڑھی۔ اسے کل رات کے سارے واقعات یاد آچکے تھے۔ سب ملازم بارات کی طرح اس کے ساتھ تھے اور معنی خیز انداز سے اسے دیکھ رہے تھے۔

مختلف غلام گردشوں، دالانوں، پیچ دار دروں سے ہوتی ہوئی وہ ایک کمرے میں پہنچی۔ چاندی کے پایوں اور بیل بوٹوں والا آبنوس کا چھپرکھٹ ریشمی جھالر دار چھت گیری سے سجا ہوا تھا۔ اس پر ایک لحیم شحیم باوقار عورت نیم دراز تھی۔ نوشینہ کو دیکھا تو چونک سی گئی اتنی حسین اتنی نازک لڑکی۔ وہ خود سے بولی پھر سر سے پیر تک اس کا معائنہ کرتی رہی۔ نوشینہ خاموش کھڑی تھی۔ خادمہ جا چکی تھی۔

کہاں سے آئی ہو۔؟ سوال ہوا۔

میں یہیں کی رہنے والی ہوں، نوشینہ نے کہا۔

ہمارے گھر کا پتہ کس نے بتایا۔؟

قسمت اور حالات نے۔ نوشینہ آہستہ سے بولی۔

دیکھو اتنے پتہ۔ عورت کی بے چین نگاہوں نے جواب مانگا۔

ان گلیوں میں کسی کے خاندان اور گھر سے کیا مطلب؟

ہوں۔ عورت نے اطمینان کا سانس لیا گویا تم جانتی ہو کہ تم اس وقت کہاں ہو۔

اچانک ایک سپاہی آگے بڑھا اور عورت کی چادر کا پلہ کھینچ کر بولا "اے بوڑھی نیچے اتر، تیرا شوہر اپنی باتوں میں لگا کر ہمیں بہلانا چاہتا ہے۔ چادر کے جھٹکے سے عورت لڑھک کر گھوڑے سے زمین پر آرہی اور اسی کے ساتھ نوشینہ نے اپنی چادر میں سے چھوٹی سی تلوار کھینچی اور تیزی سے گھوڑا آگے بڑھایا۔ لیکن اس سے پہلے سپاہی عورت پر وار کر چکا تھا، نوشینہ نے ایک لمحہ کو ماں کے سینہ سے ابلتے خون کو دیکھا اور پھر مارے طیش کے وہ زور سے چیخی "کمینے۔ جس سینے سے ممتا کے سوتے ابلتے ہیں تو نے اپنی ناپاک تلوار سے اسے خون میں نہلایا ہے، لے ایک ماں کے خون کی قیمت لیتا جا، دوسرے لمحے اس کا بھرپور وار سپاہی کی گردن پر پڑا اور سپاہی کا سر دھڑ سے الگ ہو کر اچھل کر دور جا گرا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ بقیہ تینوں سپاہی بھونچکے سے رہ گئے۔ ایک کمسن لڑکی کا یہ باہرانہ وار انہیں ششدر کر گیا۔ نوشینہ اب ادھیڑ عمر سپاہی کی طرف دیکھ کر مسکرائی "نامرادین محمد کے دغا داد آگے بڑھ کہ اس غلام زادی کے دل میں تو نے وہ آگ بھڑکائی ہے جو تیرے جیسے دغا داروں کے خون ہی سے بجھے گی۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھی دونوں جوان سپاہیوں نے نوشینہ کے باپ کو گھیر لیا۔ بوڑھا مقابلے کے لیے تیار ہوا اس نے ایک جوان کے وار کو تلوار پر روکا دوسرے کی تلوار اس کے شانے پر پڑی وہ ذرا لڑکھڑا کر گھوما اور اس پر تلوار سے وار کیا۔ سپاہی پر جھپٹا سا جا رہا تھا کیونکہ اسی وقت پہلے سپاہی کی تلوار نے اس کے پیٹ کو زخمی کیا۔ بوڑھے نے تیزی سے آگے کو جھک کر سنبھالا لیا پیٹ سے بہنے والے خون نے گھوڑے کی پشت سرخ کر دی تھی وہ اوپر اٹھا اسی وقت جھاڑیوں سے ایک خنجر

زرناتا ہوا آیا اور ایک سپاہی کی گردن میں پیوست ہو گیا اس کا اٹھا
ہوا ہاتھ کانپ گیا وہ چکرا کر زمین پر گرا اور اسی کے ساتھ شینہ جھاڑی
سے نکل کر شیرنی کی طرح دوسرے سپاہی پر ٹوٹ پڑی اس نے پیروں
سے الجھا کر اسے زمین پر گرا دیا اور پھر قریب پڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر
دے مارا۔ پھر وہ تیزی سے بہن کی طرف بڑھی جو ادھیڑ عمر کے پختہ کار سپاہی
سے لڑنے میں مصروف تھی شینہ جیسے ہی آگے بڑھی نوشینہ نے اشارے
سے روکا۔ بوڑھے کی توجہ ہٹی اور نوشینہ کی تلوار نے اس کے سینہ میں
شگاف ڈال دیا اور پھر وہ زمین پر پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا اس
کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اور نوشینہ اپنے باپ پر جھکی ہوئی تھی۔ شینہ
نے اپنی ماں کے بے جان جسم پر ایک افسردہ سی نگاہ ڈالی اور باپ
کے قریب آ گئی جو رک رک کر سانسیں لے رہا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر اٹک
اٹک کر بولا: تم دونوں نے ہماری تعلیم و تربیت کا حق ادا کر دیا... اب
... اب تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ... کسی خطرے کے آنے سے پہلے کسی محفوظ
جگہ پہنچنے کی کوشش کرو... جاؤ دیر... مت کرو...

"مگر آپ... شینہ نے ان کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا، زخمی ہیں۔

"میری پرواہ مت کرو، میں... چند گھڑی کا مہمان ہوں... جاؤ بیٹی۔
نوشینہ لے جاؤ اسے میں گھوڑوں کی ٹاپیں پھر سن رہا ہوں... جاؤ تمہیں
اپنی ماں کے... دودھ کی قسم... جاؤ تم اپنی ماں سے کیا وعدہ بھول
گئیں ہو...

اسی وقت پھر ٹاپیں ابھریں۔ بوڑھے نے کمزوری اور بڑھتے ضعف
کی بنا پر زبان سے کچھ کہہ کر شینہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں آنسوؤں

اب وہ بے خبر سو رہی تھی اس کے گرد و پیش کیا ہو رہا تھا اسے کچھ پتہ
نہیں تھا۔

دن نکلتے ہی زندگی جاگ پڑی۔ حویلی میں ابھی چہل پہل شروع ہو
چکی تھی

"ارے ـ یہ کون ہے؟ باہر کے ملازم نے حیرت سے کرسی پر گٹھری سی
بنی نوشینہ کو دیکھ کر کہا۔

"کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہاں کب آئی کیسے آئی اور کیسی
بے خبر سو رہی ہے۔ میں تو دروازے ہی پر بیٹھا تھا۔ میں نے تو اندر آتے
دیکھا نہیں:

"پردیسی ہے شاید سر اور پیر دھول سے اٹے ہیں:

"بیگم کو اطلاع کرو۔ پہلا ملازم بولا اور دوسرا فوراً اندر دوڑ گیا
کچھ دیر بعد ملازم کے ساتھ ایک خادمہ باہر آئی اور غور سے نوشینہ
کو دیکھا اس کے ہاتھ پیروں پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ لباس
شکن آلود تھا چہرے پر معصومیت اور تھکن کا ملا جلا تاثر تھا۔ خادمہ
نے آہستہ سے اس کا شانہ ہلایا۔ نوشینہ صرف کسمسا کر رہ گئی۔

"اٹھیے خاتون۔ آپ کو بیگم بلوا رہی ہیں" ایک اجنبی آواز سن کر
نوشینہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور نیند بھری آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا
اس کا سارا جسم اکڑ رہا تھا چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے تھے۔

"آپ کو بیگم نے یاد فرمایا ہے" وہی خادمہ بولی۔

"کون بیگم ـ؟

"اس حویلی کی مالکن۔ خادمہ مسکرائی۔

صبح صادق کا اجالا ابھی پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ گلی کوچوں میں خاصا اندھیرا ہی تھا، نیفی بیگم کی حویلی کے بڑے سے آہنی گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ایک ملازم بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اسی وقت شبینہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ تھکن سے چور آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور چھپاؤں اندر داخل ہو گئی۔ طویل برآمدہ نیم دائرے میں پھیلا ہوا تھا۔ وہاں پر پڑے بڑے موڑھوں میں سے ایک پر نوشینہ گر گئی۔ کچھ دیر بے سدھ پڑی رہی۔ اس کی ٹانگیں ہنچ رہی تھیں اور پیروں کے چھالوں نے پھوٹ [illegible] شروع کر دیا تھا۔ اس کے جسم کا ہر جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے [illegible] آنکھیں کھولیں اور مکان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ طویل و عریض حویلی میں امرا اور منصب داروں کے مکانوں والی روایتی سجاوٹ موجود تھی لیکن انداز بدلا ہوا تھا۔ منقش چھت پر رنگین پچی کاری سے گلکاری کی گئی تھی۔ اس نے آسمان پر نظریں جما دیں۔ نکلتے سورج نے آسمان کو سرخی مائل کر دیا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی ماں کے سینے سے بہنے والا خون سارے آسمان پر پھیل گیا ہے۔ درد سے اس کا دل بھاری ہو گیا... بابا جان میں دشمن کو خون کے آنسو رلاؤں گی۔ اس نے میری ماں کو زخمی کیا ہے میں اس کی روح کو زخمی کروں گی... میں اپنی مہربان ماں کے سینے سے ابلتے خون کا بدلہ لوں گی... میں سب سے بدلہ لوں گی... وہ خود کلامی کے انداز میں آسمان سے مخاطب رہی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا نے اس کے تھکے ہوئے نیم جان جسم پر نیند کا غلبہ طاری کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ رات بھر کا پیدل سفر، دشمن کا خوف، اغواء کا احساس ان ساری باتوں سے اس کا جسم اور ذہن تھک چکا تھا۔

سے بھیگ رہی تھیں۔ بوڑھے نے التجا کے انداز میں اپنے ہاتھ جوڑ دیے نوشینہ، شبینہ کا ہاتھ پکڑ کر جھاڑیوں میں گھستی چلی گئی۔ پانچ سات منٹ بعد ہی دس بارہ سپاہی گھوڑوں پر سوار وہاں آ چکے تھے۔ انھوں نے حیرت سے اپنے چار ساتھیوں کی لاشوں کو دیکھا اور پھر عورت کی لاش کے قریب آ کر ایک بولا۔ "اس ایک نے ان سب کو مارا ہے کیا؟"

"بے مغز نوجوان ادھر دیکھ۔" دوسرا بولا جو بوڑھے کے پاس بیٹھا اسے ہلا جلا رہا تھا۔ دو تین اس طرف تیزی سے بڑھے، ان میں سے ایک نوجوان کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا اور گزر گیا۔ اس نے تجسسانہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور بوڑھے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھا زخموں سے چور بے ہوش ہو چکا تھا۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر عورت کے جسم کو سیدھا کیا۔ عورت کے چہرے پر ممتا کی پرچھائیاں جم گئی تھیں۔ جیسے مرنے سے قبل اس نے اپنی اولاد پر محبت کی الوداعی نظر ڈالی ہو۔ نوجوان نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے۔ پھر واپس پلٹا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔

"یہاں جو کھیل ہونا تھا ہو چکا، ہمیں فوراً آگے بڑھنا چاہیے ابھی بہت سفر باقی ہے۔"

"ان دونوں بوڑھوں نے چار کا خاتمہ کیسے کر دیا۔" پہلے سپاہی کی حیرت برقرار تھی۔

"تیرا صرف جسم ہی نشوونما پا سکا ہے۔ تو کسی بات پر غور کرنے کا عادی کیوں نہیں ہے۔ شاید اسی لیے کہ عقل پروان چڑھی ہی نہیں ہے۔ ایک معمولی سی بات کو گورکھ دھندہ بنا دیتا ہے۔" ایک بوڑھے سپاہی نے تنبیہی انداز میں کہا۔

سوال کرنے والے نے نفرت سے اسے دیکھا اور بولا : بڑے احمق ہو۔ عہدے
میں میرے برابر ہی ہے۔ مجھے سبق مت پڑھا۔ اور یہ بھی یاد رکھ کہ ایک سپاہی
کو مضبوط بدن ہی طاقت دیتا ہے عقل نہیں، تو بہت عقل مند ہے مگر آج تک
ایک معمولی سپاہی ہے۔ اور میں۔ اپنی مضبوطی اور بہادری سے ایک دن
بادشاہ کی سپاہ میں کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچ جاؤں گا۔ اور تجھے آج کی اس
بدکلامی کا جواب اس دن دینا پڑے گا۔

"کیا ہم یہاں آپس میں لڑنے کے لیے آئے ہیں۔ ؟ یہ دونوں کسی قافلے
کے ساتھ ہوں گے۔ یہاں ہمارے ساتھیوں سے مقابلہ ہوا ہوگا۔ ہمارے
سپاہیوں کو مار کر ان دو بوڑھوں کو مردہ سمجھ کر قافلہ آگے چلا گیا ہوگا۔
ہمیں جلدی ان تک پہونچنا چاہیے۔"

"بوڑھا زندہ ہے۔ ایک بولا۔

"اسے چھوڑ دو وہ اتنا زخمی ہے کہ خود ہی مر جائے گا۔ بوڑھے پر ہمدرد
نظر ڈالنے والے نوجوان نے سختی سے کہا۔

تبھی ان میں سے ایک سپاہی آگے بڑھا اور اپنی تلوار بوڑھے کی گردن
پر رکھ کر بولا "ہم حکم کی تعمیل کے لیے نکلے ہیں۔ یہ کہہ کر تلوار کا وار کیا اور بوڑھے
کا حلقوم کٹ گیا تازہ خون سے زمین سرخ ہو گئی۔ بوڑھے کا جسم پھڑپھڑا
کر ساکت ہو گیا۔ نوجوان نے تاسف اور رحم سے بوڑھے کو دیکھا اور آہستہ
سے بولا "آہ تم نے بہت جلدی کی۔۔۔

پھر سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور آگے بڑھے نوجوان کے بے چین اور
مضطرب چہرے پر کسی نے غور نہیں کیا۔

گھوڑوں کی ٹاپیں جب ختم ہو گئیں تو شیبہ اور نوشینہ آہستہ آہستہ

جھاڑیوں میں سے باہر نکلیں۔ نوشینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور شیبہ کا
چہرہ جوش انتقام سے سرخ ہو رہا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ان
دونوں نے اپنی ماں اور باپ کو جھاڑیوں میں لٹا کر اوپر سے گھاس پھوس
اور گھاس ڈال کر ان کی پردہ پوشی کر دی۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے
کو دیکھا۔ دونوں ہی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اب ہمیں فوراً آگے بڑھنا چاہیے: شیبہ نے آہستہ سے کہا۔

نہیں۔ نوشینہ بولی میں واپس دہلی جاؤں گی۔ میرا مجرم دہلی ہے
اور ہم اب صرف انتقام کے لیے زندہ رہیں گے۔ تم آگے جاؤ ہمیں اپنا
ہر پہلو مضبوط رکھنا ہے۔ لیکن ہمارا مقصد ایک ہی ہوگا خواہ راستے الگ
ہوں۔ اگر کسی موڑ پر ہیں نظر آؤں تو دیکھ کر چونکنا مت چاہے کسی
انداز پر ملوں۔ ہم ایک خاص وقت کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ شیبہ اپنے
ماں باپ کا یہ آخری وقت کبھی مت بھلانا۔ جاؤ خدا حافظ و ناصر۔"
نوشینہ نے جھاڑی میں سے گھوڑا نکالا اور بہن کی طرف اشارہ کیا: "تمھارا
تمھارا سفر لمبا ہے۔" "اتنا ہی تم۔"

یہاں سے دہلی کا سفر لمبا نہیں ہے میں رات گزرنے سے پہلے پہنچ جاؤں گی
شیبہ نے ایک مردہ سپاہی کا لباس اتار کر پہنا اور اپنی اس کی چادر
سے سر اور چہرہ چھپا کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ ایک الوداعی نظر بہن
پر ڈالی۔ نوشینہ اس کے قریب آئی اس کی کمر پر ہاتھ رکھا۔ وہ جھکی
تو اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بولی۔ اگر کبھی اسلام خاں ملے تو کہنا
کہ نوشینہ کو بھول جائے اس نے اپنے لیے کسی اور منزل کا انتخاب
کر لیا ہے۔

نسیم انہونوی
Rs. 12/- only

ٹیلیفون نمبر آفس: ۴۴۵۵۰۰ اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپکی سالانہ قیمت اس حریم تک ختم ہوگی ٹیلیفون نمبر رہائش: ۴۴۳۲۰۴

گذشتہ ۵۳ سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خواتین کا ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم اتہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم اتہونوی مرحوم

جلد (۵۳) فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۸۲ء نمبر (۸)

ایڈیٹر و نگراں نسیم اتہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم عزالہ ——— جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری	"	تیئیس روپیہ

وی۔ پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ ... پیسے

سرِ ممالک کے

پچھتر روپیہ ... اس کے مساوی [illegible] اور ہوائی میل سے [illegible]

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہوجائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔

• حریم ہر انگریزی ۵ ربر کو قطعی روانہ کردیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۱۰ ر کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۰ ر کے بعد شکایت کریں۔ ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں [illegible]

ترسیل زر کا پتہ: دفتر حریم [illegible] لکھنؤ

نسیم اتہونوی پرنٹر و پبلشر نے [illegible] لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم [illegible] سے شائع کیا

لکھنؤ
حلاوتوں لطافتوں اور نزاکتوں کا شہر ہے اور
اور اس شہر نگاراں میں بخشی کمپنی کی محافظ صحت ادویات
حسن افزا مصنوعات آپ کو باآسانی حاصل ہوسکتی ہیں۔
قلب شہر کے علاوہ اترپردیش کے مرکزی شہروں
میں بھی بخشی کے اسٹاکسٹ موجود ہیں۔
اپنے قریبی بخشی اسٹاکسٹوں سے
اپنا پسندیدہ سرمہ نورنظر۔ سندری سہاگ تیل
اور
اکسیر اعظم ڈراپس وغیرہ
آسانی سے حاصل فرمائیں
ایس اے بی بخشی کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۴۵ کلکتہ ۴۳
اسٹاکسٹس:
لکھنؤ۔ ۱۔ اشتیاق حسین پرفیومرس
نائم علی صدیقی

مجھے افسوس ہے کہ اپنی خرابی صحت کے باعث اس ماہ پھر میں لمعات نہ لکھ سکا۔ اس لئے اس کمی کو پروفیسر ہارون رشید تبسم صاحب کے ایک مضمون سے پورا کر رہا ہوں۔ جس کا عنوان ہے

"اقبال کی شاعری نے عورت کو تقدس عطا کیا"

اس میں علامہ سر اقبال کے مختلف خیالات کے ایسے اشعار کو پیش کیا گیا ہے جو عورت کی عظمت ہی کے مظہر نہیں بلکہ عورت کے راز ہائے سربستہ کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ عورت کی آزادی تعلیم اور دوسرے مباحث پر بھی اس مضمون سے روشنی پڑتی ہے۔

شاعرانہ کلام میں صنفِ نازک کا ذکر عام ہے۔ لیکن متعدد شعرا نے عورت کو وہ مقام نہیں دیا۔ جس کی وہ مستحق ہے۔ اردو اور فارسی شعرا کی ایک بڑی تعداد نے عورت کو محبوبہ یا بازاری عورت کے روپ میں پیش کیا۔ صنفِ لطیف کے بارے میں ان کے تخیل کی پرواز گلشن لب و رخسار، چشم نرگس، گیسوئے سنبل کے حسن و بیان اور عشق و محبت کی رنگین داستان تک محدود تھی۔ علامہ اقبال نے مولانا الطاف حسین حالی کی طرح عورت کی حیثیت کو نہ صرف پہچانا بلکہ اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے کچھ حقوق بھی متعین کئے ہیں۔

ہر عظیم آدمی نے ایک ماں کی گود میں پرورش پائی۔ ماں ایک عورت ہے۔ عورت وہ چھتنار درخت ہے۔ جس کے سائے تلے قومیں بنتی ہیں۔ آج میرا قلم اسی چھتنار درخت کی حقیقت کو اقبال کی عظیم سوچوں کی روشنی میں بیان کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ جنت حوا جب سے بنی آدم کی ہمراہی کرتی آ رہی ہے تب سے بنی آدم کی زبان اور اس کا قلم۔ اس کا فن عورت کی اداؤں کو کچھ رنگ دیتا رہا ہے۔ یہ بحث آج تک جاری رہا کہ عورت کیا ہے؟ اسی سوچ کے تحت اقبال نے کہا کہ ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

لیکن اقبال کی حکمت نے مسئلۂ زن کو مسئلۂ زن نہیں رہنے دیا۔ انھوں نے اس کی بے رنگ زندگی کو کائنات کا حسن قرار دیا کہ ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اقبال ماں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہر فرد کی ہر خوبی کا ذمہ دار ماں کو قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی کامرانیوں کو اپنی ماں کا مرہونِ منت سمجھتے ہوئے اپنی نظم والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھتے ہیں ؎

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

ان کی شوخیِ گفتار جب زور دکے سمندر میں ہچکولے کھاتی ہے تو ممتا کی عظیم چھاؤں کے چھن جانے پر گویا ہوتی ہے ؎

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

جب ہارڈی نے کہا "عورت ایک خوفناک اژدھا ہے۔ ایک ایسا شیطانی سحر ہے۔ جس کے اثر سے محفوظ رہنا مشکل ہے" تو اقبال نے فرمایا ؎

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی

عاصم بن عشق نے کہا "عورت مکر و فریب کی حامی ہے اور فتنہ و فساد کی محرک ہے" ؎

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات!
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود!!

حیا

• حیا کی غایت یہ ہے کہ انسان خود سے بھی حیا کرے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضہ

افلاطون کا فلسفہ عورت کے وجود سے اجتناب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے مرد بنایا عورت نہیں۔" اقبال کی سوچ افلاطون کی اس سوچ کی نفی کرتی ہے۔

مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطون

کسی نے فرانس کے مرد آہن آنجہانی چارلس ڈیگال سے پوچھا کہ خواتین کے لئے علیحدہ وزارت قائم کرنے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ اس نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا "عورت کو کڑھائی کے شعبہ میں افسر مقرر کیا جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" مشہور جرمن فلسفی شوپنہار کہتا ہے۔

"عورت انصاف نہیں کر سکتی اُسے عدالت میں گواہی دینے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" اقبال یورپ کے ان ناخداؤں کی حکمت سے سوال کرتے ہیں ؎

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش

عورت انصاف پسند ہے وہ آزادیٔ نسواں کا نعرہ لگاتی ہے یہ آزادی کیا ہے۔؟ عورت کس قسم کی آزادی چاہتی ہے۔ کیا مغربی تہذیب کے سازوں پر رقص کرنے کا نام آزادی ہے یہ آزادیٔ نسوانیت کے نام پہ دھبہ ہے۔

اقبال نے بھی کہا ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

آزادیٔ نسواں کیا ہے؟ یہ زنداں سے رہائی ہے جسے جدید تہذیب نے خود ساختہ اصولوں کے زنداں میں قید رکھی ہے۔ [illegible] اور اس کی پہچان دھندلکوں میں کھو گئی ہے وہ انسان کی خالق ہوتے ہوئے بھی انسانیت کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔ جبکہ عورت خود مجسم انسانیت ہے۔ اس کی معصومیت میدانِ کارزار کی ہنگامہ خیزیوں کا ساتھ دے سکتی ہے۔ اس کا تبسم شہادت کی موت کو گلے لگا کر فاطمہ بنتِ عبداللہ کی صورت میں ابدی بھی ہو جاتا ہے۔ اقبال اُسے یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

اقبال کی سوچ صنفِ نازک کی اسی آزادی کی قائل نظر آتی ہے۔ جو اُسے فاطمہ کا وقار عطا کرے۔ نہ کہ شاہراہوں پر بھٹکتا ہوا اشتہارِ حسن بنادے۔ علامہ آزادی نسواں کی حقیقت بیان کرتے ہوئے یہ فیصلہ عورت پر چھوڑتے ہیں کہ وہ کس قسم کی آزادی پسند کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

علم کے خزانے کے در سب کے لئے وا ہیں۔ خواہ عورت ہو یا مرد علم کے بغیر ہر شخص اُس پھول کی مانند ہے جو مہک سے عاری ہو۔ علامہ اس حقیقت کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں ؎

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

عورت نازک کلی کی مانند ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے مضبوط و مقدس حصار کی ضرورت ہوتی ہے چاہے وہ چراغ خانہ ہو یا میدانِ عمل کی مجاہدہ اُسے اک محافظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبال اشعار کی زبان میں یوں کہتے ہیں ؎

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبال ایک شفیق اور حساس شوہر تھے انھوں نے کسی رفیق سے ذکر کیا کہ وہ جاوید کی والدہ کی وفات کے بعد خود کو بہت تنہا محسوس کرتے رہے۔ معاشرے اور سماج کے عام شب و روز میں بھی ان کی سوچ، عورت کو بلند مقام دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے عورت کے وقار کی حفاظت کی ہے۔ اس کی مظلومیت پر آنسو بہائے ہیں۔

ـــہ اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

ـــہ میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

معذرت

افسوس کہ شہناز کنول سلطانہ نے اپنے تاریخی افسانے "سوختہ دل" کی قسط اس ماہ نہیں روانہ کی، اس لئے اس سلسلہ کا جز و شامل حریم نہ ہوسکا انشاء اللہ تعالٰی ستمبر کے حریم میں اس کی دوسری قسط شائع کردی جائیگی۔

ادارہ

اشاعت میں تاخیر

بجلی کے فقدان کے باعث جون اور جولائی کے حریم ۲ رتاریخ کے بجائے ۱۲ر اور ۱۱ر کو شائع ہوئے تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ پرچہ بھی بروقت شائع ہوسکے گا یا نہیں۔ پریس کی مشکلات روز بروز بڑھتی جارہی ہیں، جس سے رسالے اور کتب دونوں کی اشاعت میں دشواری ہوتی ہے۔ حریم کا خسارہ نسیم بکڈپو سے پورا کیا جاتا تھا، لیکن جب کتابیں ہی نہ چھپیں گی تو بکڈپو بھی خسارے سے چلے گا۔

بشریٰ رحمٰن کا ناول

چارہ گر

(۲۹/-)

وہ ناول جس سے مصنفہ مشہور ہوئیں

محترمہ ماجدہ نازلی کا شاہکار ناول

انتظارِ سحر

پندرہ سال بعد نیا ایڈیشن ۲۴/-

ملکۂ اسرار اگاتھا کرسٹی کے ناول

دوسرے بھی جاسوسی ناولوں سے مختلف ہوتے ہیں اسی لئے اس کے جاسوسی ناول ساری دنیا کی خواتین بھی شوق سے پڑھتی ہیں

نسیم بک ڈپو پیش کرتا ہے ایک ایسا جاسوسی ناول جو نہ صرف اسرار و معمہ سے پر ہے بلکہ بے حد صاف ستھرا و معیاری ہے اور رومان و جذبات سے لبریز بھی دنیا کی سب سے زیادہ بکنے و ترجمہ ہونے والی مصنفہ اگاتھا کرسٹی کا ایک شاہکار ناول

کمند ہوا

"ملزمہ کیتھرین کارلز، تم پر الزام ہے کہ تم نے ۲۷ رجولائی کی شام میری گیرارڈ کو قتل کیا۔ کیا تمہیں اپنے جرم کا اعتراف ہے؟"

کیتھرین کارلز عدالت کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اداس و حسین تھا۔ بال کالے اور آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اس کی خوبصورت جسمانی ساخت پر ایک فراک پردہ پڑا تھا۔

خوبصورت و جوان کیتھرین پر الزام ہے کہ اس نے اپنی بے پناہ حسین رقیبہ کا قتل کیا ہے۔ ہر ثبوت ہر گواہ اس کے جرم کا شاہد ہے۔ اس کے محبوب کو بھی اس کی بے گناہی کا پورا یقین نہیں ہے لیکن

ایک اجنبی ڈاکٹر جو کیتھرین کی بے گناہی بلکہ بعد ازاں دونوں کا قائل ہوگیا ہے مشہور جاسوس ہرکیول پائرٹ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اصلی مجرم کا پتہ لگائے۔ بہت سے رقابتی، حسد و اسرار کی کہانی پہلی قسط ۲۲ رجون کے سنگم میں شائع ہورہی ہے۔ آج ہی خریدار بن کر یہ لاجواب ناول پڑھیں۔ سنگم کا سالانہ چندہ صرف -/۱۰ ہے۔

جمیلہ محمد صدیقی [illegible] (ایم اے، بی ایڈ)

اسلامی معاشرہ

حضرت کی تعلیمات ہی پر استوار ہو سکتا ہے

کون نہیں جانتا کہ ہمارے رسول کریم کی بعثت کے وقت دنیا کا معاشرہ بگڑا ہوا تھا مگر آپ نے لوگوں کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراط مستقیم عطا ہوئی ——— انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک زریں باب کھلا۔ آپ نے لوگوں کو غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے سے روکا۔ مقام ذلت سے اٹھا کر عزت و شرف کی معراج پر پہنچا دیا۔ دنیا کو ایک مکمل ترین ضابطۂ حیات آپ نے عطا کیا آداب معاشرت سے آگاہ فرمایا۔ اقتصادی، معاشی اور تہذیب و اخلاق کے اصولوں سے روشناس کرایا۔

تمام بنی نوع انسان کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ اور ایک ایسے بہترین انسانی معاشرے کی تشکیل کی کہ آج تک نسل انسانی اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

آپ نے تمام انسانیت کو محبت و اخوت کا درس دیا۔ اور ایک ایسے عظیم گھر پر لا کر کھڑا کر دیا جس میں عربی عجمی، کالے گورے، امیر غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا آپ نے اللہ تعالیٰ اور اپنی محبت کو جذبہ ایمان قرار دیا اس امر پر ہر فرقہ کے مسلمان متفق ہیں کہ جس کے دل میں آپ کی محبت عظمت راسخ نہیں ہے وہ اپنے ایمان کے دعوے میں کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔ اور محبت بھی ایسی ہو جس کے سامنے ہر محبت ہیچ نظر آئے اس بارے میں ارشاد رسولؐ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک اپنے ایمانی دعوے میں سچا نہیں ہو سکتا جب تک وہ میری محبت کو اپنے باپ بیٹے اور دنیا کے سب لوگوں کی محبت پر فوقیت نہیں دیتا۔

آپؐ کی اس محبت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہم آپ کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات کو اپنے جان و مال، اولاد اور تمام دنیاوی قرابت داروں سے زیادہ عزیز رکھیں۔ ہمارا کوئی فعل ایسا نہ ہو جس سے اللہ و رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری میں فرق آتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بے شک جنہیں نرمی دی گئی اس کا ایک حصہ عطا کر دیا گیا۔ تو گویا انہیں دنیا کی بھلائیاں عطا کر دی گئیں بھلا جس خوش خلقی، حق ہمسائیگی، وہ اوصاف انسانی ہیں جو بستیوں کو شاد و آباد رکھتے ہیں۔ فروغ علم و عمل کے بارے میں ارشاد رسول مقبولؐ ہوتا ہے کہ بہترین صدقہ یہ ہے کہ ایک مسلمان علم سیکھے اور پھر اسے دوسروں تک پہنچائے۔ جسے علم حاصل ہو وہ جاہلوں کے درمیان ایسا ہے جیسے مردوں کے درمیان زندہ۔ آپؐ نے عالموں کو عزت و فضیلت دے کر ممتاز درجہ عطا فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ جن سے تم علم سیکھتے ہو ان کی تعظیم کرو۔ طالبان علم کو یہ ارشاد فرمایا کہ جب کسی طالب علم کو حصول علم کی جدوجہد کوشش کے دوران موت آجائے تو اس کا درجہ شہید کے برابر ہے علم حاصل کرو خواہ اس کے حصول کے لئے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ آپؐ کی مشہور و مقبول دعا یہی ہے "اے میرے رب میرا علم زیادہ کر دے"۔ کونینؐ عالم اور معلم کی اصلاحی حیثیت اس طرح اجاگر فرماتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر تمہاری ہدایت سے ایک شخص کو بھی ہدایت حاصل ہو گئی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

صاحبان علم کی عابدوں پر ایسی فضیلت اور فوقیت ہے جیسے چاند کی ستاروں پر۔ عاقل آدمی سے مشکل معاملات میں ضرور مشورہ حاصل کرو۔ اس طرح تم صحیح راستے پر چلو گے اس کی نافرمانی نہ کرو۔ کیوں کہ اس فعل سے تمہیں ندامت کا سامنا ہوگا۔ میدان کارزار کے بارے میں مسلمانوں کو محسن انسانیت نے بتایا کہ اس ضابطۂ اخلاق پر عمل پیرا رہو اور اسلامی حد سے تجاوز نہ کرو۔ حالت جہاد میں کسی عورت اور غلام کو قتل نہ کرو۔ علامہ قریزی کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب کسی لشکر اسلامی کو جہاد کی اجازت دی تو خصوصی طور پر یہ ہدایت فرمائی کہ بدعہدی نہ کرنا مثلاً یعنی لاشوں کے ناک کان کاٹ کر ان کی بے حرمتی نہ کرنا اور بچوں کو قتل نہ کرنا۔

ترمذی کی حدیث نبویؐ کے مطابق جب حضورؐ دشمنان اسلام سے جنگ کرنے رات کے وقت کسی مقام پر پہونچتے تھے تو شب خون نہیں مارتے تھے۔ بلکہ آپ صبح ہونے کا انتظار فرماتے۔ ابن ماجہ اور مسند احمد کے مطابق تعلیمات نبویؐ ہمیں یہ بھی درس دیتی ہیں کہ جب کوئی تم سے امان طلب کرے تو اسے کسی بھی حالت میں قتل مت کرو۔ پناہ اور معاہدہ سلامتی کے بارے میں ارشاد رسول مقبولؐ ہے جو شخص ایسے غیر مسلم کو قتل کر دے جس سے خدا اور رسولؐ کی جانب سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے تو اس نے خدا کی دی ہوئی ذمہ داری کا عہد توڑ دیا۔ اس کو جنت کی خوشبو تک نہ ہوگی۔ جب کہ اس کی خوشبو ستر سال کی مسافت کی دوری سے آتی ہے۔

نماز

حمید رفکری بیتیا

حق تعالیٰ کی طرف سے خاص رحمت ہے نماز
پیرو دینِ احمد فرضِ اُمت ہے نماز

جان ہے ایمان ہے، روحِ عبادت ہے نماز
منتہائے اہلِ دل، معراجِ الفت ہے نماز

جیسے دریا کو روانی، پھول کو خوشبو ملی
مومنوں کے واسطے ویسی ہی نعمت ہے نماز

کردیا جس نے تمیزِ کفر کو اسلام سے
وہ ستونِ دین، وہ بنیادِ ملت ہے نماز

ہے نماز آنکھوں کی ٹھنڈک یہ نبی کا قول ہے
عرصہ گاہِ حشر میں وجہِ شفاعت ہے نماز

کرتی ہے چہرہ کو روشن اور دل کو آئینہ
جلوہ گاہِ حسنِ صورت اور سیرت ہے نماز

دوزخِ سوزانِ غمِ دوراں سے دیتی ہے نجات
یعنی عقبیٰ اور دنیا کی سعادت ہے نماز

اللہ اللہ یہ ادا، یہ جذب و مستی، ذوق و شوق
بادۂ تسنیم و کوثر، لطفِ جنت ہے نماز

کربلا کی خاک سے حمید یہ آتی ہے صدا
پیکرِ اسوۂ جانِ شہادت ہے نماز

• دو خواتین چڑیا گھر دیکھنے گئیں جب وہ شترمرغ کے پنجرے کے پاس پہنچیں تو چڑیا گھر کے گائیڈ نے تعارف کراتے ہوئے کہا یہ شترمرغ ہے یہ بڑا سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ اسے دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ یہ تقریباً ہر چیز کھا لیتا ہے اور ہضم بھی کر لیتا ہے۔

ایک خاتون نے چپکے سے دوسری خاتون سے کہا "یہ تو مثالی شوہر معلوم ہوتا ہے"

مخاطب ہے خدا خود اپنے بندوں سے!

از اُمّ ہانی

یقیں سے ہم کو پکارو! بہت قریب ہیں ہم
گماں کا دھوکا نہ کھاؤ! بہت قریب ہیں ہم

زمانہ لاکھ بدل جائے ہم نہ بدلیں گے!!
اکیلا خود کو نہ جانو! بہت قریب ہیں ہم

یہ رنگ و بو کے جہاں کو سنوارتے کیا ہو
حقیقتوں کو سنوارو! بہت قریب ہیں ہم

اثر دعاؤں میں باقی ہے اب نہ نغموں میں
دلوں میں عشق جگاؤ! بہت قریب ہیں ہم

چھپا سکو گے نہ ہم سے کوئی عمل اپنا
ہمیں علیم ہی جانو! بہت قریب ہیں ہم

قدم قدم پہ ہے جاری ہمارا فیضِ کرم
قریب خود کو نہ جانو! بہت قریب ہیں ہم

کرو تلاش نہ افلاک میں ہمیں تم لوگ!!
کہیں بھی دور نہ جاؤ! بہت قریب ہیں ہم

تمہاری ہر رگ و پے میں ظہور کس کا ہے؟
نگاہ اپنے پہ ڈالو! بہت قریب ہیں ہم

یہ بحر و بر، یہ شب و روز کس کے شاہد ہیں؟
ذرا قریب سے دیکھو! بہت قریب ہیں ہم

بہے جب اشک تو ہاتف ندائے غیب آئی
دل اپنا یوں نہ دکھاؤ! بہت قریب ہیں ہم

• ایک خاتون نے کہا۔
"جب مردوں کو اچھی بات کہی جاتی ہے تو وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں"
مرد نے جواب دیا۔
"اور جب عورتوں کو کوئی راز کی بات کہی جاتی ہے تو وہ دونوں کانوں سے سنتی ہیں اور منہ سے نکال دیتی ہیں"

افسانہ

جھوٹی شان

رضیہ بٹ

اندر سے فیروزی اور باہر سے کالے رنگ کے لوہے کے صندوق کا ڈھکنا کھولے وہ کب سے بیٹھی کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھی کبھی کاسنی لہنگا پلنگ پر پھیلا دیتی، جوگیا سوٹ بھی اس نے کئی بار ناقدانہ انداز میں دیکھا۔ آسمانی رنگ کی بروکیڈ کی قمیص بھی اپنے ساتھ لگا کر جانچی لیکن اس کی نظر انتخاب کسی کپڑے پر نہ ٹھہری فیروزی ساڑھی اچھی تو تھی، پلو بھی خاصا بھاری تھا، لیکن بارڈر مسلا مسلا سا تھا۔ سامنے ہی دو ایک داغ بھی لگ گئے تھے۔ وقت ہوتا تو اسے ہی ڈرائی کلین کروا لیتی ــــ لیکن اب تو وقت کا سوال ہی نہ تھا۔ رات اُسے ڈنر پہ جانا تھا۔ بجھے بجھے انداز میں اس نے ساڑھی رکھ کر لہنگا دیکھا، لیکن اس کا کامدانی کا کام ماند پڑ چکا تھا۔ پانچ سال پہلے کے جہیز کے کپڑے تھے۔ ان میں آب و تاب باقی کیونکر رہتی۔ یہ آسمانی رنگ کی بروکیڈ کی قمیص اچھی تھی۔ لیکن اب اس کا جسم قدرے فربہ ہو گیا تھا۔ اس کی فٹنگ اچھی نہ بیٹھتی تھی۔ پھر اس کے ساتھ کی شلوار اور دوپٹہ بھی تو کچھ ملگجا سا ہو گیا تھا۔ دو تین دفعہ وہ اُسے کاٹن کی پھولدار قمیص کے ساتھ استعمال جو کر چکی تھی۔ اور اس جوگیا سوٹ کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اتنا سادہ سا سوٹ اور اتنا شاندار ڈنر قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔ ویسے بھی وہ پچھلی میٹنگ پر یہ سوٹ پہن کر گئی تھی۔ ڈنر میں بھی تو تقریباً وہی بیگمات ہوں گی جو میٹنگ میں تھیں۔

جھلائے سے انداز میں اس نے سب کپڑے سمیٹے اور صندوق میں ڈال دیئے۔ ایک کپڑا بھی اس قابل نہ تھا جو وہ آج رات بیگم ہاشم کے ہاں پہن کر جا سکتی۔ کوئی چھوٹی موٹی پارٹی ہوتی تو بات بھی تھی۔ ایسا شاندار ڈنر تھا۔ بیگم ہاشم شہر کے دولت مند طبقے سے تعلق رکھتی تھیں ــــ ان کے ملنے ملانے والے بھی اسی متمول طبقے کے لوگ تھے۔

اپنی ظاہرداری کا بھرم رکھنے کے لئے اسے بھی کسی نفیس ترین سوٹ یا انتہائی قیمتی ساڑھی کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسا سوٹ یا ساڑھی آئے کہاں سے؟ میاں صاحب تو وہی ٹکا چال چل رہے تھے۔ پندرہ روپے سالانہ ترقی پہ مست تھے۔ لوگ کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن اصغر ابھی صرف چار سو تک ہی پہنچے تھے۔ حامد بھی تو اسی کے ساتھ نوکر ہوئے تھے۔ گو تنخواہ ان کی بھی اتنی ہی تھی لیکن کیا ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ اڑھائی ہزار روپے ماہوار کرایہ تو صرف کوٹھی کا دیتے تھے اور عیش و عشرت الگ۔ اسے اصغر پر بے طرح غصہ آنے لگا۔ اب تک حامد والا گر اس نے کیوں نہیں سیکھا تھا۔

وہ تھی تو ایک معمولی حیثیت کے آدمی کی بیوی، لیکن اس کی اڑان ہمیشہ اونچی رہی تھی۔ ظاہری ٹھاٹھ باٹھ رکھا ہوا تھا۔ اونچے طبقے میں رسائی کے نت نئے وسیلے بنا لیتی۔ خود فریبی ہی تھی۔ لیکن ان لوگوں میں اٹھ بیٹھ کر وہ اپنی انا کی ظاہرا ہی سہی، تسکین ضرور کر لیا کرتی تھی۔

بیگم ہاشم اور اس میں کبھی مالی طور سے کوئی نسبت نہ تھی۔ لیکن جس رفاہی ادارے کی بیگم ہاشم سرپرست تھیں، اس کی وہ بھی ممبر تھی۔ یہ رفاہی ادارہ ہو سکتا ہے کسی نیک جذبے کے تحت وجود میں آیا ہو۔ لیکن اب تو اس کے ارکان کی اکثریت ان بیگمات پر مشتمل تھی جو یا تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بیویاں تھیں، دولت جن کے در کی غلام تھی، بلیک مارکٹنگ اور سمگلنگ سے بنک کالے کر رکھے تھے ــــ یا ان افسروں کی بیگمات تھیں جنھیں تنخواہ کے ساتھ دولت کمانے کے خفیہ راز بھی ہاتھ آ گئے تھے۔ یہ بیگمات غیر ملکی اسمگل شدہ قیمتی کپڑوں میں ملبوس چائے یا کافی کی پیالیوں پہ قوم کے دردناک مسائل کا حل ڈھونڈا کرتی تھیں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے میٹنگ ہوتی۔ نام نمود اور تفریح کا سامان نکل آتا۔ باہر سے منگوائی ہوئی چیزوں کی نمائش ہوتی۔ اور پھر اخبار کے لئے ایک مضمون لکھ کر بھیج دیا جاتا۔ ادارے کی سرگرمیوں کا بڑے دلکش الفاظ میں ذکر ہوتا۔

وہ بھی اس ادارے کی ممبر تھی۔ ہر ماہ خرچ میں بچت کر کے وہ ایک آدھ نئی قمیص بنوا لیتی۔ کوئی پرانی شلوار اور دوپٹہ اس کے ساتھ رنگوا کر کام چلا لیتی۔ نیلی شیفون کی ساڑھی کا وہ چوتھی بار رنگ بدلوا چکی تھی۔ یوں اس نے ظاہرداری کا منقش پردہ اپنے حالات پر ڈال رکھا تھا۔ شکل و صورت خدا نے اچھی دی تھی۔ میک اپ کرنے میں وہ ماہر تھی۔ بالوں کو نت نئے طریق سے سجانا بھی آ گیا تھا۔ یوں وہ ہر ماہ اس انداز سے میٹنگ میں شریک ہوتی کہ آسیہ صدیق، راحت زمانی اور بیگم سعیدہ وغیرہ سے کسی طور مالی حیثیت سے وہ کم تر نظر نہ آتی۔

لیکن اب بات میٹنگ کی نہ تھی، ڈنر کی تھی۔ یہاں دو شیفون کی ساڑھی رنگ بدلوا کر کام دے سکتی تھی نہ ایک قمیص پرانی شلوار اور دوپٹے کے ساتھ چل سکتی تھی۔

دو شکر سی بیٹھی تھی۔ چار بجنے والے تھے۔ ساڑھے چھ تک اسے تیار ہو کر جانا تھا ___ اس کا ذہن کوئی حل ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔ بیش قیمت ساڑھی کا چکر دماغ میں چل رہا تھا۔

اور یونہی بیٹھے اُسے ناصرہ کا خیال آگیا۔ ناصرہ اس کے سسرالی عزیزوں میں سے تھی۔ پچھلے ہی دنوں اس کی شادی ہوئی تھی۔ میکے اور سسرال سے کیا خوب صورت اور قیمتی ساڑھیاں ملی تھیں اسے۔ ایک سے ایک نفیس ایک سے ایک بڑھیا۔ اور پھر اسے یک دم ایک چونکا دینے والا خیال آیا۔ کیوں نہ ناصرہ سے ایک ساڑھی مانگ لی جائے۔ گھنٹہ دو گھنٹے میں کونسی خراب ہو جائے گی۔ اُسے وہ فان کلر ساڑھی یاد آئی جو ناصرہ عصمت آپا کے ہاں پہن کر آئی تھی۔ رنگ کیسے غضب کا صوفیانہ سا تھا۔ اور کام۔ کام پر تو نظر نہ ٹھہرتی تھی۔

پہلے تو اپنے خیال پر ہی جھجک سی آئی۔ لیکن اس کے ذہن نے بہت جلد ایک ترکیب سوچ لی۔ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس نے اسی وقت ناصرہ کے ہاں جا کر ساڑھی مانگ لانے کا فیصلہ کرلیا۔

جلد جلد اس نے کھونٹی پر ٹنگے کاٹن کے استری شدہ کپڑے پہنے۔ بالوں میں کنگھی کی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک جمائی۔ بٹوہ اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"کہاں ؟" اصغر نے پوچھا۔ وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا۔ پرانے جوتے میں تلا لگوایا تھا۔ جس سے کم بخت کچھ تنگ ہو گیا تھا۔ پاؤں گھٹ کر درد کر رہے تھے۔ دفتر سے گھر تک تقریباً ڈیڑھ میل کا فاصلہ اس نے بڑی مشکل سے طے کیا تھا۔ سائیکل بھی تو کئی دنوں سے مرمت کے لئے دے رکھی تھی اس نے اصغر کے چہرے پر اذیت اور تھکن کے آثار دیکھے لیکن اسے اپنے کام کی جلدی تھی۔

"میں ذرا ناصرہ کے ہاں جا رہی ہوں۔ ابھی آئی پانچ دس منٹ میں۔" "خیریت ؟" اصغر کہتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھا۔

"آکر بتاتی ہوں" وہ باہر کی طرف لپکی۔ ملازمہ پچھلے وقت کے کام کے لئے آ رہی تھی۔ دروازے ہی میں اس نے اسے چائے بنا کر اصغر کو دینے کے لئے کہا۔ اور تیز قدم اٹھاتی باہر چل دی۔

ناصرہ گھر پہ ہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بڑے خلوص اور تپاک سے ملی۔ ناصرہ نے بھی بشاشت سے خیر مقدم کیا۔

دونوں سجے سجائے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھیں۔ ملازم کو آواز دے کر ناصرہ نے چائے کے لئے کہنا چاہا۔

"نہیں ناصرہ۔ چائے کے لئے میں نہیں ٹھہروں گی۔ میں جلدی میں ہوں۔ اک کام تھا، آ گئی۔ چائے پھر کسی فرصت کے وقت پیوں گی۔"

"فرمائیے۔" ناصرہ مسکرائی۔

اس نے باتیں شروع کر دیں۔ جلد ہی وہ مطلب کی بات پہ آ گئی۔ ناصرہ کی ساڑھیوں کی تعریف خاصے خوشامدانہ لہجے میں کرتے ہوئے اس نے اس دن والی فان کلر کی ساڑھی کا ذکر کیا۔

کونسی ؟" ناصرہ پلکیں جھپکا جھپکا کر یاد کرنے کی کوشش میں بولی۔ وہی جو اس شام تم نے عصمت آپا کے ہاں پہنی تھی۔ فان کلر۔ بھاری سا پلو ہے۔ اور ساری ساڑھی میں چوکور سے خانے ہیں۔"

"اچھا۔ اچھا یاد آیا۔ ناصرہ بولی۔" دراصل میرے پاس تین چار فان رنگ کی ساڑھیاں ہیں۔"

"نہیں۔ وہ جو عصمت آپا کے ہاں تم نے پہنی تھی۔ وہ ساڑھی مجھے چاہیئے۔"

"جی!" ناصرہ کے لہجے میں ایک دم سرد مہری سی گھل گئی۔ چیز ادھار دینے کی وہ قائل نہ تھی وہ اس کے لہجے سے سب کچھ بھانپ کر جلدی سے بولی: "میں اسی طرح کی ساڑھی منگوانا چاہتی ہوں۔ تم نے کہاں سے لی تھی؟"

"کراچی سے۔" ناصرہ کا لہجہ اب بھی ٹھنڈا تھا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ یہاں تو کسی کام کی ساڑھی ہے ہی نہیں۔ مہینہ بھر سے دکانیں دیکھ رہی ہوں۔ آج رات اصغر کراچی جا رہے ہیں۔ سوچا ہے وہیں سے منگوا لوں۔ اب اصغر کو سمجھاتی ہوں۔ انھیں پتہ ہی نہیں چلتا یقین جانو۔" وہ ساختہ ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ "ڈرائنگ کر کے بھی سمجھایا۔ لیکن انھیں پتہ نہیں چلتا۔ کہتے ہیں نمونہ دکھا دو۔"

"ہوں۔" ناصرہ اس کی باتوں سے مطمئن سی ہو گئی۔

"سوچا ساڑھی لا کر انھیں دکھا ہی دوں۔ برا نہ مانو۔ تو ذرا ساڑھی دو۔ انھیں دکھا کر واپس کر دوں گی۔ شام نہ آسکی تو صبح ہی صبح بھجوا دوں گی۔" وہ پھر خواہ مخواہ ہنسی۔

ناصرہ اٹھ کر اندر گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اس کی مطلوبہ ساڑھی لے کر آ گئی۔

سفید دھوبی کے دھلے میز پوش میں ساڑھی اچھی طرح لپیٹ کر اس نے دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا احتیاط سے رکھیے گا۔ قیمتی چیز ہے اور میں نے تو صرف ابھی ایک ہی دفعہ پہنی ہے۔"

"فکر نہ کرو ناصرہ۔ ذرا انھیں دکھا نا ہی ہے۔ اسی طرح واپس کر جاؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" ناصرہ کو بھی از راہ اخلاق کہنا پڑا۔

ساڑھی لے کر وہ خوش خوش گھر پہنچی۔ اصغر کپڑے بدل کر پلنگ پر لیٹا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اُسے آتا دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔

وہ بڑے فخر سے اُسے ساڑھی دکھانے لگی۔ اور جس بہانے ساڑھی لائی تھی وہ بھی کہہ سنایا۔ اصغر بیوی کی سرگرمیوں میں کبھی دخیل نہ ہوتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی حد تک اس کا ہم خیال بھی تھا۔ اونچے طبقے میں رسائی اس کے لئے قابلِ فخر تھی۔ لیکن ساڑھی مانگ کر لانا اُسے کچھ اچھا نہ لگا۔

"آخر بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے نا۔" وہ بولی۔ "آپ ہی کی عزت بناتی پھرتی ہوں نا۔ یہ بات بھی بن گئی۔ اور کام بھی چل گیا۔"

اصغر پھر رسالہ دیکھنے لگا۔ اور وہ اٹھ کر الماری کی طرف گئی جہاں سنہرا بلاؤز رکھا تھا۔

بلاؤز اس نے ساڑھی کے قریب رکھ کر دیکھا۔ ساڑھی کی چمک دمک اور نیا پن بلاؤز کو منہ چڑا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر دیکھ کر سوچتی رہی پھر قینچی لے کر بلاؤز کی آستینیں کاٹ دیں۔

سلائی کر کے اس نے بلاؤز بغیر آستین کے بنا لیا۔ اب کافی حصہ ساڑھی سے چھپ جائے گا۔ اس نے مطمئن انداز میں سوچا۔

پیٹی کوٹ تو کوئی سا بھی کام دے سکتا تھا۔ اب سوال جوتے کا تھا۔ سنہری ڈوریوں والا سینڈل اس کے پاس تھا۔ لیکن زیادہ استعمال سے سنہرا کئی جگہ سے سفید پڑ گیا تھا۔ ایک ڈوری بھی مسک گئی تھی۔

اس نے سینڈل کو اچھی طرح صاف کیا۔ پھر موٹی سوئی میں بٹ کر تاگہ ڈالا۔ مسکی ہوئی ڈوری کو مضبوطی سے سی لیا۔ ساڑھی کے ساتھ سنہری سینڈل ہی کام دے سکتی تھی۔ میل تو نہیں کھا رہی تھی۔ لیکن خیر رات کے وقت کام چلانا ہی تھا۔

شام کو وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ مصنوعی بالوں کا جوڑا بالوں میں رکھ کر بال بڑے ہی حسین انداز میں سجائے۔ میک اپ کرنے میں تو وہ ماہر تھی ہی۔ آج تو اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی۔

قیمتی ساڑھی کا پلو جب شانے سے ڈھلکاتے ہوئے وہ آئینے میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھی تو اصغر بھی اس کے حسن کے بھڑکتے شعلوں سے دامن بچا نہ سکا۔ کتنی سمارٹ، کتنی ماڈرن اور کتنی حسین لگ رہی تھی وہ۔

"واللہ بیگم جواب نہیں تمہارا"۔۔۔ وہ مسکرائی۔ اس کے مسکرانے اور بات کرنے کے انداز ہی بدل گئے تھے۔

ملازمہ رکشا لے آئی۔ اصغر کو تعریف میں رطب اللسان چھوڑ کر وہ چل دی۔

رکشا بیگم ہاشم کی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر ہی چھوڑ دیا لانبی لانبی چمکتی کاروں کے درمیان رکشے سے اترنے میں سبکی تھی۔

وہ خراماں خراماں پیدل چلی۔ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوگئی۔

آمنہ صدیقی اپنی مرسیڈیز سے باہر نکل رہی تھی۔

"ہلو مسز صدیقی" وہ کچھ فاصلے سے بولی۔

"ہلو۔" آمنہ صدیقی نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔

"آپ بھی ابھی ابھی آئیں مسز اصغر؟"

"ہاں۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلتی برآمدے تک پہنچیں۔ آمنہ نے روشنی میں اس کی طرف دیکھا۔ "واہ وا۔ مسز اصغر، کتنی سمارٹ نظر آ رہی ہیں آپ" آمنہ بولی۔

"تو گویا سمارٹ نہیں ہوں۔ اب نظر آ رہی ہوں" وہ خوبصورت انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے ہنسی۔

"نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا" دونوں ہنستی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم بڑے خوبصورت انداز میں سجایا گیا تھا۔ کافی مہمان آ چکے تھے۔ خوش گپیاں اور کھنکتے قہقہے مل جل کر فضا کو مترنم بنا رہے تھے۔

بڑے پرتپاک طریق سے بیگم ہاشم اور دوسرے ملنے والوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ہر کوئی اُسے تعریفی نظروں سے دیکھتا تھا۔

وہ رابعہ کے قریب صوفے پر جا بیٹھی اور بڑے خوش دلانہ انداز میں باتیں کرنے لگی۔

"کتنی خوبصورت ساڑھی ہے آپ کی۔" رابعہ نہ رہ سکی۔

"واقعی رنگ کتنا پیارا ہے" دائیں ہاتھ بیٹھی آصفہ نے کہا۔

وہ اک شانِ تفاخر سے گردن اکڑاتے ہونٹوں کے آڑے ترچھے زاویے مسکراہٹ میں ڈھال کر ان کی باتوں سے محظوظ ہوتی رہی۔

"کہاں سے خریدی؟ یہاں تو ڈھنگ کی ساڑھی ملتی ہی نہیں۔"
رابعہ ابھی جو گیا پلکے سے کام کی ساڑھی میں شاید ہیکی محسوس کر رہی تھی۔
"کراچی سے۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
"کتنے میں!" آصفہ نے تجسس ظاہر کیا۔
وہ لمحہ بھر کو بوکھلائی۔ لیکن جلد ہی سنبھل کر ہنسی۔ "اجی ہمیں قیمت معلوم نہیں۔ اور سچ پوچھیں تو قیمت سے غرض بھی نہیں۔"
"کیوں؟" دونوں اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں۔
"بات یہ ہے کہ یہ ساڑھی ہمیں تحفتہً ملی ہے۔" وہ بن بن کر مسکراتی رہی۔
"کیا کہنے ایسا قیمتی تحفہ کس نے دیا؟"
"ہمارے میاں صاحب نے شادی کی پانچویں سالگرہ پر" ـــ وہ اٹھلا کر چہکی۔
"کتنی خوش قسمت ہو تم۔" آصفہ نے جیسے اپنے دل کا درد چھپانے کی کوشش کی۔ اک اس کا میاں بھی تھا۔ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ دولت سانپ بن کر ڈستی تھی اسے۔
بیگم صفدر کے آنے سے سلسلۂ گفتگو منقطع ہو گیا۔
پرتپاک احوال پرسی کے بعد مختلف موضوعات پر باتیں ہونے لگیں۔
وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر فاخرہ کے پاس جا بیٹھی۔
یہاں بھی اس کی ساڑھی کی بے حد تعریف ہوئی۔ اور پھیر پھیر کر یہاں بھی اس نے فخریہ انداز میں اس ساڑھی کو پانچویں سالگرہ کا تحفہ کہا۔
"مسز ہاشم کیا خیال ہے۔" آمنہ صدیق نے گھڑی دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کے ساڑھے سات کب ہوں گے؟"
"کیوں بہت بھوک لگ رہی ہے۔" مسز ہاشم ہنسیں۔
"ہم وقت کے پابند ہیں اور پابندی چاہتے ہیں۔" اس نے مسز ہاشم سے کہا۔
"حضور معاف" بیگم ہاشم نے مجرمانہ سا انداز اختیار کر کے کہا۔ "لیکن کیا کیا جائے۔ ابھی تین مہمان نہیں آئے۔ اجازت ہو تو دس منٹ اور انتظار کر لیا جائے۔"
سب مسکرانے لگے۔ پھر باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔
پانچ سات منٹ کے بعد موٹر رکنے کی آواز پر بیگم ہاشم چونک کر اٹھیں
"لو جی آ گئے سب۔"
وہ دروازے کی طرف مہمانوں کے استقبال کے لئے بڑھیں۔
"اتنی دیر لگا دی۔" اس نے پہلو بدلتے ہوئے ساڑھی کا پلو کندھے پر ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کہا۔ "اللہ جانے یہ لوگ وقت کی پابندی کرنا کب سیکھیں گے۔"
اختر کچھ کہنے ہی کو تھی کہ بیگم ہاشم اور آنے والی تین مہمان عورتوں کے ملے جلے قہقہے کی طرف متوجہ ہو گئی اس نے بھی دروازے کی طرف دیکھا۔
اُف!
اسے یوں لگا جیسے زمین و آسمان ایک ساتھ گھوم گئے ہوں۔ فضائی خنکی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ ہاتھ پیر سنسنانے لگے۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ رنگ فق ہو گیا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔
بیگم ہاشم کے ساتھ اندر جانے والی مہمان عورتوں میں ایک نامرد بھی تھی۔

شادی کے گیت

رات کے بارہ بجے کون آیا ــ دولہا کے ابا آئے کیا کہنے
"بچنا اے حسینوں لو میں آ گیا!" ـــــــ
رات کے بارہ بجے کون آیا ــ دولہا کی امی آئیں کیا کہتی
"ابھی تو میں جوان ہوں ابھی تو میں جوان ہوں" ـــ
رات کے بارہ بجے کون آیا ــ دولہا کا بھائی آیا کیا کہتا
"آئی ایم اے، "ڈسکو ڈانسر"" ـــــــ
رات کے بارہ بجے کون آیا ــ دولہا کی بہن آئی کیا کہتی
"میں حسینہ زلفوں والی جانِ جہاں" ـــ

فیروزہ بیگم کانپور

مسکراہٹ

- عورت، جب تو مسکرائے گی تو دنیا تجھ پر عقیدتوں کے پھول نچھاور کرے گی۔ (شکسپیر)
- دنیا غمگین تھی، باغ ویران تھے اور مرد آہ و فغاں کر رہے تھے کہ عورت مسکرائی اور اس نے پوری کائنات کو مسرت سے معمور کر دیا! (کیمپ بل)
- خوبصورت عورت کی ایک مسکراہٹ پر ساری دنیا کو قربان کر دینا چاہیئے! (نپولین)

حریمی دسترخوان

بسکٹوں سے زیادہ ناشتہ کے لئے شاید ہی کسی چیز کا صرف ہو۔ بچے بھی بسکٹ پسند کرتے ہیں۔ بسکٹ کی سیکڑوں قسمیں ہیں۔ ان پر ہمارا کافی پیسہ صرف ہوتا ہے لیکن اگر ہم انھیں گھر میں بنانے کی مشق کرلیں تو اخراجات میں کسی حد تک کمی ہو سکتی ہے۔

بسکٹ بنانے کے اُوون کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اوون ہر گھر میں نہیں ہوتے اس لئے آپ یہ کام کسی تیل کے کنستر سے بھی لے سکتی ہیں۔ اس کا ایک چوکور حصہ کٹوا کر نکلوا دیجئے اور اسمیں لوہے کی سلاخیں کسی لوہار سے وسط میں لگوالیں چند سلاخیں دونوں ... میں لگوائیں۔ کنستر کو پٹ رکھیں تاکہ اس کے کٹے ہوئے حصہ سے آپ سلاخوں کے نیچے انگارے رکھکر بسکٹوں کی ڈش سلاخوں پر رکھ سکیں۔ یہ اوون آپ کی دوسری ضرورتیں بھی پوری کرسکے گا۔

بسکٹوں کے لئے سامان :- میدہ ۱۲۵ گرام۔ بیکنگ پوڈر چار کا ایک چمچہ چوٹی دار بھرا ہوا۔ مکھن ۲۵۰ گرام۔ ونیلا ایسنس چار کا ایک چمچہ۔ انڈا ایک۔ اخروٹ۔ بادام یا کاجو ۱۰۔ گرام یا اس سے کم۔ پسی ہوئی شکر ۵۰ گرام۔

ترکیب :- میدے میں مکھن اور بیکنگ پاؤڈر ملا کر دیر تک ملیں۔ جب اچھی طرح ایک جان ہو جائیں تو پسی ہوئی شکر ملا کر پھر ملیں۔ اس کے بعد انڈا پھینٹ کر ملائیں اور ایسنس بھی شامل کر دیں۔ اب میدے کا آمیزہ نرم ہو جائے گا۔ اسے بیل کر رول کی شکل میں کرلیں۔ اگر آپ کے گھر میں ریفریجریٹر ہے تو اس رول کو کسی باریک کپڑے میں لپیٹ کر پندرہ بیس منٹ کے لئے اس کے چیسٹ میں رکھدیں تاکہ سخت ہو جائے۔ ریفریجریٹر نہ ہو تو برف پر رکھ کر رول کو سخت کر سکتی ہیں۔ اس کے بعد رول کو تیز اور باریک چھری سے اندازاً پاؤ انچ موٹے موٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر کسی المونیم کی بیکنگ ٹرے میں جو آپ کے بنائے ہوئے اوون میں آسکے ہلکا سا مکھن لگا کر ذرا ذرا فاصلہ دے کر رکھیں۔ اخروٹ کی گری۔ بادام۔ کاجو یا ان میں سے کوئی ایک جو شامل کرنا چاہیں۔ باریک تراش کر بسکٹوں پر چھڑک کر آہستہ سے دبادیں اور اُوون میں انگارے اچھی طرح پھیلا کر رکھیں اور ٹرے کو سلاخوں پر رکھدیں۔ دیکھتی رہیں، جب ان میں ہلکی رنگ آجائے تو اتارلیں۔

اگر آپ میوہ نہ ڈالنا چاہیں تو اس کے بغیر بھی بسکٹ بن جائیں گے۔ اگر آپ نمکین بسکٹ بنانا چاہیں تو شکر کے بجائے ایک چمچہ بھر کر پسا ہوا نمک شامل کرلیں۔

ایسے بسکٹ بھی بنتے ہیں جن میں نمک اور شکر دونوں چیزیں ملائی جاتی ہیں ایسے بنانا چاہیں تو نمک ایک چمچہ اور شکر چار چمچے ملائیں۔ ایسنس خوشبو کے لئے ملایا جاتا ہے۔ اگر آپ خوشبو نہ پسند کریں تو ایسنس نہ ملائیں۔

اُوون میں جو انگارے آپ رکھیں اگر ان سے بسکٹ اچھی طرح نہ پک سکیں تو دوسرے انگارے رکھدیں لیکن اس کا خیال رکھیں کہ بسکٹ نیچے سے جل نہ جائیں۔

بسکٹ تیار ہونے پر جب ٹھنڈے ہو جائیں تو انھیں کسی ایسے ٹین کے ڈبے میں رکھیں اور ڈھکن اچھی طرح بند کریں۔ یا پلاسٹک کے تھیلے میں رکھیں تاکہ سیل نہ سکیں۔

مرسلہ۔ دردانہ خاتون (بریلی)

نعت شریف

سیفی سرونجی

تھی فکر روزِ حشر کوئی آسرا ملے
قسمت ہماری دیکھئے خیرالوریٰ ملے

میں خواب ہی میں روضۂ انور کو دیکھ لوں
رہبر مجھے بھی کوئی اگر حق نما ملے

کیسے بھٹکتا راہ میں منزل کی دوستو
مجھ کو قدم قدم پہ شہ انبیا ملے

پہنچے جہاں پہ آپ ملائک نہ جاسکے
کیا کیا مقام آپ کو اے مصطفیٰ ملے

سیفی زباں پہ آتے ہی محبوبِ حق کا نام
بھٹکے ہوئے جو راہی تھے منزل سے جا ملے

سچائی کی نشانی

نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

میرا نام ماہ پارہ ہے۔ دراصل میں اپنے نام سے بھی زیادہ حسین ہوں۔ جو کوئی بھی مجھے دیکھتا ہے تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میرا جسم بلّور کی مانند صاف اور شفاف ہے۔ میرا حسن میرا قد اور میرا نکھار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں قدرت کا حسین شاہکار ہوں۔ میری آواز کوئل سے بھی زیادہ سُریلی ہے۔ میں اپنے خالق کی شکرگزار ہوں۔ کیونکہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اس نے مجھے جمال اور کمال سے نوازا ہے۔ جہاں میں حسین ہوں۔ وہیں میں ذہین بھی ہوں۔ قدرت کی کرم فرمائی دیکھئے کہ اس نے مجھے مال و دولت سے بھی نوازا ہے۔ میں نواب حشمت جاہ جاگیردار کی اکلوتی اور نازونعم میں پلی بیٹی ہوں۔ میرا مزاج بہت نرم اور رویّہ مخلصانہ ہے۔ میں ہر ایک سے نہایت اخلاق و مروت سے پیش آتی ہوں۔

میں میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن میرے والد بزرگوار مجھے پردے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا کوئی میڈیکل کالج نہیں جہاں صرف لڑکیوں کو ہی ڈاکٹری پڑھائی جاتی ہو۔ اس لئے میں گرلس کالج بی ایس سی سکنڈ ایر کی طالبہ ہوں۔ کلاس کی تمام لڑکیاں مجھ پر جان چھڑکتی ہیں۔ تمام استانیاں میرے ساتھ نہایت ہی شفقت سے پیش آتی ہیں۔

لیکن میں چند دنوں سے بہت پریشان ہوں۔ مجھے اپنی پروفیسر پروین صاحبہ سے بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ ان کے رویّے سے سخت پریشان ہوں۔ ویسے تو وہ کلاس کی ہر لڑکی کے ساتھ خلوص و اپنائیت سے پیش آتی ہیں۔ لیکن مجھ سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اکثر وہ مجھے معمولی غلطی پر بھی ڈانٹ دیتی ہیں۔ میں اُداس ہوکر سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ پروفیسر پروین کے کلاس سے جانے کے بعد لڑکیاں مجھے دلاسہ دیتی ہیں۔ ماہ پارہ تم حسین اور ذہین ہو۔ ہم سب تم پر پروانہ وار نثار ہیں۔ اس لئے ہی پروفیسر کو تم سے حسد ہوگیا ہے۔ تم ان کی باتوں کا اثر نہ لو۔ تمہاری ذہانت اور حسن سے متاثر ہوکر ضرور ایک نہ ایک دن وہ تم سے بھی محبت کرنے لگیں گے۔ لیکن اپنی سہیلیوں کی یہ حوصلہ افزا باتیں مجھے مطمئن نہ کرسکیں۔ میں دل ہی دل میں الجھتی رہی۔ پروفیسر کیوں مجھ سے ناراض رہتی ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ میرے ساتھ ان کا برتاؤ کیوں سنگدلانہ ہے۔؟ وہ انگریزی پڑھاتی ہیں۔ میں گھر میں خوب جی لگا کر انگریزی پڑھتی رہتی ہوں تاکہ انگریزی میں مجھ سے ایک غلطی بھی نہ ہو لیکن وقت کے ساتھ ساتھ پروفیسر پروین کا رویہ میرے ساتھ بدتر ہوتا گیا۔ ہر بات میں جھڑکنا ان کی عادت بن گئی۔ میں صبروضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہی۔ میں اپنی ساتھیوں کی بے لوث محبت اور دوسری تمام استانیوں کی شفقت سے مجبور ہوکر کالج آتی ہوں۔

اب تک کسی نے مجھ سے نفرت نہیں کی تھی نفرت کیا ہوتی ہے اس کا مجھے احساس ہی نہیں تھا ممی اور ڈیڈی مجھ سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ کالج میں استانیاں اور لڑکیاں مجھے بہت چاہتی ہیں۔ میری معصوم شخصیت ہی کچھ ایسی ہے کہ چاہا جائے.. ایک مقناطیسی کشش مجھ میں پنہاں ہے۔ پروفیسر پروین ہی ایک ایسی عجیب ہستی ہیں۔ جو اپنے چہرے پر نفرت کا خول چڑھا کر نہایت ہی دُرشت اور کرخت لہجے میں مجھ سے بات کرتی ہیں۔ یوں لگ رہا ہے جیسے ..... جیسے ..... کہ میں ان کی ازلی دشمن ہوں۔ نفرت اور ناراضگی میرے لئے ناقابل برداشت ہوگئی۔ میں پریشان اور بے چین رہنے لگی ممی اور ڈیڈی مجھے پریشان دیکھکر بے چین ہوجاتے ہیں۔ ان سے کچھ کہنا بھی میں نے مناسب نہ سمجھا۔ کچھ عرصہ بعد میرے ڈیڈی اور ممی ساتھ لے کر کشمیر کی سیر کو نکل پڑے میں نے کشمیر کی حسین وادیوں میں بھی اپنا پردہ ترک نہ کیا۔ کیونکہ میرے والد بزرگوار مجھے پردے میں دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔ ان کی خوشی میرے لئے عظیم سرمائے سے کم نہیں۔

واپسی پندرہ روز بعد ہوئی تو میں یہ ارادہ کرکے کالج گئی کہ اگر پروفیسر اب بھی میرے ساتھ ایسا ہی سنگدلانہ برتاؤ کریں گی

تو میں کالج کو الوداع کہہ دوں گی۔ میں نے اپنی ساتھیوں سے بھی اس بات کا ذکر کیا۔ میری ہمراز سہیلی نازیہ مجھ سے کہنے لگی۔

ماہ پارہ..... ! تمہارے بنا ہم سب کو کالج سونا سونا لگ رہا تھا۔ اب یوں لگ رہا ہے۔ جیسے کالج میں بہاریں ہی بہاریں رقص کر رہی ہیں۔ خدارا تم کالج سے جانے کا نام ہرگز نہ لینا۔

تمہارے کشمیر جانے کے بعد ایک دن ہم نے پروین صاحبہ سے دریافت کیا۔ "آخر آپ ماہ پارہ سے نفرت کیوں کرتی ہیں۔؟ وہ تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ حسین اور معصوم۔ آخر میرے بار بار اصرار کے بعد پروفیسر صاحبہ نے ایک آپ بیتی سنائی جس سے یہ معلوم ہوگیا کہ وہ تم سے نفرت کیوں کرتی ہیں۔

انھوں نے بتایا "بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میرے ایک بہت ہی پیارے بھائی تھے۔ وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ بچپن میں ہی ہمارے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ امی جان نانا حضور کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ورثہ میں امی جان کو نانا حضور کا ناریل کا باغ ملا۔ امی جان نے ناریل کا باغ فروخت کر کے بھیا کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوائی۔ بھائی ماں کی خدمت کو اولین فریضہ سمجھتے تھے ماں کے بہت فرمانبردار تھے۔ ماں سب بچوں سے زیادہ انھیں کو چاہتی تھیں۔ پڑھائی مکمل ہو جانے کے بعد انھیں ایک سرکاری اسپتال میں معقول تنخواہ کے ساتھ نوکری مل گئی۔ شام کو وہ مریضوں کو اپنے پرائیوٹ کلنک میں دیکھتے، اس سے بھی اچھی آمدنی ہوجاتی تھی۔ زندگی نہایت ہی شادمانی سے گذر رہی تھی۔ امی اور باجی کی تمنا تھی کہ ان کی شادی سرجن ضمیر صاحب کی اکلوتی بیٹی ناہید سے کریں۔ لیکن اس سے پہلے ہی ایک روز بھائی جان سفید ساڑھی میں ملبوس ایک نازک اندام لڑکی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ لڑکی کی کیا تعریف کروں؟ من و عن مہ پارہ تھی۔

"یہ لڑکی بڑی دکھی ہے۔ دس دن پہلے یہ اپنے بیمار باپ کے ساتھ اسپتال آئی تھی۔ ہم ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی کہ اس کے باپ کو بچایا جائے۔ لیکن ہماری کوشش ناکام ہوئی۔ کل اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ لڑکی کے کوئی قریبی رشتہ دار نہیں ہیں۔ یہ چاہتی تھی کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے۔ میں نے اسے سمجھایا، تسلی دی اور بہت اصرار کر کے ساتھ لے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ امی جان اس دکھی لڑکی کو اپنی بیٹی کی طرح چاہیں گی۔ اور باجی و پروین اسے اپنی بہن سمجھیں گی۔"

بھیا نے اس لڑکی کا نام فرحین بتایا۔ میں تو بھائی کے فیصلہ سے بہت خوش ہوئی۔ لیکن نہ جانے کیوں امی جان کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ دن گذرنے لگے۔ فرحین اب ہمارے گھر کی ایک فرد کی طرح رہنے لگی۔ فرحین گھر کا کام کاج بھی سنبھالتی اور کالج بھی جاتی تھی۔ بھیا پہلے سے زیادہ شاد و مسرور رہنے لگے تھے۔ فرحین سے ان کی کافی دوستی ہوگئی تھی۔ امی تنہائی سے بور ہو کر اکثر پڑوس میں چلی جاتیں تو دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ میں نے کبھی ان کی باتوں پر دھیان ہی نہ دیا۔

مجھے صرف اپنی پڑھائی سے کام رہتا تھا۔ لیکن امی جان بے چین رہنے لگیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ بھیا کی شادی جلد ہی کر دی جائے۔

جب بھائی کو پتہ چلا کہ امی جان ان کے لئے لڑکی دیکھنے جانے والی ہیں۔ تو وہ بے چین ہو گئے۔ اور انھوں نے امی جان سے دبی زبان میں درخواست کی "اگر آپ مناسب سمجھیں تو فرحین کو ہی اپنی بہو بنا لیجئے، وہ ہر طرح سے مناسب و موزوں ہے۔"

اتنا سنتے ہی امی جان کے اندر کا لاوا پھٹ پڑا۔ انھوں نے کہا "لڑکے ہوش کی دوا کر۔ جو لڑکی ہمارے ٹکڑوں پر پل رہی ہے، اسے میں بہو بنا لوں۔ دنیا کیا کہے گی۔ میری زندگی میں تو ایسا ہو نہیں سکتا۔ میں اپنے خاندان میں بٹہ نہیں لگا سکتی۔

پھر ہمت کر کے بھیا بولے "امی جان" امی جان! آپ کی سرپرستی میں رہنے والی لاوارث کیسے ہوسکتی ہے۔"

امی جان پر اس جملے کا کوئی اثر نہ ہوا انھوں نے کہا "بکنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے کہ تم فرحین سے شادی نہ کروگے۔

بھیا بیقرار ہو کر بولے "امی جان! میں نے آپ سے کبھی کوئی التجا نہیں کی۔ میں آپ کو اپنی محبت کا واسطہ دلاتا ہوں۔ خدارا میری التجا کو ٹھکرا کر میری زندگی برباد نہ کریں۔ فرحین میری زندگی ہے

میں اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

امی جان بڑی ضدی طبیعت کی مالک تھیں۔ ان کا ہر فیصلہ ہی آخری ہوا کرتا تھا۔ بھیا اپنا جملہ پورا بھی کرنے نہ پائے تھے کہ امی جان چلا اٹھیں.....

تو جاؤ آج ہی جاکر اس لڑکی سے نکاح کر لو لیکن کل آکر تمہیں میرا جنازہ اٹھانا پڑے گا۔ چلے جاؤ..... دور ہو جاؤ میری نظروں سے.....!

بھیا بڑے سعادت مند تھے۔ انھیں امی جان سے بڑی محبت تھی۔ وہ کبھی ان کو ناراض کرنا نہ چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ امی جان کا فیصلہ اٹل فیصلہ ہے۔ اس لئے امی کے قدموں پر گرتے ہوئے انھوں نے سپر ڈال دی۔ فرحین سے انھوں نے کیا وعدہ کیا تھا اور اس نے کیا قول دیا تھا۔ امی کی ضد سے مجبور ہو کر انھوں نے کہا "امی! آپ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں۔ آپ کے لئے میں فرحین کو نہیں خود اپنے کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

بے سوچے سمجھے امی جان نے خوش ہو کر بھیا کو گلے لگا کر کہا "بیٹا! تجھ سے مجھے یہی توقع تھی۔"

اس کے بعد امی جان نے یہ فیصلہ کیا کہ بھیا سے پہلے فرحین کو رخصت کر دیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بھیا فرحین کو کتنا چاہتے ہیں اور انھیں خوف تھا کہ کہیں بہو آنے کے بعد بھیا اور فرحین کی نظریں نہ پہچان لے۔ مشاطوں کے ذریعہ انھوں نے ایک موزوں رشتہ تلاش کر لیا۔ فرحین اتنی حسین تھی کہ کوئی بھی اسے اپنا سکتا تھا۔ جھٹ پٹ بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

بھیا سے گفتگو کے بعد امی نے فرحین کا کالج جانا بند کر دیا تھا اور ہمہ وقت سائے کی طرح اس کے قریب رہتی تھیں تاکہ بھیا اس سے نہ مل سکیں۔ اور بھیا جیسے مرجھا گئے تھے۔ ان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ فرحین بیچاری تو ایک بے سہارا لڑکی تھی۔ لڑکیاں تو اپنے سگے والدین کے سامنے بھی زبان نہیں کھولتیں۔ اس گھر میں تو فرحین کچھ کہہ ہی نہ سکتی تھی۔ ایک مجبور، بے بس لڑکی کی طرح وہ اپنی شادی کے تذکرے سنتی رہی۔ اہتمام ہوتے دیکھتی رہی۔ مجھے خود اس پر رحم آتا تھا، لیکن میری کیا مجال تھی کہ میں امی جان کے سامنے زبان کھول سکتی۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب فرحین کا ہونے والا دولہا بارات لے کر آنے والا تھا۔ کوٹھی میں ایک ہنگامہ سا ہو رہا تھا۔ بھڑکدار لباسوں میں خواتین اور لڑکیاں چہلیں کرتی پھر رہی تھیں۔ امی نے شاندار پیمانے پر شادی کا اہتمام کیا تھا۔

بارات بینڈ باجے کے ساتھ آئی تھی۔ سب ہی خواتین اور لڑکیاں بارات دیکھنے بھاگیں ——— اور اسی وقت فرحین نے عقبی راستے سے راہ فرار اختیار کی۔ بارات کی خاطر مدارات کے بعد نکاح کے لئے وکیل اور شاہد اندر بھیجے گئے تو معلوم ہوا کہ فرحین موجود نہیں ہے۔ یہ بات آگ کی طرح اندر سے باہر تک پہنچ گئی۔ اور جب بھیا کو علم ہوا تو وہ جیسے پاگل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور فرحین کے تعاقب میں نکل گئے تیز ہی نہیں بے تحاشہ کار بھگاتے ہوئے وہ سڑکوں سے گزرتے رہے۔ بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن ہر جگہ انھوں نے فرحین کو دیکھا مگر وہ نہ مل سکی۔ اسی سلسلے میں آخر کار ان کی کار ایک ٹرک سے لڑ کر چکنا چور ہو گئی اور بھیا کی لاش بھی بکھر گئی۔ جب یہ خبر گھر پہنچی تو ایک قیامت بپا ہو گئی۔ بارات واپس چلی گئی۔ بھیا کا لاشہ جو اب پہچانا بھی نہ جاتا تھا گھر لایا گیا تو گھر ماتم کدہ بن گیا۔ امی جان اس حالت میں بھائی جان کی لاش دیکھ کر ہائے مارتی ہوئی گریں تو پھر انھیں ہوش ہی نہ آیا۔ بھائی جان ہی کا غم کیا کم تھا کہ یہ پہاڑ بھی مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں دیوانی ہو گئی۔ اور اگر اس وقت فرحین مجھے مل جاتی تو شاید میں اس کی بوٹیاں نوچ ڈالتی۔

فرحین کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ہماری ذلت و رسوائی ہوئی بلکہ ہمارا گھرانہ جو بھائی جان مرحوم کی آمدنی سے خوشحال ہو گیا تھا تباہ و برباد ہو گیا۔ اور ماہ پارہ ہو بہو فرحین ہے۔ جب میں نے فرحین کو دیکھا تھا تو وہ بالکل ایسی ہی تھی۔ اسی لئے مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ جب بھی میری نظر اس پر پڑتی ہے، میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میرے بھائی کا پارہ پارہ لاشہ اور ماں کی صورت یاد آ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ماہ پارہ اس ناگن فرحین ہی کی بیٹی ہو گی۔

اتنا کہہ کر نازیہ خاموش ہو گئی تو ماہ پارہ نے کہا میری ماں کا نام

بیشک نرحین ہے لیکن میں ان واقعات سے لاعلم ہوں۔ اور پھر تم ہی سوچو کہ اس میں میرا کیا قصور ہو سکتا ہے۔"

اور پھر گھر جا کر ماہ پارہ نے ماں سے کہا "امی جان! میں اب کالج نہیں جایا کروں گی۔ پروفیسر پروین میری دشمن بن گئی ہیں۔ انھوں نے نازیہ کو جو کہانی سنائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی وجہ سے ان کے بھائی اور ماں کی موت واقع ہوئی تھی۔ کیا یہ سب سچ ہے امی؟"

ماں نے ماہ پارہ کو سینے سے لگا کر آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور آواز پر بمشکل تمام قابو پاتے ہوئے کہا "بیٹی! تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور ہاں۔ خبردار یہ کہانی اپنے ابو جان سے نہ بیان کرنا۔ میں تمہیں ایک خط دوں گی۔ وہ لیجا کر تم اپنی پروفیسر صاحبہ کو دے دینا۔ اس کے بعد ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔"

اور دوسرے ہی دن ماہ پارہ کی ماں نے ایک بند لفافہ اسے دیکر کالج بھیجا اور تاکید کر دی کہ لفافہ پروین کے سوا اور کسی کو نہ دے۔ پروین نے ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ماں کا لفافہ پروفیسر پروین کو ان کے ریٹائرنگ روم میں جا کر دے دیا۔

پروفیسر پروین نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ماہ پارہ بت بنی کھڑی رہی۔ وہ غور سے پروین کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی۔ پروفیسر کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ پھر پلکیں بھیگیں اور پھر کئی آنسو خط ہی پر ٹپک پڑے۔ وہ خط پڑھنے میں اتنی منہمک تھیں کہ انھیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ ماہ پارہ ان کے قریب ہی کھڑی ہے۔ انھوں نے جلدی سے رومال اٹھا کر اپنی آنکھیں صاف کیں اور کرسی سے اٹھ کر انھوں نے ماہ پارہ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا "میری بچی۔ میرے بھائی کی نشانی!"

اور ماہ پارہ حیران تھی کہ یہ کیسا انقلاب ہوا۔ اس روز سے ماہ پارہ پروفیسر پروین کو بھی اتنی ہی عزیز ہو گئی تھی جتنی تمام گھر اور دوسری لکچررس کو عزیز تھی۔

رات کے دو بجے بچے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ماں سے کوئی نئی کہانی سنانے کی فرمائش کرنے لگا۔ ماں نے اسے سمجھایا، بیٹے ذرا صبر کرو۔ تمہارے باپ اب آتے ہی ہوں گے وہ آج بھی کوئی نئی کہانی سنائیں گے۔

حقائق

• ساس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی بہو سے بالکل ایسا ہی سلوک کرے جیسا وہ اپنی بیٹی کے لئے اس کی ساس سے خواہشمند ہو۔ بہو سے زیادتی کرنے سے پہلے اسے سوچنا چاہیئے کہ اس کی بیٹی بھی ایک دن سسرال جائے گی۔ یا جا چکی ہے جیسی راحت وہ اپنی بیٹی کے لئے چاہتی ہے اسے بھی بہو کو ایسا ہی ماحول دینا چاہیئے۔

• بہو کو بھی یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ وہ بھی ایک روز ساس بن سکتی ہے۔ اگر اس کی بہو نے اس کے ساتھ غلط اور ناروا سلوک کیا تو اس کے دل پر کیا بیتے گی۔؟

• مجھے ہمیشہ بچے کا ارمان رہا اور میرا خیال ہے کہ ایسا ارمان ہر عورت کو ہوتا ہے۔ اب میرا اپنا بچہ ہے۔ بچہ آپ کی بھلائی کے لئے بہت کچھ کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کی خود پسندی کا بہترین علاج ہے۔ مجھ میں خود پسندی کا جو رجحان تھا۔ اب وہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ (اداکارہ برشی باردوت)

کالی مرچ

صرف چٹپٹی ہی نہیں ایک مفید دوا بھی ہے

کالی مرچ کو عام طور پر ذائقہ کے لئے چاٹ وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے کھانے کے مسالوں میں بھی یہ ذائقہ کے لئے ہی ڈالی جاتی ہے، لیکن اب سائنس اور طب کے ذریعہ یہ انکشاف ہوا ہے کہ اس کے استعمال سے شریانوں میں خون کا انجماد نہیں ہوتا — خون تھکوں کی شکل میں بھی جمنے نہیں پاتا۔ اس لئے اس کا استعمال کرنے سے عوارض قلب کم ہوتے ہیں اور جو قلبی امراض میں مبتلا ہیں، انھیں اس کے استعمال سے فائدہ ہو سکتا ہے۔

کالی مرچ کسی طرح بھی استعمال کی جائے، فائدہ پہنچاتی ہے یعنی خون میں انجماد نہ پیدا ہونے سے خون مناسب انداز میں دوڑتا رہتا ہے۔ آپ کالی مرچ کھانوں میں ملا کر کھائیں، انڈوں پر چھڑک کر یا یوں ہی چبا کر کھائیں، ہر حالت میں اس سے فائدہ ہوتا ہے۔

کالی مرچ کا استعمال چٹنی اور سالن وغیرہ میں بھی عرصہ دراز سے کیا جا رہا ہے۔ شاید ہمارے متقدمین اس کی خصوصیت سے آگاہ تھے جس کا انکشاف اب سائنس دانوں نے کیا ہے۔

افسانہ

"قفس"

مشتاق لکھیم پوری

سُرخ پردوں سے ڈھکی ہوئی قفس چلی جارہی تھی۔ کہاروں کے قدم بینڈ کی آواز کے ساتھ ہلکے ہلکے اٹھ رہے تھے۔ دور سے عورتوں کے ڈھول پر گانے کی آواز اب بھی آرہی تھی "کاہے کو بیاہی بدلیس سُن بابل مورے" اس نے چپکے ہی چپکے وہ الفاظ دہرالئے "کاہے کو بیاہی بدلیس" اور نہ جانے کیوں دو بوند آنسو چھلک کر اس کے دامن پر آپڑے۔ کاش بدلیس بیاہنے سے پہلے کوئی اس کے دل کی "آرزو" بھی پوچھ لیتا۔ یہ اتنے پیار و محبت سے پرورش کرنے والے ماں باپ آخر اس موقعہ پر کیوں اپنا دل پتھر کرلیتے ہیں۔ ہائے کوئی بھی نہیں پوچھتا۔ "آن دیکھا پردیسی تجھے پسند ہے کہ نہیں۔ آن دیکھا پردیسی اس کی نیّا کا کھیون ہار۔ دُکھ سکھ کا ساتھی جانے نیّا کو کنارے تک لے جائے یا بھنور میں ہی چھوڑ دے۔

ظاہر کی ان مسرتوں میں محو ہوکر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اس پردے میں حسرتوں کے کتنے لاشے تڑپ رہے ہیں۔ کتنی آرزوؤں کا خون ہوچکا ہے۔ یہ بیاہ کا سرخ سرخ جوڑا۔ یہ ہاتھوں میں رچائی ہوئی مہندی۔ یہ مانگ کی سرخ لکیریں۔ سب ہی تو اس کی تمناؤں کے خون سے رنگی گئی ہیں۔

آخر یہ ہر ہر چیز میں "سرخی" کیوں مدغم ہورہی ہے۔ یہ قفس کا لال لال پردہ اسے کیوں گھور رہا ہے۔ اس نے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ سُرخ پردوں سے چھائی ہوئی تاریکی میں، قفس کا اندرونی سکوت آہیں بھر رہا تھا۔ وہ ضبط کرنے کے باوجود اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس تنگ دنیا سے نکل کر سامنے میدانوں میں بھاگنے لگے۔ بھاگتی رہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کی منزل اسے مل جائے اور یہ بھی نہ سہی تو وہ درختوں اور پتھروں سے ٹکرا کر اپنی جان تمام دے سکے۔

آج کا دن اس کی زندگی کے لئے ایک انقلاب تھا۔ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر آج وہ ایک اجنبی کی قید میں جارہی تھی۔ آج اس کے بانکپن کی زندگی اپنی لاش اٹھا رہی تھی بچپن کی سکھی سہیلیاں ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی دنیا خوش تھی۔ ماں باپ نے جاتے جاتے یہ الفاظ کہے تھے "بیٹی اپنے شوہر کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا اور کبھی اس کے حکم سے انحراف نہ کرنا" وہ ماں باپ جنھوں نے اپنے حکم کی عدم تعمیل پر کبھی ایک لفظ نہ کہا تھا۔ آج غیر شخص کے لئے زندگی مٹا دینے کی تلقین کررہے تھے۔ "ہائے" اس نے ایک آہ کھینچی۔ کل تک وہ ایک لڑکی تھی۔ اسے دنیا کی فکر نہ تھی لیکن۔ آج سے اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑا تھا اور اس کے وہ سارے سنہرے محل، جو اس نے اپنی زندگی کے لئے بنائے تھے مسمار ہوگئے تھے اس نے چپکے سے گردو پیش پر پھر ایک نظر ڈالی۔ وہ بنک کچی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی گئی تھی۔ آگے آگے بینڈ اب بھی بج رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ رو پڑے اور اپنی قفس سے سر ٹکرا کر اپنی جان دیدے۔ آخر یہ ہر شخص اس کے زخموں پر نمک پاشی کیوں کررہا ہے۔ یہ بینڈ درد بھرے نغمے کیوں الاپ رہا ہے۔ اور اسی وقت اس کی نگاہوں میں بھائی کی وہ تصویر پھر گئی۔ جب اس نے روتے ہوئے بہن کو یہ کہکر جدا کیا تھا۔ جا میری معصوم بہن تیری امیدوں کی لاشوں کے ساتھ تیرے بھائی کے دلی تاثرات کا جنازہ بھی جارہے گا۔

بھیّا کے یہ آخری جملے اس کے دل پر تیر کی طرح چبھنے لگے۔ سارے گھر میں وہی تو ایک ایسا تھا جس نے اسکے آرام کو آرام اور اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا تھا اور جب اسکی پالکی کہاروں نے اٹھائی تھی اور اس نے ایک آخری نظر گھر کے در و دیوار پر ڈالی تھی اس وقت کی وہ آنسو بھری شکلیں دیکھ کر اس کا کلیجہ اُمڈ آیا تھا۔ پھر ایسے میں بھیّا کے یہ جملے کیا اسے بھول سکتے تھے۔ بچپن کا وہ زمانہ اسے بھولا نہ تھا۔ جب وہ بھیا کو ساتھ لے کر خالہ کے گھر کھیلنے جاتی تھی اور سلیم اسکی خالہ کا لڑکا اپنے تمام کھلونے اس کے قدموں میں ڈال دیتا تھا۔ خالہ اس کی طرف پیار سے دیکھتیں اور کہتیں۔ سلمٰی آ۔ تو تو ہمارے گھر کی رانی ہے۔ وہ شرما کر خالہ کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے لئے مانگ لئے گئے تھے۔ اور پھر سن شعور کا وہ زمانہ۔ وہ اسکول میں

بڑھتی جاتی تھی۔ اور سلیم اس کی بہن کے گرد چکر لگایا کرتا تھا۔ سگائی کے بعد ہی دونوں ایک دوسرے میں کتنا جذب ہو گئے تھے۔ جانتے تھے کہ اب ہماری زندگی دائمی طور پر ایک دوسرے کے لئے بنادی گئی ہے۔ بھیا کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی اول تو سلیم ان کا خالہ زاد بھائی تھا پھر یہ سبھی کو معلوم تھا کہ ان کی سلمیٰ اس سے کتنا پیار رکھتی تھی۔ مگر زمانے کے انقلاب اور قسمت کے لکھے کو مٹانا کھیل نہ تھا۔ یہ تو ڈرامے کے پردے تھے جو کے بعد دیگرے اٹھ رہے تھے اور اس کا ڈراپ سین ہونا لازمی تھا کسی آپسی معاملہ میں خالہ اور امی میں تنازعہ ہو گیا اور یہ جھگڑا اس قدر بڑھا کہ جملہ تعلقات منقطع ہو گئے۔ امی نے اس کی شادی فوراً دوسری جگہ طے کر لی اور بغیر انجام پر نظر کئے آج اپنے دروازے سے ہمیشہ کے لئے ایک محبت بھری کلی کو جدا کر دیا۔ اسے یاد تھا بھیا نے اس کے لئے کتنی کوششیں کی تھیں گھر چھوڑ دینے پر تیار ہو گئے تھے مگر ماں باپ کی ضد کے آگے ان کی بھی کچھ نہ چلی وہ شادی میں شریک نہ ہوئے لیکن ماں باپ سے کوئی پرواہ کئے بغیر اپنے پالنے پوسنے کا حق آج اپنی بے زبان لڑکی کی قربانی کر کے وصول کر لیا تھا۔ اس کا رونا دھونا ایک رسمی چیز سمجھ لیا گیا تھا۔ کسی نے اس زخم کو نہ دیکھا جس کا خون آنکھوں کے راستہ بہہ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے آخر اس کے سب ساتھی چھوٹ گئے اور اس کی پالکی غیروں کے احاطہ میں آ گئی۔ اور اس کا سلیم۔ وہ سلیم جس نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی آج ہمیشہ کے لئے تنہا رہ گیا۔ ہاں! اس کا وہ آنسو بھرا چہرا جس میں نہ معلوم کتنی حسرتیں پنہاں تھیں اس کے دل میں ایک آخری نقش چھوڑ گیا۔ اور اس کو وہ اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے آج ان گلیوں سے جا رہی تھی۔ اپنے جیون کی آرتھی کو خود اپنے ہاتھوں "شمشان" تک پہنچانے۔ کون جانے۔ اب انجام کیا ہو۔؟ دور کوؤں کی کائیں کائیں۔ اور بچوں کے شور و پکار سے وہ چونک پڑی۔ شاید سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور شام کی سیاہی فضا میں حلول کر رہی تھی۔ قریب سے کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی "ڈولے کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا آیا پرایا دیس رے سن بابل موہرے" اس نے چپکے سے پردہ اٹھا کر دیکھا کہ واقعی پرایا دیس آ چکا تھا۔ قصبہ کی عورتیں اور بچے ادھر ادھر سے جمع ہو کر بارات کی خوشیوں میں شریک ہو رہے تھے۔ اس کے جیون کی ارتھی شمشان پہونچ چکی تھی۔

لطیفے

• بیوی اپنے میاں کے ساتھ علاج کی غرض سے ڈاکٹر کے پاس گئی ڈاکٹر نے معائنے کے لئے بیوی کو اندر بلایا پردہ برابر کر کے جب وہ اس کا معائنہ کرنے لگا تو بیوی نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔ آپ نرس کو وہیں کیوں چھوڑ آئے ہیں ساتھ نہیں لائے۔

ڈاکٹر نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کیوں مجھ پر بھروسہ نہیں۔

نہیں آپ پر تو بھروسہ ہے مگر مجھے اپنے میاں پر نہیں!

• آپ جانتے ہیں کچھ لڑکیاں کسی فوجی سے شادی کرنے کی خواہش مند کیوں ہوتی ہیں؟ اس لئے کہ فوجی اسمارٹ اور صحت مند ہوتا ہے، وہ کھانا پکا سکتا ہے بستر بچھا اور تہہ کر سکتا ہے، قمیض کو بٹن لگا سکتا ہے جھاڑ پونچھ کر سکتا ہے اور اسے ہر وقت حکم سننے اور حکم کی تعمیل کرنے کی عادت ہوتی ہے، اور پھر یہ بھی کہ وہ ہر روز سر پر سوار نہیں رہتے۔ بیوی زیادہ تر آزاد ہی رہتی ہے۔

ماں نے بیٹی سے کہا "بیٹی اتنی دیر سے بالکونی میں کھڑی کیا کر رہی ہو؟

بیٹی نے جواب دیا۔ امی چاند دیکھ رہی ہوں۔

ماں نے کہا "اب اندر آ جاؤ اور چاند سے کہو کہ وہ بھی گھر جائے رات بہت ہو گئی ہے۔

• میاں بیوی شام کے وقت ڈرائینگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بیوی نے ریسیور اٹھانا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی شوہر نے ریسیور اٹھا لیا اور پھر ایک لمحے بعد ہی جھلا کر کہا: "مجھے کیا معلوم! تم محکمۂ موسمیات سے بات کیوں نہیں کرتے"؟ یہ کہکر اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

"کون تھا۔ ڈارلنگ"؟ بیوی نے بے چینی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں کون گدھا تھا، پوچھ رہا تھا کہ مطلع صاف ہے یا نہیں"

نقشِ وفا

امروز جہاں (ملکی محلہ آرہ)

رات سرد اور تاریک تھی۔ آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے کمرہ نیم گرم ہو رہا تھا۔ سامنے ہی منہاج صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ سلگ کر ختم ہو رہی تھی لیکن انھیں تپش کا احساس ہی کہاں تھا۔ ایسی ہی آگ تو ان کے اندر بھی لگی ہوئی تھی، جس میں وہ سلگ رہے تھے۔ انھیں کسی پل قرار نہیں تھا۔ سامنے ٹیبل پر ہما کی مسکراتی تصویر فریم میں جکڑی رکھی تھی۔

شیشے کے اُس پار ان کی ہما تھی۔ یہ شیشے کی دیوار اتنی آہنی اور مضبوط نہ تھی جسے گرا کر وہ اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اب دونوں کے بیچ ایک ایسی دیوار حائل تھی جسے جیتے جی توڑا نہ جا سکتا تھا۔

یہ دیوار خود منہاج کی ہی کھڑی کی ہوئی تھی۔
خود انھوں نے ہی تو ہما سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔
ہما تو بے قصور تھی۔
ہما جو کبھی اس کی سب کچھ تھی! اور آخر تک وفاکیش رہی گویا محبت بھی لباس ہے کہ جب چاہا مرضی کے مطابق تبدیل کر لیا۔ منہاج اب پریشان تھے۔ پشیمان تھے۔ لیکن وقت اپنے ساتھ سب کچھ لیتا چلا گیا اور اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان کی ہما اب انھیں دوبارہ نہیں مل سکتی تھی۔

یہ کیسا انتقام ہما نے لیا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا وہ جیتے جی مجھے بڑی سے بڑی سزا دے دیتی۔ لیکن عورت کا یہ روپ کسی نے دیکھا ہے۔ جسے عورت کی خودداری کہتے ہیں۔ عورت بار بار پامال نہیں کی جا سکتی۔ عورت تو ایسا آبگینہ ہے جس کی حفاظت نہ کی جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بکھر جاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود عورت عظیم ہے اور عظیم ہی رہے گی۔

ہما نے انھیں عمر بھر کی اذیت میں یوں مبتلا کیا تھا جس سے نجات کی کوئی راہ نہ تھی۔ منہاج زندگی کو بوجھ کی طرح گھسیٹ رہے تھے۔ کیا بگڑ جاتا ان کا جو وہ ہما کی جفاؤں کا تذکرہ نہ پیش کرتے۔ آج مر مر کے جینا تو نہ پڑتا۔ وہ سدا سے ہی ان کی تھی۔ ان کی محبت پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والی۔ منہاج کی محبت کی دیوانی منہاج کی دید کی پیاسی۔ ان کے پیار کی متلاشی ——— پھر یہ سب کچھ کیا ہو گیا تھا۔ وہ سوچتے سوچتے چار سال پہلے کی بیتی یادوں میں کھو گئے۔

الطاف متوسط طبقہ کے ایک غیور انسان تھے۔ خدا نے انھیں تین تین بیٹیاں ہی دی تھیں پھر بھی وہ خوش تھے۔ بیوی ایک وفا شعار خاتون تھیں۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ کہ ایک سانحہ ان سب پر سے گزر گیا۔ الطاف صاحب کے بہن اور بہنوئی اپنے دس سالہ بچے کو چھوڑ کر حادثے کا شکار ہو گئے۔ الطاف صاحب نے بہن کے غم کو اسی طرح بھلانا چاہا کہ منہاج کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ وہ انھیں کے شفیق سائے میں پلتا رہا۔ الطاف صاحب اپنی دو لڑکیوں کی شادی کر چکے تھے اب صرف سب سے چھوٹی لڑکی ہما رہ گئی تھی جو منہاج سے پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے گھل مل گئے دونوں کی معصوم زندگی ہنستے کھیلتے ایک ساتھ اسکول جاتے گزر رہی تھی۔

رفتہ رفتہ دونوں نے بچپن کو پیچھے چھوڑا اور جوانی کی حدود میں داخل ہوئے۔ منہاج۔ ایم۔ ایس۔ سی اور ہما بی۔ اے کے آخری سال میں تھی۔ ایک ہی کالج میں دونوں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دونوں کی امنگوں پر بہار کا سایہ تھا۔ ایک دوسرے کو چاہنے والے، ایک دوسرے پر مر مٹنے والے۔ اپنی صاف پاک محبت پر سب کچھ قربان کر دینے والے۔ منہاج کی محبت اگر لازوال تھی تو ہما کی محبت پر فرشتے رشک کر سکتے تھے ان دونوں کے رازِ محبت سے گھر کے سبھی افراد واقف تھے لیکن کسی کی نظروں میں یہ گناہ نہ تھا جو انھیں ایک دوسرے سے جدا کر سکتا۔ سبھی جانتے تھے یہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔

ہما بی۔ اے کا امتحان دے کر گھر بیٹھ رہی۔ منہاج کو ایم سی کرنے کے بعد اسی کالج میں لیکچرر کی جگہ مل گئی تھی۔ دونوں مستقبل کے حسین تانے بانے بنتے رہتے تھے۔ ہما گھر پر منہاج کے چھوٹے بڑے سارے کام کرتے ہوئے وہ اپنی چھوٹی سی خوبصورت دنیا میں

مگن تھی۔ الطاف صاحب کو بھی اطمینان تھا کہ ہما کے لئے غیروں میں جا بکنا نہیں پڑے گا۔

لیکن یکایک وقت نے اپنے تیور بدلے۔ پرسکون سمندر میں دفعتاً طوفان آگیا۔ موجوں کے مدوجزر میں ہما کی نیا ڈگمگانے لگی۔

منہاج کے کالج میں بی۔ ایس۔ سی۔ میں ایک نئی طالبہ آئی ہوئی تھی۔ تزئین۔ سیدھی سادی مگر ایسی حسین کہ قدرت کا شاہکار معلوم ہوتی۔ کالج کے تمام دل پھینک نوجوانوں کا مرکز نظر بنی ہوئی تزئین منہاج کی نگاہوں میں بھی سما گئی۔ منہاج نے اپنی پندرہ سال پرانی محبت کو جڑ سے اکھاڑ کر تزئین کے حسن کا نیا پودا لگا دیا۔ وہ بھول گئے اپنی ہما کو۔ ایک پجارن کو جو دن رات ان کی پرستش میں مگن رہتی تھی۔

وہ بدلے۔ بدلے سے رہنے لگے تھے۔ ہما اگر پریشان تھی تو گھر والے حیران۔ لیکن وہ ہر بات ہنس کر ٹال جاتے۔ ہما ساری ساری رات ان کا انتظار دیکھتی اور وہ دوسرے دروازے سے آکر اپنے کمرے میں سو جاتے۔

آخر کار ایک دن ہما ہمت کر کے پوچھ ہی بیٹھی۔ "آپ کو ایسی کون سی پریشانی لاحق ہے جو آپ مجھے بھی نہیں بتا سکتے۔ ایسی کون سی مصروفیت ہے جو اب آپ مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔ ہما نے سوالوں کی بوچھار کر دی۔

منہاج نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔ لیکن ہما نے ٹھان رکھی تھی کہ آج وہ جواب لے کر ہی رہے گی۔ اس نے کہا آپ کو بتانا ہی پڑے گا کہ اتنے بیگانے کیوں بن گئے ہیں

"پریشان نہ کرو ہما" منہاج نے تیور بدل کر تلخ لہجے میں کہا مجھے اب اتنا وقت نہیں ملتا کہ میں تمہارے پاس بیٹھ کر برباد کروں۔ میری ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئی ہوگی — اور!

ہما سکتے میں رہ گئی۔ اسے منہاج کا ایک ایک لفظ بجلی کے شاک جیسا لگ رہا تھا۔ سب کچھ بڑی دور دور نظر آنے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا یہ سب کچھ منہاج نے ہی کہا ہے۔ وہ بوجھل قدموں سے لوٹ آئی۔

اس کے بعد ہما کے لبوں پر کوئی فریاد نہ مچلی۔ نہ گلے نہ شکوے۔ بس خاموش رہنے لگی۔ بظاہر اُسے اپنی محبت کے بدل جانے کا کوئی ملال نہ تھا۔ لیکن کوئی کیا جانے کہ ہما کے دل پر کیا گزری۔ وہ ٹوٹ گئی۔ بکھر گئی اور دفعتاً سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ کالی اندھیری اور لمبی لمبی راتیں اب اس کی تنہا غمگسار تھیں اور وہ تمام راتیں اس نے اشکوں کی نذر کر دیں۔

منہاج کا سرد رویہ کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ الطاف صاحب فطرتاً بڑے شریف انسان تھے۔ کچھ دنوں تک انھوں نے سب کچھ محسوس کیا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر ہما کے لئے ایک رشتہ ڈھونڈھ کر لے آئے۔ بعد ازاں تب ہما پر آخری پہاڑ ٹوٹ پڑا وہ پاگل ہو گئی۔ دیوانی بن گئی اور اس نے دیوانہ وار منہاج کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اسے محبت کا واسطہ دیا۔ گزرے ہوئے محبت بھرے لمحے یاد دلائے۔

لیکن منہاج تو تزئین کا دیوانہ بن چکا تھا۔ اسے اب کوئی ہما یاد نہیں تھی اس نے براہ راست الطاف صاحب سے کہہ دیا کہ یہ رشتہ ہما کے لئے موزوں ہے۔ ہما کی شادی کے بعد میں بھی آپکی خدمت میں آپ کی بہو کو حاضر کر دوں گا۔

اور تب ہما کے ہونٹوں پر دعائیں مچل کر دم توڑ گئیں خدا کرے تم سلامت رہو۔

کس سوتن نے روکی ڈگریا
کس بیرن کی لاگی نجریا

نہ جانے کس ظالم نے ریڈیو آن کر دیا ہما نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لئے ہما کی شادی کی تیاریاں ہونے لگی۔

منہاج ہما کے لئے ایسا تحفہ لینا چاہتے تھے جو تزئین کا پسند کردہ ہو۔ دونوں کالج سے سیدھے مارکٹ آئے۔ تزئین نے ایک خوبصورت تاج محل پسند کیا۔ شاید اسے ہما کے محسوسات کا اندازہ تھا—

دونوں دوکان سے باہر آئے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

منہاج تزئین کو ہما سے ملانا چاہتے تھے۔

دونوں مسرور و شاداں چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً وقت کی تیز رفتار آندھی نے اپنا خوفناک پنجہ دونوں پر گاڑ دیا۔ سامنے سے آتی ہوئی ایک لاری ان کی ٹیکسی سے ٹکرا گئی۔ ہما کی آہ جگمگا اٹھنے لگی۔ اور سب کچھ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اسی حادثے نے غیروں کی آنکھیں نم کر دیں۔ تزئین نے

جانے حادثہ ہی کیا [illegible] دیا۔ منہاج پانچ دنوں بعد ہوش میں آئے تھے۔ انھیں خون کی سخت ضرورت تھی اور تمام کوششوں کے باوجود بھی ان کے گروپ کا خون کہیں نہیں مل رہا تھا۔

ان سب سے الگ تھلگ ایک اور دیوانی ہستی تھی۔ جسے دن رات کا ہوش نہ تھا شاید منہاج کی بربادی نے اسے بالکل ہی دیوانہ اور سودائی بنا دیا تھا اور تب محبت نے اپنی قربانی دی۔ ہما نے ڈاکٹروں سے منت سماجت کی خدا کے لئے ڈاکٹر میرا خون ٹسٹ کیجئے۔ اور انھیں موت کے منہ سے بچا لیجئے۔ ڈاکٹر اسے الگ کمرے میں لے گئے

منہاج کی رگوں میں ہما کا خون تیزی سے سرایت کر رہا تھا۔ ایک زندگی کی طرف پلٹ رہا تھا۔ دوسرا موت سے ہمکنار ہو رہا تھا۔

ہما کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ وہ ہار کر بھی جیت گئی تھی۔

منہاج نے رفتہ رفتہ آنکھیں کھولیں۔ الطاف صاحب اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔

اب کیسے ہو بیٹے۔ آنکھیں کھولو مجھے دیکھو میں ....!

اسی وقت نرس گھبرائی ہوئی وارڈ میں داخل ہوئی اور ڈاکٹروں کو پکڑ لے گئی۔

ڈاکٹر صاحب اس لڑکی کی حالت سیریس ہے جس نے مسٹر منہاج کو خون دیا ہے۔

نرس کے پیچھے ہی سب وارڈ سے نکل گئے۔

منہاج سوچنے لگے نہ جانے وہ کون خدا کی نیک بندی ہے جس نے اپنے خون سے انھیں زندگی بخشی۔

رفتہ رفتہ انھیں سب کچھ یاد آنے لگا کہ ہوش گنوانے سے پہلے ہی انھوں نے تڑپ کر دم توڑتے دیکھا تھا۔ وہ گرم گرم آنسوؤں سے رونے لگے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آ رہا تھا۔

ہما کی بے وفائی نے انھیں تڑپا دیا تھا۔ ہما کی آہیں انھیں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ قدرت نے انھیں ہما سے برتی ہوئی بے توجہی کی بڑی سخت سزا دی تھی وہ پشیمان تھے۔

وارڈ کے باہر اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ان کی نگاہیں دروازے پر مرکوز تھیں۔

نرس انجکشن لئے وارڈ میں داخل ہوئی۔

سسٹر یہ کیسا ہنگامہ ہے باہر؟

جس لڑکی نے آپ کو خون دیا تھا وہ مر گئی۔ نہ جانے اس نے کیا کھا لیا تھا۔ پوسٹمارٹم ہوگا۔

سسٹر وہ کون لڑکی تھی۔ پلیز مجھے اس کے پاس لے چلو۔ مجھے بتاؤ وہ کون تھی۔ آپ ابھی نہیں چل سکتے مسٹر!

خدا کے لئے اس کا نام ہی بتا دو سسٹر پلیز میں تم سے التجا کرتا ہوں؟ ٹھہریئے میں رجسٹر دیکھ کر بتاتی ہوں کہتی ہوئی سسٹر باہر چلی گئی اور چند ہی منٹ بعد واپس آکر اس نے کہا مسٹر منہاج اس کا نام ہما تھا۔ دور کہیں بجلی گری آسمان میں زبردست کڑکتا ہوا بادل چنگھاڑنے لگے۔ ہوائیں دیوانہ وار کھڑکی سے ٹکرائیں اور شیشے کا اگالدان گر کر چکنا چور ہو گیا۔

نہیں۔ نہیں۔ ایک دلخراش چیخ ہسپتال کے در و دیوار کو ہلا گئی۔

منہاج دیوانہ وار نرس کو دھکا دیتے وارڈ سے نکل بھاگے۔ ہما کی زرد رنگ کی لاش چادر سے ڈھکی تھی۔ وہ گر پڑے محبت کی دیوانی پر۔ چومنے لگے اس کے پیروں کو بڑھ کر وفاؤں کا بھرم رکھنے کے لئے ہما نے اپنے آپ کو گنوا دیا۔

وقت کی آندھی نے سب تہہ و بالا کر ڈالا۔ وقت کے ساتھ ہر زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن منہاج کے دل میں ہما کی وفاؤں کا زخم تازہ ہی رہا۔ وقت کی گردش اسے مندمل نہ کر سکی۔ ہما نے عمر بھر کا روگ لگا دیا تھا اب وہ جب تک زندہ رہیں گے مر مر کے جیتے رہیں گے ہما کا خون چیخ چیخ کر اپنی امر ہو جانے والی محبت کی یاد دلاتا رہے گا۔

محبت کا ایسا انداز ہما نے دیا تھا کہ منہاج کی جفائیں ان کے لئے ناسور بن گئی تھی۔

ہما جیت گئی تھی وہ ہار گئے تھے۔ ان کی کشتی حیات کو دو کنارے ملے دونوں طوفان کی نذر ہو گئے۔ آج چار برسوں سے وہ ہما کی یاد میں سلگ رہے تھے۔ ہما نے اپنی وفاؤں کا گہرا نقش انکے دل پر ثبت کیا تھا کہ وہ بے قرار رہتے تھے۔ بے چین رہتے تھے۔ ہما کی یادوں کی تپش نہ جانے کب تک انھیں جلاتی رہیگی۔

بچوں کا جیب خرچ

سعیدہ طاہرہ صدیقی

ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لئے انسان کو جہاں اور بہت سی باتوں کی آگہی ضروری ہے وہاں اس کے لئے یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ وہ یہ جانے اور سمجھے کہ پیسا کس طرح کمایا، بچایا اور خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ بات سیکھنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

جو تجربہ ہمارے ماں باپ کو ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ ہم کو بھی بڑے ہو کر وہی تجربہ حاصل ہو جائے۔ یہ تجربہ اسی وقت پختہ ہوتا ہے، جب ہم اپنے بچوں کو شروع ہی سے رقم خرچ کرنے اور بچانے کی تعلیم دیں اور اس کے لئے ہمیں اپنے بچوں کو شروع ہی سے کچھ پیسے خرچ کے لئے دینے چاہئیں، تاکہ جب بچے کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ اپنی خواہش پر سوچ سمجھ کر خرچ کرے۔ وہ والدین جو بچوں کو اس لطف سے محروم کر دیتے ہیں جو انھیں اپنا روپیہ اپنے پاس رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح خود اسے اپنے فیصلے کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ منصوبہ بنانا اس کو انتظام سے خرچ کرنا اور پھر اپنی قوتِ فیصلہ کو استعمال کرنا، یہ وہ عمل ہے جو بچے کو رفتہ رفتہ روپے پیسے خرچ کرنے کا طریقہ سکھا دیتا ہے۔

جب بچوں کے پاس اپنی ایک رقم ہوتی ہے اور وہ اسے جمع کرتے یا منصوبہ بنا کر خرچ کرتے ہیں تو انھیں چھوٹے پیمانے پر بڑوں کی ذمے داری کا لطف آتا ہے۔

اس خوشی کا موقع آپ اپنے بچوں کو اس طرح دے سکتے ہیں کہ اسے ایک مقررہ رقم ہفتہ وار یا ماہوار دیں اور اسے سمجھائیں کہ سمجھ دار لوگ کس طرح سلیقے سے اپنا پیسہ خرچ کرتے ہیں اور پھر اسے یہ بھی بتائیں کہ وہ کس صورت میں بچت بھی کرتا رہے۔

خوش حال والدین عام طور سے اپنے بچوں کو بڑی بے ترتیبی سے پیسے دیتے ہیں۔

اس طرح سے بچہ جب پیسے حاصل کرتا ہے تو وہ اسے خوش اسلوبی سے خرچ کرنا تو در کنار وہ یہ کبھی سوچے گا بھی نہیں کہ اس میں سے کچھ پیسے اسے بچانے بھی چاہئیں۔

بچوں کو جیب خرچ دیتے وقت ان کی عمر اور ضرورت کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی والدین کو اس کا بھی خیال ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی حیثیت سے زیادہ پیسے بچے کو خرچ کرنے کو نہ دیں۔

بچے کو زیادہ پیسے دینا شدید غلطی ہوتی ہے۔ جب کوئی بچہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ پیسے پاتا ہے تو وہ اس کو خواہ مخواہ خرچ کر کے دوسروں پر اپنا رعب جماتا ہے اپنے کو دوسروں کے مقابلے میں بڑا سمجھنے لگتا ہے۔

اگر والدین اپنے بچوں کو زیادہ پیسے دینا بھی چاہتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچے کو یہ بھی سکھائیں کہ وہ پیسے جو اس کے پاس فالتو ہیں ان کو ادھر ادھر بے کار خرچ کرنے کے بجائے کس طرح بچائے۔

مثلاً اکبر کے والدین اکبر کو ایک مقررہ رقم ہر ماہ دیتے رہے اور اس کو یہ سمجھاتے رہے کہ وہ کس طرح اسے خرچ کرے۔ اکبر نے پیسے تو خرچ کیے، لیکن اپنے پیسے بچا کر رکھنے اور انھیں کسی خاص موقع پر خرچ کرنے کے طریقہ پر وہ عمل نہ کر سکا۔

شہر میں کوئی مشہور کھیل آیا۔ اکبر نے اس کو دیکھنا چاہا، چونکہ اس کے پاس اپنی رقم نہ تھی، اس لئے اس نے اپنے والدین سے پیسے مانگے، لیکن والدین نے محض تنبیہ کی غرض سے اس کو پیسے دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اسکو اپنی رقم پہلے ہی انتظام اور منصوبے کے مطابق خرچ کرنی چاہیئے تھی۔

اکبر کو اس کھیل کے نہ دیکھنے کا افسوس ہوا، لیکن آئندہ وہ اپنے جیب خرچ میں سے تھوڑا تھوڑا بچا کر رکھنے لگا۔ اکبر کے والدین نے اپنے بچے کا وقتی طور پر دل تو ضرور توڑا، لیکن اس کو ہمیشہ کے لئے پیسے قاعدے اور منصوبے کے مطابق خرچ کرنے اور بچانے کا سبق سکھا دیا۔

سمجھ دار والدین اپنے بچوں کی عمر، ان کی ضرورتیں اور اپنی آمدنی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انھیں اپنے بچوں کو پیسے خرچ کرنے کے کیا طریقے سکھانے چاہئیں۔ بعض بچوں کو یہ بتانے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے کہ ان کے والدین کی ماہانہ یا سالانہ آمدنی کیا ہے اور یہ کہ وہ (والدین) زیادہ سے زیادہ کتنے پیسے اپنے بچوں کو جیب خرچ کے لئے دے سکتے ہیں، لیکن اس تربیت میں اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ والدین کا کوئی رویہ بچے میں احساس کم تری پیدا کرنے کا موجب نہ بنے اور نہ یہ کہ والدین کی کوئی بات بچے کو ایسے احساسِ برتری میں مبتلا کر دے کہ بعد میں اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے کی نوبت آ جائے۔

(بشکریہ ہمدرد صحت۔ کراچی)

نئے خواب نئے عزائم

ریاست مسلسل ترقی کی جانب گامزن
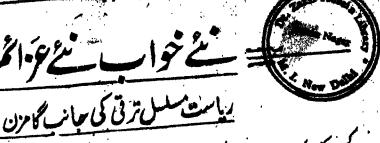
کسی بھی ملک یا ریاست کی شرح نمو میں اضافہ کا مطلب ہے وہاں کے باشندوں کی
آمدنی میں اضافہ۔ زراعت پر منحصر علاقوں میں یہ اضافہ خاص طور سے اناج کی پیداوار
اور کارخانوں کی پیداوار پر مبنی ہوتا ہے۔

اترپردیش میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے آبپاشی کی سہولتوں میں توسیع کی گئی۔
کسانوں کو کیمیاوی کھاد وافر مقدار میں فراہم کی گئی زیادہ سے زیادہ رقبے کو زیادہ پیداوار
دینے والی اقسام کے تحت لایا گیا اور خشک کاشت کے ترقی یافتہ طریقے بھی اپنائے گئے
چھٹے منصوبے سے قبل تک ریاست میں آبپاشی کے تمام وسائل سے ۱۲۹٫۶۳ لاکھ ہیکٹر
رقبہ سیراب تھا جو ۸۳-۱۹۸۲ کے آخر تک بڑھ کر ۱۸۰٫۶۰۵ لاکھ ہیکٹر اور ۸۴-۱۹۸۳ کے
آخر تک ۲۰۷٫۶۷ لاکھ ہیکٹر ہوگیا۔

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ریاست میں ۸۱-۱۹۸۰ کے دوران اناج کی مجموعی پیداوار
۲۴۹٫۴۵ لاکھ میٹرک ٹن تھی، وہیں سال ۸۳-۱۹۸۲ کے آخر تک بڑھ کر یہ پیداوار ۲۶۵٫۵۲
لاکھ ٹن ہوگئی جو اس سال کے مقررہ نشانہ سے بھی زیادہ تھی۔ اس سال ملک بھر میں
گیہوں کی پیداوار ۴۷ لاکھ میٹرک ٹن بڑھی جس میں اس ریاست کا اپنا حصہ ۲۵ لاکھ
میٹرک ٹن تھا۔

اور اب ابتدائی تخمینوں کے بموجب ۸۴-۱۹۸۳ میں خریف کی پیداوار گزشتہ سال کے
مقابلے میں تقریباً ۱۹ لاکھ میٹرک ٹن زیادہ ہوئی جو ایک نیا ریکارڈ ہے۔ ربیع کی پیداوار بھی مقررہ
نشانہ سے ۱۸۱٫۶۰ لاکھ میٹرک ٹن سے زیادہ ہونے کی توقع ہے۔ اس سال گیہوں کے پیداواری رقبہ
میں بھی نیا ریکارڈ قائم ہونے کی پوری امید ہے۔

دوسری جانب صنعتی پیداوار کا اشاریہ بھی ۷۱-۱۹۷۰ کے مقابلے میں ۸۳-۱۹۸۲ کے دوران ۲۱۷٫۰۵ ہوگیا۔
دیہی اور چھوٹی صنعتوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ بجلی کی تنصیبی صلاحیت اور اصل پیداوار میں
امید افزا اضافہ کے باعث ریاست کے ۵۸۰۰۵ مواضعات میں اب بجلی دستیاب ہے۔

اترپردیش ترقی کی دوڑ میں اب پیچھے نہیں ہے۔

جاری کردہ :۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

انتقال پر ملال کی خبریں

• ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ اردو کے ایک مشہور ادیب اور ناول نگار جناب ضیا عظیم آبادی کا لکھنؤ میں گزشتہ ماہ انتقال ہو گیا۔ ضیا صاحب کا مستقل قیام لکھنؤ ہی میں تھا اور ذریعہ معاش تصنیف و تالیف کا کام ہی تھا، اس لئے ساری عمر نہایت عسرت و کس مپرسی کی حالت میں بسر ہوئی ـــــ حالانکہ انھیں قلم و ادب پر کافی عبور حاصل تھا۔ پھر بھی مرحوم کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ ضیا صاحب نے بہت سے ناول اور ادبی کتب لکھیں، لیکن انھیں اچھے پبلشر نہیں ملے۔ بڑے نیک اور سادہ مزاج انسان تھے، جو کچھ مل جاتا اسی پر قناعت کرتے تھے۔ عظیم آباد اور لکھنؤ دونوں کے تعلق نے انھیں حد درجہ مہذب اور شائستہ بنا دیا تھا۔ ملتے تو ایسی کسرِ نفسی کا اظہار کرتے کہ ملنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ لکھنؤ کی متعدد ادبی انجمنوں نے ان کے انتقال پر تعزیتی جلسے کئے۔ یقین ہے کہ اردو اکادمی مرحوم کے پسماندگان کی مالی امداد سے دریغ نہ کرے گی۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• درسلا طاہرہ سعد تحسینہ تبسم (آمبور) دلی افسوس کے ساتھ تحریر کر رہی ہوں کہ میری پھوپی زاد بہن کی نبیرہ بانو ۲۰ر جولائی ۱۹۸۸ء بروز جمعہ اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ کی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی۔ انتقال کے روز ۱۰ بجے یکایک بخار آ گیا، اسپتال لے جایا گیا۔ ۱۲ بجے قلبی دورہ پڑا اور اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس حادثہ پر ایک کہرام مچ گیا۔ ایسی نوجوان موت پر کون ہے جو آنسو نہ بہاتا۔ اللہ پاک مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• بجمہ محمود (بنگلور) افسوس میرے شفیق والد محترم عثمان عبدالستار سیٹھ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک ۱۱ر جولائی ۱۹۸۸ء کی صبح ۱۰ سوا آٹھ بجے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک انھیں غریقِ رحمت کرے۔ مرحوم بڑے مہمان نواز اور ہمدرد خلائق تھے۔ قاری بہنیں دعا فرمائیں کہ اللہ پاک ہمیں صبر کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔

عفت موہانی کا نیا ناول

نقاب

(۱۲/-)

[illegible] کے مقبول ترین ناول

ناول	مصنفہ	قیمت
ہارجیت	عفت موہانی	۱۶/-
بادل کا سایہ	شہناز کنول	۲۰/-
تشنہ کام	عفت موہانی	۲۴/-
کشور	نسیم دہلوی	۱۲/-
سارے جہاں کا درد	رفیعہ منظور الامین	۲۴/-
کالجسہ	عطیہ پروین	۲۲/۵۰
مرحلہ	"	۱۰/-
تمہارے لئے	"	۳۰/-
شرافت	اوشا بالا	۲۵/-
خواب زخمی ہیں	ثروت ذکی	۲۲/-
لازوال	بشریٰ رحمٰن	۸۰/-
پیاسی	"	۶۰/-
نورینہ	رضیہ بٹ	۲۰/-
پناہ گاہ	سلمیٰ کنول	۲۵/-
اندھی راہیں	تنویر زہرہ بخاری	۲۵/-
بے نشان راستے	بلقیس ظفر	۳۰/-
مجبوری	روحی اعظم	۲۵/-
پہلا آنسو تک	نسیم مظہر	۲۰/-
آہ	شہناز نرگس	۲۵/-
بھیگے ہوئے رخسار	نائلہ طارق	۴۵/-
جھوٹے سپنے لوگ	سعیدہ یانفضل	۲۵/-
گردش دوراں	بیگم رفیعہ سلیم	۲۵/-
چشمہ	اے آر خاتون	۳۶/-
گردشیں	مسرور جہاں	۱۸/-
نئی صبح	"	۱۸/-
پیار کا ساگر	فردوس حیدر	۴۰/-
تحفہ بہار	عفت موہانی	۱۸/-
[illegible]	سلمیٰ کنول	[illegible]

چھتری

عبدالمجیب سہالوی

ایک کالج میں فلسفے کے ایک لیکچرر تھے۔ ماشاءاللہ خود بھی فلسفی تھے۔ سنا ہے کہ وہ چھتری لے کر کلاس میں آتے تھے اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد چھتری کونے میں کھڑی کر کے میز کے پاس آکر لیکچر دینے لگتے تھے۔ ایک دن دھوپ تیز نہیں تھی وہ چھتری لانا بھول گئے۔ کلاس میں پہنچے اور کلاس میں جا کر خاموش چھتری کی طرح کھڑے ہو گئے۔

لڑکوں کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ کیا معاملہ ہے مگر لڑکوں کو خیال آیا کہ لیکچرر صاحب جب کمرے میں داخل ہوتے تھے تو چھتری کونے میں کھڑی کرنے جاتے تھے آج ان کے ہاتھ میں چھتری نہیں تھی اس لیے عادت کے مطابق وہ کونے کی طرف گئے مگر چھتری تو تھی نہیں اس لیے بے خودی میں خود کونے میں کھڑے ہو گئے سب لڑکے زور سے ہنسنے لگے اس پر لیکچرر صاحب چونکے اور مسکراتے ہوئے کونے سے آکر لیکچر دینے لگے۔

فلسفے کے ایک دوسرے لیکچرر صاحب بازار سامان خریدنے گئے ہاتھ میں چھتری بھی تھی۔ جب سامان لے کر دکان سے جانے لگے تو چھتری دکان ہی پر بھول گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد لوٹے اور دکاندار سے کہا میں تمہاری دکان پر چھتری بھول گیا تھا۔ دکاندار ایماندار تھا اس نے کہا جی ہاں فکر نہ کیجیے آپ کی چھتری محفوظ ہے اور کونے سے اٹھا کر چھتری لیکچرر صاحب کو دے دی۔

جب وہ چھتری لے کر واپس ہونے لگے تو دکاندار نے پوچھا آپ کو چھتری یاد کیسے آئی۔

لیکچرر صاحب نے کہا جب بارش رک گئی تو میں نے چھتری بند کرنے کے لیے اوپر ہاتھ بڑھایا تو چھتری غائب تھی اس طرح مجھے چھتری کا خیال آیا۔ دعا کرو اب کہیں نہ بھول جاؤں۔

جب چھتری کی بات چلی ہے تو ایک اور لطیفہ اس کے بارے میں سن لیجیے۔

ایک صاحب چند دنوں کے بعد ایک ہوٹل میں گئے جہاں جایا کرتے تھے وہاں ایک صاحب دکھائی دیے۔ صورت جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ انھوں نے کہا غالباً ایک سال پہلے اسی ہوٹل میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔

ان صاحب نے کہا کیا آپ نے مجھے پہچان لیا۔

پہلے صاحب مسکرائے اور کہا آپ کو کم آپ کی چھتری کو زیادہ پہچان لیا۔

دوسرے صاحب نے منھ بنا کر کہا غالباً اس وقت میرے پاس کوئی چھتری نہیں تھی۔

پہلے صاحب نے فوراً کہا اس وقت یہ چھتری میرے پاس تھی۔

ایک صاحب نے اپنے کچھ دوستوں اور جاننے والوں کی دعوت کی۔ ان کی بیوی بڑی سگھڑ تھیں انھوں نے لذیذ کھانے بڑے اہتمام سے تیار کیے اور کمرے میں کھانے کا انتظام کرنے لگیں۔ شوہر صاحب بولے ارے بھئی یہ چھتریاں اور چھڑیاں بھی ہٹا دینا۔

بیوی نے کہا انھیں ہٹانے کی کیا ضرورت یہ بری تو لگتی نہیں۔

شوہر نے کہا تمھارے اندر سب اچھائیاں ہیں مگر یہ تمھاری عادت ہے کہ جو بات کہو نہیں سنتیں اور میں ٹھیک کہا لگتی ہو ارے بھئی چھتریاں اور چھڑیاں اس لیے ہٹوا رہا ہوں کہ کہیں کوئی اپنی چھتری اور چھڑی پہچان نہ لے۔

دی کی اشعار زبان پر رہتے۔ لوگوں نے سوچا لڑکی دیوانی تو نہیں ہو رہی ہے۔
سوچنے والے الگ حیران تھیں۔ نوشابہ، زہرہ، سیرہ وغیرہ سے کتنا گہرا رابطہ تھا جیسے وہ ایک ہی خاندان کی بہنیں ہوں۔ ان میں ہزار طرح کی باتیں ہوتیں
سیر و فلموں کی رسیا تھی۔ جب بھی مل بیٹھتی۔ اس طرح کسی نے فلم کی کہانی معہ
اداکاری اور گانوں کے سنا دی کہ پورا وقت لے لیتی۔ نت نئے فیشن موضوع بنتے
اکثر ان بیچاریوں کی بحث بھی ہوتی جسے وہ پسند نہ کرتیں۔ مگر کچھ دنوں سے وہ
سب حیران تھیں۔ کوئی بھی چیز زیادہ مقدار میں اچھی نہیں لگتی۔ لڑکیاں بیزار
ہو گئیں۔

"بھئی سنو" زہرہ بولی تھی۔ "ہم تو اپنے گھر سے بیزار ہو کر تمہارے پاس
آتے ہیں کہ کچھ دیر کو ابا کی گرج، بھیا کی رعونت اور امی کی جھڑکیوں سے نجات
ملے گی یہاں تم اپنے پسندیدہ شاعر کو ہمارے سر پر بٹھا دیتی ہو۔ قسم سے مجھے تو
اب ابکائی آرہی ہے۔ تمہیں اپنے محبوب ہی کا واسطہ۔ اب کوئی شعر مت سنانا۔"
"بھئی تم تو عجیب سی بھوت ہو کر رہ گئی ہو" نوشابہ نے کہا۔ "اب اس
بھوت کو اتار دو سر سے۔ ورنہ وہ اس طرح جکڑے گا کہ پھر بلبلاتی پھرو گی۔ میں
اب یہ سوچ رہی ہوں کہ چچی ماں سے کہوں۔ تمہیں کسی گرہست آدمی کے گلے ڈال
دیں۔ چولہے چکی سے لگو گی بچے ہوں گے۔ آپ ہی آپ یہ خناس دور ہو جائے گا۔"
"اتنی بے دردی سے اسے خناس مت کہو۔ نوشی" رضوانہ گڑگڑائی "تم لوگ
نہیں جانتے۔ میں اسے خدانخواستہ اپنے محبوب کا درجہ نہیں دیتی۔ کیا میں اس قابل
بھی ہوں۔ ارے میں فرش وہ عرش۔ میں ذرہ وہ آفتاب۔ بھلا کہاں وہ اور
کہاں میں۔ میں تو بس اپنے گرشن کی میرا ہوں۔ اس کی محبت میں بھجن گاتی
والی جوگن ہوں۔ تم سب کو کیوں جلن لگ رہی ہے۔" (باقی آئندہ)

محترمہ آپ مجھے واقعی شرمندہ کر رہی ہیں۔ میری ادبی شخصیت اتنی
اہم بھی نہیں کہ اسے یوں سراہا جائے۔ اس کا اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ کچھ ٹوٹا
پھوٹا لکھ تو لیتا ہوں۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی قابل بھی ہے یا نہیں۔"
"آپ کے فن کے ناقدین آپ کی ادبی شخصیت تسلیم کر چکے ہیں۔ جناب اور
آج شہر بھر میں کون ایسا ہے جو آپ کا مقابلہ کر سکے۔" مسز شکیل نے کہا۔ "آپ
خود کو اتنا اہم نہ سمجھیں اس سے کیا۔ آپ کی وقعت و قدر و قیمت تو کچھ ہم ہی
جانتے ہیں۔" وہ یکایک اپنی بھانجی سے مخاطب ہو گئیں۔ "شاید تمہیں یہ معلوم
نہیں ہے۔ ابھی پچھلے ماہ ایک انٹرنیشنل مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں منتظمین نے
لندن اور امریکہ میں مقیم شعرا کو بھی دعوت دی تھی۔ بڑے بڑے شاعر محفل
میں موجود تھے۔ مگر واقعی میں نے دیکھا کہ جناب علی صاحب آپ کے بعد پھر کسی
کا رنگ ہی نہ جما۔ حاضرین نے وہ غزل بار بار پڑھوائی تھی۔"
"آپ مجھے مغرور کر رہی ہیں۔ مسز شکیل۔" ان کے چہرے پر تکدر کے آثار
تھے۔ "اب اس تذکرہ کو ختم کر دیجئے۔ اور۔ ہاں۔ وہ کتاب کہاں ہیں۔
لائیے ان پر دستخط کر دوں۔ میں اس کے بعد کچھ مصروف ہوں۔"
"کون سی غزل۔؟" دفعتہً فضا میں بانسری سی بجی۔
"دو شعر یاد آگئے ہیں۔" مسز شکیل نے کہا۔ "پوری غزل میری بیاض میں ہے
دو شعر ہیں ؎

تمنا تری ہم نشینی کی ہے
بس اک ساعتِ مختصر کے لیے
کہ اس محنت آباد ایام میں
فراغت نہیں [illegible] کے لیے

ہونٹ چباتے ہوئے شباہت صاحب نے کہا۔ "وہ کتابیں۔"

"وہ تو۔ میں آج نہیں لائی۔" رضوانہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اس کی جھالر سی پلکیں جھپکیں۔ پل بھر کے لیے اپنی جگہ پر رکیں اور پھر وہ اپنا گلابی چہرہ جھکا کر بولی۔ "آپ فرمائیں گے تو میں کل۔ لے آؤں گی۔!"

وہ چپ رہے۔

"تو پھر اب مجھے اجازت دیجئے۔ جناب!" مسز شکیل نے کہا۔ رضوانہ کا خیال تھا کہ وہ انھیں اجازت نہ دیں گے۔ کچھ ادبی و شعری گفتگو ہوگی۔ اس شخص کے لبوں سے عشق و محبت کے پھول بکھر رہے ہوں گے۔ وہ متوالی سی بیٹھی وہ مسحور کن آواز سنتی رہے گی۔ اس حسین چہرے کو تکا کرے گی۔ اور اس کے دل میں عقیدت و محبت کے ہمالہ بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن اس کے خوبصورت خیالوں کا شیش محل حقیقت کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ کیونکہ شباہت صاحب نے ان دونوں کی طرف دیکھے بغیر سر جھکایا اور بصد اخلاق سے کہا۔

"خدا حافظ محترمہ۔!" اور نہایت خوبصورت انداز میں رخصتی سلام کی خاطر ہاتھ پیشانی تک اٹھایا۔ پھر وہ اپنے سامنے رکھے کاغذات پر جھک گئے۔ ایک ہوک سی رضوانہ کے سینے سے اٹھی۔ بیدرد۔ بے حس۔ سنگدل۔ وہ بلا آواز چیخی۔ اور چپ چاپ اپنی آنٹی کے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ باہر برآمدے میں پہونچ کر مسز شکیل رضوانہ کی طرف دیکھ کر جھینپتے ہوئے انداز میں مسکرائیں وہ استفہامیہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگی۔

"بڑا اللہ کا احسان ہے کہ اتنی ہی دیر کے لیے سہی۔ ہمیں اپنے پاس گوارہ کیا۔ ورنہ مسز جعفری تو کہہ رہی تھیں کہ انتہا قدر مغرور اور گستاخ انسان

تذکرہ، ان کی تعریف۔ انھیں بلند مراتب دینا۔ ان کی ذاتی زندگی کی کھوج کرنا ان کے خداداد فن پر خود فخر کرنا۔ ایسا بزرگانہ سلوک تھا کہ غرور انداز ان کی انا حد سے زیادہ اکتا گئیں۔ انہوں نے تو کہہ دیا کہ خبردار خبردار کوئی بھی اشعار ان کے سامنے نہ پڑھا جائے۔ نہ وہ کسی ناول کا منتخب باب ہی سننا گوارہ کرتی تھیں مختلف موضوعات پر سر دھننا اور مزاحیہ تحریروں پر اکیلے ہنسنا ان کے نزدیک کھلے ہوئے پاگل پن کی دلیل تھی۔ اور وہ سمجھتی بھی یہی تھیں کہ لڑکی کا دماغ خراب چل نکلے گا۔ سمجھانے پر رضوانہ مانتی نہیں تھی۔ انہوں نے اس سے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ اور سوچا عمر ان ہی کو مکمل نسائیت کے روپ میں ڈھال دیں۔

ایک ادبی جلسہ میں رضوانہ نے شباہت کو اپنا کلام پڑھتے سنا۔ اور ان کی گرویدہ ہو گئی۔ تلاش کر کر کے ان کی کتابیں حاصل کیں۔ رفتہ رفتہ ان کے منفرد کلام نے اس کے دل و دماغ پر ایسا سکہ جمایا کہ پھر متقدمین اور متوسطین شعرا اس کی نظروں سے گر گئے۔ انتہا پسند اتنی تھی کہ بڑے بڑے شاعروں کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتی۔

اس شاعر کی پرستاری میں بہت بڑا دخل شاعر کی شکل و صورت کا بھی تھا۔ اس کی نگاہوں سے بڑے خوب رو مرد گزرے تھے خود اس کے ہندی کے پروفیسر اتنے خوبصورت تھے کہ لڑکیاں ان کے تذکرے پر آہیں بھرتی تھیں۔ اور جان بوجھ کر اپنے مضامین میں ہندی ضرور لیتی تھیں۔ ایک تو ہندی کے مؤثر دوہے۔ عورت کی زبان، لہجے کے گداز سانچے پروفیسر کی تشریح اور ان کے پرستاروں کا زخمی دل۔ بس ہندی کی کلاس میں مزہ ہی آجاتا۔!

کچھ دنوں اسے بھی پروفیسر مدھوکر کا خیال رہا تھا۔ لیکن اس نے ابھرتے ہوئے شاعر نے اسطرح اس کے دل و دماغ پر قبضہ کیا کہ وہ خود کو بھی بھول گئی۔ ہر وقت

وہ بڑے ادبی اور علم دوست آدمی تھے۔ جہاں کہیں ادبی یا شعری نشست ہوتی۔ سعید صاحب نہایت دلجمعی اور دلچسپی سے حصہ لیتے۔ ان کا پورا پورا اثر رضوانہ میں آیا تھا۔ وہ خود تو فنافی العلم تھی ہی۔ کسی کو بھی ادبیت سے دلچسپی لیتے دیکھتی تو اس میں لگاؤ سا محسوس کرنے لگتی چاہے وہ کوئی غیر یا بالکل اجنبی ہوتا۔ عرانہ ہر چند سنجیدہ، گہری فکر رکھنے والی اور حقیقت کی دنیا میں جینے والی لڑکی تھی پڑھنا لکھنا اسے بھی پسند تھا مگر ایک حد تک، دیوانگی اسے گوارا نہ تھی۔ اچھے شعر اس کی بھوک پیاس بند نہیں کرتے تھے۔ نہ کسی ناول نویس یا افسانہ نگار نے اس کی نیندیں اڑائی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ سب بھرے پیٹ کے چونچلے یا خالی پیٹ کے بہلاوے ہیں۔ اسے رضوانہ کا بڑھا ہوا ادبی ذوق بھی چنداں پسند نہ تھا مگر کیا کرتی۔ بڑی بہن کا لحاظ تو کرنا ہی پڑتا تھا۔ البتہ سعید صاحب بے حد خوش ہوتے تھے۔ وہ اپنی صاحب زادی میں ایک بڑی شاعرہ یا منفرد ادیب پنہاں دیکھ رہے تھے۔ لیکن انہیں بڑی حیرت ہوئی جب کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اس کی ساری صلاحیتیں دوسروں کی کاوشوں پر سر دھننے اور صرف اس کی سخن فہمی پر ہی محدود تھیں۔ نہ تو وہ ایک شعر کہہ سکتی تھی نہ اسے ایک ادبی فقرہ لکھنا آتا تھا۔ یوں وہ گزبھوبیٹ تھی اور اپنے ذوق کی بنا پر ایک جانی پہچانی شخصیت بھی بن گئی تھی۔

سعید صاحب اس کے ہم نوا تھے گھنٹوں اس سے کتابی بحثیں کیا کرتے۔ کوئی موضوع ایسا نہ تھا جو ان کے درمیان چھڑتا نہ ہو۔ عرانہ ایسے موقعوں پر برے برے منہ بنایا کرتی۔ اماں بیچاری خار کھاتیں۔ کیا صرف ان ہی باتوں سے کوئی لڑکی، لڑکا بن سکتی ہے۔ وہ تو اسے جی بھر کے چوپٹ کر رہے تھے۔ دن رات اشعار، دن رات ادبی فقرے۔ ہر وقت لکھی فن کاروں کا

ہے کہ انہیں بری طرح پھٹکار کر اپنے اجلاس سے نکال دیا تھا۔

"کیوں۔ انہیں اپنی بدنامی کا خیال نہیں ہے۔ اگر یہ عہدہ چھین لیا گیا تو پھر۔!" رضوانہ نے حیرت سے کہا۔

مشہور تو یہی ہے کہ وہ دو چیزوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔

شراب اور سگریٹ؟:

جی نہیں۔ خوشامد اور عورت۔!"

کیا۔!؛ رضوانہ کے لب کھل گئے۔" اوہ۔ آنٹی۔ ان کی شادی نہیں ہوئی!۔

نہیں۔!"

کوئی ٹریجڈی۔ عورت سے نفرت کی وجہ۔؟ آنٹی۔

بھئی میں کیا جانوں۔ سنا ہے بیس نے۔ اور کبھی یقین کیا کبھی نہ کیا۔ مجھ سے تو ہمیشہ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کی شکل و صورت کو دیکھنے اور شعر شاعری سے محظوظ ہونے یا پھر ان کے آٹوگراف لینے کے لیے خواتین ان کو گھیرے رہنا چاہتی ہیں۔ بس۔ اکتا گئے ہوں گے۔ جھلا کے میں کچھ کہہ دیا ہوگا۔ جلنے والوں نے رائی کا پہاڑ بنا لیا۔"

"ایک بات تو ویسے بھی ہے آنٹی۔!

کیا بات ہے۔؟

"میں کبھی تھی کہ وہ آپ کو چائے آفر کریں گے اور میری پسند کو سراہیں گے۔ مگر بڑی سرد مہری سے انھوں نے آپ کو خدا حافظ کہہ دیا۔ اب تو مجھے خوف محسوس ہونے لگا ہے کہ جب اپنی کتابیں لے کر ان کے پاس جاؤں کہیں جھلا کے کچھ کہہ دیا تو پھر۔ میں تو وہیں کھڑے کھڑے رو دوں گی!؛

معلوم نہیں بیٹی۔ میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی!"

رضوانہ کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں جیسے کوئی نیا خیال اس کی مسرت کا باعث بنا ہو۔ لیکن وہ مسز شکیل سے کچھ بولی نہیں۔ ایک مرتبہ مڑ کر پرنسپل صاحبہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اندر سے ہنسنے بولنے اور کسی شاعر کی بکواس پر تعریفی نعرے لگتے بھی سنے۔ لیکن ان میں اس کی پسندیدہ آواز نہیں تھی وہ اپنی آنٹی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

"آپ کے پرستاروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ شباہت صاحب۔" ایک صاحب نے کہا: "کتنی قابل فخر و مباہات آپ کی ہستی ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کے فن پر کئی ضخیم عظیم نمبر نکل چکے ہیں۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ اس مدح و ستائش کا کوئی اثر آپ پر نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا آپ اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب۔" شباہت مسکرائے: "ہر انسان فطرتاً اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے۔ لیکن اسی صورت میں جبکہ صاحب تعریف کو مکمل اعتماد ہو جائے کہ اس نے واقعی کوئی عمدہ کام کیا ہے۔ میں زیادہ خوش اس لیے نہیں ہوتا کہ مجھے علم ہے۔ ابھی میں نے کچھ نہیں کیا۔ کوئی چیز مجھے بیتاب رکھتی ہے کیا کرنا ہے مجھے! ذہن میں اگر خیالوں کا ہجوم ہو تو قلم کی زبان اظہار سے قاصر رہ جاتی ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی بھی شاہکار بالکل مکمل ہے۔ اور میری تو کوئی تصنیف قطعی مکمل نہیں۔ جب میں اپنا کام خود ہی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں تو کسی کی مدح سرائی سے متاثر و مسرور کیسے ہو سکتا ہوں۔!"

"آپ کی کسر نفسی ہمارے [illegible] کو متزلزل نہیں کر سکتی جناب!"

تھے! وہ جنبش بھی نہ کر سکی۔

دفعتاً نرگسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ اور کسی توقع پر آہٹوں کی سمت دیکھنے لگی!

ایک مایوس گہری سانس اس کے سینے سے نکلی۔

ملازم جھاڑن کندھے پر رکھے آ نکلا۔ ایک پل کے لیے رضوانہ کو دیکھ کر جھجکا اور پھر میز کرسیاں صاف کرنے لگا!

کچھ دیر تک رضوانہ نیم جان سی کھڑی رہی۔ لیکن کب تک۔ ملازم نے دو ایک بار سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ کتنی بری بات تھی۔ عجیب سی نڈھال، بدحال شکست خوردہ سی ہو گئی تھی۔ اس نے شباہت کی عطا کردہ کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اور انہیں تلے اوپر میز ہی پر چھوڑ کر مرے مرے قدموں سے باہر نکل آئی۔! دن زیادہ اداس ہو رہا تھا۔ زرد زرد مرتی ہوئی دھوپ اونچی اونچی دیواروں پر اس طرح منجمد تھی جیسے اس جگہ سے سرکنا ہی نہیں ہے درختوں سے گزر کر آنے والی سرد ہوا اس کے کمزور جسم میں برچھیاں سی چبھو رہی تھی۔! ایک بار اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک آہ دل کی گہرائیوں سے نکلی۔ جب وہ یہاں آ رہی تھی کتنی خوش تھی! امید و آرزوؤں کا صنم خانہ تھا۔ جو اس کے دل میں سجا تھا۔ اور اب وہ جا رہی تھی۔ عقیدت و محبت کے سیکڑوں بتوں کو ریزہ ریزہ کر کے۔ دل کا کعبہ اب بالکل ویران تھا! وہ سڑک پر آ گئی اور ایک خالی رکشے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا! آنسوؤں پر قابو حاصل کرنا بڑا دشوار ہو رہا تھا۔!

رضوانہ اور عذرانہ سعید صاحب کی دو ہی لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکے کی تمنا جب بار آور نہ ہو سکی تو انہوں نے اپنی دونوں کو لڑکوں کی سی تعلیم و [illegible]

"مگر۔ مگر۔ !" رضوانہ ہکلانے لگی۔ "کیوں۔ ؟ کیا۔ میری کوئی بات آپ کو ناگوار ہوئی ہے۔ جناب۔ !"

جواب دیئے بغیر انہوں نے اس کے بیگ سے کتابیں نکال لیں۔ اور انہیں ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے بولے۔ "میرے دستخط بہت حقیر ہیں۔ ایسے نہیں کہ کسی اہم ہستی کو دیئے جائیں۔ آپ جا سکتی ہیں۔ پھر کبھی تشریف لانے کی زحمت نہ فرمائیے گا۔" ایک قہر آلود نظر انہوں نے اس غریب بے گناہ پر ڈالی اور انگلیسی سے چلے گئے۔ اپنی دستخط شدہ کتابیں ساتھ لے گئے۔ رضوانہ کا یہ حال تھا کہ جیسے کسی نے اسے لاش میں تبدیل کر دیا ہو۔ مبہوت۔ دم بخود۔ اور سکتہ زدہ سی وہ کھڑی رہ گئی۔ ندامت، خجالت اور محرومی کے احساس نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ لگتا تھا کہ اب وہ زمین سے اپنے قدم اٹھا ہی نہیں سکتی یوں ہی کھڑی رہ جائے گی اور سینے سے سانس نکل جائے گی۔

کون سا قصور تھا اس کا۔ جس کی یہ سزا ملی تھی۔ خواہ مخواہ کی خفگی کی ہولناک سزا۔ گویا اب آئندہ کے لیے در ہی بند ہو گیا تھا۔ ! کاش اس نے ایک حقیقت اس پیرائے میں نہ کہی ہوتی۔ وہ برا مان گئے۔

برا مان گئے۔ میرے خدا۔ میں نے انھیں اپنا دیوتا، اپنا آدرش، اپنا اول اور آخر محبوب مانا تھا۔ ! میں سمجھتی تھی کہ وہ چاہے ساری دنیا کی عورتوں سے نفرت کریں مگر مجھ سے نہیں کر سکتے۔ اب اس پر یہ جانگسل حقیقت واضح ہوئی کہ انہیں دنیا کی دوسری عورتوں سے نفرت ہو چاہے نہ ہو۔ اس سے بے پناہ ہے۔ یک بیک موٹے موٹے آنسو اس کے تپتے ہوئے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔ پچھتاوے نے رگ رگ کا لہو نچوڑنا شروع کیا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس بے درد کے قدموں میں گر کر وہ بے گناہی کی معافی مانگے۔ مگر میں نے قدم اب بھی [illegible]

"اچھا۔ !" وہ ہنس پڑے۔

دیر تک ان میں ادبی گفتگو ہوتی رہی۔ اور جب وہ تھکے ہارے اپنے کمرے میں لیٹے آرام کر رہے تھے تب بڑے گہرے سناٹے میں رہ رہ کر ایک آواز گونج جاتی تھی۔ بند پلکوں کے سامنے ایک چہرہ ابھر ابھر کر مٹ جاتا تھا۔ اب تک بے گنتی آوازوں نے ان کا تعاقب کیا تھا۔ بے شمار چہرے ان کی نظروں کے سامنے سے گزر چکے تھے کسی قسم کا تاثر دیئے بغیر۔ بلکہ وہ ملی جلی موٹی باریک سریلی اور بھونڈی آوازیں انھیں ناگوار بھی گزرتی تھیں۔ وہ چہرے جو خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ذہنی کوفت کا باعث بن جاتے تھے۔ ! پھر۔ اب۔ یہ تاثر۔ یہ یاد یہ خیال کیسا تھا۔ ان کے ایک انگریزی پیریڈ میں بار بار ایک شکل نظر آتی تھی۔ ماریہ کی شکل۔ شاید وہ کسی بڑے عہدے دار کی بیٹی تھی۔ حد درجہ بیباک اور گستاخ۔ ان کا لیکچر تو شاید ڈھنگ سے سنتی بھی نہ ہو۔ نہایت ڈھٹائی اور بے باکی سے کسی کی قابل اعتراض نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر انھیں ٹکٹکی باندھے گھورا کرتی۔ کئی مرتبہ ان کی بھی نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں اور ماریہ کے لبوں پر مسکراہٹ کا شائبہ دیکھ کر دوسری طرف پھر گئی تھیں۔ انہیں حیرت تھی۔ لڑکیوں کو بھی مردانہ اسٹائل میں گھورنا آتا ہے پھر انہوں نے خاص کر کے ان نظروں کو مارک کیا تھا۔ ایک پروفیسر کے ساتھ ان کے لیکچر میں گئے تھے۔ وہ خاموش کرسی پر بیٹھے رہے۔ پروفیسر صاحب ان کی موجودگی سے کچھ بوکھلائے ہوئے سے طلبا کو [illegible] لکھاتے رہے۔ تب شباہت صاحب نے دیکھا کہ ماریہ سر جھکائے بڑے انہماک سے نوٹس لکھ رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نظریں اٹھا کر پروفیسر کو نہیں دیکھا۔

تو پھر اس پر کیا شاید گوارا تھی کہ اس نے اپنی نظروں کا مرکز اپنے پرنسپل کو بنا رکھا تھا۔ انہیں اپنی سخت توہین اور شکست کی محسوس ہوئی تھی۔ لڑکی کی اس [illegible]

کی نظروں کا تعاقب کرے تو کیا ہوگا۔ انہوں نے اپنا ایک گھنٹہ ایک معمر پروفیسر کو دے دیا۔ دوسرے روز جانی بوجھی بے خبری میں کلاس کے سامنے سے گزرے۔ ماریہ کی نشست خالی تھی۔ ہفتہ بھر بعد رجسٹر منگا کے دیکھا۔ ماریہ کے نام کے آگے مسلسل غیر حاضری کے چلیپے لگے تھے۔!

مارے غصے کے ان کا چہرہ آگ کی طرح جلنے لگا!۔ وہ گستاخ لڑکی خود کو سمجھتی کیا تھی۔ صنف نازک سے نفرت کا احساس اور پختہ ہوگیا۔ اب تو سیدھے منہ بولتے بھی نہ تھے۔ عورتیں ان کے اجلاس پر جانے سے گھبرانے لگیں۔ آپس میں بڑبڑا لیا کرتیں۔ لیکن کیا یہ شکایت کسی سے کی جا سکتی تھی کہ پرنسپل صاحب خواتین سے سیدھے منہ نہیں بولتے۔؟ ارے۔ آپ اپنے کام سے کام رکھئے۔ پڑھیے اور گھر کا راستہ ناپئے۔ کیا آپ اس بات کی خواہش مند ہیں کہ جواں سال پرنسپل آپ سے میٹھی میٹھی بولیاں بولے۔؟

دفعتہً فضا کا سکوت ٹوٹ گیا۔!

دھڑسے کمرے کا دروازہ کھلا اور اندھیرے کمرے میں چاندنی کا سیلاب سا آگیا۔! وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے۔ پھر دفعتہً احساس ہوا کہ وہ شور وغل جو ان کی بے پناہ محویت میں کھو گیا تھا۔ اچانک کئی گنا زیادہ بڑھ گیا ہو۔ ان کے اعصاب سنسنانے لگے۔!

اماں بی نے بڑھ کر روشنی کی۔ بے حد خوش نظر آرہی تھیں۔

"میاں اب تو تم سنیاس ہی لے لو۔ ہائے ہائے کیا ترس آتا ہے تم پر۔ سارا زمانہ خوش ہے۔ دلہن گھر میں آ چکی ہے۔ بچے ناچ رہے ہیں۔ میراثنیں سہاگ کے گیت گا رہی ہیں۔ مگر تم ـــ اندھیرے کمرے میں چھپے جانے کیا سوچ رہے ہو۔ ارے [illegible] خوشی تم نصیب [illegible] ساعت کا کھانا کھایا نہیں۔ غرور سے [illegible]

"میں تو یہی سوچ کر آئی تھی کہ آپ۔ مجھے آپ کے شعر بے حد پسند ہیں۔ سچ مانئے آپ کے شعر پڑھنے کے بعد۔ مجھے دنیا کا کوئی سا شاعر اچھا نہیں لگتا!۔ میں نے ـــ!

اور دفعتہً اسے ہوش سا آگیا۔ آنٹی نے کہا تھا کہ انہیں خوشامد سے نفرت تھی اور یہ خوشامد تو عورت کی زبانی تھی۔ دو آتشہ۔ اس نے خود کو روک لیا۔ بے حد مایوسی سے کتابیں ٹھونس کر بیگ میں رکھیں اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" کچھ طنز تھا اس کے لہجے میں۔ "یہ بھی آپ نے لکھ دیا۔ آپ کے قیمتی دستخط بھی خوش نصیبوں ہی کو ملتے ہیں۔!"

دفعتہً شباہت نے اپنا نچلا لب دانتوں میں دبا لیا اور ایک جھٹکے سے کھڑے ہوگئے۔! اس سے کہا:

"آپ دو منٹ تشریف رکھئے۔ میں ابھی آیا۔"

اور انیکسی سے نکل کر چلے گئے۔!

رضوانہ کا دل دھڑکنے لگا۔ شاید کوئی نئی کتاب لینے گئے ہیں۔ اوہ۔ میری قسمت۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور اب جو اس کا جسم کانپ رہا تھا تو خوشی سے کانپ رہا تھا۔! اس کی نظریں ادھر ہی لگی ہوئی تھیں جدھر وہ گئے تھے۔ یا خدا! اب کون سا تحفہ اسے ملے گا۔ وہی عالم تھا کہ آرٹ پر کان در پہ نظر دل میں اشتیاق ـــ رہ رہ کر ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ جاتی۔!

اور وہ سچ مچ دو ہی منٹ بعد آگئے!۔ ان کے ہاتھوں میں وہی چھ کتابیں تھیں جن پر انہوں نے اپنے دستخط کئے تھے۔! بڑے بے رحمانہ لہجے میں انہوں نے کہا:

"آپ اپنی کتابیں [illegible] لیجئے۔!"

"میں اس لیے آئی تھی کہ۔" آپ کی کتابوں پر۔ آپ کے دستخط لوں گی۔ اگر آپ توجہ فرماتے تو میری بڑی خوشی پوری ہو جاتی۔ !"

"اچھا۔ اچھا۔ وہ۔ ہاں آپ کتابیں لائی ہیں ؟"

"جی۔ !" فرطِ مسرت سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"دیکھئے۔" ذرا سا بھی نرم سلوک نہ تھا۔ وہی رکھائی۔ وہی سرد مہری وہی بےزاری۔ !

اس نے بیگ سے چھ سات کتابیں نکالیں اور بڑے ادب و احترام سے میز پر رکھ دیں اور خود نہایت اشتیاق و اضطراب سے ان کا چہرہ تکنے لگی جس پر سوائے ناگواری اور خشونت کے کوئی دوسرا حوصلہ افزا جذبہ نہ تھا۔ !

انھوں نے جیب ٹٹولی اور زیرِ لب بولے۔ "قلم شاید میں اپنے کمرے میں بھول آیا ہوں !"

"لیجئے۔ !" رضوانہ نے فوراً ایک خوب صورت قلم ان کی طرف بڑھایا۔ جسے انہوں نے اتنی احتیاط اور نزاکت سے سنبھالا کہ خدانخواستہ لڑکی کی انگلیوں سے ان کی انگلیاں نہ ٹکرا جائیں۔ رضوانہ نے جلدی ایک کتاب کھول کر ان کے آگے رکھ دی۔ ! ایک کے بعد ایک کتاب پر انہوں نے اپنا نام مع تاریخ کے لکھ دیا۔ اور قلم رضوانہ کے سامنے سرکا کے دوبارہ پھر سگریٹ سلگانے لگے۔

"بس۔ ؟" رضوانہ عجیب سے درد و حسرت سے انہیں تکنے لگی۔ "آپ نے ان پر کچھ لکھا نہیں۔"

"کیا لکھوں ؟" ان کی گہری گہری آنکھیں اس کی بے بس نگاہوں سے ملیں اور ایک عجیب سی سنسناہٹ رضوانہ کے جسم میں پھیر گئی۔

"کوئی تحریر۔ آپ کا کوئی شعر۔ مجھے بے حد تمنا تھی۔" وہ جیسے گڑگڑا رہی تھی۔

جلد ہی تمہیں کھانا پہونچا دے۔ بریانی ٹھنڈی ہو کر خراب جاتی۔ لایا تھا وہ تمہارا کھانا۔ !"

"مجھے بالکل یاد نہیں۔ اماں بی۔ آپ کے جانے کے بعد میں شاید سو گیا تھا۔ یا مجھ پر غفلت سی طاری تھی۔ ! کچھ پتہ نہیں۔ اچھا۔ آپ غفور سے پوچھئے۔ میں نے کھانا کھایا ہے کہ نہیں۔" شباہت نے کہا۔ اماں حیرت سے ان کی شکل تکتی رہ گئیں۔ خدا ہی دماغ پر رحم کرے۔ کہیں پاگل بدحواس تو نہیں ہو جائیں گے۔ اپنی بھوک پیاس کا پتہ نہیں۔ دوسرے بتائیں کہ انہوں نے کھانا کھایا ہے کہ نہیں ؟۔

غفور نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ وہ کئی مرتبہ جھانک گیا تھا۔ مگر صاحب کو آواز دینے کی ہمت نہیں پڑی۔ ! کھانے کے لیے کیونکر پوچھتا۔

اماں کے چہرے پر غیظ و غضب کی سرخی دیکھ کر انہوں نے ہنستے ہوئے غفور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اچھی بات ہے۔ تو اب لے آؤ۔ ہری اَپ۔ !" پھر اماں سے بولے۔ "آپ جائیے۔ میں کھانا کھانے کے بعد دلہن کو دیکھنے آتا ہوں۔"

کالج میں ہفتہ بھر کی چھٹی تھی۔ سرما کا آغاز تھا۔ موسم عجیب سا بے کیف اور اُداس ہو رہا تھا۔ اس دن گھر کے سب لوگ نئی دلہن کے ساتھ کسی خوب صورت جگہ انجوائے کرنے چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی میں ابھی دیر تھی۔ شباہت چونکہ گھر والوں سے ذہنی اور جذباتی طور پر بہت دور تھے۔ لہٰذا نہ وہ کسی کے ہمراہ گئے اور نہ کسی نے ان سے چلنے کے لیے کہا۔ وہ نیچے اترے۔ یونہی ایک ایک کمرہ اور راہداری میں ٹہلتے پھرے اور پھر گول بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں کی ہر شے بہت سلیقہ

اخبار اور کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ کتابیں ان کی واحد غم گسار تھیں۔ انھوں نے ایک کتاب اٹھائی اور بے دلی سے اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ سامنے مختصر سا باغ تھا۔ زمین بیکار پڑی تھی اس میں وجاہت نے تفریحاً جامن، امرود، اور آم کے پودے بو دیے تھے جو اب تناور اور گھنیرے درخت بن چکے تھے۔ ان کے آس پاس گلاب، موتیا اور موگرے کے جھنڈ تھے۔ رفتہ رفتہ یہ جگہ ایک چھوٹے سے باغ میں تبدیل ہو گئی تھی۔! تیز سرد ہوا ان درختوں سے گزر کر آ رہی تھی اور شباہت کے جسم میں جھرجھری سی دوڑا دیتی۔ انہوں نے ملازم کو آواز دے کر کافی منگوائی۔!

اس نے کافی کے ساتھ ساتھ کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع بھی دی۔!

"کون آیا ہے؟" انہوں نے دھار دار نظروں سے ملازم کو گھورا۔

"میں انہیں جانتا نہیں سرکار۔!"

"یہیں پہونچا دو!"

اور پھر ملاقاتی پر ان کی نگاہیں جم گئیں۔ کوئی لڑکی تھی۔

اسے کہاں دیکھا تھا۔ اوہ۔ یہ وہ ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ انہوں نے سوچا اور ملازم پر غصہ ہونے لگے۔ کم بخت نے صراحت نہ کی تھی کہ ملنے والا کون ہے۔ ناگواری کی شکنیں اس طرح پیشانی پر پڑیں کہ وہ نو وارد کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔! انہوں نے بیحد بے رخی سے چہرہ پھیر لیا۔

"تسلیم جناب۔!" لڑکی کی آواز کپکپا رہی تھی

"وعلیکم السلام۔!"

وہ اتنی بے تکی سے کافی پیتے رہے اور لڑکی سے بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہا۔ وہ [illegible] ایک ۔۔۔ بیگ لائے کھڑی [illegible] رہی!

پھر انہوں نے پیالی نیچے رکھ دی۔ اور سگریٹ کیس اٹھاتے ہوئے رکھائی سے بولے

"بیٹھیے۔!"

اس نے بیگ اتار کے میز پر رکھ دیا اور اپنے بے قابو وجود کو سنبھالتی ہوئی چوڑی سی بید کی کرسی پر ٹک گئی۔! اور مرتعش ہاتھوں کو چھپانے کے لیے دوپٹہ مروڑنے لگی۔!

شباہت نے سگریٹ سلگایا اور لائٹر میز پر پھینکتے ہوئے بدستور سرد لہجے میں پوچھا:

"فرمائیے!"

کیسے قاتل الفاظ تھے۔ بیٹھیے، فرمائیے، اف توبہ۔ وہ تو اپنی محبت اور عقیدت کے اس درجہ میں تھی جہاں اپنے آئیڈیل کے لبوں سے اپنے لیے بے حد بے تکلف اور اپنائیت سے معمور خطاب سننا چاہتی تھی۔! اب وہ کیا فرماتی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

"آپ جس مقصد کے لیے تشریف لائی ہیں۔ وہ بتائیے۔!"

"ہم۔ میں۔ اس دن بیگم شکیل کے ساتھ آپ سے ملنے آئی تھی۔ وہ میری خالہ ہوتی ہیں۔"

"اچھا۔" انہوں نے ایک گہرا کش لیا اور دھوئیں سے فضا غبار آلود کر دی۔ اب بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے اور رضوانہ کا یہ حال تھا کہ وہ فوراً اٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ نجانے کیا کیا سوچ کے وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ اور اس کے بھڑکتے ہوئے جذبات کے الاؤ پر شباہت نے اپنے سرد سلوک کی برف ڈال دی تھی۔!

Dr. Zakir Husain Library
Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

حریمی دسترخوان

اردی (جسے گھوئیاں بھی کہتے ہیں) ساگ
شاملات اردی موٹی موٹی ۵۰۰ گرام۔ سوکھا میتھی کا
ساگ ۱۰۰ گرام (میتھی کا ساگ خشک کیا ہوا پنساریوں سے مل جاتا
ہے) ویسے جب میتھی کی فصل ہو تو آپ بھی اسے خشک کرکے رکھ لیں
کام آسکتی ہے۔ ہلدی پسی ہوئی چائے کا ایک چمچہ۔ اجوائن چائے کا ایک
چمچہ۔ پیاز بڑی آدھی ہو تو ایک ورنہ دو۔ تیل یا گھی اصلی ۱۰۰ گرام۔ لہسن
نصف گٹھی۔ ادرک بڑی ایک گرہ۔ مرچ و نمک اندازے سے لیں اور
انھیں پیس لیں سل پر۔

ترکیب:- اردیوں کو دھو کر چھیل لیں اور گول گول تراش
لیں۔ نہ بہت پتلی تراشیں نہ بہت موٹی۔ پیاز کے لچھے کاٹ لیں۔ گھی
میں پیاز کے لچھوں کو گلابی کرکے تقریباً نصف نکال لیں۔ نصف پیاز
اور گھی پتیلی ہی میں رہنے دیں۔ اجوائن اور پسے مسالے کو ڈال کر بھونیں
پھر اردی اور ساگ ڈال کر بھونیں، اس کے بعد اتنا پانی ڈال کر پکائیں
کہ اردیاں گل جائیں۔ اردیاں نہ گلیں تو تھوڑا پانی اور ڈال دیں۔
آخر میں جو تلی پیاز نکال لی تھی اسے چھڑک دیں۔ بہنیں ایک بار
پکا کر نوش فرمائیں۔ امید ہے پسند فرمائیں گی۔

مرسلہ:- نیلوفر (پٹنہ)

آلو قیمہ بھرے شلجم

شلجم درمیانہ سائز کے چھ عدد۔ آلو بڑے تین۔ قیمہ باریک ۱۰۰ گرام
پنیر ۵۰ گرام۔ انڈا ایک عدد۔ نمک، کالی مرچ اندازے سے۔ گھی یا
ڈالڈا ۱۰۰ گرام۔

ترکیب:- پنیر کو کدوکش کرکے رکھ لیں۔ گھی میں قیمہ کو بھونیں
[illegible] نمک اور ذرا سی پسی ہوئی کالی مرچ بھی
ڈال دیں۔ [illegible] علیحدہ رکھ لیں۔ پانی کھولائیں، تھوڑا
نمک ڈال دیں اور شلجم کو دھو کر ابال لیں۔ تین چار منٹ ابلنے کے
بعد شلجم نکال کر رکھ لیں۔ اسی طرح آلوؤں کو تھوڑا ابال کر
نکال لیں۔ جب دونوں چیزیں ٹھنڈی ہو جائیں تو شلجم کے درمیان
کے گودے کو نکال لیں، لیکن اس طرح کہ شلجم کا خول سلامت
رہے۔ آلوؤں کو چھلکا نکال کر کدوکش کر لیں اور شلجم سے نکالے
ہوئے گودے میں ملا دیں۔ پنیر بھی شامل کر دیں۔

شلجم کے خول میں جو دو دو ٹکڑوں پر مشتمل ہوں گے، نمک
اور کالی مرچ چھڑک دیں۔ (اگر آپ مرچ زیادہ پسند کرتی ہوں
تو نمک و کالی مرچ میں حسب خواہش سرخ مرچ بھی شامل کر سکتی
ہیں) اس کے بعد آلو شلجم کے گودے اور پنیر کے آمیزے میں نمک اور
کالی مرچ ملا کر ان خولوں میں بھر دیں۔ اس کے بعد قیمہ کی ایک پرت
ڈال دیں۔ سب سے آخر میں انڈے کو پھینٹ کر چمچے سے قیمہ کی تہہ پر ڈال دیں۔
اور شلجموں کو پندرہ منٹ تک اوون میں رکھیں۔ اس کے بعد نوش فرمائیں۔
اگر آپ کے پاس اوون نہیں ہے تو تین اینٹوں کے درمیان انگارے بچھا
کسی بھگونے میں شلجموں کو رکھیں اور اینٹوں پر رکھ دیں۔ بھگونے کے
ڈھکن پر بھی تیز انگارے رکھیں۔ خیال رہے کہ نیچے کے انگاروں کی
آنچ زیادہ تیز نہ ہو اور بھگونا انگاروں سے ۴-۵ انچ اونچائی پر رہے۔

نوٹ:- حریم کے جولائی نمبر میں ٹین کے کنستر کو اوون کی طرح استعمال
کرنے کی ترکیب لکھی گئی ہے۔ اگر ویسا اوون آپ بنا لیں وہ بھی
ایسے کاموں میں آسکتا ہے۔ (ادارہ)

عورت سے متعلق خیالات

عورتوں کی عموماً سب سے بڑی تمنا یہی ہوتی ہے کہ عمر بھر پچیس
سال تک تو بڑھتی رہے گی مگر زیادہ سے زیادہ پچیس سال کے بعد وہ
پچیسویں سالگرہ سے ایسی بامعنی جائیں کہ پھر مزید پچیس سال تک
وہ پچیس سال ہی کی رہیں۔ (شوکت تھانوی)

خدا نے عورت کو حسن کی ایسی عظیم خوبی عطا کی ہے، جس خوبی
تک کوئی چیز نہیں پہنچتی۔ دوسرے الفاظ میں تمام دنیا کی خوبیاں کوٹ
کوٹ کر صنف نازک میں بھر دی گئی ہیں۔ [illegible] شاعر
[illegible] جاتے ہیں۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

حمیدہ بجئیے۔ میرے کچھ دوست آئے ہیں تم ذرا چائے وغیرہ کا انتظام کردو۔ ثاقب نے بہن پر زور دے کر کہا۔

اوہ سوری۔ بھیا اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں تم کسی اور سے کہہ دو۔ اس کا جواب سن کر ثاقب لال پیلا ہو گیا، اچھا یہ بات ہے کل تو بڑی منتیں کر رہی تھیں۔ بھائی بن جاؤ۔ اور آج ذرا سا کام کہہ دیا تو صاف انکار۔ کوئی نہیں بھائی تمہارا اب کہنا بھائی بن جاؤ۔ ثاقب نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری تو حمیدہ کا بھی پارہ چڑھ گیا۔ دفع ہو جاؤ۔ لعنت ہے ایسے بھائی پہ۔ ٹھیک ہے آج سے ہمارا کل والا رشتہ ختم، مجھے ایسی نافرمان بہن کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ غصے سے چلا گیا اور حمیدہ بھرائی آواز سے بڑبڑاتی ہوئی کپڑے استری کرنے لگی۔ اپنی قسمت میں بھائی کا پیار ہی نہیں۔

لیکن ایک دن پھر خود سے چار سال بڑے احمد بھائی کی طرف قدم بڑھایا وہ ان کا ہر طرح کا خیال رکھتی مگر ایک روز اسے اندازہ ہوا احمد بھائی اسے بہن نہیں سمجھتے۔ تب اس نے خود کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ خالہ صفیہ کے گھر دوسرا بیٹا ہوا تو انھوں نے اسے بلا بھیجا۔ وہ بھی امتحانوں سے فارغ تھی۔ خوشی خوشی چلی گئی۔ خالہ کا بڑا بیٹا نجم دو سال کا تھا۔ وہ اسے بڑا پیار کرتی۔ خالہ کا گھر بڑے پرسکون علاقے میں تھا۔ وہ اکثر شام کو نجم کے ساتھ باہر نکل جاتی۔ برابر پڑوس میں بھابھی صفیہ کا گھر تھا۔ جو اکثر خالہ کے پاس آتی رہتی تھیں۔ ان کے تین بچے تھے۔ وہ بھی حمیدہ سے بڑے گھل مل گئے تھے۔ ایک دن انھوں نے قرآن خوانی کی تو خالہ نے اسے وہاں بھیج دیا۔ وہ پہلی بار ان کے یہاں گئی تھی۔ یہاں آکر اسے بڑا مزہ آیا۔ بھابھی صفیہ کے بچوں کی پیاری پیاری دلچسپ حرکتیں ننھے کے پلے ہوئے طوطے اور چڑیاں۔ اسے کئی سفید بلیوں سے دوستی۔ صفیہ بھابھی کا گھر چھوٹا سا چڑیا گھر تھا۔ اس پر یہ کہ صفیہ بھابھی نے بہت سی مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ ہر وقت چوں چوں کی آوازیں عجیب سی سنسنی پیدا کرتیں۔ حمیدہ نے گھوم پھر کر ان کا گھر دیکھا اور بے حد خوش ہوئی۔

اس دن کے بعد جب بھی اسے وقت ملتا صفیہ بھابھی کے ہاں چلی جاتی۔ خالہ صفیہ نے بھی کبھی اسے وہاں جانے سے نہ روکا تھا۔ صفیہ بھابھی بہت ملنسار تھیں۔ گھر گرہستی میں تو ان کا جواب نہ تھا۔ بچوں کے کپڑے ایسے خوبصورت بنائیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ حمیدہ نے سوچا چلو یہ ہنر بھی بھابھی سے سیکھ لیں۔ یہی سوچ کر اس روز وہ بھابھی کے گھر پہنچی۔ صفیہ بھابھی صحن میں بیٹھی بچے کے لیے فراک کاٹ رہی تھیں پاس ہی کچھ میگزین پڑے تھے۔ اس نے زور دار سلام کیا تو صفیہ بھابھی چونک گئیں پھر اس کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس دیں۔ توبہ ہے، تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ ویسے آج صبح سے ہی میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔ یہ دیکھو میں نے ربیعہ کے لیے کیا ڈیزائن بنایا ہے کیسا ہے۔۔؟

اوہو۔ ونڈرفل، حمیدہ نے تعریف کی۔ اس میگزین میں دیکھا تھا۔ بھابھی بتانے لگیں۔

اللہ، بھابھی آپ کہاں سے اتنے پیارے ڈیزائن والے میگزین لاتی ہیں، سچ مجھے بھی بڑا شوق ہے لیکن آتا کچھ نہیں۔ اب سوچتی ہوں آپ سے سیکھوں گی۔ سکھا دیں گی نا مجھے۔؟

ضرور بھئی، مگر فیس لگے گی۔ بھابھی نے شرارت سے کہا۔ دونوں ہنس دیں۔ اچھا تم بیٹھو میں نے ابھی عصر کی نماز نہیں پڑھی۔ بھابھی نماز پڑھنے چل دیں اور وہ میگزین کا جائزہ لینے لگی۔

'بھابھی۔ بھابھی!' مردانہ آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ صحن کے بیچوں بیچ وہ کھڑا تھا۔ ہلکے سلیٹی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس سر پر سفید ٹوپی پہنے جیسے نماز پڑھ کر آیا ہو۔ حمیدہ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ دم بخود کھڑا رہا۔ پھر جیسے نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ سوری کہہ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ حمیدہ ابھی تک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کون ہو سکتا ہے؟ عادل بھائی کو دیکھا ہے ان کے سب بھائیوں کی تصویریں بھی دیکھی ہیں ہو سکتا ہے کوئی رشتہ دار ہو مجھے کیا؟ وہ کندھے اچکا کر پھر سے میگزین میں گم ہو گئی۔

پھر بھابھی سے پتہ چلا وہ کنعان ہے عادل بھائی کا [illegible] کے انتقال کے بعد پھوپھا نے دوسری شادی رچائی تھی۔ پہلی بیوی سے یہ دو بچے تھے کنعان اور ایمن۔ ایمن کے بارے میں سنا ہے پاگل خانے میں ہے۔ کنعان کئی سال پہلے آسٹریلیا چلا گیا تھا۔ آج کل ایک ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے اور ہمارے گھر ملنے آیا ہے۔ بہت شریف انسان ہے۔ مجھ سے پہلی بار ملا مگر اتنی عزت کرتا ہے میری ڈھیر ساری تو چیزیں آسٹریلیا سے لایا۔ بھابھی نے اس کی

بہت کچھ بیان کر دی تھی۔

حمیدہ تھوڑی دیر بعد گھر لوٹ آئی۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے عشا کی نماز پڑھی۔ دعا مانگتے وقت اچانک سا کنعان کی صورت سامنے آ گئی۔ وہ دعا مانگنا بھول گئی تھی۔ بستر پر آ کے آ کے عجیب سا محسوس ہوا۔ موٹی موٹی اداس آنکھیں سنجیدہ سی بارعب شخصیت، اسے یوں لگا جیسے وہ برسوں سے یہ آئیڈیل تراشتی رہی ہو۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی جسے تصوراتی باتوں سے دور کا بھی سروکار نہ تھا۔ اسکول کالج میں بھی اسے آئیڈیل بنانے والی لڑکیوں سے چڑ ہی رہتی۔ مگر آج۔ آج وہ خود ان کی صف میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو بار بار اس کے خیالوں سے نکالنا چاہا لیکن پھر ایک بات پر اسے الجھن ہونے لگی۔ کنعان اسے دیکھ کر اتنا اداس کیوں ہو گیا تھا اس کے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا تھا۔ رات اسی طرح گزر گئی۔

پھر وہ جب بھی بھابھی صفیہ کے پاس جاتی۔ بہت کم کنعان اس کے سامنے آتا لیکن جب بھی ملتا بڑے اخلاق سے۔ بھابھی کی دلچسپ باتوں پر ہولے سے ہنس دیتا۔ اس نے کبھی فضول باتیں بھی نہیں کیں۔ صفیہ بھابھی نے ربیعہ کی رسم بسم اللہ کی تقریب کا اہتمام کیا۔ حمیدہ صبح ہی سے بھابھی کا ہاتھ بٹانے کو وہاں موجود تھی۔ ابھی ابھی وہ تیار ہوئی تھی۔ بھابھی نے کہا تھا۔ اب مہمانوں کے آنے کا وقت ہو چلا ہے تم بھی حلیہ صحیح کر لو۔ اس نے فیروزی پلین سوٹ پہنا اور چٹیا کھولتی ہوئی کچن کی طرف جانے لگی تبھی راستے میں کنعان کے کمرے کو کھلا دیکھ کر رک گئی وہ خاموش سا کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر وہ زبردستی کو مسکرایا اور سیدھا ہو گیا۔ آؤ حمیدہ کیا حال ہے تمھارا۔؟

میں تو ٹھیک ہوں آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے حمیدہ نے ہوا مسکرا کر پوچھا۔

کیوں بھئی ہمارا کیا کام ہے خواتین کی محفلوں میں ویسے تم آج بہت پیاری لگ رہی ہو ان کپڑوں میں، وہ بے تکلفی سے بولا۔ حمیدہ نے حیرت سے اسے تکا اور پھر بولی اچھا میں چلوں ابھی بہت کام ہے۔

وہ سارا دن حمیدہ نے ان جملوں کی بازگشت میں گزارا "تم آج بہت پیاری لگ رہی ہو ان کپڑوں میں" اس نے بار ہا خود کو آئینے میں دیکھا۔ مگر وہ اتنی خوبصورت تو نہیں تھی بس ٹھیک ٹھاک سی تھی۔ مگر کنعان نے شاید وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ اتنے دنوں سے وہ صرف چند رسمی باتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ مگر اب۔ اب اس نے کیسے بے تکلفی سے تعریف کر دی۔

نجم کو بخار تھا۔ اس لیے وہ تین دن تک بھابھی کے گھر نہ جا سکی، اس روز خالہ منیبہ سے اجازت لے کر وہ اکیلی ہی چلی آئی مگر بھابھی گھر پر موجود نہیں تھیں۔ فہد مٹھیا اپنے طوطے سے باتیں کر رہا تھا اس نے بتایا امی تھوڑی ہی دیر میں آتی ہوں گی کہیں کام سے گئی ہیں۔ وہ دیر تک اس کے پرندوں سے باتیں کرتی رہی پھر آہستہ سے اٹھی اور کنعان کے کمرے کی طرف چل دی۔ پردہ ہٹا کے وہ اندر تکتی رہی۔ وہ نیم دراز پلنگ پر کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ وہ اس کی آمد سے بے خبر کتاب میں گم تھا۔ تبھی حمیدہ نے اپنے پاؤں کی آہٹ سے اسے متوجہ کیا۔ اسے دیکھ کر وہ کھل سا گیا۔ حمیدہ تم اتنے دن کہاں غائب تھیں؟ میں تمھارے بغیر اداس ہو گیا تھا حمیدہ۔ تم خیریت سے تھیں نا کہیں بیمار تو نہیں تھیں؟ وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔ اور حمیدہ تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ اتنا پیارا اعلیٰ شخصیت کا مالک شخص اس کے بغیر اداس تھا۔ کیا وہ اتنی اعلیٰ ہستی بن گئی ہے اس شخص کی نظر میں۔ پھر وہ اٹھا اور اپنا اٹیچی کھول کر اس میں سے بہت خوبصورت کپڑا نکالا اور دوسرے ہاتھ میں جیولری کا ڈبہ تھا حمیدہ ابھی تک سحر زدہ سی کھڑی تھی حمیدہ یہ میری طرف سے تمھارے لیے ہے، اس نے وہ چیزیں حمیدہ کی طرف بڑھا دیں۔

مگر یہ کیا۔ کنعان حمیدہ نے پہلی بار اس کا نام لیا تھا کنعان نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ حمیدہ جب میں چھوٹا سا تھا تو میری امی فوت ہو گئیں تھیں اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن تنہا رہ گئے۔ جب ابو نے دوسری شادی کر لی تو

بھائی آسٹریلیا چلا گیا تو امین اس وقت ۸ برس میں پڑھا کرتی تھی مجھے اکثر خط میں لکھتی۔ بھائی جان میرے لیے خوبصورت کپڑے اور کھلونوں والا سیٹ لائیے گا۔ لیکن حمیدہ میری زندگی کا المیہ دیکھو جب میں اپنی پیاری بہن کی خواہش پوری کرنے کے قابل ہوا تو وہ ان چیزوں کی پہچان سے قطعی ناآشنا ہو چکی ہے۔ سوتیلی ماں نے ظلم و ستم کی حد کر دی اور اسے ہوش و خرد کی دنیا سے دور کر دیا۔ وہ پاگل ہو گئی حمیدہ۔ میری پیاری امین پاگل خانے میں ہے اس نے اپنے بھائی جان کو نہ پہچانا وہ جذباتی ہو کر رو رہا تھا۔ حمیدہ ایک ٹک اس کے معصوم چہرے کو تک رہی تھی۔ وہ دوبارہ سنبھل کر بولا اس روز جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تو یوں لگا جیسے تم امین ہو۔ تمہارا قد و قامت صورت و شکل ہو بہو امین کی طرح ہے۔ میں تمہیں اپنی امین ہی سمجھ کر آج تک اتنے پیار و خلوص سے باتیں کرتا رہا ہوں تم نے برا تو نہیں مانا۔ یہ چیزیں بھی میں تمہیں اپنی بہن امین سمجھ کر ہی تو دے رہا ہوں۔ حمیدہ تمہارا بھائی بھی تو میری طرح ہوگا۔ اپنی چھوٹی بہن سے پیار کرنے والا۔ اس کی فرمائشوں کو پورا کرنے والا۔ تم یہی سمجھنا تمہارے اپنے بھائی نے تمہیں یہ چیزیں تمہاری فرمائش پر دی ہیں کیا تم مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتیں۔؟ وہ حمیدہ سے التجا کر رہا تھا۔

اور وہ۔ اسے پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا تھا، اتنے عرصے وہ جس بھائی کے پیار کو ترستی رہی۔ آج ملا بھی تو کس طرح ملا؟ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ آنکھیں جلنے لگیں اس نے اپنی جلتی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ کنعان اس کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا۔ حمیدہ کیا میری باتوں سے تمہیں دکھ ہوا ہے میری اچھی بہن۔ میں تمہیں پریشان دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ کمرے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسوؤں نے سارا چہرہ دھو دیا تھا۔ کنعان نے وہ چیزیں اس کے ہاتھوں میں دیں کیا بھائی کا یہ حقیر تحفہ قبول نہیں؟۔

نہیں۔ بھائی جان۔ یہ میرے لیے سب تحفوں سے قیمتی تحفہ ہے وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ بھائی جان کہتے ہوئے اسے اپنے اندر ایک خوشی کا احساس ہوا لفظ بھائی جان سے اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔

حمیدہ میں کل واپس آسٹریلیا جا رہا ہوں۔ میری بہن کی دعائیں مجھے امید ہے ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔ اور حمیدہ نے اس کے تحفے کو سینے سے لگا لیا۔ بھائی جان خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین

اور پھر اسی سال وہ حمیدہ سے مسز ثاقب بن گئی۔ بہت چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے بھائی کو مدعو نہ کر سکی کہ لوگوں کے چھوٹے ذہن اس عظیم رشتے کو کیسے قبول کر سکتے تھے؟۔

نئے دعا لیہ رومانی ناول

نئی صبح	مسرور جہاں	[illegible]
اکیلی	سلمیٰ کنول	[illegible]
شگفتہ	نسیم انہونی	[illegible]
گوری	روحی معظم	[illegible]
بے نشان راستے	بلقیس ظفر	[illegible]
پیاسی	بشریٰ رحمن	[illegible]
تعبیر	ثریا شمع ملک	[illegible]
دل ایک گلشن	رضیہ جمیل	[illegible]
گوہر	رعنا محمود	۲۵/-
بہار آنے تک	نسیم منظر	[illegible]
جھوٹے سچے لوگ	سیدہ افضل	۲۰/-
بے درد	سلمیٰ کنول	[illegible]
سوج نگر کی رانی	رضیہ جمیل	[illegible]
راضیہ	فریدہ جبیں	[illegible]
اندھی راہیں	تنویر زہرہ بخاری	[illegible]
گناہ گار	عفت موہانی	[illegible]
نیلوفر	شاہدہ ابو بگرامی	[illegible]
گردش دوراں	بیگم رقیہ سلیم	[illegible]

چند معیاری ناولیں

آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	۲۵/-
آنگن	خدیجہ مستور	۲۰/-
آخری شب کے ہم سفر	قرۃ العین حیدر	[illegible]
دوسری منزل	امرتا پریتم	[illegible]

قصہ مہمانوں کا

سہ کس بلا کا جوش اس مہمان دیوانے میں ہے
کل پکا کر گھر سے نکلا آج پھر کھانے میں ہے

پرانے وقتوں میں کوا منڈیر پر بول کر مہمان کی آمد کا اعلان کر دیتا تھا۔ مگر سائنس کے اس دور میں پتہ ہی نہیں چلتا اور مہمان آ ٹپکتا ہے۔ مہمان کا گھر میں آنا برکتوں کا نزول ہوتا ہے۔ جس گھر میں مہمانوں کی ریل پیل ہو وہاں رزق میں کمی نہیں ہوتی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے۔ مہمان اپنے مقدر کا کھاتا ہے۔ مہمان نوازی کا اگرچہ عربوں کی مشہور رہے مگر ہمارے ملک کے شہرۂ آفاق ہیں۔ مہمان کیلئے مشہور رہے کہ وہ ملک لیے آتا ہے۔ مگر یہ ضرب المثل ہمارے ملک کے مہمانوں کیلئے نہیں کیونکہ یہاں بیشتر مہمان ایک دفعہ آ کر اہل خانہ کی بے مثال میزبانی سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے اور میزبان دن کے چین اور رات کے سکون سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ایک صاحب رزق جب کبھی کسی کے گھر جاتے تو وہاں سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں کسی مہمان گزیدہ شخص کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ خاصی رات بیت گئی۔ باتوں کا سلسلہ اور مہمان نوازی کی رسمات تک ختم ہو چکی تھیں۔ مگر حضرت مہمان بدستور ڈٹے بیٹھے تھے صاحب خانہ نے جب مہمان کی جبر آزما مستقل مزاجی دیکھی تو اپنے لڑکے کو آواز دی۔ لڑکا آیا تو انہوں نے اسے مکان کی رجسٹری اندر سے لانے کے لیے کہا۔ مہمان یہ انوکھی فرمائش سن کر بول اٹھا۔ چوہدری صاحب! اتنی رات گئے رجسٹری کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟

صاحب خانہ نے برجستہ جواب دیا، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مکان کے مالک آپ ہی ہیں یا میں۔ اگر آپ ہیں تو میں چلتا ہوں سہ

یہ نہ پوچھ کہ مجھ پہ کیا گذری
یہ بہت دکھ بھری کہانی ہے
صبح صادق سے ہو گئی ہے شام
مجھ کو اک سال بھی گرانی ہے

———

اس قسم کا ایک مہمان کسی بدنصیب کے ہاں اچانک وارد ہوا اہل خانہ کے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مہمان اپنے میزبان سے اتنا متاثر ہوا کہ واپس جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ آخر ایک دن میزبان اور مہمان دونوں اکٹھے بیٹھے تو معزز مہمان نے انتہائی انکسار سے میزبان پر انکشاف کیا کہ وہ چند روز اور ٹھہر کر واپس جانے کا پروگرام بنائے گا۔ میزبان نے سر تھام لیا اور کہنے لگا: اب نہیں ہو سکتا۔ کم از کم میری زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

مہمان یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوا اور میزبان کے خلوص کا تذکرہ کرتے ہوئے تشکر آمیز لہجے میں کہنے لگا، آپ گھبرائیں نہیں میں پھر آ جاؤں گا۔

میزبان پر جوش انداز میں کہنے لگا، "خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آپ پھر نہیں آئیں گے۔"

مہمان حیرت زدہ ہوا اور کہنے لگا، آپ یقین کریں میں ضرور واپس آؤں گا۔

میزبان نے جواب دیا: یقین کس طرح کروں۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آپ یہاں سے جائیں گے ہی نہیں تو واپس کیسے آئیں گے؟

———

شادی، بیاہ، منگنی کی کوئی تقریب ہو کسی بوڑھے یا جوان یا بچے کی حادثاتی یا طبعی موت واقع ہو جائے۔ اہل خانہ میں سے کوئی بیمار پڑ جائے کوئی بچہ امتحان میں غلطی سے کامیاب ہو جائے۔ کسی کو اچھی ملازمت مل جائے یا کوئی شخص حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے واپس آیا ہو تو مہمانوں کو دعوت عام کا بہانہ مل جاتا ہے۔ وہ بغیر اطلاع دیئے آنا شروع ہو جاتے ہیں اہل خانہ اپنی خوشی یا غم کو یکسر فراموش کر کے مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

———

کبھی کبھی ایسے مہمان بھی آ جاتے ہیں، جن کی جیب واپسی کے وقت کٹ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں میزبان کیلئے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ مہمان کو اتنی مدت تک اندر ٹھہرائے کہ وہ گھر خط لکھ کر روپیہ منگا لے یا واپسی کے کرایہ کا انتظام کر دے۔

ہمکنار کرے۔

انتقال پرملال کی خبریں

● بہن توحیدہ خاتم (شوہر برکھا پ) تحریر فرماتی ہیں کہ ان کی [illegible] تبسم حسن کی عمر صرف ۱۴ اور ۳ سال کی تھی ۲۲ جولائی [illegible] صبح اللہ پاک کو پیاری ہوگئی (اللہ پاک بہن توحیدہ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور نعم البدل دے۔)

● پروفیسر شبیہ [illegible] حسن صاحب صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی [illegible] ۱۴ راگست ۸۲ء کی شب میں بعمر ۶۰ سال رحلت فرما گئیں۔ چند روز قبل ان پر فالج کا دورہ پڑا تھا۔ ہر کوشش اور علاج کے باوجود کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مرحومہ پٹنہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد محترم خان بہادر سید احمد علی خان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ اسی طرح مرحومہ کے شوہر سید امتیاز حسین ترمذی ایڈووکیٹ بھی اسلامی تاریخ کے مورخ تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومہ کو بخشے اور ان کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (نسیم انہونوی)

● باقر جلالی عرف بدھن صاحب سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمارے قریبی عزیزوں سے بھی زیادہ ہم سب کو عزیز رکھتے ہیں اس لیے جب کراچی سے ان کا خط آیا کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو ہم سب کو بے حد صدمہ ہوا۔ باقر صاحب کے والد سید محمد سجاد صاحب کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ ان کا انتقال ۲۸ جولائی ۸۲ء کو ہوا تھا۔ مرحوم پرانی وضع کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کی عمر ایک سو سال کے لگ بھگ تھی۔ اللہ پاک انہیں بخشے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

● بشیر احمد امیر خاں ارد بلور اہم بڑے غم و افسوس کے ساتھ لکھ رہے ہیں کہ ہماری لاڈلی جان ر [illegible] میں نہیں آیا یعنی دل کا دورہ) منو باقر صرف دو دن بخار میں مبتلا رہ کر ہمیں [illegible] ۲۲ جولائی یعنی ۱۶ سال کی عمر میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مرحومہ ملنسار خوش مزاج اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ یہ حادثہ ہمارے خاندان کے لیے بڑا المناک ہے۔ اللہ پاک انہیں بخشے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ایسی موت سب کے لئے المناک ہوتی ہے۔ میں بھی آپ سب کا شریک غم ہوں۔ ۔۔۔ نسیم انہونوی)

انتقال کی ایک پرالم خبر عزیزہ شکیلہ پروین نے کلکتہ سے بھیجی ہے ان کے والد محترم امیر حسین صاحب نماز مغرب پڑھ کر واپسی کے لئے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے کہ ایک مٹاڈار گاڑی اوورٹیک کرتے ہوئے ان سے ٹکرا گئی۔ وہ بیہوش ہوکر گر پڑے۔ اسپتال لے جایا گیا لیکن چوٹ دماغی تھی اس لئے ہوش نہ آسکا اور تین دن میں ۳ راگست ۸۲ء کی شب میں ۱۱ بجکر ۴۰ منٹ پر رحلت فرما گئے۔ مرحوم کی عمر ۶۰ سال کی تھی۔ صرف پابند صوم صلوٰۃ ہی نہیں پردہ کے بھی حامی تھے۔ ۳۰ سال تک باقاعدہ حریم کے خریدار ہی نہیں رہے بلکہ اس کے لطائف کا بغور مطالعہ بھی کرتے تھے۔ ایسے حریم نواز کی موت میرے لئے بھی المناک ہے۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ مرحوم نے ماشاء اللہ چار لڑکیاں اور دو لڑکے اپنی نشانی چھوڑے ہیں۔ اللہ پاک انہیں اور مرحوم کی اہلیہ صاحبہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(شریک غم نسیم انہونوی)

● افسوس میرے خالہ زاد بھائی محمد احسن عرف بٹن کا ۲۴ راگست ۸۲ء کی صبح ۵ بجے لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک عرصہ سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ اس کے بعد میت ان کے وطن محمد آباد۔ اٹھی بندگی میاں برائے تدفین لے جائی گئی۔ (نسیم انہونوی)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں سنجیدہ اور معیاری ہو۔ اشعار شائع ہونے والے مہینہ سے قبل کے مہینے میں ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول نہیں ہوتے وہ شائع نہیں کیے جاتے۔ اکتوبر کے لیے عنوان ہے "گلشن" اور نومبر کے لیے "نشاط"۔ (ادارہ)

وعدہ ہو یا کہ قول، وہ ایسے ہیں نا دہند
ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضہ کیے بغیر

مرسلہ: کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

مرسلہ: حفصہ رحمٰن (آمبور)

تم اُن کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

مرسلہ: مسز عالیہ خلیل (بڑودہ)

شکوہ کروں میں وعدہ خلافی کا تجھ سے کیا
جب ہو چکا ہے دل سے ترا اعتبار ختم

مرسلہ: مسرور جہاں (آرہ بہار)

وعدہ اپنا وفا نہیں کرتے عمر میری بڑھائے جاتے ہیں

مرسلہ: بلقیس [illegible] (احمد نگر)

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا ہوتا، وعدہ تو کیا ہوتا

مرسلہ: نور جبین دل افروز (رجہت۔ نادہ)

وعدہ کر کے گئے کہ آئیں گے خواب میں
مارے خوشی کے نیند نہ آئے تو کیا کروں

مرسلہ: سمیہ صبا (گیا بہار)

[illegible]

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ
کوئی جینے کا سہارا ہی نہیں

مرسلہ: نیلوفر (چھنڈ)

جب نبھانے کی ہمت نہیں ہے تو پھر
سارے وعدے بھلانے کا وعدہ کرو

مرسلہ: سہیلہ (حسان)

حسین وعدے تو کرتے ہیں نبھانا بھول جاتے ہیں
لگا کر آگ سینے میں بجھانا بھول جاتے ہیں

مرسلہ: جبیں رومی، نازنین و تنویر (کبی پور)

مرسلہ: پی نیرہ بانو (پرنام بٹ)

کس طرح کوئی ترے وعدۂ فردا پہ جیے
جبکہ دم بھر نہیں جینے کا بھروسہ کوئی

مرسلہ: صوفیہ مظفر (ملکو۔ جمشید پور)

وعدہ وفا کر دے گے، یہ میں مانتا نہیں
اس کو فریب دو جو تمھیں جانتا نہیں

مرسلہ: خدیجہ نسیمی (ہزاری باغ)

وعدہ کے اعتبار میں تسکین دل تو ہے
اک بے وفا کو بھول نہ جائیں تو کیا کریں

مرسلہ: قرۃ العین (سندیال)

شکر صد شکر کہ آیا ملک الموت رفیق
آج اس وعدہ فراموش کو میں یاد آیا

مرسلہ: ب، ن۔ آنسہ
ابراہیم بنگلور

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں
در حقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

مرسلہ: صباح یاسمین (آمبور)

اُتر پردیش

ہمالہ سے لے کر بحیرِ ہند تک
سمائی ہوئی ہے میری روح
اٹھتا ہے ایک قدم
کھلتی ہیں ہزار راہیں
میں ہندوستان کا دل ہوں۔ میں اُتر پردیش ہوں
ملی جلی تہذیب، یک جہتی اور ترقی کا سندیش ہوں
میں اُتر پردیش ہوں

آیئے

نئی بلندیاں سر کرنے کے لئے
یوم آزادی کے موقع پر ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھیں
ترقی ہمارا نصب العین ہے

جاری کردہ: [illegible]

کیسا ہے؟"

"[illegible] دوست ہیں" الیاس احمد نے کہا: "وہ دوست بنانے میں [illegible] آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اچھے ہی لوگ ہوں گے۔ ان کے صاحبزادے [illegible] ہیں بہت معقول آدمی ہیں۔ آپ ایک نظر انھیں دیکھ لیجئے تو پھر بات آگے بڑھاؤں"

تمھاری بہن نے اپنے بھائی کے لیے کہا تھا: بڑی بی بولیں۔

خاندان میں اس قسم کی کھچڑی پکانا عقلمندی نہیں ہے امی: الیاس احمد نے کہا: فرض کیجئے کہ میں اگر سلیقہ سے کسی بات پر ناراض ہوتا ہوں تو میرا انتقام ان کے بھائی صاحب ماریہ سے لیں گے یعنی کہ بھائی کا تھپڑ ناکردہ گناہ بہن کے گال پر واپس کریں گے!"

"یہ تو ہے۔" بڑی بی نے ہلکا سا سر ہلایا۔

ماریہ کمرے سے نکل کر جا چکی تھی۔ جب وہ چھوٹی سی چمکدار ٹرے میں ان کے لیے دلیہ اور بھائی کے لیے کافی رکھ کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی تو اس نے سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"اللہ کا نام لے کر رشتہ پختہ کر دو۔ اور وہم کو دل سے نکالو بعض وقت [illegible] کا کہا سامنے آ جاتا ہے۔ ابھی کچھ نہیں ہوگا!"

الیاس احمد نے کافی پیتے ہوئے کہا: "تو پھر میں صاحبزادے اشتہر کرمانی کو لکھوا دوں کہ براہ کرم بردکھوے کے لیے تشریف لے آئیے!"

ماریہ ماں کے پہلو میں بیٹھی انھیں چمچہ چمچہ دلیہ کھلا رہی تھی۔ ماں کا سر جھکا ہوا تھا۔ بڑی بی نے سر ہلایا پھر منہ اونچا کر کے دلیہ نگلا پھر بولیں: "میں [illegible] نئی نسل کے جوانوں کو مینہ دے کے [illegible] (باقی آئندہ)

کام سے جو چلی گئی ہو۔ چچی ماں شکایت کر رہی تھیں کہ تو ہنڈیا سے گوشت بھونے کو مت کہو۔ خاک کر دے گی۔ مردوں کی طرح تھوڑے سے شیر بھیڑیے سن لو۔" زہرہ نے کہا: "جس گھر میں جائے گی۔ میرے سفید بالوں اور باپ کی سفید مونچھ میں [illegible] لگائے گی۔ میاں شعر اور بحر نہیں سنے گا۔ چولی پکڑ کر چولہے میں منہ گھسیڑ دے گا۔"

"یہ کہا تھا امی نے۔؟" رضوانہ نے کپکپاتے ہونٹوں سے پوچھا۔

"اور بھی جیسے کیا کچھ کہا تھا۔ ہمیں اتنا ہی سا یاد رہا" انوشابہ نے کہا۔

"کاش امی میں کچھ ادبی ذوق ہوتا" رضوانہ نے ٹھنڈی سانس لی جس پر سمیرہ چیخ اٹھی۔ "اب نام مت لینا۔ مجھ سے سنو۔ کل بھائی میاں کے ساتھ فلم کھٹا میٹھا دیکھ کے آئی۔ واہ۔ تم نے سنا۔ اس میں گانے والوں نے اتنی تیزی سے کھٹا میٹھا کو کھٹ مٹ مکوٹ مٹ گایا کہ ایمان سے ہم لوگ تو نقل کر ہی نہیں سکتے۔ سناؤں پوری اسٹوری۔"

"خدا کی مار اسٹوری پر اور تم پر بھی" رضوانہ نے کہا۔ زہرہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور دفعتہً مسکرا کر بولی۔ "اسٹوری کو رکھو چولہے میں۔ ایک اشاپ پریس کی خبر مجھ سے سنو۔ اگر پسند نہ آئے تو دام واپس"

"دام۔ کاہے کا دام۔؟" زہرہ بی اب آمدنی کے نئے طریقے نکال رہی ہیں" سمیرو نے کہا:

"دام اس کے کہ خوشخبری سن کر مٹھائی تو تم لوگ منگوا دو گی ہی" زہرہ بولی۔

"تو پھر سنا بھی چکو" سمیرو نے کہا۔

گوش بر آواز نگاہ بہ روبرو۔ دست بہ کلیجہ۔ کی خبر سننے کے بعد ممکن ہے کوئی فرط مسرت سے یا فرط غم سے اللہ کو پیارا ہو جائے؟"

"[illegible] رضوانہ نے [illegible]

"نوشابہ ہنس دی۔ "وہاں نند و نند کا جھگڑا ہی نہیں ہے۔"

"اچھا تو پھر تمہارے جیٹھ کی اماں سنو" ہو نے کہا۔

"بات تو سنو میری" رضوانہ نے دخل دیا "ہاں تو وہ بے چاری کیسی ہیں!"

"ہائے۔ سنتی ہوں کہ الف کا نام لٹھ بھی نہیں جانتی" نوشابہ بولی۔

"ایک مرتبہ مشن بھائی کے بچے کے عقیقے میں بڑی بی کو میں نے دیکھا تھا"
زہرہ نے کہا "کیا بتاؤں ان کا حلیہ۔ کلف دار کڑک ساڑی پر گھٹنوں تک
لمبا چکن کا کرتہ پہنے تھیں۔ کھچڑی بالوں کی دم میں لال موباف اور اللہ
نوشابہ کو جوتے بھر کے تیکی دے متوں سونا لاد رکھا تھا بھاری بھرکم پیلے بدن
پر۔ مانی جالہ نے چپکے سے بتایا کہ وہ ہیں۔ نوشابہ بٹیا کی ہونے والی ساس
یہ سنتے ہی تو ہم تو مانی بولیں کہ احمق نہ ہو۔ بڑھی مالدار ہے۔ سب بیٹے
بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔ نوشابہ کا دولھا تو ماشاءاللہ ڈاکٹر ہونے والا
ہے۔ لڑکی ایک نہیں جو نند بن کر کلیجہ جلائے۔ بڑی بی کے بعد سارا مال و
متاع بہوؤں ہی میں تقسیم ہوگا۔ نوشابہ کی قسمت اچھی ہے۔ لڑکی راج
رے گی"

"اور کیا" سیمرہ بولی "ساسوں سے کیا لینا دینا، تھوڑے دن بے شک
اپنی ساسیت" بگھارتی ہیں۔ بگڑا نامیاں اچھا تو جگ اچھا"

"بے چاری نے جہالت کی تاریک زندگی کیسے گزاری ہوگی" یا رضوانہ نے
چہرے پر لرزنے کے آثار پیدا کر کے نوشابہ کی ساس پر ترس کھایا ہی تھا کہ زہرہ
منہ ورگ دیا۔ "اپنا پرانا فلسفہ مت بگھارو۔ کیچڑ کی بو آتی ہے۔ تم تو اس پر شکر
کرو کہ وہ تمہارے آئیڈیل کے گھر میں جا رہی ہے"

"کیا مطلب" کیا رگی رضوانہ کو جیسے بچھو نے ڈنک چبھو دیا۔

اس کا چہرہ رنج و الم کے ساتھ نجانے کن کن صدمات کا آئینہ بن کے رہ گیا تھا
کہ الیاس احمد کے دل پر بڑی چوٹ پڑی!

"تم خدا کی رحمت سے مایوس ہوگئی ہو۔ ماریہ" انھوں نے کہا اور بڑے لاڈ
بڑے پیار سے ماریہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے "اللہ اتنی زبردست آزمائش میں
بھی مبتلا نہ کرے گا کہ ہم جی نہ سکیں۔ ابا جان کی ناگہانی موت کا صدمہ امی کو اس
نوبت پر پہنچا گیا ہے اور دوسرا ہیجان انہی لوگوں کا ہے۔ سچ بتاؤ۔ کیا
تم بھی اس چیز کو یوں بڑھا چڑھا کر محسوس کرتی ہو۔؟"

"بھائی جان۔ مجھے کسی بات کا صدمہ نہیں۔ مگر۔!"

"کسی بات کا صدمہ نہیں؟" حیران ہو کر الیاس احمد نے کہا "میں تمہاری بات
قطعی سمجھ نہیں سکا!"

"میں شروع ہی سے بہت منحوس ہوں" ماریہ نے خشک لہجے میں جواب دیا "
پیدا ہوئی اور دادا ابا چل بسے، پہلی سالگرہ تھی۔ دادی اماں نے ہمیشہ کے لیے
ساتھ چھوڑ دیا۔ آپ نے بڑی دھوم دھام سے بسم اللہ کا انتظام کیا تھا ادھر
میرے لیے ہار پھول مٹھائی کا بندوبست ہو رہا تھا ادھر فرید آباد سے تار آیا کہ
پھوپھی اماں دماغ کی رگ کے پھٹ جانے سے ختم ہوگئیں۔ اب دیکھیے کہ آپ
نے میری گھر بسائی کا شوشہ چھوڑا تھا۔ ابا جان داغ مفارقت دے گئے امی
نے بستر پکڑا ہے۔ باز آجائیے بھائی جان۔ خدا کے لیے کسی نئی بات کا اہتمام
کیجیے۔ ابا جان کے بعد مجھے امی کی زندگی بہت عزیز ہوگئی ہے۔ اگر خدانخواستہ
امی کو بھی کچھ ہوگیا تو میں خودکشی کر لوں گی!"

پھر دیکھ۔ الیاس احمد نے دل ہی دل میں کانپ کر اسے کہا "میں کئی
مرتبہ تم کو نصیحت کر چکا ہوں کہ [illegible] نہیں سوچنا چاہیے

[illegible] جاری تھی۔ ایک معیاری رشتہ طے بھی گیا تھا لیکن بات کے پختہ ہونے سے پہلے ہی ان کے والد اچانک چل بسے۔ وہ کاروباری سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ انہی کی بدولت الیاس احمد کا بزنس بھی چمک رہا تھا۔ اب ساری ذمہ داری ان کے سر آپڑی۔ کچھ دنوں کے لیے وہ بدحواس ہو گئے۔ باہر کی مصروفیات میں وہ بھول گئے کہ زریں کے رشتے کی بات بھی ہوئی ہے۔ اس طرف توجہ گئی تو پتہ چلا کہ وہ لڑکا جو کسی بڑے لابیے میں ان کے خاندان میں شامل ہونا چاہتا تھا کہیں اور جگہ شادی کر چکا ہے۔ اس سانحے نے الیاس احمد کو پریشان کر دیا۔ رہی سہی کسر ان کی ناگہانی بیماری نے پوری کر دی۔ شوہر کی وفات کا صدمہ بیٹی کی بدقسمتی کا رنج دوہری اذیت تھی جس نے بڑی بی کو ایک سخت معذور مجبور کرکے بستر پر لا ڈالا۔

الیاس احمد بڑے نیک، رحمدل اور سعادت مند بیٹے تھے۔ انھوں نے ان کو مستقل سمجھ کر ان سے لاپرواہی نہیں برتی۔ بلکہ بڑے قابل ڈاکٹروں کو ان کے علاج پر متعین کیا۔ نرسیں خدمت گزاری کے لیے الگ تھیں۔ آریہ خود دیکھ بھال کرتی تھی اور اپنی ضروری مصروفیات سے وقت نکال کر الیاس احمد بھی ان کی تیمارداری میں ہاتھ بٹاتے! لیکن یہاں تو دن رات تھی کہ بہترے اور بہترین علاج کے ساتھ ساتھ بیماری روز افزوں ترقی پر تھی! الیاس احمد کی پریشانی نقطۂ عروج پر پہونچتی جارہی تھی! وہ سمجھ چکے تھے کہ انھیں آپ کے بعد اب ان کی جدائی کا صدمہ بھی برداشت کرنا تھا!

ان کی پریشانی، تفکر اور بیزاریٔ شکار انداز بیگم سے پوشیدہ نہ رہا۔ جب وہ بعد [illegible] طرح ان کی مزاج پرسی کے لیے ان کے کمرے میں آئے تب [illegible] بالکل [illegible] بستر پر پڑی تھیں اور پائنتی آریہ سر جھکائے بیٹھی تھی

"جی ہاں! ڈاکٹر حشمت علی خان صاحب، تمہارے من چاہے شاعر صاحب کے چھوٹے بھائی ہی تو ہیں!" زہرہ نے اس پر ایٹم بم پھینک مارا اور اس کے حواس کے پرخچے اڑا دیے۔

"زہے قسمت، زہے نصیب!" رضوانہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ پھر بھی بڑی بہادری سے مسکرا کر بولی: "اسے کہتے ہیں۔ بن مانگے موتی ملیں مانگے ملے نہ بھیک، نوشابہ تم بہت خوش قسمت ہو...!"

نوشابہ کو کسی شاعر واعر سے دلچسپی ہی کب تھی۔ وہ بیزار بیٹھی رہی۔ لڑکیاں دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرکے قہقہے لگاتی رہیں مگر اب رضوانہ کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ سب کس وقت گئیں۔ کمرہ اب سنسان تھا۔ اس کے دل کی طرح۔ وہ گم صم سی بیٹھی سوچتی رہی۔ قدرت کی دین کے طریقے بھی عجیب ہیں۔ قدرت اتنی بے رحم اتنی ناانصاف کیوں ہے۔ وہ اپنے محبوب سے بڑی دور ہے۔ ان کی دید کو ترس رہی ہے۔ ان کے قرب کو مچل رہی ہے۔ مگر اس کے بس میں نہ دید ہے نہ شنید۔ اور یہ ایک خوش نصیب ہے۔ جسے کچھ احساس ہی نہیں کہ اسے بن مانگے کون سی دولت مل رہی ہے اور خدا۔ نوشابہ ان کی چھوٹی بھاوج کہلائے گی۔ ہمیشہ انھیں دیکھا کرے گی۔ وہ اس سے ہم کلام ہوں گے۔ ان کے چھوٹے موٹے کام اس سے متعلق ہوں گے! اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک کوئی دفینہ اس کے ہاتھ سے جاتا رہا ہو۔ کوئی بڑی خوشی اس سے چھین لی گئی ہو۔ وہ عرش کی رفعتوں سے پاتال کی پستیوں میں جا پڑی ہو۔ اس کی ساری جبلت اس کا شوق و ذوق اس کے سارے [illegible] مشاغل سب [illegible] ہوں۔ وہ ایک [illegible]

سے بندیا ابھی نہیں جارہا تھا۔ آنسو بھسم ہو چکے تھے۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو!

شادی کے دن عزرانہ نے اس سے پوچھا تھا: "نوشی باجی آپ کی غیر موجودگی کو بہت بری طرح محسوس کریں گی۔ کیا آپ نہیں جائیں گی۔!؟"

"میں دنیا سے اور دنیا والوں سے بہت بیزار ہو رہی ہوں" رضوانہ نے کہا "پہلے شادی میں شریک ہو جائیے۔ پھر بے زار ہو جائیے گا۔ کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔ میں سوچتی ہی تھی کہ آپ کا یہی انجام ہونا ہے۔ بیس برس کی قنوطیت، سفر اپن، غیر معمولی ادبی خبط آپ کو اس نوبت پر لا کے چھوڑے گا۔ مجھے معلوم تھا" عزرانہ نے کہا۔ سخت غصے میں تھی۔

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے"

"تو پھر بتائیے اس آدم بیزاری کی گوشہ نشینی کی وجہ۔؟"

"کیا کرو گی سن کے؟"

"تو پھر کچھ کوئی سنگین وجہ ہے!" عزرانہ حیران تھی۔

"صرف میرے لیے۔! تم لوگ اس بات کو ہنسی میں ٹال دوگے۔ اور مجھے پاگل کہوگے"

"وعدہ کرتی ہوں۔ نہ ہنسی میں ٹالوں گی نہ آپ کو پاگل کہوں گی"

"نہیں عزرانہ کچھ نہیں۔ میں بیوقوف ہوں۔ یونہی بکواس کرتی ہوں۔ تم تو نوشابہ کی شادی میں جاؤ!"

"نہیں آپ کی سہیلی ہیں۔ میں نہیں جاؤں تو کیا۔ پہلے آپ اپنی اس عجیب و غریب بیماری کے بارے میں بتائیے۔ میں ابا اور امی کو بھی مطمئن کر سکوں یا پھر آپ کا معقول علاج ہو سکے کہ آپ پھر پرانی کیفیت میں آجائیں!"

"زندگی ڈاں بن گئی ہے" رضوانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

"آپ نے بنا لی ہے" عزرانہ ترکی بہ ترکی بولی "آپ نے امی ابا کی زندگیوں کو بھی تماشہ بنا لیا ہے۔ وہ لوگ اتنے پریشان ہیں۔ آپا کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے لیے اب کون سے ڈاکٹر کو لائیں۔ امی کہتی ہیں کہ آپ پر آسیب کا سایہ ہے اب وہ لوگ چکر میں ہیں کہ ڈاکٹر کو لائیں کہ مُلا کو۔ میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ نہ حکیم نہ ملا۔ آپ کو دس پندرہ کتابیں ایسی ہی شاعروں کی لادیں۔ آپ کا علاج وہی ہے۔ مگر وہ لوگ یہ سمجھے کہ میں مذاق کر رہی ہوں۔!"

"سلام کیا شاعری داعری کو۔ عزرانہ۔ طبیعت اُدھر نہیں آ رہی ہے"

"مرحبا۔ جزاک اللہ۔ چشم بد دور۔ آپ تو گویا اب سخت منکر ہوگئی ہیں"

"تم اس قدر پے در پے طعنے کیوں دے رہی ہو" رضوانہ نے بسور کر کہا۔ [illegible]

عزرانہ بے حد سرد لہجے میں بولی "جب ہم آپ کو ان خرافات سے منع کرتے تھے تو آپ کو نہایت ناگوار ہوتا تھا۔ اب آپ خود ہی شاعری کو داعری کہہ رہی ہیں اس پر میرا اظہار مسرت طعنہ کیونکر ہوگیا۔! مگر۔ تو بتائیے کہ اس انقلاب کی وجہ کیا ہے؟"

ٹھنڈی سانس رضوانہ کے سینے سے نکلی۔ "کھل گئی حقیقت کسی کے اونچے قد و قامت کی۔ ضروری نہیں ہے کہ اپنا آدرش صحیح معنوں میں مکمل اخلاقیت کا پیکر ہو۔"

"کسی نے بداخلاقی کی ہے آپ کے ساتھ؟" عزرانہ نے پوچھا۔ دفعتاً رضوانہ کا دل بھر آیا۔ اور وہ خود بھی بھری بیٹھی تھی۔ دبی دبی آہوں میں اپنے دل ٹوٹنے کا سانحہ اس کے گوش گزار کر دیا اور پھر بولی "تم نے ... میں نے کیا سوچا تھا اور وہ کیا نکلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی گونا گوں صفات کا خوب اندازہ ہے۔ آہ۔ عزرانہ کیا کچھ نہیں دیا انھیں ... عقیدت، محبت، شہرت، ..."

وہ قربان کیے جا رہے ہیں۔ ہم ان اعلیٰ ظرف انسانوں کے ممنون ہیں کہ وہ قول کے
پکے نکلے۔ لیکن تیری یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ تجھے اپنے حسن و جمال پر
پندار نہیں جاتا ہے کہ اس طرح تو نے اپنے حسن کو خود ہی بے قیمت کر دیا تو پھر
ہمارے پاس کیوں بھیجی گئی ہے۔ حسن کو اگر نفی کر دیں تو پھر عورت کے پاس
وہ کیا رہ جاتا ہے؟ اس بارے میں کیا کہہ کر ہمیں مطمئن کرے گی۔؟"

"غلام زادی کو آپ نے حقیقت بیانی کی اجازت دے کر بہت بڑا احسان
کیا ہے آپ کی اس عالی اجازت کے تحت ہی میں اب ہر بات کہہ سکوں گی
اس امید کے ساتھ کہ آپ میری باتوں پر غور بھی فرمائیں گے:"

"تیری جرأتیں قابل تعریف ہیں" ابوبکر شاہ زور سے ہنس کر بولا۔ "اپنی
ذات پر بہت اعتماد ہے۔ ہم مشتاق ہیں اس خوبی کو جاننے کے جس نے تجھے
بے باک انداز تکلم بخشا ہے۔ اور جس کی بنا پر تو اپنے جمال کو ثانوی سمجھ بیٹھی ہے۔"

"غلام نوازی پر میں ابوبکر شاہ کی شکر گزار ہوں۔ میرا دل زخموں سے
چور ہے۔ اور جو روستم برداشت کر رہا ہے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی ہے
لیکن پھر بھی میں آپ کے پاس انصاف حاصل کرنے کے لیے اپنے حسن کا حربہ
لے کر نہیں آئی ہوں۔ اور اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے۔ میرے جسم
پر لعل و جواہر کے زیورات نہیں ہیں میں نے بے رنگ سفید لباس سے جسم
کو ڈھانک رکھا ہے۔ میرا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا ہے میری زلفوں میں
سنہری ریشمی موباف اور موتی کی لڑیاں نہیں ہیں۔ اس حقیقت سے واقف
ہونے کے عورت کا حسن شاہوں سے تخت و تاج چھنوا دیتا ہے۔ وہ چیز جو
زوال کو دعوت دے اس پر کیا فخر کرنا۔"

ابوبکر شاہ کا چہرہ [illegible] کے جذبات یکلخت ابھرے۔

(باقی آئندہ)

ونا کی دیواریں اس کی کہنہ سالی کی داستان سنا رہی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت
کے علاوہ اسے اور کوئی نظر نہ آیا۔

اگلے روز اسلام خاں واپس آ گیا۔ وہ بہت بجھا بجھا سا تھا۔ شبینہ نے سوالیہ
انداز سے دیکھا تو بولا "نوشینہ دہلی میں بھی نہیں ملی۔ میں کل سارا دن اسے
کھوجتا رہا۔ ہماری بستی خالی پڑی ہے۔ جہاں شجاعت بہادری پیار اور
وفاداری کے نغمے گونجتے تھے اب صرف سناٹا ہے یا پھر کوؤں کا شور۔ آخر اس نے
گھر چھوڑنے میں بہت جلدی کی مجھے ڈر ہے نوشینہ سپاہیوں کے ہتھے نہ
چڑھ گئی ہو۔"

"وہ جہاں کہیں بھی ہوں گی اپنے مقصد کو نہیں بھولیں گی۔ اسلام خاں
تم غلامان فیروز شاہی کے وہ فرد ہو جسے موجودہ بادشاہ کا قرب حاصل ہے
شاید ہمارے اندر تم ہی ہو جو شاہی عتاب سے محفوظ ہے۔ لیکن اگر تمہارا ضمیر
زندہ ہے تو مجھے بتاؤ کہ اپنی اس تباہی پر تم رنجیدہ نہیں ہو کیا اپنے ماں باپ
کی بربادی پر تمہارا دل رو نہیں رہا ہے کیا تم ان ننھے بچوں کی سسکیوں کو
بھول سکو گے۔ تمہیں عورتوں کی آہوں کا دھواں دکھائی دے رہا ہے؟
اپنی بہنوں کی بے حرمتی پر......"

"بس کرو شبینہ بس کرو...... میں انسان ہوں پتھر نہیں، میں کچھ نہیں بھولا
ہوں۔ سب یاد ہے مجھے سب یاد ہے مگر میں تنہا ہوں شاہی غیظ و غضب کا
مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔"

"تم تنہا نہیں ہو اسلام خاں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

"میں جانتا ہوں شبینہ تم ایک غیور اور بہادر باپ کی بیٹی ہو۔ تم نے
تمہیں تمام فنون میں ماہر کر دیا ہے تم بہت اچھی سپاہی ہو۔ مگر تم [illegible]

معصوم ہو۔ ان محلوں میں ہونے والی سازشوں کا تمھیں تجربہ نہیں ہے۔ وہاں کے اتار چڑھاؤ سے تم واقف نہیں ہو۔ ان نشیب و فراز سے تمھارا واسطہ نہیں پڑا ہے۔"

"اسلام خاں۔ ان تین دنوں نے مجھے بہت تجربہ کار بنا دیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تیر و تلوار کی جنگ ہم ہار جائیں گے لیکن اب ہم ذہنی جنگ لڑیں گے بغیر ہتھیار کے... میں ان سب کو شکست دوں گی بس مجھے تمھاری تھوڑی سی مدد درکار ہے۔"

"میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں بولو مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"تم میری رسائی ناصرالدین تغلق تک کرا دو۔ بس فی الحال میں اتنا ہی چاہتی ہوں۔"

"اس سلسلے میں مجھے کوئی مشورہ دینے کا حق دیتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔ آج ہی نہیں تمھارے مشوروں کی مجھے ہر وقت ضرورت رہے گی۔"

"تو پھر تم بجائے دہلی کے میوات جاؤ۔ ابوبکر شاہ زخمی ناگ ہو رہا ہے۔ ناصرالدین سے شکست کھانے کے بعد اب وہ دوبارہ تیاری کر رہا ہے۔ وہ تمھیں دلی طور پر خوش آمدید کہے گا۔ تمھیں اور نوشینہ کو تلوار اور خنجر زنی کی تعلیم میں نے دی ہے اور اس کے کچھ اصول بھی تمھیں بتائے تھے۔ ان سے ہٹ کر اگر تم تلوار چلاؤ گی تو تمھارا ہر وار بیکار جائے گا۔ ایسے ہی اصول ذہنی جنگ کے بھی ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہو کر ہی تم فتح پا سکو گی۔ دشمن کے ذہن کو اپنے حق میں کرنا در اصل کام ہے۔ اس وقت غور یہ کرو کہ تمھارے دشمن کا حریف کون ہے۔ میں تم سے دور رہ کر تمھاری مدد زیادہ بہتر انداز پر کر سکوں گا۔"

تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے ابوبکر شاہ کے پاس جانا چاہیے لیکن تم بھر سے

نہیں۔ اس کے خوبصورت جسم کی بناوٹ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اونچے طبقہ کی ہے۔ خود اعتماد ہے البتہ نقاب میں سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں غموں کی دنیا آباد تھی۔

ابوبکر شاہ اگرچہ میدان کارزار کا مرد تھا مگر اس وقت شینہ کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ زندگی کی کڑوی آزمائشوں میں عورت کا ساتھ بڑا فرحت بخش اثر کرتا ہے۔ دو ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ آخر شینہ نے نظریں اٹھائیں اور ابوبکر شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ دیکھنے سے مسکرا پڑا اور بولا: "بہت حسین بہت دلفریب ہے یہ تو ہیں، ہماری نگاہوں نے بتا دیا مگر ہمارا تجربہ بتا رہا ہے کہ تجھے اپنے حسن و جمال پر پندار بھی بہت ہے۔"

شینہ نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور ہمت کر کے بولی۔

"اگر میری حقیقت بیانی سے ابوبکر شاہ کے دل کو تکلیف نہ پہنچے تو کچھ عرض کرنے کی جسارت کروں؟"

ابوبکر شاہ کی نظریں بدستور اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ شینہ کے انداز تکلم نے اسے خوش کر دیا وہ بولا۔ "ہم میدان جنگ کے مرد ہیں جہاں انسان کی آنکھ صرف حقیقت ہی دیکھتی ہے رنگین خوابوں سے کوئی رغبت نہیں۔ ہمیں یقین ہے تیری حقیقت بیانی بھی تیری طرح حسین ہوگی کہہ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"بس یہی کہ فیروز شاہی غلاموں کی لڑکیوں کو حسن پر غرور کرنا نہیں سکھایا جاتا۔ ہماری ماؤں نے ہمیں اس لیے پیدا نہیں کیا کہ ہم اپنے حسن کے گرداب میں مردوں کو غرق کریں۔ ہمیں پیدا کرنے کی تکلیف اس لیے برداشت کی کہ ہم اپنے حسن و جمال کی دولت سے خسارے کا سودا کریں۔"

"ہاں۔ تو تو ان بدنصیبوں کی اولاد ہے جو اپنی جانبازی اور جاں نثاری

رابطہ ضرور رکھنا"۔

"میں نوشینہ کا زخم دل پر لیے ہوئے ہوں تم ہر طرح مجھے اپنے قریب پاؤ گی پھر دو آہستہ سے بولا نوشینہ کی تلاش میرا مقصد زندگی ہے وہ میری زندگی کی بہار آفریں ہے

شینہ نے محبت اور یاس سے بھرپور نظریں اس پر ڈالیں اور بولی "اسلام خاں، تم سے الگ ہونے سے پہلے ایک بات اور بتا دوں۔ آپا بہن جب مجھ سے بچھڑ رہی تھیں تو نجانے کیوں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اسلام خاں اگر کہیں ملے تو کہنا کہ نوشینہ کو بھول جائے اس نے اپنے لیے کسی اور منزل کا انتخاب کر لیا ہے"۔

اسلام خاں کے چہرے پر درد کے سائے گہرے ہو گئے۔ دل کا ستیاں آنکھوں میں سرخی بن کر چھا گیا۔ چند ساعت وہ گردن جھکائے بیٹھا رہا پھر بولا۔ "اس نے اپنے لیے کسی نئی منزل کا انتخاب کر لیا مگر میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں سوچی میں تو آج بھی اسی کی محبت کو اپنی منزل بنائے ہوئے ہوں"۔

"نہیں.... نہیں تم ان کی طرف سے بدظن مت ہونا۔ میری آپا بہن بے وفا نہیں ہیں۔ ان کی منزل کوئی اور نہیں وہ انتقام ہے جو لاوا بن کر ان کے دل و دماغ کو جلا رہا ہے"۔

"میں جانتا ہوں وہ بے وفا کبھی نہیں ہو سکتی۔ فیروز شاہ تغلق کے غلاموں کی اولاد کبھی بے وفا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس نے جو کچھ کیا نادانی میں کیا۔ اسے قتل کوئی نہیں کرے گا لیکن.... وہ ایک لحہ کو چپ ہوا پھر قدرے جوش سے بولا مجھے نوشینہ کو تلاش کرنا ہے۔ بولو یہ حق تو ہے مجھے۔ کیا میں اسے ڈھونڈنے کا مجاز بھی نہیں ہوں؟"

اسی وقت اس کے غلام نے آکر دست بستہ سلام پیش کیا۔

"کیا ہمارا مہمان آگیا ہے۔؟" ابو بکر شاہ نے غلام سے سوال کیا۔

"آقا آپ جس مہمان کے منتظر ہیں اس سے غلام ناواقف ہے البتہ ایک خاتون آپ سے ملنے کی خواہش لے کر آئی ہیں"۔

ابو بکر شاہ کے پر شوق چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔ "اتنی صبح وہ کیا چاہتی ہے؟"

"گستاخی معاف غلام نے یہی سوال کیا تھا"۔

"تو پھر۔؟"

"وہ کہتی ہیں کہ آپ کے بلاوے پر ہی آئی ہیں"۔

"ہمارے بلاوے پر۔؟ خیر اگر کسی نے شرارت کی ہے تو ہم اتنے بے دست و پا نہیں ہیں کہ جواب نہ دے سکیں۔ اور اگر فریاد ہے تو اسے ملنے کے آداب سے واقف کرانا بھی ضروری ہے۔ اسے حاضر کیا جائے"۔

اور چند ساعتوں بعد وہ حسن و جمال نزاکت اور صباحت کے ایک جیتے جاگتے پیکر کو مبہوت سا دیکھ رہا تھا۔ اور شینہ گردن جھکائے اس کے ردعمل کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سفید قبا پہنی تھی جسے سنہری ڈوریوں سے کمر پر تنگ کر لیا تھا۔ سفید حریری نقاب چہرے پر پڑی ہوئی تھی جس میں سے اس کی گلاب رنگت جھلک رہی تھی۔ سنہری ریشم جیسے بالوں کے لچھے اس کی پیشانی پر چاند بنا رہے تھے۔ اس نے جھک کر سلام پیش کیا۔ ابو بکر شاہ بغور اس حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سادگی میں ہزار سنگھار تھے اس کے حسن میں ایک وقار اور تمکنت تھی، انکار نہیں، اس کی اداؤں میں سرافرازی تھی کہ جیتا زندگی نہیں۔ اس کے سلام میں حقیقی ساقی خوشامد

ابوبکر شاہ کی نظریں اس جوان پر جمی ہوئی تھیں جو اب تک چار تجربہ کار سپاہیوں کو شکست دے چکا تھا۔ تلوار بازی میں اس کی مہارت دیکھ کر ابوبکر شاہ بے ساختہ ستائشی کلمات ادا کر رہا تھا۔ اس کی تلوار میں بلا کی تیزی تندی اور کاٹ تھی۔ ہر وار نپا تلا ہوتا تھا ایسا لگتا کہ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تلوار اٹھاتا اور گراتا ہے۔ ابوبکر شاہ حیران تھا کہ کیا وہ ایک لمحے میں اپنے اگلے قدم کے بارے میں سوچ لیتا ہے۔ اتنی ذہانت کے ساتھ ایسی پھرتی اور ایسا فن اس نے بہت کم دیکھا تھا کچھ سوچ کر وہ واپسی کے لیے اٹھا اور آدم خاں سے بولا۔ "اس نوجوان کو ہم قریب سے دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔"

"جب آپ فرمائیں خدمت میں حاضر کر دیا جائے۔" آدم خاں جھک گیا۔

"کل علی الصبح۔" ابوبکر شاہ نے آہستہ سے کہا۔

آدم خاں کے چہرے پر ایک مسرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

ابوبکر شاہ میدان کا رزار کا مرد تھا، بہادر اور دلیر، اور انہیں صفات کو وہ اوروں میں بھی دیکھنا پسند کرتا تھا۔ بہادر اور جانباز سپاہیوں کے درمیان بیٹھ کر تلوار بازی کے مقابلے دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھیں مقابلوں میں نوعمر اور نوآموز تلوار باز آتے اور ابوبکر شاہ ان میں سے اپنی ذاتی سپاہ کے لیے نوجوان پسند کر لیتا۔ یہ نوآموز سپاہی پختہ کاروں سے تربیت پانے کے بعد بڑے جیالے سپاہی ثابت ہوا کرتے تھے جنھیں کچھ کر دکھانے کا شوق ہی نہیں جنون ہوتا ہے۔ لیکن آج جس نوجوان کے کمالات اس نے دیکھے اس کی تیزی، پھرتی اور دلیری نے اسے بے تاب سا کر دیا۔ وہ خود بھی ایسا ہی تھا۔

وہ محفل کے ختم ہونے سے فارغ ہو کر وہ ملاقات کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"تمھیں اختیار ہے۔ میرے نزدیک وہ صرف تمھاری ہی ہیں۔"

"شکریہ شبینہ۔ ہمیں ایک دوسرے کے زخموں پر پھاہے رکھنا چاہئیں۔ اچھا اب میں چلوں تمھیں مبوات بھیجنے کا بندوبست بھی کرنا ہے۔"

خاندان تغلق کے تیسرے بادشاہ فیروز شاہ تغلق نے اپنے بڑھاپے اور ضعف کو دیکھتے ہوئے اپنے سب سے بڑے بیٹے محمد تغلق کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔ نوے سالہ فیروز تغلق نے تاج و تخت بیٹے کے سپرد کر کے باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی رسہ کشی سے گویا خود کو محفوظ کر لیا تھا۔ محمد تغلق نے ناصر الدین محمد تغلق کے لقب سے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی اور جمعہ کے خطبہ میں اپنا اور اپنے باپ کا نام شامل کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے دربار میں نوعمر درباریوں کا اضافہ بھی کیا اور ان کو اعلیٰ منصب اور عہدوں سے سرفراز کیا۔ اور ان ہی کی وجہ سے بعض قدیم اراکین کو برخاست بھی کیا جس کی بنا پر اراکین سلطنت میں ذہنی جنگ شروع ہو گئی۔ پرانے اور بوڑھے رکن نوجوانوں کی باتوں اور تجویزوں کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اور جوانوں میں یہ زعم پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی کم عمری میں ایسے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیے گئے ہیں اور نوجوان بادشاہ ناصر الدین ان کا ہمنوا ہے۔ قدیم اور جدید اراکین میں جب آپس کی چپقلش زیادہ بڑھی تو دونوں نے ناصر الدین سے اس کی شکایت کی۔ اس سے یہ غلطی ہوئی کہ باپ کے زمانہ کے وفادار درباریوں کو نوعمروں کے سامنے برا بھلا کہا اور بعض کو سزا بھی دی۔ فیروز تغلق ابھی زندہ تھا اس لیے اس کے بہی خواہوں کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے ناصر الدین کے خلاف بغاوت کر دی۔ ناصر الدین نے اپنے دست راست ظہیر الدین لاہوری کو فوری طور پر طلب کیا۔ ظہیر الدین لاہوری اس کے خصوصی کمرے میں پہنچا اور

اس نے جو غور کو دیکھ رہی تھی آخر بولی۔ "لڑکی مجھے سودا منظور ہے"!

نوشینہ نے غور کو پایا اور بولی "ابھی بات پوری نہیں ہوئی ہے تمہارے معاوضے کا معاملہ۔۔۔۔

فیضی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا اور بولی "میرے تو حسن و جمال ہی سے بڑے سوختہ دل بہل سکتے ہیں۔ لیکن میں تجھے اس طرح تراشوں گی کہ تیری کاٹ سے کوئی بھی نہیں بچ پائے گا۔ تو میرا شاہکار ہو گی۔ میں اپنی ساری عمر کی ریاضت اور تجربوں کا نچوڑ تیرے اندر اتار دوں گی۔ ہر انسان اپنے فن کی معراج دیکھنا چاہتا ہے۔ میرے فن کی معراج اب تو ہی بنے گی اور یہی میرا معاوضہ ہوگا"۔

"میں چاہتی ہوں بات صاف ہو جائے"۔

"پہلے میری صاف بات سن۔ تو تو ابھی اجنبیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے لیکن میں اپنے بارے میں بتا دوں۔ کہ فیضی نے ہمیشہ پارس ڈھونڈے اور سونا پایا۔ یہ حویلی یہ خدام یہ کنیزیں یہ کروفر سب فیضی نے خود پیدا کیا ہے۔ اسے یہ فن آتا ہے۔ لیکن میں تجھے بتا چکی ہوں کہ میں صرف سوداگر نہیں ہوں۔ تیری تربیت کو میں نے ایک آزمائش سمجھ کر قبول کیا ہے۔ یہ سمجھ لے کہ فیضی آج خود اپنا امتحان کرنے چلی ہے"۔

"میری ایک شرط اور بھی ہے"۔

"بس اور کچھ نہیں۔ فیضی نے ہنس کر کہا۔ بغیر سنے ہی میں تیری تمام شرائط منظور کرتی ہوں۔ جتنے پیار، لگن اور انہماک سے فرشتوں نے تجھے بنایا ہوگا۔ اسی پیار، لگن اور انہماک سے میں تجھے سنواروں گی۔ اس کے بعد جو تیرا دل چاہے۔ وہ کام خود سے ... فیضی کبھی آڑے نہیں آئے گی"۔

[illegible] غالب نشینہ کو لے کر حویلی پہنچ گئی۔

جھک کر کورنش بجا لایا۔ اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

ناصر الدین نے ذرا سا سر ترچھا کر کے اس کی طرف دیکھا اور بولا "بغاوت کی خبر کس حد تک صحیح ہے؟"

"ظل سبحانی کا اقبال بلند ہو، آپ ہم سب سے زیادہ دانا اور باخبر ہیں۔ آپ نے جو کچھ سنا ہے اس میں صداقت ہی صداقت ہے"۔ ظہیر الدین ذرا سا خم ہو کر بولا۔

"ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ کہ بابا جان کے بہی خواہ ہم سے کوئی خصوصی انس نہیں رکھتے۔ بابا جان گوشہ نشین ہیں اور ہم اس تخت کے نہ صرف جائز وارث بلکہ مالک ہیں۔ پھر آخر اس بغاوت کے پیچھے کون سا جذبہ پوشیدہ ہے؟" ناصر الدین نے چند لمحے ظہیر الدین لاہوری کی طرف غور سے دیکھا جو دم سادھے کھڑا تھا پھر بولا۔ "کیا محض اس لیے کہ ہم نے دربار میں اپنے مزاج اور جوان حوصلوں کے عین مطابق بہادر اور غیور نوجوانوں کو شامل کر لیا کیا ہم ایسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ جس کی وجہ سے بابا جان کے ہمنوا بغاوت پر آمادہ ہو جائیں"۔

"بندہ پرور اگر اس غلام کو اظہار رائے کی اجازت مرحمت فرمائیں تو کچھ عرض کرے"۔

"تجھ پر ہمیں اعتماد ہے کہہ کیا کہنا چاہتا ہے"۔ ناصر الدین کچھ سوچ کر بولا۔ ظہیر الدین لاہوری نے اظہار ممنونیت کے طور پر دونوں ہاتھ سینہ پر باندھے اور بولا "بوڑھے درباریوں کی بغاوت پر آپ طول دل گرفتہ نہ ہوں، یہ ایسی کڑھی کا ابال ہے جس میں گرمی نہیں ہوتی۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور بزرگ نوازی تھی کہ ان سب کو ان کے سابقہ عہدوں پر

برقرار رکھا۔ آپ نے جس وسیع القلبی اور فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ یہ کمزور بوڑھے اپنی زندگی کے بقیہ چند روز آپ کی رفاقت اور وفاداری میں گزارتے لیکن یہ ناسپاس لوگ ہیں۔ اب جبکہ سلطان معظم فیروز شاہ تغلق تخت و تاج سے دستبردار ہو کر اس عظیم ذمہ داری کو آپ کے سپرد کر چکے ہیں تو سلطنت اور عوام الناس کی بقا کی خاطر ان لوگوں کے سلسلے میں اب رحم دلی کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔"

ظہیر الدین کی اس تقریر نے بادشاہ کو بہت متاثر کیا اس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت دوڑ گئی۔

"تو نے ہمارے مزاج کے سلسلے میں بڑی صحیح بیانی سے کام لیا ہے اب اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

"اگر یہ لوگ آپ کی اعلیٰ فطرت اور احسان کو مانتے تو ان پر رحم دلی برقرار رکھی جا سکتی تھی لیکن موجودہ حالات میں ان کی احسان فراموشی پر کچھ نہ کچھ سبق ملنا چاہیئے۔"

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو زیادہ دیر تک من مانی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔؟"

"بجا ارشاد فرمایا۔"

"ٹھیک ہے اگر یہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں تو ہمیں بادل ناخواستہ ان سے جنگ بھی منظور ہے۔ بابا جان کا لحاظ بھی ایک حد تک ہی کیا جا سکتا ہے۔ ان کو سبق دینے کا کام ہم تیرے سپرد کرتے ہیں۔"

کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ناصر الدین تغلق کا حکم ملتے ہی نوجوان درباریوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ خوشی اور غرور سے سرشار وہ عقل مند بڑھاپے سے ٹکرانے کو نکل پڑے۔

جہاں دیدہ بوڑھوں نے فوری طور پر فیروز تغلق سے وفاداری کا اعلان [illegible]

"ٹھیک ہے۔ وہ سنجیدگی سے بولی لیکن اجنبیت کی دیوار رفتہ رفتہ گرے تو کیا مضائقہ ہے۔ میری مصلحت اسی میں ہے نیفی بیگم ورنہ جب تمہارے پاس آ گئی ہوں تو ایک دن سب کچھ تمہیں معلوم ہونا ہی ہے۔" نیفی خاموش اسے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

"تیرے چہرے کی تابانی اور پاکیزگی یہ سوال کر رہی ہے کہ بلندی سے پستی کی طرف گر سکے گی؟"

"ہم۔" اس نے افسردگی سے اقرار کیا "جب اس منظر کو یاد کروں گی تو سب کچھ کر گزروں گی ... مجھے اب کچھ یاد مت دلاؤ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ضبط غم سے چہرہ سرخ ہو گیا پیشانی کی رگیں ابھر آئیں وہ نیفی کی آنکھوں میں دیکھ کر جرأت سے بولی۔ "نیفی بیگم تم نے اب تک نجانے کتنی حسین لڑکیوں کو دل لوٹنے کی تربیت دی ہو گی مگر میں چاہتی ہوں مجھے ناز و ادا کا وہ انداز دے دو کہ عابد اپنی عبادت بھول جائے میرے پیروں کو رقص کی وہ پھرتی اور تیزی دے دو کہ فرشتے دیکھیں تو اپنا زہد کھو بیٹھیں میرے گلے میں وہ سوز پیدا کر دو کہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن رک جائے میرے جسم کو وہ لچک دے دو کہ ہر تھرکن پر بڑے بڑے ایوان ہل جائیں میری ابرو کے ایک اشارے پر شاہوں کے دل مچل جائیں میری مسکراہٹ کو قتل سامان بنا دو، مجھے مجسم فتنہ غمزہ بنا دو کہ سب کی نگاہیں مجھ پر رک جائیں۔ نیفی بیگم مجھ میں وہ بے حسی پیدا کر دو کہ کسی بھی مقام پر میرے قدم نہ لڑکھڑائیں، میرے دل کو پتھر بنا دو کہ میرے سارا دوں میں لغزش نہ پیدا ہو میرے ذہن سے یہ بات کھرچ کر پھینک دو کہ ... میں ... میں کون ہوں ... کون ہوں ..." نوشینہ شدت جذبات سے چپ ہو گئی اب وہ بے آواز رو رہی تھی اور نیفی بغور [illegible]

اور [illegible] چاہتی ہوں ۔ البتہ سودا ایسا ہے کہ جس میں نفع میں تم ہی رہو گی یا تم اپنے لیے نقصان ہی پسند کر لیا ہے "۔ وہ ایک لمحہ کو رکی ۔

" آگے کہو ۔ " فیضی بیگم بولی ۔

" فیضی بیگم ۔ ! تم ایک تجربہ کار خاتون ہو ، اس بازار کے سرد و گرم سے گزری ہو ، کسی کے خاندان یا حسب نسب نے تمہیں کبھی کوئی واسطہ نہ رہا ہوگا ۔ ایک عام قسم کے حسن کو تم نے ہاتھ سے جانے نہ دیا ہوگا ۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم اپنے فن میں مہارت رکھتی ہو ۔ لیکن چند ہی لمحوں میں میں نے بھی اندازہ کر لیا ہے کہ تمہاری آنکھوں میں میرا حسن میری نفاست و نزاکت اور میری موزونیت نے ایک روشنی پیدا کر دی ہے ۔ سچ بتانا کیا تم میرے حسن سے متاثر نہیں ہوئی ہو ؟ "

اجنبی لڑکی ۔ فیضی کے پاس ہر قسم کا حسن آیا اور گیا لیکن سچ پوچھو تو میری نگاہ میں تمہارے وجود میں حسن و جمال کے علاوہ کوئی اور خوبی بھی سوجھ رہی ہے ۔ بیٹی فیضی نے آج تک خسارے کا سودا تو کیا ہی نہیں ۔ مگر تمہارے ساتھ سودے کی بات کرنا کچھ عجیب سا لگ رہا ہے ۔ میری مانو تو اجنبیت کی دیوار گرا دو اور فطری ماحول میں بات کرو ۔ فیضی کو صرف سوداگر مت سمجھو ۔ اس بازار میں یہی میری خصوصیت ہے ۔ مجھے کھلے دل سے سب کچھ بتا ڈالو ، وہ کون سی بپتا پڑی ہے جس کی بنا پر اپنا سودا کرنے تم خود نکلی ہو ؟ "

نوخیزہ نے فیضی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولی " تم نے قبول کیا کہ میری خوبصورتی عام خوبصورتی سے الگ قسم کی ہے ؟ "

فیضی بے ساختہ مسکرا پڑی " بالکل قبول کیا "

کیا اور اس کے ذاتی غلاموں سے رابطہ قائم کیا جو ہر صورت میں اپنے آقا کے وفادار اور جاں نثار رہے تھے ۔ فیروز شاہی غلاموں کا وفد ناصر الدین سے ملا اور اسے سمجھانا چاہا کہ بوڑھے ارکین سے جنگ کا مطلب فیروز تغلق سے بغاوت سمجھا جائے گا اور تجربہ کار لوگوں سے بگاڑ کر سلطنت باقی نہیں رہ سکتی ۔ لیکن نوعمر خوشامدی اور حاشیہ نشین لوگوں نے ناصر الدین کا دماغ آسمان پر پہونچا رکھا تھا ۔ جوانی کا گرم خون نصیحتیں سننے کو تیار نہ ہوا ۔ اس نے فیروز تغلق کے غلاموں کو دربار سے نکلوا دیا ۔ ناصر الدین کے رویے نے غلاموں کو بددل کر دیا ۔ کیونکہ اس نے باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا تھا ۔

جوانوں کا جوش اور بوڑھوں کا ہوش آخر کار ٹکرا گیا ۔ دارالسلطنت میں دو روز تک خون کی ندیاں بہتی رہیں کوئی بھی فریق میدان سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا ۔ تیسرے دن فیروز شاہی غلاموں نے ایک نئی بات سوچی اور بوڑھے فیروز تغلق کو پالکی میں بٹھا کر میدان جنگ میں لے آئے اور پالکی پر فیروز کا چتر اور اتنا شہ لگا دیا ۔ ناصر الدین کی نوج کے فیل بان سمجھے کہ سابق بادشاہ خود آ گیا ہے اس لیے شہزادے سے منحرف ہو کر ادھر آ گئے اور اس طرح بہت جلد ناصر الدین شکست کھا گیا اس کا سارا مال و متاع حکومت تخت و تاج سب چھن گیا اور وہ بھاگ کر کوہ سیر مور کی طرف چلا گیا ۔ اور فیروز شاہی غلاموں کی طرف سے اپنے دل میں کینہ لے کر گیا ۔ فیروز تغلق کے دوسرے بیٹے فتح خاں کے لڑکے غیاث الدین کو تخت پر بٹھا دیا ۔ غیاث الدین محمد فتح خاں بن فیروز شاہ تغلق کم عمر تھا نا تجربہ کار تھا نرم خو تھا اور آرام پسند تھا ۔ وہ جلد ہی عیش و عشرت شراب و شباب میں غرق ہو گیا ۔ حکومت سلطنت حل و انصاف اور جہاں بانی اس کے بس کی بات نہیں تھی ۔ تجربہ کار لوگ [illegible]

ابتری اور انتشار پھیلتا رہا اور وزیرا امیر من مانی کرنے لگے اور عوام تماشائی بن گئے
جب اسے تنبیہ کیا گیا تو اس نے بغیر سوچے سمجھے محض شبہ میں کئی سنجیدہ اور یکسو قسم
کے درباری امیروں کو قتل کروا دیا۔ اس کی نوجوانی کی ناانصافی کا شکار اس
کے عزیز رشتہ دار بھی ہوئے۔ اس کا چچازاد بھائی ابو بکر شاہ بھی گوشہ نشین
ہو گیا تھا۔ جبکہ وہ اچھا سپاہی، دانا انسان، عمدہ منتظم اور سنجیدہ شخص تھا مگر
غیاث الدین کی لغزشوں کی سزا بھگتنے کو تیار نہیں تھا۔
فیروز شاہی غلاموں کے لیے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ اب جبکہ فیروز شاہ کا بھی
انتقال ہو چکا تھا وہ غیاث الدین کے پاس پہنچے اور براہ راست اس سے بات
کی لیکن وہ شراب میں دھت پڑا تھا۔ رقاصائیں اور ساقیں اسے گھیرے
ہوئے تھیں اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ایک کمسن لڑکی اسے جام پر جام دے
رہی تھی۔ ہر نصیحت پر وہ ایک قہقہہ لگا کر ایک جام چڑھا لیتا بہت دیر بعد وہ
جھنجھلا کر بولا "جاؤ تمہیں بھی اجازت ہے جسے چاہو قتل کرو جسے چاہو قید کرو
اور جسے دل چاہے اسے امیر وزیر مقرر کرو لیکن ہمیں پریشان مت کرو ہم تو تمہیں کو
اپنا بہی خواہ سمجھتے ہیں:"
اس سے پہلے کہ فیروز شاہی غلام کوئی قدم اٹھاتے اراکین سلطنت میں
سے چند نے غیاث الدین کو قتل کر دیا۔ اور ابو بکر شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم
کر لیا۔ ابو بکر شاہ کی سنجیدگی اور تدبر نے حکومت میں ایک ٹھہراؤ سا قائم
کر دیا۔ عوام نے اس کی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لیں ایک طویل
عرصے سے وہ مختلف بادشاہوں کو دیکھتے آ رہے تھے۔ ابو بکر شاہ نے ابھی عملی
طور پر سیاست میں حصہ لینا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ناصر الدین محمد نے حملہ
کر دیا۔ وہ جالندھر کی راہ سے سامانہ پہنچا اور وہاں کے دل حکمراں بن کر اہم

پھر دہلی کی حکومت پر دھاوا بول دیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ ابو بکر
شاہ اپنی مدافعت کے لیے کوئی تیاری بھی نہیں کر سکا اور شکست کھا کر [illegible]
کی طرف فرار ہو گیا اور قلعہ میوات میں جا کر پناہ لی
اور یوں ناصر الدین محمد ایک بار پھر دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا اور اس
نے سب سے پہلے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ فیروز شاہی غلاموں کو چن چن کر مارا
جائے ان کی املاک ضبط کر کے ان کو تمام اعلیٰ عہدوں سے برخاست کر دیا گیا
اور پھر ان پر وہ ظلم و ستم شروع ہوا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ان
کی عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ جہاں کہیں ان کا کوئی گروہ یا کوئی
یا فرد نظر آتا اس کا مال و اسباب لوٹ لیا جاتا اور ان کو فوراً موت کے
گھاٹ اتار دیا جاتا۔ بہت سے لوگوں نے اپنی ذاتی دشمنیوں کے بدلے بھی اس
کے اس حکم کی آڑ میں لیے اور یوں امرا اور سپاہیوں کے ہاتھوں فیروز شاہی
غلاموں کی بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی۔ بہت سے دہلی چھوڑ کر بھاگے مگر ان
کا پیچھا کیا گیا اور راستے میں پکڑ کر مار دیا گیا۔ خاندان کے خاندان ناصر الدین
محمد تغلق کے غیظ و غضب اور عتاب کا شکار ہو گئے۔
"اب بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ سے کس قسم کا سودا کرنا چاہتی ہو؟" نتھنی
بیگم نے نوشینہ کی طرف دیکھا جو مکمل آرام کرنے کے بعد نہا دھو کر نئے لباس
میں پریوں کا روپ لیے حسن لیے کھڑی تھی۔ اس کا شباب چھلکا پڑ رہا تھا
شرمیلی آنکھوں میں سرمے کی تحریر نے [illegible]
کی تفسیر پیش کر رہی تھی۔
نوشینہ نے اپنے ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں کو ایک دوسرے
میں پھنسا کر نتھنی بیگم کی طرف دیکھا اور بولی: "میں تمہارے لیے اجنبی ہوں

THE HAREEM

Oct. 84

Rs. 1.50

نسیم انہونوی

سرکاری لاٹریاں بادی النظر میں جتنے خوش نما نظر آتے ہیں، معلوم ہوتی ہیں اور عوام کا پیسہ کھنچ کر حکومت کے پاس چلا جاتا ہے۔ لاکھوں خریداروں میں سے صرف چند دولت مند بن جاتے ہیں، لیکن لاکھوں انسانوں کی دولت چند لوگوں کے پاس پہنچ جائے تو اسے ایسا ہی سمجھا جا سکتا ہے جیسے ہزارہا مزدوروں کی خون پسینہ ایک کر دینے والی محنت کا پھل ایک مالک اٹھاتا ہے۔ وہ ایسی شاندار زندگی بسر کرتا ہے کہ سب ہی اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن حکومت نے یہ بھی اعلان کر رکھا ہے کہ لاٹریوں سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے اسپتالوں پر صرف کیا جاتا ہے۔

بلاشبہ یہ طریقہ یعنی روپیہ جمع کر کے اسپتالوں پر صرف کرنے کا قابلِ تعریف ہے اور سب نہیں تو چند فی صدی لوگ ضرور ایسے بھی ہیں جو اسی خیال سے لاٹریوں کے ٹکٹ خرید لیتے ہیں کہ اس سے اسپتالوں کی حالت بہتر ہوگی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کروڑوں اربوں روپیہ لاٹریوں سے حاصل ہونے کے بعد بھی اسپتالوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ ایمرجنسی یا چند مخصوص بیماریوں کے سلسلے میں یقیناً بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اسپتالوں میں داخل ہونا پڑتا ہے، لیکن عام طور پر امرا اسپتال نہیں جاتے، اسپتالوں کی ضرورت تو غریبوں کو ہی ہوتی ہے جو پرائیوٹ ڈاکٹروں کی قیمتی دوائیں نہیں خرید سکتے، لیکن اسپتالوں میں غریبوں کے ساتھ جیسا سلوک ہوتا ہے اسے کہتے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ [illegible] بہت ہی کم قیمت دوائیں اور لال رنگ کا پانی جیسا مکسچر دیا جاتا ہے۔ ضروری اور قیمتی دواؤں کے لئے ہدایت ہوتی ہے کہ بازار سے خرید و۔ لیکن یہی قیمتی دوائیں انجکشن اور ٹانک وغیرہ وزرا، ان کے ملازمین اور ممبرانِ اسمبلی یا بڑے عہدے داروں کو بے دریغ مل جایا کرتی ہیں۔ ایسے لوگ اسپتال آتے ہیں تو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ حال ہی میں لاہور اسپتال [illegible] میں میری ایک ملنے والی کو ڈاکٹر نے صرف [illegible] کے آپریشن کئے گئے کہ آخر کار وہ مر گئی۔

ان حقائق کے پیشِ نظر لاٹری سے کثیر روپیہ کی جو آمدنی غریبوں کی گاڑھی کمائی سے ہو رہی ہے، جسے وہ اپنا پیٹ کاٹ کر لاٹری ٹکٹ خرید کر گورنمنٹ کے خزانے میں جمع کرا دیتے ہیں اس سے انھیں کتنا فائدہ پہنچتا ہے۔ قابلِ غور ہے۔ لیکن غور کون کرے گا۔ حکومت تو بیشک کروڑہا روپے اسپتالوں کے لئے دیتی ہے لیکن یہ دیکھنے والا کوئی نہیں کہ اس رقم کو کس طرح صرف کیا جاتا ہے۔

آج یہ بات بالکل عام ہو گئی ہے کہ اگر کوئی مریض اسپتال میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ ڈاکٹر کی کوٹھی پر جا کر فیس دے کر اپنی شکل دکھائے۔ اس کے بعد اسپتال جائے۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو اسے داخلہ مل سکے۔ غریبوں کے لئے یہ بہت دشوار ہوتا ہے، لیکن جان بہت پیاری ہوتی ہے اس لئے جس طرح بھی ہوتا ہے وہ ایسا کرتے ہیں۔ اس کے لئے انھیں بیوی کے زیور یا گھر کے برتن ہی کیوں نہ بیچنا پڑیں یا مہاجن سے قرض لے کر سود ادا کرنے کے مرض میں ہی کیوں نہ مبتلا ہونا پڑے۔ حکومت کے اربابِ حل و عقد کو اس طرف بھرپور توجہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ ہندوستان میں غریبوں کی تعداد اسی فی صدی سے بھی زیادہ ہے اور جس ملک کے اتنے انسانوں کو وہ علاج کی سہولتیں حاصل نہ ہوں، وہ ملک کیسے ترقی کر سکتا ہے۔

> اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے پردہ واجب کر کے ان کو ایک محفوظ اور پُروقار مقام عطا کیا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیئے۔ ایک چھوٹی سی مثال لیجئے۔ ہم کسی جوہری کی دکان پر جائیں تو تمام کم قیمت اور معمولی زیورات ہم کو شوکیس میں رکھے ہوئے مل جائیں گے لیکن جب کبھی ہم کو قیمتی اور نادر پتھروں یا زیورات کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ آہنی الماریوں کے اندر سے نکال کر لائے جاتے ہیں۔ نگینہ جتنا زیادہ قیمتی ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ حفاظت اور احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔
>
> (بیگم ارجمند ظہیر)

گلیوں میں شمار کیا جائے گا۔ محکمۂ صحت کے منسٹر اور متعلقہ بڑے افسران کو چاہیئے کہ وہ اچانک اسپتالوں میں پہنچ کر معائنہ کریں اور وہاں مجبور و غریب مریضوں سے ان کو معلوم کریں کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہوتا۔ دورہ کیا بھی جاتا ہے تو اعلان کے ساتھ جو برطانوی غلامی کے دور کی یاد تازہ کرنے والا ہوتا ہے۔

سالانہ قیمت حریم

سالانہ قیمت حریم منی آرڈر سے بھیجنے میں چھ روپیہ کی آپکو بچت ہو سکتی ہے اس لئے اگر آپ آسانی کے ساتھ منی آرڈر بھجوا سکیں تو ایسا ہی کریں۔ وی۔پی۔ واپس ہو جاتا ہے تو حریم کو چھ روپیہ کا نقصان ہوتا ہے۔ امید ہے حریمی بہنیں خیال فرمائیں گی۔ لیکن منی آرڈر سے سالانہ قیمت روانہ کرنے کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ وہ سالانہ قیمت ختم ہوتے ہی بھیج دیا جائے۔ اکثر حریمی بہنیں تاخیر سے منی آرڈر روانہ کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دفتر سے وی۔پی چلا جاتا ہے اس کے بعد منی آرڈر وصول ہوتا ہے۔ منی آرڈر جلد نہ بھیجا جا سکتا ہو تو دفتر کو یہ لکھ دیا جائے کہ وی۔پی نہ روانہ کیا جائے سالانہ قیمت منی آرڈر سے بھیجی جائے گی۔

شادی کے گیت

مرسلہ: مسرور تمنا گورکھپور

بنو کرے تو سولہ سنگار
اللہ خیر کرے
بنا آئے گا گھوڑے پہ سوار
اللہ خیر کرے
لال لال جوڑا وہ لائے گا   پھولوں سے ڈولی سجائے گا
مہندی کی کیا ہے درکار
اللہ خیر کرے
پائل کرے گی چھم چھم   گھونگھٹ بھی چمکے گا چم چم
بنو بنے گی شہزادی ورنگار
اللہ خیر کرے
مہندی چلے گی ٹھمک کے   جیسے ڈولے ترے کانوں میں جھمکے
ساتھ منائے تہوار
اللہ خیر کرے
کرے سسرال میں راج   بنے بنا تیرا تاج
سہرہ کی کیا ہے درکار
اللہ خیر کرے
اب تو یہ آئی بارات   آیا ہے دیور بھی ساتھ
زیور کی کیا ہے درکار
اللہ خیر کرے
بنو تو کرے سولہ سنگار
اللہ خیر کرے

ایک غلطی

حریم ستمبر کے صفحہ و میں تبصرات کے تحت اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار جناب ضیا حسنی صاحب کا نام پروف ریڈر کی غلطی سے ضیا حسین اور ضیا حسن چھپ گیا ہے، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

آگ کے پھول

مشتاق الحکیم پوری

پہلا منظر

شہنشاہ عراق نمرود کا دربار ——— وقت سہ پہر

نمرود اپنے زر و جواہر سے مرصع تخت پر پورے جاہ و جلال سے بیٹھا ہے۔ امراء و درباری اپنی اپنی جگہ ادب سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ محافظ دستہ اس کے چاروں طرف ننگی تلواریں لئے ایستادہ ہے ——— حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پا بہ زنجیر کر کے دربار میں لایا جاتا ہے۔

نمرود ایکبار ان کی طرف دیکھتا ہے پھر غضبناک لہجہ میں مخاطب ہوتا ہے۔

کیا تو ہی وہ شخص ہے جو اپنے باپ دادا کے دین سے منحرف ہو گیا ہے اور مجھے اپنا رب تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ——— میں نہیں جانتا تیرا مخاطب کس سے ہے لیکن ہاں یہ درست ہے کہ میں کسی جھوٹے خدا کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں تو اس خدائے واحد کا پرستار ہوں جو اس کائنات اور تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ تو میری ہی طرح ایک ضعیف و ناتواں انسان ہے پھر میں تجھے اپنا رب کیسے تسلیم کر سکتا ہوں۔

نمرود ——— مگر میں تیرا یا اوروں جیسا انسان نہیں ہوں۔ اگر تیرے رب میں کوئی ایسا وصف ہے جو مجھ میں نہیں ہے بیان کر۔ تاکہ میں اس کی طاقت کا قائل ہو سکوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام۔

میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے۔ دنیا میں مرنے کو وہی موت دیتا ہے اور وہی حیات بخشتا ہے۔ تیری سلطنت تو اس کے سامنے ایک ادنیٰ غلام کی سی ہے۔

خاموش! نمرود چیخ کر کہتا ہے۔

میں تجھے دکھاتا ہوں۔ موت و حیات صرف تیرے خدا کے قبضہ میں نہیں میرے اختیار میں بھی ہے۔

وہ اشارہ کرتا ہے اور جلاد بے گناہ درباریوں میں سے ایک کا سر اس کی گردن سے اڑا دیتا ہے ——— پھر دوسرے آدمی کو حکم دیتا ہے کہ کسی پھانسی کے مجرم کو حاضر کیا جائے اور جب وہ آ جاتا ہے تو اس سے کہتا ہے۔

جا ہم نے تجھے زندگی بخشی۔ تجھے رہا کیا جاتا ہے۔

اب پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہوتا ہے۔

تو نے دیکھا ہم کس طرح زندگی اور موت پر قادر ہیں۔ یہ اتنا بڑا آدمیوں کا مجمع غفیر ——— ہماری رضا کے سہارے سانس لے رہا ہے ہم چاہیں تو اسے زندگی بخشیں اور چاہیں تو موت سے ہمکنار کر دیں تو ابھی ہماری نرمی سے فائدہ اٹھا اور اپنے عقائد [illegible] چھوڑ کر ہماری برتری قبول کر۔ ہم تجھے دنیا کی ہر خوشی اور عیش سے نوازیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی ڈینگ اور لاف و گزاف کو سنتے رہے پھر بڑے سکون سے فرمایا۔

مجھے تیری کم عقلی پر رحم آتا ہے نمرود!

تو ابھی تک زندگی اور موت کے فلسفے کو ہی نہیں سمجھ سکا۔ ارے نا سمجھ اگر زندگی اور موت تیرے جیسے بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتی تو آج تو اس تخت پر ہی نہ دکھائی دیتا۔ بھلا پہلا نمرود کبھی موت قبول کر کے تجھے اس کا موقع ہی کیوں دیتا کہ تو اس کے تخت پر فروکش ہوتا لیکن تو اگر اب بھی بضد ہے اور اپنے کو کائنات کا مالک سمجھتا ہے تو اس مقتول کو زندگی بخش کر دکھا تاکہ میں اور تیرے یہ سب درباری تیری برتری کے قائل ہو جائیں۔

نمرود غصہ سے پیچ و تاب کھاتا ہے۔ تلملاتا ہے لیکن اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا۔

میں رب کائنات ہوں جوان! اپنے حکم کبھی واپس نہیں لیا کرتا میرے فیصلے اٹل ہوا کرتے ہیں اپنے باپ کو دیکھ وہ تجھ سے زیادہ سمجھدار ہے اس نے تجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہے اس کے کہنے پر عمل کر۔

باپ میرے رب سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب دیتے ہیں۔

میں اپنے باپ ہی کا نہیں تیرا اور ان سب کا بھلا چاہتا ہوں کہ اپنے رب کے سایۂ عاطفت میں بلا رہا ہوں۔

نمرود سوچ ——— کیا واقعی مجھ میں وہ قوتیں ہیں کہ تو اس کائنات کے نظام کو چلا سکے۔ میرا رب روزانہ سورج کو

مشرق سے نکال کر مغرب میں غروب کرتا ہے۔ کیا تجھ میں یہ قوت ہے کہ اس گردش کو روک دے ــــــ تو اگر خدا ہے تو کیا سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکال سکتا ہے ــــــ

میں اب بھی تجھے ہدایت کرتا ہوں کہ گمراہی کے راستے سے باز آجا اور اس خدائے وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ میں سر جھکا کر توبہ کر ــــ ہوسکتا ہے وہ تجھے معاف کر دے کیوں کہ وہ بڑا مہربان اور رحم و کرم والا ہے۔

بس بند کر اپنی زبان ــــــ نمرود چیخ کر کہتا ہے۔

میں نے تجھے بہت ڈھیل دی لیکن شاید تیری موت ہی قریب آگئی ہے۔ میں دیکھتا ہوں تیرا رب تجھے میرے ہاتھ سے کیسے بچاتا ہے۔

وہ اپنے درباریوں کی جانب گھور کر دیکھتا ہے۔ سارے درباری لرزہ براندام ہو کر سجدے میں گر جاتے ہیں۔

لے جاؤ اس بے دین کو اور دہکتے ہوئے الاؤ میں زندہ جلا دو۔

نمرود دربار سے اٹھ جاتا ہے اور محافظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پھر قید خانے میں لے جا کر ڈال دیتے ہیں۔

دوسرا منظر

ایک وسیع میدان :۔ تقریباً نصف میل کے گھیرے میں زبردست دہکتی ہوئی آگ۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میدان میں لایا جاتا ہے۔ ان کے باپ آزر آگے بڑھتے ہیں۔

بیٹے اب بھی اپنی ضد سے باز آجاؤ۔

میں تمہارا دشمن نہیں۔ تمہارے اجداد بیوقوف نہیں تھے کہ اس دین پر چلتے تھے اپنے معبودوں سے معافی مانگ لو میں بادشاہ سے تمہاری خطا معاف کرا دوں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مسکرا کر باپ کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کے چہرے پر فتح مندی کا نور ہے۔ ایک ایسا سکون اور اطمینان ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرب کے چہرہ پر ہی ہوسکتا ہے۔ فرماتے ہیں ــــــ

اے باپ تم میرے متعلق فکر نہ کرو۔ یہ کافر ہیں بالکل گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ یہ طاقت میرے رب ہی میں ہے کہ وہ جسے چاہے جلائے اور جسے چاہے مارے۔

ہاں اگر تم کو واقعی مجھ سے کوئی تعلق ہے تو ان سب اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش سے باز آجاؤ اور اس وحدہٗ لاشریک کے آگے سر جھکا دو کہ وہ بڑی عظمت اور طاقت والا ہے۔

آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جواب سن کر بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور اب محافظ ان کو آگ میں پھینکنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں لیکن دور تک جھلسانے والی لپٹیں ان کی ہمت پست کر دیتی ہیں آخر یہ بدطینت کافر انھیں ایک گوپھن میں بٹھا کر گردش دیتے ہوئے الاؤ کے اس بحر ذخار میں پھینک دیتے ہیں۔

تیسرا منظر

میلوں میں دہکتا ہوا الاؤ۔ شعلوں کی لپک۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ابھی فضا میں ہی ہوتے ہیں کہ رحمتِ خداوندی جوش میں آتی ہے اور آگ کو حکم ملتا ہے کہ اے نار اپنے خواص تبدیل کر دے اور میرے خلیل کے لئے گلزار بن جا۔

ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام آنکھیں بند کئے ہوئے اللہ جل شانہٗ کی تسبیح کرتے جب نیچے پہونچتے ہیں تو انھیں اپنے چاروں طرف انگاروں کے بجائے پھول بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ بے اختیار ان کا سر اداے شکر میں اپنے خالق کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے اور آسمان سے انھیں فرشتوں کے تہنیت دینے اور خالق کی حمد و ثنا گانے کی آواز آتی ہے۔

حکیم لقمان

"اس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہے" یہ محاورہ عام بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقمان کسی ایسے حکیم کا نام ہے۔ جس کے پاس ہر مرض کا علاج موجود تھا۔ لوگ اس کے ہاتھوں شفایاب ہوتے اور کوئی مریض اس کے علاج سے مایوس نہیں ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لقمان صاحب کون تھے کس دور میں تھے اور بے مثال طبیب حاذق کی یہ شہرت کس طرح حاصل کی جو آج بھی محاورے کی صورت میں برقرار ہے۔

قرآن مجید میں "لقمان" نام کے ایک بزرگ کا ذکر ہے اور ایک سورہ ہی لقمان کے نام سے منسوب ہے اور جس انداز سے قرآن مجید میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی حکمت و دانائی کے لئے اپنے زمانے میں مشہور تھے۔ یہی نہیں بلکہ قوم کی رہنمائی اور اسے نیک کاموں کی ہدایت بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی تعلیمات وہی تھیں جو اللہ کے رسول اور پیغمبر ہر دور میں دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی شخصیت اور تعلیمات کے بارے میں اس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ترجمہ؛

"اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی اور (کہا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو۔ جو شخص اس کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس کے فائدے کے لئے کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ اس سے بے پروا ہے وہ لائق حمد ہے اور جس وقت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے اللہ کا شریک نہ ٹھہرا، بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے" اور ہم نے حکم دیا انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں کہ اٹھائے رکھا اس کو اس کی ماں نے تکلیف در تکلیف جھیل کر اور دو برس تک اس کو دودھ پلانا ہے۔ یہ کہ میرا شکر گزار رہ اور اپنے والدین کا شکر گزار ہو۔ آخر میری ہی جانب لوٹنا ہے اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر ایسا شریک ٹھہرانے کے لئے سختی کریں۔ جس کے بارے میں تو ناواقف اور جہالت میں ہیں تو اس میں ان دونوں کی پیروی نہ کر اور دنیاوی زندگی میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور پیروی اس شخص کی کرنا جو صرف میری ہی جانب رجوع کرتا ہے۔ پھر میری ہی جانب تم سب کو لوٹنا ہے۔ پس میں اس وقت تم کو تمہارے کئے کی خبر دوں گا۔ اے میرے بیٹے بلاشبہ اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی چیز چھوٹی ہوتی ہے اور پتھر کے اندر یا آسمانوں اور زمینوں میں کہیں بھی ہو۔ اللہ اس کو لے آتا ہے بے شک اللہ دقیق مشاہدہ کرنے والا باخبر دار ہے۔ اے میرے بیٹے! قائم کر نماز کو اور حکم کر بھلائی کا اور برائی سے منع کر اور جو تجھ پر پڑے اس پر صبر کر۔ بلاشبہ یہ عزائم امور میں سے ہے اور تو رخساروں کو (ازراہ تکبر) لوگوں سے نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل۔ بے شبہ اللہ تعالیٰ کسی تکبر اور شیخی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا ہے اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو نرم و پست رکھ بے شک گدھے کی آواز بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔"

قرآن مجید کے اس بیان کی روشنی میں جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ لقمان کو اللہ تعالیٰ نے حکمت یعنی دانائی عطا کی تھی اور مخلوق خدا کو کفر و شرک سے باز رکھنے اور نیک کاموں کی تلقین پر مامور کیا تھا۔ اپنے بیٹے کے ذریعے انھوں نے تمام لوگوں کو جو نصیحت کی وہ وہی ہے جو پیغمبروں اور رسولوں نے کی۔ لقمان نے جن باتوں کی نصیحت کی ان میں خاص خاص یہ ہیں۔ کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اس کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکاؤ۔ والدین کے ہمیشہ شکر گزار ہو۔ خاص کر ماں کے کیونکہ اس نے اپنے پیٹ میں تمہاری پرورش کے تکلیف دہ مرحلے برداشت کئے ہیں۔ والدین کی اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک وہ گمراہی پر مجبور نہ کریں۔ اگر وہ شرک پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں تو ان کی اطاعت درست نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ والدین کی خدمت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے اسکے باوجود دنیوی زندگی میں والدین کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال پر سلوک کرنا چاہیئے۔ نماز قائم کرو بھلائی کے کام کرو، اور لوگوں کو برائی سے روکو، یعنی دعوت و تبلیغ کا کام بھی کرتے رہنا چاہیئے۔ لوگوں کے ساتھ اخلاق اور حسن سلوک سے پیش آنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت و ثروت یا طاقت و اقتدار آنے پر مغرور ہو جاؤ اور لوگوں کی باتیں سننے اور ان کی مشکلات حل کرنے کے بجائے غرور و نخوت سے منہ پھیر لو، اسی طرح زمین پر اکڑ کر مت چلو یعنی طاقت کے نشے میں اس طرح مدہوش نہ ہو جاؤ کہ کسی کو خاطر میں نہ لاؤ اور اپنے آپ کو قادر مطلق سمجھنے لگو، غرور سے ذہن پر جہالت

کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔

جہاں تک حضرت لقمان کا تعلق ہے تاریخی اور روایتی تحقیقات کے مطابق وہ سرزمین عرب سے تعلق رکھتے تھے بعض روایات میں ہے کہ وہ حبشی النسل تھے اور عرب میں غلام ہو کر آئے اور آباد ہو گئے۔ وہ میانہ قامت اور پست قد تھے لیکن ماہر طبیب تھے۔ اس وجہ سے ان کو شہرت ملی اور لوگ ان کی عزت کرتے تھے لیکن خود قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلام نہ تھے بلکہ بے حد معزز تھے اور انھوں نے لوگوں کی ہدایت کا کام انجام دیا۔ زیادہ تر روایات اس کے حق میں ہیں کہ حضرت لقمان کا دور حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال قبل کا تھا اور وہ سرزمین عرب کے رہنے والے تھے۔ دانائی و حکمت میں شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ بعد کو بھی عربوں میں ان کی دانائی و حکمت اور نیکی و خدا ترسی کا چرچا رہا۔ اور عرب اپنی مجلسوں اور محفلوں میں لقمان کی نصیحتوں اور اقوال کا احترام سے ذکر کرتے تھے۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ نبی نہیں تھے لیکن اللہ کے برگزیدہ بندے تھے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی حضرت لقمان کے کچھ اقوال منقول ہیں جو بروایت مختلف یوں ہیں۔

(۱) حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

(۲) جب کسی مجلس میں شریک ہو تو اول سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ۔ اور جب تک اہل مجلس کی گفتگو سن نہ لو اس میں شریک نہ ہو اگر وہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں حصہ لو اور اگر وہ فضولیات و خرافات میں مشغول ہوں تو وہاں سے اٹھ جاؤ اور کسی اچھی مجلس کو تلاش کرو۔ (۳) جب اللہ کسی کو امانت دار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ امانت کی حفاظت کرے۔ (۴) اے بیٹے اللہ سے ڈر اور ریاکاری سے اللہ کے ڈر کا اظہار نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقت میں گنہگار ہو۔ (۵) اے بیٹے جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصے کو بے پروائی سے دنبال کر دہ کہیں تجھ سے علیحدگی اختیار نہ کرے۔ (۶) داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے (۷) بیٹے خاموشی میں کبھی ندامت نہیں اٹھانی پڑتی اگر کلام چاندی کا ہے تو سکوت سونا ہے۔ (۸) شر سے ہمیشہ دور رہو تو شر بھی تم سے دور رہے گا۔ (۹) غیظ و غضب سے بچو اس لئے کہ شدت غضب دانا کے قلب کو مردہ بنا دیتی ہے (۱۰) اور مثل کلام بہتر۔ (۱۱) نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے ... بانوں گے وہی کاٹو گے، (۱۲) اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو، (۱۳) کسی نے لقمان سے دریافت کیا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے جواب دیا جس کے صبر کے پیچھے ایذا نہ ہو، پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے، کہا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ پھر سوال کیا سب سے بہتر آدمی کون ہے کہا غنی، پوچھا غنی سے مراد مالدار ہے جواب دیا نہیں غنی وہ ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے۔ (۱۵) کسی نے پوچھا بہترین آدمی کون ہے؟ کہا کہ جو اس کی پروا نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے (۱۶) تیرے دسترخوان پر ہمیشہ نیکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علمائے حق ہی سے لینا۔

قرآن مجید میں اور پھر خود ختمی مرتبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت لقمان کی نصیحتوں کا جو ذکر فرمایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں میں حضرت لقمان اور ان کی تعلیمات کا چرچا موجود تھا۔

• خط کا جواب چاہتی ہوں تو جوابی لفافہ یا ٹکٹ روانہ کرنا نہ بھولیں۔

خاص حریم کے لئے

ناقابلِ فراموش

عفت موہانی

دید اور شنید میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پردے کے سامنے اور پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔ کوئی المناک واقعہ کسی کی زبانی سننے میں وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو آنکھوں سے دیکھنے سے ہوتا ہے! بعض بعض دفعہ ایسے واقعات انسانی ذہن پر اس طرح مرتسم ہو جاتے ہیں کہ امتداد زمانہ بھی ان کے نقوش مدھم نہیں کر سکتا۔ انسانی زندگی اپنے ذاتی یا دوسروں پر بیتے ناقابل فراموش حادثات سانحات اور واقعات سے پُر ہے۔ اب ملاحظہ کیجئے یہ واقعات جو میرے چشم دید ہیں انھیں گزرے برسوں ہو چکے ہیں لیکن یہ میرے ذہن پر ہنوز جوں کے توں اپنی پوری شدت سے نقش ہیں!

تقسیم کے بعد کا واقعہ ہے۔ میری والدہ ورنگل سے پھوپھی جان کی عیادت کے لئے آئی تھیں۔ پھوپھی جان ان دنوں اتنی علیل تھیں کہ ان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہ گیا تھا۔ صبح یا شام پر بات آکے ٹھہر گئی تھی۔ ان کی سنجیدہ بیماری کی خبر جب امی کو ملی تو وہ فوری حیدرآباد کے لئے چل پڑیں۔ ان کی گود میں میری چھوٹی بہن رضوانہ تھی!۔ بہت خوب صورت۔ شریر اور پیاری سی بچی تھی جب امی یہاں پہونچی ہیں تب رضوانہ ہر طرح صحت مند اور تندرست تھی! کسی کو خفیف سا گمان بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی اتنی مختصر ہے۔! امی حیدرآباد پہونچی ہیں تب پھوپھی جان کا حال یہ تھا کہ ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ چہرے پر مُردنی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور چچا جان ان کے سرہانے بیٹھے یٰسین شریف پڑھ رہے تھے۔ ان کے آنسو قرآن مجید کے صفحات پر گر رہے تھے اور گھر بھر میں عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی! مجھے خوب یاد ہے کہ وہ گرمی کا موسم تھا۔ بڑے وسیع و عریض صحن میں دھوپ اتنی تیزی سے چمک رہی تھی کہ اس طرف دیکھنا دشوار تھا!۔ میں ایک کھمبے سے لگی

کھڑی تھی۔ اور میری وہ دہشت اور خوف جو تنہائی میں اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ وہ امی کے قرب میں بڑی حد تک کم ہو گیا تھا! میں نے امی کی گود سے رضوانہ کو لے لیا اور ڈرائینگ روم میں آکے بیٹھ گئی۔ ہر لمحہ مجھے شور و شیون کی آوازوں کا انتظار تھا! لیکن اندرونی گھر میں جہاں بیمار تھا مکمل خاموشی تھی!۔ عین دوپہر کو پتہ چلا کہ ہماری قدیم ملازمہ جسے گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی ایک ہندو عامل کو لے کر آئی ہے۔ دوا علاج سے مایوس ہو کر اب عمل اور "اتارے" پر بات آگئی تھی! میں اپنی گود میں رضوانہ کو لئے اندر دالان میں آئی۔ اس وقت دالان میں سب بڑے اکٹھا تھے۔ امی بھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر رضوانہ میری گود سے اتری اور جا کے امی سے لپٹ گئی۔ ہندو عامل اس وقت ایک دم کالے مرغ کو پھوپھی جان پر سے صدقہ کر رہا تھا۔ اس نے بڑی برہمی سے کہا۔ بچوں کو پہلے ہی سے کیوں نہ الگ ہٹا دیا گیا۔ اور پھر اس نے امی سے کہا۔ وہ بچی کو لیکر فوراً وہاں سے چلی جائیں۔

صدقہ اتر گیا۔ اور کسی کو یہ بات یاد بھی نہ رہی کہ رضوانہ عین عمل کے دوران راستہ کاٹ کے آئی تھی۔ میں نے پھر بچی کو اپنے ساتھ لیا اور باہر صحن میں آکر اس کے ساتھ کھیلنے لگی۔ صحن کے کونے میں کنگھی کا بڑا درخت لگا تھا جو ان دنوں پھلوں سے لدا ہوا اور خوب پُربہار تھا۔ دفعتہً ایک چرچراہٹ سنائی دی۔ اور کنگھی کا درخت جڑوں سے اکھڑ کر یوں گرا کہ صحن میں دو مثلث بن گئے۔ یعنے وہ ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ترچھا ہو گیا۔ اس کی چوٹی دیوار سے لگ گئی۔ مغرب کا وقت تھا۔ میں نے رضوانہ کو اس کے تنے پر یوں بٹھا لیا جیسے گھوڑے پر بیٹھتے ہیں۔ پھر اسے جھلانے لگی۔ تنا جو متحرک ہوا تو اس کی چوٹی دیوار سے رگڑ کے عجیب سی بھیانک آواز پیدا کرنے لگی۔ میں نے بچی کو گود میں لے لیا اور اندر بھاگ آئی۔ پتہ چلا کہ اب پھوپھی جان کی طبیعت ٹھیک تھی۔ وہ ہوش میں تھیں۔ اور شاید باتیں بھی کر رہی تھیں۔ اسی رات اچانک رضوانہ کو بخار آگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بخار خوب تیز ہو گیا۔ دوسرے دن اسے خسرہ نکل آئی اور سارا دن وہ بخار میں پھنکتی رہی۔ بیہوش رہی۔ ڈاکٹروں کا ماتھا پھر ٹھنکا گیا لیکن انھوں نے اطمینان دلا دیا کہ یہ خسرہ کا اثر ہے۔ اس میں علاج نہیں کیا جاتا۔ اس پر گھر کی بڑی بوڑھی خواتین بھی نابو پا لیتی ہیں۔ لیکن

بڑی بوڑھی عورتیں بھی اس پر قابو نہ پاسکیں۔ شام ہوتے ہوتے خسرہ غائب ہوگئی اور رضوانہ پر گہری بیہوشی طاری ہوگئی۔ امی کا چہرہ مجھے یاد آرہا ہے۔ اتنا سفید ہوگیا تھا جیسے اس پر خون کا رتی بھر رنگ نہ رہا ہو۔ ایک ایک کو اس بھری نظروں سے تک رہی تھیں۔ رضوانہ خالہ امی سے بہت مانوس تھی وہ ورنگل ہی میں تھیں۔ اور بعد کو معلوم ہوا کہ بہت بے چین تھیں۔ انھیں اطلاع دی گئی۔ یہاں رضوانہ بیہوشی میں بھی بار بار اپیا۔ اپیا۔ کر رہی تھی! جس وقت اپیا کو مطلع کیا گیا وہ اسی وقت ٹرین سے آئیں۔ بتایا کہ رات انھوں نے خواب دیکھا تھا کہ رضوانہ ان کے پاس آئی تھی۔ وہ اسے گود میں لینے کو آگے بڑھتی تھیں اور وہ دور ہو جاتی تھی۔ راستے بھر انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ رضوانہ ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔ رات بھر رضوانہ بیہوشی میں انھیں پکارتی رہی ——— صبح آٹھ بجے اس کی زندگی کی توقع ختم ہوگئی۔ سب لوگ بڑے کمرے میں اکٹھا تھے۔ وہ مجمع اس وقت بھی میری نظروں میں پھر رہا ہے۔ رضوانہ سرد و سفید بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی رنگت نیلی ہو رہی تھی۔ امی دروازے پر کھڑی رو رہی تھیں۔ خالو جان رضوانہ کے منہ میں دودھ ٹپکا رہے تھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور اپیا۔ رضوانہ رضوانہ کرتی اندر آکے اس کے پیروں پر گریں۔ اسی وقت رضوانہ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اپیا اس کے سرد پاؤں اپنی آنکھوں سے لگا کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ وہ چند منٹ پہلے نہ آسکیں۔ اِدھر وہ دروازے میں داخل ہوئیں اُدھر رضوانہ نے دم توڑ دیا۔!

یہ واقعہ مجھے اس طرح یاد ہے جیسے ابھی حال کا ہو۔ اپیا کا کہرام۔ رضوانہ کی نیلی رنگت۔ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ پھوپھی جان ہر طرح صحت مند ہوگئیں۔ کہتے ہیں کہ ان کا صدقہ بچی پر اتر گیا۔ معلوم نہیں۔ رضوانہ کو مرے عرصہ گزر گیا۔ پھوپھی جان نے ابھی حال میں انتقال کیا۔

امی کی بیزاری آج بھی یاد ہے۔ ورنگل جا رہی تھیں تو کس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ ہائے میری بچی۔ مجھے ساتھ لائی تھی آج خالی گود لے کے جا رہی ہوں۔

جمعہ کے دن وہ ہنستی کھیلتی ہر طرح صحت مند اور تندرست آئی تھی۔ اتوار کی دوپہر کو قبر میں سلا دی گئی۔ کتنی ناقابلِ اعتبار ہے انسان کی زندگی۔!

رادھا کشن بنیا تھا۔ ہمارے ہاں ہر ماہ غلّہ اسی کی دکان سے آتا تھا۔ بہت قبول صورت تھا اس کی بیوی سروپی چودہ پندرہ برس کی بڑی پیاری لڑکی تھی۔ اکثر ہمارے ہاں آتی اور مرچ کوٹ دیتی۔ میں نے اسے کبھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا۔ شروع ہی سے میری طبیعت ایسی رہی ہے کہ کسی کا ذرا سا دکھ یا غم مجھے بھی پہروں اداس رکھتا ہے۔ ایک بار وہ چاول صاف کرنے آئی۔ دالان میں چاولوں کا ڈھیر لگا تھا وہ چاولوں کو پھوڑتی جاتی تھی اور رہ رہ کر آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ ہماری پرانی خادمہ نے اس سے پوچھا۔ سروپی کیا ہوا۔ تیرا میاں تو ایسا بھلا مانس ہے۔ تجھے آدھی بات نہیں کہتا۔ پھر تو کیوں رو رہی ہے؟ بس جیسے اس کے آنسوؤں کا بند کھل گیا۔ اس بُری طرح روئی ہے کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اماں نے اسے سمجھایا۔ منایا اور پانی پلایا۔ تب اس کا جی ٹھکانے ہوا اور پوچھنے پر رکتی ہوئی آواز میں اس نے اپنی ساس کے مظالم کی داستان سنائی۔ لرزہ خیز کہانی تھی۔ بہو کو بھوکا مارتی تھی۔ رات گئے تک اس سے کٹھن کام لیا کرتی۔ دھان کٹواتی۔ مرچ پسواتی۔ پانی بھرواتی اور اگر ان کاموں میں ذرا بھی تساہل ہوتا بے چاری بہو کے دونوں ہاتھ کھردری رسّی سے باندھ کر اپنے شوہر کی سخت کھڑاؤں سے مارتی۔! لڑکی نے اپنی ڈھیلی ڈھالی کرتی سرکا کے پیٹھ دکھائی۔ جس پر سرخ و سیاہ نیل کی دھاریاں پڑی تھیں۔ ایک زخم تو ابھی کچا تھا!۔

اس کی یہ کہانی سننے کے لئے سب اس کے آس پاس بیٹھے تھے۔ اور بے حد متاثر ہو رہے تھے۔ میری والدہ نے تعجب سے پوچھا۔ اور تیرا میاں کچھ نہیں بولتا؟۔ بچاتا نہیں تجھے اپنی ماں سے!

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی " وہ خود اپنی ماں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر کچھ کہے تو اُسے اس کے باپ سے پٹواتی ہے"

اس کے بعد اس نے اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ اور پھر آخر میں گڑگڑا کر بولی کہ اس کی یہ باتیں ساس کو معلوم نہ ہوں۔ وہ ہمارے ہاں سے کبھی کچھ مانگنے آجاتی تھی۔ سب نے اسے اطمینان دلایا۔ جب وہ جانے لگی تو پتہ چلا کہ اسے حمل بھی تھا۔ یہ دیکھ کر وہ ماما جی اس

سے رشتوں کو جھڑ چکی تھیں بے حد ہمدردی اور بڑے دکھ سے بولیں۔

"ایسی نگوڑیاں جن کا کوئی میکہ نہیں جن کو سسرال میں سکھ نہیں۔ وہ نامراد مر ہی جائیں تو اچھا ہے۔ اللہ کی طرف سے موت نہ آئے تو خود زہر کھا کے سو رہیں!۔"

سروپا سنے جاتے جاتے ان کی بات سن لی اور بولی "ٹھیک بات بولی ہو۔ موسی۔!" اور چلی گئی تھوڑی دیر تک بے چاری کی مظلومیت پر تبصرہ ہوتا رہا۔ پھر سب اس بات کو بھول بھال گئے۔۔

دوسری ہی سہ پہر تھی کہ محلے میں ایک حشر سا بپا ہو گیا۔ دوڑ بھاگ شور و غل، پولیس۔ پتہ چلا کہ رادھا کشن کے گھر پر پولیس آئی تھی۔ سروپا نے ریل کے نیچے آ کے خودکشی کر لی تھی!۔

تحقیق پر معلوم ہوا کہ جس رات وہ ایک جگہ سے مصالحہ پیس کے آئی تھی۔ اس رات کو اس کی ساس نے اُسے خوب مارا پیٹا تھا۔ اور گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ دوپہر تک بھوکی پیاسی گھر کی دہلیز پر بیٹھی روتی رہی تھی!۔ اس کا شوہر آیا تھا مگر وہ بھی [illegible] تب اُسے بے حد دکھ ہوا۔ گھر کے سامنے سے ریل جاتی تھی سہ پہر کے قریب جب پل گرا یا گیا اور ٹرین آنے لگی۔ سروپا بے تحاشہ دوڑتی ہوئی گئی اور ٹرین کے سامنے آ گئی۔ اس طرح بے چاری کٹ گئی تھی کہ جسم مکمل دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ والد دیکھ آئے تھے اور بتا رہے تھے کہ نجانے کس طرح اس کے پیٹ سے بچہ نکل کر دور جا پڑا تھا۔ بالشت بھر کا بچہ تھا۔ لیکن پورا بن چکا تھا۔ ننھا سا لڑکا۔ انگلی بھر کے بازو۔ ماچس کی تیلیوں کی سی انگلیاں، اور آنکھوں کے نیلے اور سیاہ نشان۔ ننھی سی ناک۔ دہانہ، ایک جم غفیر پل کے پاس اکٹھا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ لوگ کٹی ہوئی لڑکی سے زیادہ اس بچے کو دیکھ رہے تھے۔ ماں سے کئی گز دور ایک مجسمہ بلکہ درس عبرت بنا پڑا تھا۔ سنا تھا کہ بڈھی اور ساس بیٹے کو پولیس والے لے گئے۔ سروپا کے باپ اپنی مقتول بیٹی اور نامکمل نواسے کو لے گیا۔ اس کی گریہ وزاری سے پولیس والے بھی متاثر نظر آ رہے تھے۔ سب کی زبان پر یہی تھا کہ کاش بدنصیب لڑکی کی ماں زندہ ہوتی۔ شاید چھپا لیتی اسے اپنے آنچل میں۔ جن کی ماں نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر مظلوم اور کون ہے۔؟

باقی آئندہ

حریمی دسترخوان

پالک کی پھلکیاں

پالک ایک کلو۔ بیسن ۱۲۵ گرام۔ کھویا ۳۰ گرام۔ ناریل کا برادہ ۳۰ گرام۔ دہی ۵۰ گرام۔ نمک، دھنیا خشک مرچ، ہلدی، گرم مسالہ اندازے سے۔ گھی، تیل یا ڈالڈا جتنا بھی صرف ہو۔

ترکیب۔ پالک کو اچھی طرح دھو کر پانی میں جوش دے کر پانی نچوڑیں اور تھوڑا سا نمک ملا کر سل پر پیس لیں۔ اس کے بعد بیسن کھویا اور ناریل کا برادہ پسی ہوئی پالک میں ملا کر پھینٹیں اور گھی یا تیل میں اس کی چھوٹی چھوٹی پھلکیاں تل لیں۔ اس کے بعد تھوڑا نمک، دھنیا، ہلدی، مرچ اور گرم مسالہ باریک پیس کر تھوڑے گھی یا تیل میں بھونیں۔ اس کے بعد دہی ملا دیں اور تھوڑا سا پانی دے کر پھلکیاں ڈال کر ۵ منٹ پکائیں۔ پھر نوش فرمائیں۔ مسالے اندازے سے ڈالیں۔ وزن لکھنا دشوار ہے۔

مرسلہ:۔ [illegible]

سیب کی مٹھائی

آجکل سیب کی فصل ہے اس لئے حریمی بہنیں اس کی مٹھائی بنائیں۔ بیحد لذیذ ہوگی۔ ایک بار آزمائیں۔

سامان۔ بڑے سیب تین۔ انڈے دو۔ میدہ پچاس گرام۔ شکر ۱۰۰ گرام گھی یا ڈالڈا حسب ضرورت پہلے سیب کے اوپر اور نیچے کے حصے کو تھوڑا تھوڑا تراش کر پھینک دیں۔ اس کے بعد چھلکا علیحدہ کر کے باریک باریک قتلے کاٹ لیں۔ درمیان میں بیج وغیرہ کے حصوں کو باریک چاقو یا چھری سے احتیاط کے ساتھ علیحدہ کر دیں۔ اس طرح ہر قتلے کے درمیان گول حصہ خالی ہو جائے گا۔

انڈوں کی سفیدی اور زردی کو علیحدہ علیحدہ پھینٹیں، پھر میدہ اور شکر (شکر کو باریک پیس لیں) انڈوں میں ملا کر ایک جان کر لیں۔ اس کے بعد گھی یا ڈالڈا کسی فرائی پین میں گرم کر لیں اور سیب کے قتلوں کو آمیزے میں اچھی طرح لت پت کر کے تلیں، جب ہلکی سرخی آ جائے تو نکالتی جائیں۔ خیال رہے کہ آنچ زیادہ تیز نہ ہو۔ کسی پلیٹ میں ٹکڑوں کو سجا کر عرق کیوڑہ چھڑک دیں۔ اور نوش فرمائیں۔

مرسلہ:۔ فیروزی قسیم اشرفی (لکھنؤ)

ماہتاب

ثمینہ ممتاز

آپ کو بتا کر جاتا مجھے اور کوئی بات سنائی نہ دے رہی تھی بس ماہتاب اور اس کا چہرہ میرے ارد گرد گھوم رہا تھا کہ اس شخص نے بیٹی کا چہرہ دیکھ کر کتنا خوبصورت نام رکھا ہے مجھے شک گزرا کہ یہ چھوٹی بچی کا نام نہ ہو تو میں نے جھٹ سے پوچھ لیا اچھا منی کا نام ماہتاب ہے۔ وہ بولے نہیں منی کا نام تو بدر ہے۔

میں آصف جان کی منگنی میں شریک ہونے گیا میرے دور کے ماموں برمنگھم سے آئے تھے۔ اور اب کئی سال بعد ان کی عقل میں یہ بات آئی کہ اپنے ملک جیسا کوئی ملک نہیں اس لیے مستقل طور پر اپنے وطن لوٹ آئے اور آ کر اپنی بیٹی فائزہ کی منگنی میرے بھائی جان آصف سے طے کر دی۔ آپ نے منگنی کی تقریب میں بھرپور حصہ لیا۔

آصف بھائیجان کی منگنی کے بعد امی اور بھیا ایک خوبصورت انگوٹھی کے ہمراہ میرے ساتھ لکھنؤ آ گئے کہ اگر حاجی صاحب نے ہاں کر دی تو میرے نام سے اس کی انگلی میں ڈال دی جائے۔

میں نے امی اور بھائی جان کے آنے کی اطلاع حاجی صاحب کو دی وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز دوپہر کے کھانے پر ہمیں مدعو کیا جیسے تیسے گذری دوپہر کو ہم لوگ حاجی صاحب کے یہاں گئے مگر اس چھوٹی بچی کے سوا ایک ادھیڑ سی عمر کی عورت تھی میں نے سوچا یہ عورت کسی طرح بھی ان کی بیٹیوں کی ماں نہیں ہو سکتی۔ امی نے بچی سے پوچھا امی کہاں ہیں بلاؤ انھیں تو بچی حاجی صاحب کے پاس جا کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی جب حاجی صاحب نے بتایا کہ ان کی ماں کو بچھڑے آٹھ سال ہو گئے ہیں ہم لوگوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا پھر کھانا کھانے کے بعد امی اصل بات کی طرف آئیں اور حاجی صاحب سے گویا ہوئیں کہ بھائی صاحب ثاقب کی زبانی آپ کی بہت تعریف سن چکے جانیے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہم ایسے ہی شریف گھرانے کے متلاشی تھے اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ثاقب کو آپ کا بیٹا بنانے آئی ہوں ہم نے اپنی اولاد کی تربیت جس انداز سے کی ہے وہ آپ کو ثاقب کی صورت میں معلوم ہو گیا ہوگا۔ آپ انشاءاللہ ثاقب کو اپنا بیٹا قبول کر کے زندگی بھر نہیں پچھتائیں گے۔

حاجی صاحب سکتے کے سے عالم میں آ گئے بالکل ساکت و جامد حیران سے میری جان ہی تو نکل گئی کہ کتنا بھروسہ تھا کتنا مان تھا مگر حاجی صاحب تو بالکل خاموش تھے۔ امی اور بھائی جان نے باری باری مجھے دیکھا پھر امی کہنے لگیں حاجی صاحب کچھ بولیے' اگر میں نے کوئی بات آپ کی شان کے خلاف کہہ دی ہو تو میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں ویسے بیٹیاں کسی نہ کسی کو تو دینی ہی ہوتی ہیں کیا یہ بہتر نہیں کہ جو خود گھر چل کے آئے اس شرف مند کو بیٹی دے دی جائے تا کہ وہ تمام عمر عزت پا سکے۔

حاجی صاحب نے لرزتے ہونٹوں سے بمشکل یہ کہا میں ہزار جان سے ثاقب کو اپنا بیٹا بنا سکتا ہوں مگر آپ ماہتاب کو اپنی بیٹی نہیں بنا سکیں گی۔ امی اس کو روائتی بات سمجھ کر جلدی سے اٹھیں اور حاجی صاحب سے کہا کہ نہیں نہیں بھائی صاحب آپ ایسا نہ سوچیں میں ان ساسوں میں سے نہیں ہوں جو دوسروں کی بیٹیوں کو ظلم سہنے کے لیے لاتی ہیں۔ آپ کی بیٹی میری اپنی بیٹی ہو گی مجھے ثاقب سے بھی زیادہ عزیز ہو گی آپ دیکھیں گے میں اسے ماں سے بھی بڑھ کر پیار دوں گی۔

تب حاجی صاحب بولے کہ بہن جی یہ سب فیصلے آپ ماہتاب کو دیکھ کر ہی کر سکتی ہیں اور پھر حاجی صاحب نے چھوٹی بچی سے کہا جاؤ آپا کو بلا لاؤ۔

میرا حال دیکھنے کے قابل تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ہوا میں معلق ہو گیا ہوں یا خدا آج میں اپنی چاہت اپنی محبت کو اتنے قریب سے دیکھوں گا میں اپنے وجود کو خواب کی دنیا سے نکال رہا تھا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے، ماہتاب ابھی آنے والی ہے ابھی جلوہ افروز ہو گی میرے دل کی ملکہ اور عین اسی لمحے وہ حسینہ اپنے سنہری بالوں کو بکھرائے کٹورا سی اداس آنکھیں لیے گہرے سبز سوٹ کے ساتھ بیساکھی کے سہارے کمرے میں آئی اور امی اور بھیا کو جھک کر سلام کیا پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اس کی بیساکھی ٹھک سے فرش پر گر پڑی امی بھیا اور میں ایسے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے جیسے زلزلہ آ جائے اور چھت گر کر مکینوں کو زندگی سے

آزاد کر دے۔

میں یک بارگی ڈول گیا اپنے آئیڈیل کو کرچی کرچی ہوتے دیکھ کر قریب تھا کہ میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاتا مگر میرے اندر کے انسان نے چیخ چیخ کر مجھے پکارا میرے پاؤں جکڑ کر رکھ دیے کہ او لالچی انسان ظاہر پر مرنے والے کبھی باطن میں بھی جھانک کر دیکھ کیا تو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ تو تاحیات ایسا ہی تندرست و توانا رہے گا کیا تو اس مقدس ذات کو نہیں مانتا جو اتنے حسین چہرے دیتے ہوئے ایسی معذوری دے دیتا ہے تو یہاں سے بھاگ کر کہاں جائے گا اگر کل پھر بس تجھے خدانے ہاتھوں پیروں سے معذور کر دیا تو کیا تو اپنا جسم پھینک دے گا۔ ناکارہ اور بے مقصد سمجھ کر۔ کیا تو نے ماہتاب کو چاہا نہیں۔ کیا اس کے لیے راتوں کو جاگتی آنکھوں سے سپنے نہیں دیکھے کیا اس کے لیے خدائے برتر سے التجائیں نہیں کیں اور پھر جب خدانے تیری سن لی تو اب اس کی دی ہوئی نعمت کو ٹھکرا کر بھاگ جانے کی سوچتا ہے کیا یہ ہی اس کا قصور ہے کہ وہ بیساکھی کے سہارے چلتی ہے کیا تو اپنے محبوب کی معذوری کو نظرانداز کر کے اس کا سہارا نہیں بن سکتا، اور پھر جیسے میں نے نڈھال برف کی مانند جسم کو کرسی کی پشت سے ٹکا دیا چند لمحوں بعد حاجی صاحب نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری امی اور بھیا کی جانب اور پھر میری جانب دیکھا بخدا میں ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اور اپنے خود غرض لالچی کو ڈھکیل کر اپنے اندر کے انسان اور اپنے ضمیر کی پکار پر اٹھا امی کے پرس سے انگوٹھی نکال کر ماہتاب کی نازک خوبصورت مرمریں انگلی میں خود پہنا دی۔ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ حاجی صاحب اٹھے اور مجھ سے بغلگیر ہو کر رو دیے ان کی ریشیں بھیگ بھیگ جاتی تھی میں نے انھیں ہر طرح تسلی دی حاجی صاحب آپ مجھے ہر موڑ پر ثابت قدم پائیں گے امی جان بھی کمال حوصلہ سے اٹھیں اور ماہتاب کو گلے سے لگا لیا۔ مگر بھائی جان نے میری پسند پر تحقیر آمیز نظر ڈالی اور مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

آج میری شادی کو پانچ برس ہو گئے ہیں خدا نے مجھے تین خوبصورت صحت مند بیٹوں سے نوازا ہے جو ماہتاب کے حسن کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ماہتاب نے میری زندگی میں بہاریں بکھیر دیں۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میری شریک سفر معذور ہے جس عورت کو خدا نے حسن کی بے پناہ دولت دے رکھی ہو سیرت کے بے بہا خزانے دیے ہوں پیار کرنے والا شوہر اور تین بیٹوں کا سہارا دیا ہو وہ عورت کبھی بے سہارا نہیں ہوتی میں خوش ہوں میرا ضمیر خوش ہے مجھے خدا نے وہ نعمت دی ہے جس سے آصف بھائی ابھی تک محروم ہیں۔ آصف بھائی آئے تھے وہ ماہتاب سے میرے چھوٹے بیٹے مانی کو مانگ رہے تھے میں نے اور ماہتاب نے بخوشی اپنا بیٹا آصف بھائی اور نادیہ بھابی کو دے دیا کہ وہ انھیں کے سائے میں پرورش پائے اور ان کی محرومئ اولاد کو دور کر دے۔

نئے دعالیہ رومانی ناول

آتش	خدیجہ مستور	۳۰/-
زرد چاندنی	عقیلہ ہما	۳۰/-
انتظار کا موسم	دیبا خانم	۱۵/-
راضیہ	زہرہ جبیں	۲۲/-
پناہ گاہ	سلمیٰ کنول	۲۵/-
عقیلی	〃 〃	۱۸/-
بے نام	〃 〃	۳۵/-
عالم پناہ	رفیعہ منظور الامین	۳۰/-
راز	عفت موہانی	۱۸/-
شام تمنا	〃 〃	۱۵/-
ناگمہ	رضیہ بٹ	۲۵/-
بہار جاوداں	زبیدہ خاتون صدیقی	۹/-
آہ	شہلا نرگس	۲۵/-
لیلیٰ تیری گلی میں	مینا ناز	۲۳/-
بادل کا سایہ	شہناز کنول	۳۰/-
غزل	پروین شریف	۱۲/-
سوز و ساز	نجم اعزاز	۱۵/-
محرد نشیں	مسرور جہاں	۱۵/-
نادرہ	زبیدہ خاتون	۱۵/-
چندا	عطیہ پروین	۳۰/-

بندھن

شگفتہ اعجاز

یہ افسانہ ان لوگوں کے لئے ایک تازیانہ ہے جو اپنی بیویوں کو گھروں میں چھوڑ کر غیر ممالک میں کسب زر کے لئے سکونت اختیار کر لیتے ہیں ـــــ شمع جذبات سے مغلوب ہو کر بال بال بچی لیکن ہو سکتا ہے کہ ہر ایسی برہا کی ماری عورت شمع ہی کی طرح اپنے جذبات کو فرض پر قربان نہ کر سکے ۔ ۔ ـــــ ادارہ

کھلکھلاتے چہرے، مسکراتی آنکھیں، ہر طرف رنگ و نور کا طوفان ہے، شادیانے بج رہے ہیں بچے تتلیوں کی مانند ادھر سے ادھر اڑتے پھر رہے ہیں اور خوشی کی ایسی ہی رات کا ارماں سجائے پہلو میں بیٹھی تمہاری دلہن بند آنکھوں میں تمہارے سپنے دیکھ رہی ہے۔ دلہا بنے تم بھی بڑے پیارے لگ رہے ہو "خدا تم دونوں کو زندگی بھر ایک دوسرے کے پیار سے سرشار رکھے" میرے دل نے تم دونوں کو پر خلوص دعا دی۔

من میں اٹھتے ہوئے درد کو دبائے میں تم کو دیکھ رہی تھی، تم نے بھی ایک پل مجھے دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ہاں شاید میں تمہاری نفرت کے قابل ہوں۔ جبھی تو یہ تنہائی اور اداسی میرا مقدر ہے۔ تم میری قسمت بدلنے چلے تھے، میری زندگی میں خوشیاں لانا چاہتے تھے مگر یہ خوشیوں کا سودا کتنے لوگوں کی جان لے کر پورا ہوتا سجاد؟

آج بھی میری نظروں میں اس خوبصورت شام کا منظر تازہ ہے۔

گرمیوں کی ڈھلتی دھوپ تھی چنبیلی اور موگرے کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر تھی، اور میں کرسی پر بیٹھی سر جھکائے اپنے میاں وحید کا خط پڑھ رہی تھی نئی کوئی بات نہ تھی میری ہر التجا کا ان کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ "میں فی الحال واپس نہیں آسکتا اور نہ ہی تم کو یہاں بلا سکتا ہوں کہ یہ علاقہ ریگستانی ہے اور یہاں دور دور تک عورت نام کی کوئی چیز نہیں آرام سے جہاں ہو وہیں رہو وہاں تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ پیسے بھی میں بھیج رہا ہوں، امی تمہارا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں جہاں مرضی آئے آؤ جاؤ کوئی روک ٹوک نہیں آخر تم چاہتی کیا ہو؟

"میں کیا چاہتی ہوں تمہیں کیا معلوم" یہ بولتے ہوئے میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔

"جی میں واقعی نہیں جانتا کہ آپ کیا چاہتی ہیں" ایک گمبھیر آواز نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہلکی بادامی قمیض اور براؤن چیک پینٹ میں ملبوس میرے سامنے تم کھڑے تھے۔

"معاف کیجئے گا میں آپ سے نہیں کہہ رہی تھی" میں نے بوکھلائے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ویسے بھی میں آپ کو جانتا نہیں ہوں" تم پھر بولے ـــ

میں اب تک ذرا سنبھل چکی تھی اور تمہاری اس قدر دیدہ دلیری پر حیران تھی۔

"آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے" میں نے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"فاروق صاحب کا گھر یہی ہے نا مجھے ان سے یا خالہ جان سے ملنا ہے"

"جی ہاں، یہ انہی کا گھر ہے آپ تشریف رکھیں میں ابا کو بلاتی ہوں"

"ارے بیٹا سجاد" میرے سسر نے دور ہی سے تمہیں دیکھتے ہی آواز دی، پھر آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

"کب آئے؟" ابا نے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے ہو"

"بس آپ کی دعا ہے ابھی چند دن پہلے ہی انگلینڈ سے آیا ہوں سوچا آپ سے مل لوں"

"بہت اچھا کیا بیٹے" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے "دلہن یہ سجاد ہیں وحید کے دوست، اور سجاد یہ شمع ہے وحید کی دلہن" انہوں نے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروا دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، آپ کی شادی میں شرکت نہ کر سکا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے"

تم نے اس قدر ادب کے ساتھ معذرت کی کہ میں مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا کرتے رہے بیٹا" ابا نے تم سے پوچھا۔

"جی ہاں خط آتے ہیں، نہیں وہاں پر فیملی کوارٹرز نہیں اس لئے مجھے بلا نہیں سکتے۔" جی ہاں اگلے سال ضرور آئیں گے وغیرہ وغیرہ۔"

رات کافی بیت چکی تھی، تم لوگ پھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے ———

رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے سوچنے لگی کہ کتنے دنوں کے بعد آج میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سوکھی مٹی پر موسم بہار کی پہلی بارش ہوئی ہو اور زمین سے اٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو میرے چاروں اور بس گئی ہو۔ آج کی رات اور وحید کے فراق میں گزاری ہوئی جاگتی راتوں میں کتنا فرق تھا، آج تو ان آنسوؤں نے بھی نہ نکلنے کی قسم کھائی تھی اور پھر میں شام کی مسکراتی یادوں کو لئے نیند کی وادی میں اتر گئی۔

زندگی پھر اسی طرح گزرنے لگی وہی بے کیف دن وہی ویران شام یہ کیسی زندگی ہے میں کبھی کبھی سوچنے لگتی۔ کیا شادی اسی لئے کی جاتی ہے کہ کسی کو بندھن میں باندھ کر اسے یادوں کے سہارے چھوڑ دیا جائے، یہ قربتیں یہ نزدیکیاں۔ وہ اقرار و انکار، کسی کا روٹھنا اور کسی کا منانا۔ وہ مسکراتے دن اور رنگین راتیں۔ کیا یہ سب افسانے کی باتیں ہیں۔ مگر یہ باتیں میں کس سے کہتی وحید کے والدین سے یا اپنے میکے والوں سے، دونوں مجھے ہی مورد الزام ٹھہراتے اور دنیا مجھ پر ہنستی کہ اتنے عیش و آرام کی زندگی ہے اور پھر بھی محترمہ کو غم ہے :

اس دن گھر پر کوئی نہ تھا، امی ابا دونوں کسی کے گھر عقیقہ میں گئے ہوئے تھے، ان لوگوں نے مجھے لیجانے کی بڑی کوشش کی مگر میں نہ گئی۔ شاید دل کو تمہارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ شام کا وقت تھا میں کیاریوں میں پانی ڈال رہی تھی کہ گیٹ پر گھنٹی بجی، گیٹ پر تمہیں کھڑا دیکھ کر میں ٹھٹھک سی گئی۔ تم مسکرا رہے تھے۔

"خالو جان ہیں:" تم نے پوچھا۔

"جی نہیں :"

"خالہ جان ہیں"؟

"جی نہیں :"

"آسیہ گھر پر موجود ہیں ؟"

"جی نہیں :" میرے منہ سے "جی نہیں" بے اختیار نکل گیا۔ تم نے

یہ سنتے ہی ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

" وہ جی میرا مطلب ہے کہ صرف میں اکیلی ہی گھر پر ہوں اور کوئی نہیں ہے :" میں کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

"اچھا پھر آپ سے مل لیتے ہیں :"

"جی ؟"

"تو کیا میں گیٹ پر سے ہی واپس چلا جاؤں، آپ کے یہاں گھر آئے مہمان کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے" ؟ تم الٹا مجھ سے سوال کرنے لگے۔

"نہیں نہیں آپ آئیے تشریف رکھیے :" میں نے مسکراتے ہوئے تمہیں خوش آمدید کہا اور پھر ہم دونوں لان پر آکر بیٹھ گئے۔

"آپ نے تو بڑے خوبصورت پھول لگا رکھے ہیں :" تم نے میرے خوبصورت باغیچہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

" جی ہاں مجھے کھلے ہوئے پھول بہت اچھے لگتے ہیں :" میں نے جواب دیا۔

"اور مجھے کھلے ہوئے چہرے بہت پسند ہیں۔ ویسے آپ کبھی ہنستی بھی ہیں یا......"

دیکھئے سجاد صاحب، آپ کو میرے بارے میں اس طرح کہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ میری مرضی ہے کہ میں چاہے سنجیدہ رہوں یا ہر وقت قہقہے لگاتی رہوں۔

"ارے ارے آپ تو ناراض ہو گئیں" میرے جواب سے تم گھبرا گئے۔ "میرا مطلب آپ کی دل شکنی کرنا نہیں تھا۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا اگر آپ کو میری بات سے تکلیف پہنچی ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں :"

میں بدستور خاموش رہی۔

"چلئے معاف کر دیجئے :" تم دونوں ہاتھ باندھ کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے ———

"ٹھیک ہے مگر آئندہ ایسی گفتگو سے پرہیز کیجئے گا :" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے میرے باپ کی توبہ جو آئندہ نازیبا حرکت کی :" تم نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تمہیں ایسی حالت میں دیکھ ہنسی پر قابو

کرتا دوبھر ہوگیا۔ اور میں ہنسنے لگی۔ مجھے ہنستا دیکھ کر تم بھی ہنسنے لگے ——

"اب تو آپ ناراض نہیں ہیں" تم نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے گردن ہلائی "تو پھر چلیئے دوستی کا ہاتھ ملائیے" یہ کہتے ہوئے تم نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا اور میں نے بھی نہ جانے کس دھن میں اپنا ہاتھ تمہیں دے دیا۔

اچانک ہم دونوں کو ہوش آیا۔ بے خیالی میں پکڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کیا۔

مگر چھوٹے سے اس لمحہ نے بہت کچھ کر دیا۔ اب ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار گر چکی تھی۔ اور تم۔ تم تو بالکل چھوٹے بچوں کی طرح چہک رہے تھے کیسے کیسے قصے، کہانیاں دنیا جہان کی اس شام تم نے مجھے سنائیں اور میں تو اتنی خوش تھی کہ میرا بس چلتا تو وقت کو وہیں روک لیتی، مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں اب تک بھٹک رہی تھی۔ مجھے ایک ایسا رہبر مل گیا ہے جو مجھے منزل تک پہنچا دے گا۔ ہم گھنٹوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہیں آفتاب غروب ہوگیا اور چاند نکل آیا تھا مگر وقت کا احساس کسے تھا، باتیں تو ختم ہونے کو ہی نہ آرہی تھیں ایسا لگتا تھا کہ من کی پیاس برسوں بعد بجھی ہے۔

"ارے سجاد بیٹے تم کب آئے" گیٹ ہی پر سے امی نے آواز دی اور وقت کا طلسم وہیں ٹوٹ گیا۔

"جی خالہ جان بس ابھی ابھی آیا ہوں۔ شمع کہہ رہی تھیں کہ آپ لوگ آنے والے ہیں اس لئے رک گیا۔"

"بہت اچھا کیا بیٹے، آؤ بیٹھو ویسے آج تقریب میں بہت ہی مزہ آیا" امی کہنے لگیں۔ "وہاں تو بہت لوگ آئے ہوئے تھے میں نے دلہن سے بھی ملنے کو کہا تھا مگر یہ گئی نہیں چلتی تو یہ بھی دیکھ لیتی۔"

"کس کو امی"۔ میں نے پوچھا۔

"ارے میں نے سجاد کے لئے بڑی پیاری لڑکی ڈھونڈی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں گورا رنگ اور مزے کی بات یہ ہے کہ میں اس کے والدین کو بھی جانتی ہوں۔ اس لئے کوئی زحمت نہ ہوگی۔ بس اب بیٹا سجاد تمہارے گھر والے دیکھ لیں تو بات آگے بڑھائیں" امی پورے جوش کے ساتھ کہنے لگی۔

مگر تم سجاد اس وقت مجھے دیکھ رہے تھے۔

"سجاد بیٹے۔ ارے تم تو ابھی سے اس کے خیالوں میں کھو گئے" امی ہنسنے لگیں "کل امی اور رضیہ کو یہاں بھیج دو ہم لوگ شام کو لڑکی دیکھنے جائیں گے۔ شمع تم بھی چلو گی نا؟"

جی امی میں نے آہستہ سے کہا۔

تم پھر میری طرف ایک ٹک دیکھنے لگے تمہاری نظروں کی تپش سے میرا بدن جلنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھ سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے اور میں کسی کڑی سزا کی مستحق ہوں۔

"اچھا میں چلتا ہوں" تم یہ کہتے ہوئے تیزی سے نکل گئے۔

دوسرے دن شام کو امی رضیہ خالہ جان اور میں، ہاں میں بھی سجاد! اپنے گھائل من کے ساتھ تمہاری ہونے والی دلہن شہلا کے گھر گئے۔ لڑکی واقعی بے حد پیاری تھی، تم دونوں کی جوڑی خوب سجتی۔ رضیہ بھی بے حد خوش تھی اپنے بھائی کو دولہا بنانے کا ارمان کس کے دل میں نہیں ہوتا ہے۔

"کیسی لگی آپ کو شہلا" باجی رضیہ نے مجھ سے پوچھا

"بہت پیاری" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بس اگلے مہینے کی کوئی بھی تاریخ پکی کر لیتے ہیں۔ وہ چہک رہی تھی۔

ارے بیٹا ایسے نہیں ہوتا۔ تمہاری امی بولیں۔ وہ لوگ سجاد کو تو دیکھ لیں۔

"ارے وہ لوگ سجاد بھائی کو دیکھتے ہی فدا ہو جائیں گے، میرے بھائی جیسا لڑکا انہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا —— ٹھیک کہہ رہی ہوں نا باجی" رضیہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"ہاں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو" میں نے تصدیق کی۔

صبح امی اور ابا دونوں تمہارے گھر پر گئے ہوئے تھے اور میں کام کاج میں مشغول تھی کہ اچانک تم آ گئے اڑی اڑی سی رنگت سرخ آنکھیں اور بکھرے ہوئے بال صاف پتہ چلتا تھا کہ رات بھر جاگتے رہے ہو۔

"شمع یہ سب کیا ہے؟" تم مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پڑے کل شام تم کہاں گئی تھیں کیا تم میرے جذبات سے باخبر نہیں ہو کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں جواب دو شمع آج مجھے جواب چاہیئے۔

کیا تم سب رسم و رواج توڑ کر میرا ساتھ دو گی۔ بولو شمع کیا میں ہمیشہ چند خوبصورت لمحوں کی یاد کے لئے تڑپتا رہوں۔

تم ہذیانی کیفیت کے ساتھ بولے جا رہے تھے، مجھ سے یہ دیکھا نہ جاتا تھا۔

سجاد یہ تم نے مجھے کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ میری ساکت زندگی میں کیسا طوفان برپا کر دیا ہے۔ میں تم کو کیا جواب دوں۔ تم نے میری زندگی میں قوس قزح بکھیرنے کی کوشش کی مگر میں کیا کروں کہ میں رنگوں کو سمیٹ نہیں سکتی کاش ہماری ملاقات شادی سے قبل ہوتی تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے، مگر سجاد اب ہوش میں آجاؤ۔ ہماری راہیں جدا جدا ہیں۔ تم نے میرے کاندھے پکڑ لیئے۔

تم وحید سے طلاق لے لو، تم اس کے ساتھ خوش نہیں ہو اور میں تمہارے بغیر.....

چپ ہو جاؤ سجاد۔ خاموش ہو جاؤ۔ میں چیخ پڑی یہ سب ناممکن ہے۔ تقدیر نے آج مجھے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ ایک طرف تو محبت خوشی امنگ ہاتھ پھیلائے مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لینے کو بیقرار ہے اور دوسری طرف میرا فرض مجھے مجبور کر رہا ہے۔ میری شرافت کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ میں طلاق لے لوں میرا ضمیر مجھ پر لعنت بھیج رہا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ بھی گناہ ہے۔ مانا کہ اس کا سبب وحید کا کردار ہے، جسے میرے جذبات کی فکر نہیں، جو دولت سے ہی بیوی کو مطمئن رکھنا چاہتا ہے۔ کاش ایسے مرد یہ بھی سمجھ سکیں کہ بیوی صرف دولت ہی سے مطمئن نہیں ہو جاتی۔ مجھ سے جو گناہ سرزد ہوا ہے اسکی ذمہ داری وحید پر بھی ہے۔ اس کے باوجود میں اپنے ہی کو خطاوار سمجھتی ہوں۔ ایک بیوی اپنے شوہر کی امانت ہوتی ہے۔ شوہر برا ہو یا بھلا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ذرا تم سوچو تو کہ اگر میں تمہاری بات مان لوں تو وحید کا کیا ہوگا، میرے بوڑھے ساس سسر پر کیا گزرے گی اور یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ مجھے بے وفا، آوارہ، مکار اور نجانے کیا کیا نام دے گی ـــ اس جہاں میں صرف اپنے لئے ہی نہیں دوسروں کے لئے بھی جینا پڑتا ہے اپنے ارمانوں کے خون سے دوسرے کے لئے خوشیاں خریدی جاتی ہیں۔

نہیں سجاد میں اتنی خود غرض نہیں، تم واپس چلے جاؤ آج سے ہم اور تم اجنبی ہیں میں نے اپنے دل کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کے لئے بند کر لئے ہیں۔ تم تنہا میں میرا عکس تلاش کر لینا۔ خدا حافظ

"ٹھیک ہے شمع میں جا رہا ہوں، مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس قدر سنگدل بھی ہو سکتی ہو۔ مگر ایک بات یاد رکھو۔ میرے دل میں تمہاری یاد کی شمع ہمیشہ جلتی رہے گی اور تم چاہو بھی تو اسے بجھا نہ سکو گی" یہ کہتے ہوئے تم تیزی سے باہر نکل گئے اور میں وہاں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی

• سلسلہ بزم حریم صفحہ ۲۳ـ

(ابوالکلام (پسر ابوالحسنات) کے ساتھ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵ء کو، پھپول بڑا گاؤں اور بلوان بازار میں بالترتیب عمل میں آئیں۔ اللہ پاک دونوں جوڑیوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• صبیحہ یاسمین ایم۔ اے (میسور) میری چھوٹی خالہ زبیدہ بیگم بنت محمد جمال، جمال بکڈپو میسور) کی شادی فیاض احمد سلمہ کے ساتھ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۵ء بروز اتوار گیارہ بجے دن مسجد درگاہ ہی میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک انھیں دنیا جہاں کی خوشیاں عطا فرمائے۔

• مسز عصمت فاطمہ صاحبہ نے اپنے فرزند اقبال احمد سلمہ کی شادی کے سلسلے میں جو شگفتہ نفیس سلمہا (دختر نیک اختر شیخ محمد شکور صدیقی صاحب) کے ساتھ عمل میں آئی، ۲۴ ستمبر کو بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی، جس میں معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم

انتقال پر ملال کی خبریں

• طلعت پروین، نسرین خاں، فرح دیبا، فرح زیبا، ثریا خان ہمارے دادا الحاج عزیز احمد خاں صاحب ۲۲ اگست ۱۹۸۵ء کی شب میں اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم عرصہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ بڑے شریف النفس، عبادت گزار، صابر و شاکر انسان تھے۔ آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میرا امتحان لے رہا ہے۔ حریمی بہنوں سے التماس ہے کہ ہمارے دادا مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں۔

افسانہ

ہم رہے نہ ہم

ــــــ مس شمیم اختر ایم۔اے۔بی ایڈ

ذیل کا افسانہ صرف شیفتہ ہی کی کہانی نہیں۔ صدہا گھرانوں میں اسی طرح بڑی بہنوں یا بھائیوں کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں آپ سوچئے کہ قصور شیفتہ کا ہے یا اس کی امی کا۔ خدانخواستہ شیفتہ کی جگہ آپ ہوتیں تو کیا کرتیں ــــــ ادارہ

گھڑی نے جیسے ہی آٹھ بجائے شیفتہ فوراً ہی گھر سے نکل کر برق رفتاری سے چلتی ہوئی ایک خوبصورت بلڈنگ کے سرمئی رنگ و روغن سے مزین دروازے کے نزدیک آکر ٹھہر گئی۔ چند ثانیہ اپنی ناہموار سانسوں کو درست کر کے اس نے آہستہ سے بل کے بٹن کو دبا یا گھنٹی کی آواز فضا میں تحلیل نہ ہو پائی تھی کہ دروازہ تیز جھٹکے سے کھل گیا۔ خلاف معمول اس کے روبرو ننھے رضوان کی جگہ ایک اجنبی شوخ و شریر، وجیہہ و شکیل مرد کھڑا تھا۔ جس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ شیفتہ نے گھبرا کر اپنے بڑھتے قدموں کو روک لیا اپنی بکھرتی سانسوں کو درست کرتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔ کیونکہ اس شخص کی شوخ نگاہیں بے باکی سے اس کے خد و خال کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نگاہوں کی تپش سے اس کا پورا وجود پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ آواز حلق میں پھنس کر دم توڑ گئی۔ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے اس مرد نے نہایت شائستگی سے پوچھا۔

"کہئے مس آپ کو کس خوش نصیب سے ملاقات کرنا ہے؟"

"جی۔۔۔۔وہ۔۔۔۔" اس کی زبان لکنت کھا گئی۔

"فرمائیے۔ فرمائیے آپ اتنی زیادہ نروس کیوں ہو رہی ہیں؟ اچھا میں سمجھا شاید آپ ہکلاتی ہیں" اس نے افسوس کے ساتھ اپنی اوٹ پٹانگ رائے کا اظہار کیا۔

شیفتہ کے گلابی نرم رخساروں پر حیرت و غصہ کے ملے جلے تاثرات ایک لمحہ کے لئے نمایاں ہوئے پھر معدوم ہو گئے۔

اس نے مزید کہا۔ "کوئی بات نہیں آپ اندر تشریف لائیں۔ افسوس ہوا کہ آپ جیسی حسن کی شاہکار کے ساتھ خدا نے ناانصافی کی۔ خیر مجھ پر اثر نہیں ہوگا"

ان ذہنی جملوں نے اس پر پھر حیرت و استعجاب کا حملہ کیا۔ وہ باہر ہی کھڑی پس و پیش کے عالم میں تھی کہ رضوان کاپی کتابیں لئے دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"گڈ مارننگ مس!"

وہ جواب نہ دے سکی صرف خاموش مجسمہ میں حرکت ہوئی۔ اس شخص کے پیچھے ہٹتے ہی شیفتہ نے کمرے میں داخل ہو کر اپنے لرزتے وجود کو کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی مانند گرا دیا۔ اس نے ایک طویل گہری سانس لے کر رضوان کو پڑھانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کو حیرت تھی کہ اس شخص کے روبرو اس کی تمام قوت گویائی کیوں سلب ہو گئی۔ وہ بظاہر تو میگزین پر نظریں لگائے ہوئے تھا۔ لیکن اس کی بھرپور توجہ کا مرکز شیفتہ ہی تھی۔ جس کے لئے ہر گزرتا ہوا لمحہ برسوں کے مانند طویل لگ رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی الجھن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ احساس قرب کی تپش سے اس کا ریشمی جسم پسینہ کی بوندوں سے چمک رہا تھا۔

صبح کچھ نکھری نکھری سی تھی کیونکہ اس وقت تک آسمان پر سفیدی نمودار نہ ہوئی تھی البتہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی۔ موسم کی خوشگواری نے اس کے ذہن سے تمام تلخیوں کو محو کر کے اس کو خوش کر دیا تھا۔ سبزہ پر پڑے شبنم کے قطروں کی چمک کی طرح اس کا روپ دمک رہا تھا۔

رضوان کے گھر پہنچ کر اس کو معلوم ہوا کہ وہ شخص ابھی موجود ہے۔ اس نے واپس جانے کا تہیہ کر لیا ابھی وہ اٹھی نہ تھی کہ وہ شخص کسی شیطان کی طرح پھر نازل ہو گیا شیفتہ کے ہوش و حواس ہی باختہ ہو گئے۔ اب نہ جانے کیا آفت آئے یہ سوچتے ہی دل و دماغ میں خوف کی بجلی کوندی اور وہ سرتاپا پسینہ سے نہا گئی۔

آسمانی سے لباس میں وہ کوئی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کی والہانہ پیار بھری نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے اپنی ریشمی پھولوں والی چنری سے خود کو ہر طرف سے لپیٹ کر محفوظ کر لیا۔ اپنی توجہ رضوان کی جانب مبذول کی لیکن وہ کسی طرح بھی بولنے سے قاصر تھی۔ رضوان نے معصومیت سے دریافت کیا۔

"کیا بات ہے ٹیچر جی، کیا آج پھر آپ کی طبیعت خراب ہے؟"

شیفتہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر آپ خاموش کیوں ہیں؟"

شیفتہ کے جواب دینے سے قبل ہی وہ بول اٹھا۔ "ویسے [illegible]

بیٹھے شاید آپ کی مس ہکلاتی ہیں اسی لئے میرے سامنے بولنے سے گریز کرتی ہیں۔" لہجہ شوخ تھا اور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"نہیں تو" رضوان ہنسنے لگا۔ "یہ آپ کو کس نے بتایا میری مس آپ میرے ماموں جان کو بول کر بتائیں نا۔"

شگفتہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گئی، ہوں تو یہ رضوان کے ماموں ہیں اسی لئے اتنی بدتمیزی اور بے باکی سے سر پر مسلط ہیں۔ وہ طیش میں صرف اپنی مخروطی انگلیوں کو مروڑ کر رہ گئی "آپ اپنی کتاب پر نظر رکھیں۔" اس نے قدرے جھنجھلاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

شگفتہ کے بولتے ہی رضوان خوش ہوتا ہوا بولا۔ "آپ نے سنا ماموں جان میری مس بولی ہیں۔"

اس نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اُدہ میں نے تو سنا نہیں۔"

"رضوان" شگفتہ کی ڈانٹ پر رضوان نے کتاب پر نظر کر لی۔ شگفتہ نے کسی طرح مقررہ وقت گزارا اور اس طرح بھاگی جیسے شیر کو دیکھ کر بھیڑ بھاگتی ہے۔

آج پھر خلاف معمول وہ رضوان کی امی سے ملے بغیر ہی واپس چلی گئی تو اس کی امی کو فکر لاحق ہوئی۔ لیکن رضوان نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا۔ "ممی آج شاید پھر ان کی طبیعت خراب تھی مجھ کو پڑھایا بھی نہیں۔"

عاصیہ بیگم کی نظر کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھے اپنے شوخ طبع چھوٹے بھائی شہ زور خان پر پڑتے ہی ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ان کے جہاں دیدہ ذہن نے کچھ اور چغلی کی۔ وہ انہماک سے ماحول سے بے زار کسی کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا۔

"شہ زور۔"

"جی آپا جان!" اس نے چہرے کے سامنے سے اس طرح میگزین ہٹائی جیسے کہ کمرے کے ماحول سے وہ اب تک لاتعلق رہا ہو۔

تم نے تو شگفتہ سے کوئی شرارت نہیں کی۔" لہجہ پر تشویش تھا۔

"میں۔۔۔ نے۔۔۔۔ نہیں تو۔

"ارے ہاں یاد آیا" وہ بیچ میں ہی مخل ہوا۔ "ماموں جان نے میری مس کو ہکلا سمجھ لیا تھا۔ میں نے مس سے بہت بار کہا کہ بول کر بتا دیں تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ لیکن۔۔۔"

لیکن جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی عاصیہ بیگم بول اٹھیں۔

"شہ زور کیا رضوان درست کہہ رہا ہے؟" چہرے پر ناگواری تھی۔

"آپا جان" اس نے سر کھجایا۔ "دراصل۔"

"جب تک شگفتہ رضوان کو پڑھایا کرے تم کمرے میں نہیں جاؤ گے۔"

حکم صادر کر دیا گیا۔

"آپا جان پلیز اتنی سخت سزا نہ دیں۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے وہ کن خطرناک حالات سے دوچار ہے۔ وقت کے ظالمانہ شکنجوں سے وہ جکڑی ہوئی ہے۔ خدا ایسا وقت کسی دشمن پر بھی نہ ڈالے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟" وہ مجسم سوال بن گیا۔

عاصیہ بیگم نے شگفتہ پر گزرے تمام اذیت ناک و روح فرسا حالات کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا۔ ان کا ایک ایک جملہ شہ زور خان کے دل و دماغ کو اپنے نرغے میں لیتا گیا۔ اس شوخ و شریر خیالات کا دھارا محبت و چاہت کا دریا بن کر بہہ نکلا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کے مستحکم سائے لہرائے اور دل و دماغ پر قابض ہو گئے۔

شگفتہ تمام راستہ اپنی کم نصیبی اور حالات و وقت کی بے رحمی کے شعلوں میں سلگتی ہوئی گھر پہنچی۔ اس کو اپنی بے بسی پر بے طرح رونا آیا۔ لیکن کوئی انسان کر بھی کیا سکتا تھا۔ خدا نے جن دشوار گزار راستوں پر چلنے کے لئے اس کو مجبور کر دیا تھا۔ اس پر وہ آنکھ بند کئے چلی آ رہی تھی۔

ستم ظریف وقت نے ان کی پرسکون زندگی میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔ کنبہ کی کفالت کی خاطر اس کو سب کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

شگفتہ کا کنبہ کھاتے پیتے گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس کے والد کسی پرائیویٹ فرم میں دیانتدار افسر تھے۔ کنبہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ شگفتہ بی اے۔ بی ایڈ کرکے ایم، اے، کے پرائیوٹ ایگزام میں تھی۔ چھوٹا بھائی ہائی اسکول کر رہا تھا۔ ماں بھی نیک سیرت، نیک خو تھیں دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے۔ شاید فلک کو ان کی خوشی راس نہ آئی اور ایک رات شگفتہ کے والد پر فالج کا زبردست حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں کی تمام کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے اور ان معصوموں کو بے رحم زمانے کے حوالے کرکے ابدی نیند سو گئے۔ شگفتہ سب سے بڑی تھی سنجیدہ اور متین بھی تھی اس لئے گھر کے تمام اخراجات کا بوجھ اس کے ناتواں کاندھوں پر آ پڑا۔ غم و یاس سے جب اس کو مہلت ملی تو اس نے ایک نرسری اسکول میں سروس کر لی۔ لیکن لڑکی کی بڑھتی ہوئی جوانی کی مانند بڑھتی ہوئی مہنگائی نے اس کے حوصلے پست کر دیئے۔

اب اس کے سامنے ایک ہی چارہ تھا — وہ بچوں کے ٹیوشن بھی کرے۔ اس طرف جب قدم بڑھائے تو دوسرا مسئلہ درپیش تھا۔ کند ذہن والدین اپنے بچوں کو لڑکیوں سے انھیں کے گھر پر درس دلانا خلافِ شان سمجھتے ہیں۔ بہرحال کسی طرح چند کرم فرماؤں اور والدِ مرحوم کے کچھ خیرخواہوں نے اپنے بچوں کے لئے اس کو مدرس رکھ لیا۔ زیادہ تر بچوں کو وہ انھیں کے گھر پر جاکر ہی درس دیتی تھی۔ انھیں میں رضوان بھی تھا۔ شیفتہ کو رضوان کے والد بیٹی کی مانند ہی سمجھتے تھے۔ آج کے حادثہ نے اس کا ذہنی سکون چھین لیا تھا۔ وہ سوچ کر پریشان تھی کہ خدا نہ کرے کہ عزت پر حرف آئے ایسا ہوا تو کیا ہوگا؟ کیونکہ متوسط طبقہ کے پاس دولت و ثروت تو ہوتی نہیں۔ ان کا واحد سرمایہ و کل متاعِ حیات عزت ہوتی ہے۔ جس کی حفاظت وہ جی جان سے کرتا ہے۔

جب کئی دن تک وہ رضوان کو پڑھانے نہ گئی تو ان کی امی اس کے گھر چلی آئیں اور بہت پرخلوص طریقہ سے اصرار کیا۔ ان کی بے لوث محبت و خلوص کے آگے شیفتہ کو سرنگوں ہونا پڑا اور وہ پڑھانے جانے لگی اور ضرور جائے گی۔

اکثر ہی شیفتہ کا رضوان کے گھر پہونچتے ہی شہ زور سے ٹکراؤ ہوجاتا۔ شہ زور کے دیکھنے کا والہانہ انداز اس کے دل میں جذبات کا ہیجان برپا کردیتا۔ اس کی شوخ مسکراہٹ و پرمعنی جملوں کی تاب نہ لاکر وہ جلد واپس لوٹ آتی۔ لیکن ایسا کب تک ہوسکتا تھا یہ تو اس کی روزی روٹی کا سوال تھا۔ بھائی بہن کے درخشاں مستقبل کا مسئلہ تھا۔ اس نے اپنے پاگل دماغ اور بے قرار دل کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھائے اور پھر وہ اپنی منزل کی طرف مستحکم ارادے سے رواں دواں ہوگئی۔

تمام جدّ و جہد کے باوجود شہ زور کے روبرو جذبات و خیالات پر لگے قفل خود بخود کھل جاتے تو وہ اپنے کو ان کے پیچھے کمزور پاتی۔ اس کے زخمی وجود کو حالات کی مجبوریاں جکڑے سہی لیکن تھی تو وہ بھی انسان۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل تھا۔ جس میں لطیف و شیریں قوس و قزح کے رنگوں سے مزین جذبات تھے۔ آرزوئیں تھیں۔ وہ جیسے ہی تنہائی میں ہوتی شہ زور کے خیالات اس کے گرد میلا لگا لیتے اور پھر وہ اپنے گرد و پیش کو بھول کر اپنے آپ میں کھو جاتی۔ اس نے درخشاں مستقبل کے لئے خوش رنگ تمناؤں، دھنکی آرزوؤں اور لطیف جذبات کا ایک حسین محل تعمیر کرلیا۔ جس میں وہ تھی اس کا پیارا شہ زور تھا۔ جب دونوں کے پیار کے پودے میں ننھے مہکتے پھول کھلتے تو اس کی روح تک سرشار ہوجاتی۔

شہ زور خاں بجلی کے ہیڈ آفس میں اونچے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی تقرری اسی شہر میں ہوئی تھی۔ گھر نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنی بہن کے گھر قیام پذیر تھا۔ اس کی جب ملاقات ہوتی تو وہ حیران و پریشان کناروں پر کھڑی رہ جاتی اور اس کے جذبات کے سمندر میں جوار بھاٹے آنے لگتے۔ ہر ملاقات کے اختتام پر شیفتہ اپنے خوابوں کے محل کو بے شمار آرزوؤں کے دفینوں سے پختہ کردیتی۔

عاصیہ بیگم بھی شیفتہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھیں۔ جب شہ زور نے اپنا عندیہ ظاہر کیا کہ وہ شیفتہ کو اپنی دولہن بنانا چاہتا ہے تو ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا پہلی فرصت میں ہی وہ شیفتہ کی امی کے پاس پہونچ گئیں۔

"بھابی جان میں آپ سے ایک انمول ہیرا مانگنے آئی ہوں۔ لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔ رخسار دل پرمسرت و شادمانی کا عکس نمایاں تھا۔

"کیوں مذاق کرتی ہو دولہن میرے پاس ہیرے کہاں؟ ہیرے تو امیروں کے پاس ہوتے ہیں۔"

"نہ بھابی جان ہیرے اور امیروں کے پاس ان کے پاس تو سجے سنورے بے نوا پتھر ہوتے ہیں۔ ہیرے تو ہم غریبوں کی کٹیا میں روشن رہتے ہیں۔ میں آپ سے وہی ہیرا مانگنے آئی ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں دلہن۔" وہ چونکیں۔

"میں نے کوئی مشکل بات نہیں کہی۔ دراصل میں اپنے بھائی شہ زور کے لئے شیفتہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔"

شیفتہ کی امی پر تاریکی کا ایک دور آکر گزر گیا۔ "بیٹی یہ ممکن نہیں۔" آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"بھابی جان آپ فکر نہ کریں شیفتہ میرے لئے بیٹی کی طرح ہے میں جہیز کا قطعی مطالبہ نہ کروں گی۔ مجھے آپ صرف شیفتہ کو دے دیں۔"

وہ عاجزی اور انکساری کے پیکر میں ڈھل گئیں۔

"ناممکن کو ممکن نہیں بنایا جاسکتا۔" وہ بڑبڑائیں۔

"کیوں؟" حامدہ بیگم کی ابرو تن گئے۔ "میرے بھائی میں کس بات کی کمی ہے اللہ کے رحم و کرم .....؟"

انھوں نے جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔ "تم نہیں سمجھو گی دلہن ہمارے کنبہ کی پرورش کی تمام ذمہ داری صرف شگفتہ پر ہے۔ اس کے بغیر اس گھر کا خرچ ....؟"

"جب ہی رہیں بھابی، کیا اس کی کمائی کی خاطر اس کا گھر نہ بسائیں گی۔ اس کے ارمانوں کو خاکستر کر دیں گی۔ اللہ سے توبہ کریں جوان کو بٹھائے رکھیں گی؟"

"دلہن ہماری غیرت و ضمیر کو نہ للکاریئے۔ مجھ کو اپنی مطلق فکر نہیں۔ چھوٹے بچوں کے مستقبل کی فکر ہے۔ میں مجبور ہوں کہ یہ رشتہ نہ ہو سکے گا۔" ان کے لہجہ سے گہرا عزم جھلک رہا تھا۔

"آپ غیرت و ضمیر کی آڑ سے اپنی خود غرضی کو پوج رہی ہیں۔ اس کے مستقبل پر آپ کی نظر نہیں ہے۔ آپ غور کر لیجئے شگفتہ کے دل میں بھی شہ زور کے لئے نرم گوشہ ہے۔ انجام کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔" وہ غصہ سے پیر پٹکتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

شگفتہ کے ہوش و حواس پر ماں کے الفاظ بجلی بن کر گرے اور سب کچھ جلا گئے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ماں کی محبت میں تضاد کیسا؟ دوسرے بچوں کی محبت کو کیوں فوقیت دی جا رہی ہے؟ کیا بڑا ہونا گناہ ہے یا پھر وہ ان کی محبت و توجہ کی حق دار نہیں۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ خود غرضی کے اندھیروں میں اس کے وجود کو اس طرح غرق کر دیا جائے گا۔ وہ تڑپ کر بے اختیار ہچکیوں اور سسکیوں سے رو دی۔ شاید زندگی کی تمام رعنائیاں اس کے لئے نہ تھیں۔ اس کی زندگی کی حاشیہ آرائی ہو گئی تھی اور ان حاشیوں کو توڑ کر آگے نکلنا اس کے بس میں نہ تھا۔ ابھی وہ بستر پر پڑی دھڑکنوں اور روح کے درد و غم کو کم نہ کر پائی تھی کہ اس کی امی آ گئیں۔ وہ اس کے حالِ زار کو دیکھ کر سہم گئیں۔

"بیٹی"

اس نے ملامت کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ امی ... آپ ... آپ۔ خدارا مجھ کو تنہا چھوڑ دیں۔ مجھ کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ میں تو بھول سے سمجھ بیٹھی تھی کہ میں بھی انسان ہوں۔ میں تو ذمہ داری اٹھانے کی ایک مشین ہوں جس کو جذبات و محبت سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کو تو صرف تیل اور پانی چاہیئے۔"

"میری بچی مجھ کو تیری پریشانیوں اور غموں کا احساس ہے لیکن اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے سوچو۔ اس کے بعد تو تم آزاد ہو گی میں خود تم کو اپنے ہاتھوں سے دلہن بناؤں گی۔"

"اگر آپ مجھ کو دلہن بنائیں گی پھر آپ کا کیا ہوگا۔ آپ کس کے سہارے جئیں گی؟" لہجہ تلخ تھا۔

"بیٹی" وہ گھبرا گئیں۔ آنکھوں میں آنسو چھل اٹھے۔

"آپ پریشان نہ ہوں امی۔ خزاں رسیدہ چمن سے سوکھے پھول اور پتے چننے کون آئے گا۔ آپ کچھ نہ سوچیں میں اپنے وجود کو بھول گئی ہوں میں، میں نہیں رہی امی۔ ہمارے لئے اب دنیا کی رنگینیاں نہیں ہیں۔ اب میں ..... میں آج سے کبھی رضوان کو ٹیوشن پڑھانے نہ جاؤں گی۔"

• سلسلہ پسندیدہ اشعار صفحہ ۲۴۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

مرسلہ: شاداں جمال (کرسی۔ لودہ)

گلشن زیست میں کتنی ہی بہاریں آئیں
اپنا دامن ہے کہ پھولوں کو ترستا ہی رہا

مرسلہ: تبسم عارف (مرود۔ جنجیرہ)

دل کو ہے ضد کہ فقط شعلوں میں جلنا سیکھو
عقل کہتی ہے کہ گلشن ہے مقدر تیرا

مرسلہ: شہناز پروین (باڈی۔ بیتاپو)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی ہر ماہ ایک ایسی مفت خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی اور غمی سے متعلق ہو خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھکر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجیں کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ ۲۰ کے بعد ملنے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے چھپتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• انجم، سمیعہ، دردانہ "شبانہ (آمبور) ہماری آپی عشرت آرا اور بھائی جان نثار احمد کو اللہ پاک نے دس سال کی طویل مدت کے بعد ۱۸ اگست ۸۳ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔

• نجمہ انصار (بھٹکل) میری چھوٹی بہن عشرہ خانم اور بہنوئی محمد یوسف کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۶ ستمبر ۸۳ء بروز جمعرات ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ نومولود عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

• مہر نگار (بنگلور۔ کرناٹک) میری بہن ماہ جبیں اور بہنوئی عتیق الرحمٰن کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۰ اگست ۸۳ء بروز جمعرات بوقت صبح ۵ بجکر ۴۰ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام شہباز عرشی رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور فخر ملت بنائے۔

• نغمہ سلم، عارفہ حسن، ہلال فاطمہ، زیبا حسن، حجاب فاطمہ، عطا فاطمہ، نماد فاطمہ، عصمہ حسن (بھاگلپور) ہمارے چچا ابو محمد شاہ رہنما مجید ڈی۔ ایس۔ پی بہار و چچی امی انجم افشاں کو اللہ پاک نے ۵ مارچ ۸۳ء بروز جمعہ بوقت ۹ بجے شب، پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی۔

• عائشہ آصف، عابدہ (کٹک) میری پھوپی رابعہ لطیف و پھوپھا ڈاکٹر سید فضل امین صاحب کو اللہ پاک نے ۸ ستمبر ۸۳ء کی شام کو ۵ بجکر ۵ منٹ پر دوسری بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد ذوالفقار عظمی رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر

خاندان بنائے۔

• وحیدہ ناز (عمرآباد) میری باجی زبیدہ شبنم اور دولہا بھائی نیاز احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۱۶ اگست ۸۳ء کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام ریحان رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ نومولود عمر دراز پائے اور فخر ملت بنے۔

پیغامات نشاط

• شمیمہ نشاط (دھنباد) میری اکلوتی چچازاد بہن شاہینہ ظفر اور چچازاد بھائی سید نظام الحسن (دختر و پسر سید ظفر حسن صاحب چک عبدالغنی) کی شادیاں، جناب سید محمد عثمان، بجھری کے پسر سید اقبال حسین اور دختر شاہدہ عثمان کے ساتھ بالترتیب ۸ جولائی اور ۱۲ جولائی ۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پائیں۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ دونوں جوڑیاں ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• ڈاکٹر سلمان عباسی صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی) کی شادی کے سلسلہ میں ۲۴ ستمبر ۸۳ء کی شام کو ایک شاندار دعوت ولیمہ ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ موتی لال بوس روڈ پر دی گئی جس میں اکابرین شہر کے ساتھ ہی شعراء اور ادبا نے بھی شرکت کی۔ میں محترمہ والدہ صاحبہ سلمان عباس اور عرفان عباسی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• چودھری شرف الدین صاحب کی صاحبزادی کشور سلطانہ کی شادی شکیل سلمہ فرزند جناب حکیم فخرالدین صاحب۔ باندہ) کے ہمراہ ۱۵ ستمبر ۸۳ء کی شام کو نعمت اللہ بلڈنگ لکھنؤ میں بصد تزک و احتشام عمل میں آئی۔ بیگم و چودھری شرف الدین صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اللہ پاک کشور و شکیل کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ (نسیم انہونوی)

• کے لبنیٰ مریم (مدراس) میری آپا تحسین فاطمہ صاحبہ (بنت امین الرحمٰن صاحب) کا نکاح پُرفلاح برخوردار شفیق احمد سلمہ (ابن جناب محمد سعید احمد اقبال) کے ہمراہ ۵ اگست ۸۳ء کو بمقام آمبور انجام پایا۔ اللہ پاک میری آپا اور نوشے بھائی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• مہ پارہ صبا (حنیفہ منزل۔ بھاگلپور) میرے بھائی اوصاف احمد (پسر اقبال صاحب) کی شادی نورالصباح بانو (دختر جناب اختر سراج احمد) کے ہمراہ ۲۴ جولائی ۸۳ء کو بہپوری بڑا گاؤں میں اور

• مہ پارہ صبا (بھاگلپور) میرے بھائی اوصاف احمد اور بہن زیبا جبیں (پسر و دختر اقبال صاحب) کی شادیاں ہمراہ نورالصباح بانو (دختر جناب اختر سراج احمد)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں سنجیدہ اور معیاری ہو اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجا گیا ہو کہ جس ماہ میں شائع ہوتا ہو، اس سے پہلے ماہ کی ۰۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جائے۔

نومبر کے لئے عنوان ہے "نثار" اور دسمبر کے لئے "ندامت"

پھول ہی پھول کھلیں گلشن ہستی میں تری
میری راہوں میں سدا خار بچھانے والے

مرسلہ:۔ شمونہ روحی (حیدر آباد)

سیر کی خوب بھرے، پھول چنے شاد رہے
باغباں جاتے ہیں، گلشن ترا آباد رہے

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لال باغ۔ لکھنؤ)

نہ گل اپنا نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

مرسلہ:۔ خالدہ بلدسے (مہسلہ۔ رائے گڑھ)

مرسلہ:۔ شہناز یوسف احمد (ترچی)

شباب و شوق کے گلشن ہو تم بہار ہوں میں
تمہارے عیش و محبت کی رازدار ہوں میں

مرسلہ:۔ پروین فاطمہ لاری (اجا جمنو۔ کانپور)

الٰہی باغباں خدارا، گلشن میں نصب کر دے
ہلکی سی چاندنی میں پھولوں کا شامیانہ

مرسلہ:۔ شہناز یوسف احمد (ترچی)

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

مرسلہ:۔ ب۔ ن آنسہ ابراہیم (بنگلور)

مرسلہ:۔ نیلوفر (پٹنہ)

مرسلہ:۔ امروز جہاں (ملکی محلہ۔ آرہ)

مرسلہ:۔ رضوانہ سیف (کھیتا سرائے بارہ بنکی)

امید کی کلیاں یہاں کھلتی ہیں شب و روز
دل میرا ہے گلشن کی طرح، بن تو نہیں ہے

مرسلہ:۔ نجمہ افضار (جبلپور)

دیکھ جا آ کے مہکتے ہوئے زخموں کی بہار
میں نے ابتک ترے گلشن کو سجا رکھا ہے

مرسلہ:۔ اے ریحانہ تبسم (داماباڈی)

دل ہے ایک ہی لیکن نام دل بدلتا ہے
بچ گیا تو گلشن ہے، لٹ گیا تو صحرا ہے

مرسلہ:۔ حمیدہ صبا (آمبور)

گلشن کو بہاروں نے اس طرح نوازا ہے
ہر شاخ کے کاندھے پر کلیوں کا جنازا ہے

مرسلہ:۔ ثمینہ شاہین (آرا۔ بہار)

جب سے کوئی بچھڑ گیا، گلشن دل اجڑ گیا
آئے نہ اب بہار بھی کہہ دو کوئی بہار سے

مرسلہ:۔ سیدہ تنویر فاطمہ بیگم قادری (بھوپال)

لوٹے گئے دانستہ ہمارے ہی نشیمن
گلشن کے نگہبان ہمیں یاد رہیں گے

مرسلہ:۔ قرۃ العین (ستدیال)

گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

مرسلہ:۔ بی نسرہ بانو (پرنام بٹ)

بہار آئی ہے گلشن میں عنادل چہچہاتے ہیں
اگر ہیں پھول خندہ زن تو غنچے مسکراتے ہیں

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (جمشید پور)

آتی ہے تو کانٹے بھی دعا دیتے ہیں اسکو
جاتی ہے تو گلشن کو رلا جاتی ہے خوشبو

مرسلہ:۔ صدیقہ ہری (آمبور)

مرسلہ:۔ دی تنصیرہ تبسم طیبہ سلطانہ (آمبور)

مسل کلیوں کا ماتم بہت ہو چکا، کھلتی کلیاں چھپانے کی کوشش کرو
برق چمکی ہے کالی گھٹاؤں سے گر، اب تو گلشن بچانے کی کوشش کرو

مرسلہ:۔ نسرین بانو (بیتیا۔ بہار)

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن، جو دامن میں نہیں

مرسلہ:۔ خدیجہ زیبی (الہاب گنج۔ ہزاری باغ)

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

تھے۔ کیا دو دن کی فرقت گراں گزر رہی ہے؟ خفگی کا یہ اظہار واللہ تیور ہی انداز نرالا ہے۔

"اپنے چاہنے والوں کی جدائی شاق تو ضرور گزرتی ہے لیکن میں اتنی جرأت نہیں کر سکتی کہ خنجر دکھا کر اظہار ناراضگی کروں۔ تم ہمارے لیے انسان کے روپ میں فرشتہ ہو اور ہم کم ظرف نہیں ہیں۔"
شبینہ نے جواب دیا۔

"تب پھر ہمیں بتا کہ ہمارے اور تیرے درمیان یہ ہتھیار کیوں آیا تو خود ہی معمہ پیش کرتی ہے خود ہی حل کرتی ہے۔ اب اس سلسلے میں بھی ہم حقیقت جاننے کے منتظر ہیں۔"

"حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے شاہ ہند۔"

لفظ شاہ ہند پر ابوبکر شاہ کھل جایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خوشدلی سے بولا۔ "ہم جانتے ہیں مگر تیری زبان سے وہ تلخی شیرینی میں بدل جائے گی۔ بتا ہم منتظر ہیں۔"

"ابوبکر شاہ۔! میں شکر گزار ہوں اس اعتماد کے لیے جو تم نے غلامان فیروزی پر کیا ہے۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ ناصر الدین محمد بہت جلد میوات پہونچ رہا ہے ہزاروں کا لشکر لے کر۔ تم نے ہم لوگوں پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ ہم اپنی جان دے کر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ خنجر تمہارے قدموں میں اس لیے رکھا ہے کہ تم بہادروں کی طرح مقابلہ کرو ہمارے خنجر ہماری تلواریں اب تمہاری ہیں۔ یہ تمہارے اشارے پر دشمنوں کو کاٹ کر رکھ دیں گی۔ میری اس ادنیٰ نذر کو شرف قبولیت بخش کر غلامان فیروز شاہی پر ایک احسان اور کر دو۔"

(باقی آئندہ)

وہ نرم لہجہ میں بولا۔

"تیری باتیں ہمیں پسند آئیں تیرا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ تو آرائش دنیا کی شے سے بے نیاز ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ پھر بھی تیری ذات نے ہمیں متاثر کیا یعنی تجھ میں کوئی خاص بات ہے ضرور۔ اس کا بھی اظہار کر دے ہمیں ذہنی خلجان پسند نہیں ہے۔"

"میں وہی نوجوان ہوں جس کی تلوار بازی کی مہارت نے آپ کو کل اتنا متاثر کیا کہ آپ بذات خود مجھ سے ملنے کی خواہش کر بیٹھے۔ داد و ستائش کی خاطر آپ نے مجھے اس وقت یاد فرمایا تھا۔"

ابوبکر شاہ مسند چھوڑ کر کھڑا ہو گیا حیرت سے اس کی آنکھیں شبینہ کو تک رہی تھیں اور چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور شبینہ پر محبت بھری نظر ڈال کر بولا۔ "کیا واقعی یہ حقیقت ہے جو تو نے بیان کی ہے۔؟"

"کذب و افترا میری سرشت میں نہیں ہے۔ آپ ایسا پھر میرا امتحان لے سکتے ہیں۔ میرے ماں باپ نے مجھے علم کی وہ دولت دی ہے جو لازوال ہے۔ انھوں نے مجھے فنون حرب میں باکمال کیا، مشہور شاعر اور عالم اعزاز الدین خالد خانی نے حکمت طبعی، ملل اور شعر و شاعری میں یکتا بنایا دینی علوم سے بھی آگاہ کیا گیا۔ فیروز شاہی غلاموں کی لڑکیوں کے چہرے پر انھیں علوم کی روشنی کا نور ہوتا ہے۔ اسی نور نے آپ کو متاثر کیا اور غلامان فیروز شاہ کی لڑکیاں اپنے ان علوم و فنون پر ہمیشہ فخر کرتی رہی ہیں جو انسان کو صاحب کردار اور قدر شناس بناتے ہیں۔ میرا پندار بھی حسن پر نہیں ہے اپنے علم پر ہے۔"

ابوبکر شاہ اس کے حسن سے مسحور ہوا اس کے کلام سے مبہوت ہوا اور اس کے فنون حرب سے متاثر ہوا اور علمی قابلیت سے مرعوب ہوگیا۔ ایک لڑکی حسن وجمال علوم، فنون اور کلام میں اس قدر بے مثال ہوگی اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"آپ کچھ متردد معلوم ہو رہے ہیں؟" شبینہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہونا ہی چاہیے۔" ابوبکر شاہ کھوئے کھوئے لہجہ میں بولا۔ "تو کیا نہیں ہے تو سب کچھ ہے۔ ایک انسان ہے ایک لڑکی ہے مگر حرم کی خلوت میں نازک ادا اور مہنج دوشیزہ ہے۔ محفل میں شیریں بیان حسینہ اور شاعرہ ہے بکھتے دلوں کے لیے مسیحا صفت خاتون ہے۔ سنجیدہ اہل دانش کے سامنے تو عالمہ ہے اور میدان جنگ میں بہادر سپاہی ہے۔ واللہ! تیری خوبیاں بڑی مختلف النوع اور کشش انگیز ہیں۔ ہمیں یقین ہے ناصر الدین کے کم ظرف سپاہیوں سے بچ کر ہم تک آنے میں تیرا کوئی ایک فن ضرور کام آیا ہوگا۔"

شبینہ کے چہرے پر درد وغم پھیل گئے، آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر ڈھلک آئے۔ ابوبکر شاہ اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور اس کی ٹھوڑی ہاتھ سے اٹھا کر بولا۔ "تیرے اشکوں نے ساری داستان کہہ سنائی تو جس عظیم دولت کو کھو کر آئی ہے وہ تو ہم تجھے نہیں دے سکتے لیکن یہ یقین ضرور دے سکتے ہیں کہ ناصر الدین سے ان ظلموں کا حساب ایک دن ضرور لیا جائے گا۔ آج ہم شکست خوردہ ہیں پسپا ہیں مگر کل ہمارا ہے۔ ناصر الدین تغلق اپنے ظلم کے دھارے میں خود ہی بہہ جائے گا۔ تو اپنی آنکھوں سے اشکوں کی جھلکن ہٹا دے اور ظلم کا انجام

اور دائمی مسکراہٹ بڑی دلنواز تھی۔ آدم خاں سر سے پیر تک کانپ گیا۔

دو دن سے ابوبکر شاہ میوات سے باہر تھا۔ تیسرے دن شبینہ کو پتہ چلا کہ وہ واپس آگیا ہے۔ سہ پہر کے قریب شبینہ نے اپنی کنیز کو ابوبکر شاہ کے پاس بھیجا کہ وہ ملاقات کی خواہش مند ہے۔ ابوبکر شاہ کو اس خواہش پر حیرت ہوئی کیونکہ شبینہ کبھی خود سے اس کے پاس نہیں آتی تھی۔ وہی اس کی محلسرا میں جاتا اور دنیا جہان کی باتیں کرکے واپس آجاتا۔ شبینہ کی سنجیدگی، رکھ رکھاؤ اور علمی گفتگو نے ایک حد قائم کر رکھی تھی۔ اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے ایک قدم بھی آگے بڑھائے۔ وہ شبینہ کے سامنے پہنچ کر معمول بن جاتا تھا۔ جو عامل کے اشاروں پر چلتا ہے۔

شبینہ کے پیغام کے جواب میں اس نے کنیز کو پھول اور خوشبو دے کر بھیجا کہ یہ ہماری طرف سے دینا اور کہنا کہ ہم شب کے پہلے پہر میں تیرے منتظر رہیں گے۔

ایک پہر رات گزرتے ہی شبینہ ابوبکر شاہ سے ملنے کو چل پڑی تھی اس نے آسمانی رنگ کی کرتی اور ٹخنوں پر سے تنگ پیزار پہن رکھی تھی روپہلی جالی کا دوپٹہ۔ اس کے ہاتھ میں ایک مرصع خنجر تھا۔ ابوبکر شاہ کے سامنے پہونچ کر اس نے جھک کر کورنش پیش کی اور خنجر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس نے حیرت اور تعجب سے شبینہ کو دیکھا اور پھر خنجر پر نظر ڈال کر بولا "آج حسن کے انداز تیرے قاتلانہ ہیں۔ کیا ہم سے کوئی خطا ہوگئی ہے۔ ہم تو تیری آمد ہی پر متعجب

دیکھنے کو تیار ہو جائے"

"میں جانتی تھی کہ میں مستقبل کے ایک منصف اور عادل بادشاہ کے سایہ میں پہونچ رہی ہوں۔ جو وفا کی قدر و قیمت سے واقف ہے۔"

ابو بکر شاہ مسکرایا اور شبینہ کا ہاتھ تھام کر محبت سے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور پھر اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر شبینہ کی انگلی میں پہنا کر بولا "آج کی اس ملاقات نے ہمیں بے حد مسرور کیا ہمارے دل میں تو نے بہت جلد جگہ بنا لی ہے آج کی ملاقات کو ہم اس آرسی سے یادگار بنا رہے ہیں۔"

شبینہ دھیمے سے ہنسی اور بولی "اس یادگار کا نام میں نے "لمعہ" رکھ دیا ہے کیونکہ اس نے مجھے زینت بخشی ہے۔"

"خوب - بہت خوب" ابو بکر شاہ تعریف کے اس انداز پر کھل اٹھا۔

شبینہ نے واپسی کی اجازت لی اور دروازے کی طرف مڑ گئی ابو بکر شاہ کی پر محبت نگاہیں اب تک اسی پر جمی ہوئی تھیں

سامانہ کے حکمراں شہزادہ ہمایوں خاں کے پاس دہلی کی ایک نامی گرامی طوائف فیضی بیگم کا قاصد پہونچا۔ جس نے ایک عریضہ حکمراں کی خدمت میں پیش کیا جس میں تحریر تھا کہ "میں آپ کی خدمت میں ایک ایسا بیش بہا ہیرا پیش کرنا چاہتی ہوں جس کے ہر پہلو سے ایک نیا رنگ پھوٹتا ہے۔ جس کے حسن کو دنیا کی کسی چیز سے تشبیہہ نہیں دی جا سکتی نہ چودھویں کے چاند سے کہ اس میں داغ ہے نہ گلاب سے کہ اس میں خار ہیں نہ ستاروں سے کہ آگ ہیں۔ وہ تو بند سیپ کا وہ نرم و نازک آبدار موتی ہے جسے ابھی تک انسانی آنکھ نے نہ دیکھا ہو جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی سفید

اور اس نے فیروزی غلاموں کے اونچے منصب داروں سے شاہی اعزازات، ہاتھی اور گھوڑے چھین کر اپنے امراء میں تقسیم کر دیے ہیں اور ان منصب داروں کو تہ تیغ کروا دیا ہے۔ اس کے علاوہ سامانہ کا حکمراں اپنے بیٹے ہمایوں خاں کو مقرر کیا ہے اور اب وہ کثیر فوج لے کر ابو بکر شاہ اور بچے کھچے فیروزی غلاموں کو نیست و نابود کرنے کی سوچ رہا ہے۔ ابو بکر شاہ تک پہونچنے کے لیے وہ پہلے سامانہ میں چند روز قیام کرے گا اور پھر وہاں سے مزید فوج لے کر میوات پہونچے گا۔ تم جانتی ہو کہ میرا باپ فیروز شاہی غلام تھا لیکن میں اپنی ماں کی طرف سے دوسرا نسب رکھتا ہوں اور اسی بنا پر میں اس انتقام کی زد سے بچا ہوا ہوں۔ لیکن موجودہ اعزاز و اکرام پانے کے باوجود میں تو شبینہ کے مجرم کو معاف نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم سے رابطہ رکھوں گا تمام حالات سے آگاہی میں دوں گا لیکن چال بہر صورت تمہیں ہی چلنی ہوگی۔"

شبینہ یہ ساری تفصیل پڑھ کر بے ساختہ ہنس پڑی۔ آدم خاں حیرت سے بولا۔ "کیا ہوا اسلام خاں نے کوئی مضحکہ خیز بات لکھ دی ہے کیا؟"

"نہیں - وہ چونک کر بولی۔ زمانے کے پردے پر ایک نیا تماشہ دیکھنا جب وہ تڑپیں گے اور ہم تڑپائیں گے اب تو جا میں جلد ہی تجھے پھر بلاؤں گی اب تیرا کام صرف یہ ہوگا کہ میوات میں جمع شدہ اپنے گروہ کے لوگوں کو متحد رکھ اور ان سے کہہ کر اپنی تلواروں کو آب دے لیں۔ شبینہ نے مسکرا کر آدم خاں کو دیکھا اس کی

اور اس کا بدلہ لینا چاہیے گا؟"

"میں حکومتوں اور حکمرانوں کے ساتھ عوام کے اس عروج و زوال کا عادی ہوں البتہ اگر تو کہے تو آگ کے سمندر میں کود پڑوں"۔ وہ صفائی سے بولا۔

"جب کسی مقصد میں خود غرضی شامل ہو جاتی ہے تو اس میں کامیابی ملنے کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ شبینہ نے سنجیدگی سے کہا۔ کیا تو کچھ دن اور اپنے دل اور جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا؟"

"لیکن ہر انسان اپنی خدمات کا صلہ تو چاہتا ہی ہے!" وہ بولا۔

"بعض حالات میں صلہ فوراً ہی نہیں ملتا۔ اس کے لیے صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ وقت اس کا صلہ خود دیتا ہے"۔ شبینہ نے سمجھایا۔

"تب ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر لوں گا۔ فی الحال تیری مسکراہٹ ہی کا تحفہ سہی۔ مجھے کیا کرنا ہوگا۔؟"

شبینہ چند لمحے خاموش رہی وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی پھر آہستہ سے سر اٹھا کر بغور آدم خاں کو دیکھا اور بولی: "سامانہ جا کر اسلام خاں سے مل اور دہلی کے حالات معلوم کر کے آ۔ لیکن رازداری شرط ہے"۔

اگلے روز آدم خاں جب شبینہ سے ملا تو ایک حیرت انگیز خبر لے کر آیا۔ ناصرالدین شاہ نے اسلام خاں کو وزیرالممالک مقرر کر دیا ہے اور اس پر کافی اعتماد کرنے لگا ہے اور اسلام خاں اب مستقل دہلی ہی میں سکونت پذیر ہے۔ اسلام خاں نے ایک رقعہ شبینہ کے نام بھیجا تھا جس میں تحریر تھا کہ ناصرالدین کے انتقام کا سلسلہ ابھی جاری ہے

نور بن کر آپ کے دل کی دنیا کو منور کرے گی۔ اجازت مرحمت فرمائیں تو خود لے کر حاضر ہو جاؤں"۔

رنگین مزاج شہزادہ حظ حسن کر بے تاب ہو گیا۔ فیضی کی طرف سے نوشینہ کے حسن و جمال کو اس قدر دلفریب پیرایہ میں بیان کیا گیا تھا کہ شہزادے کا دل مچل مچل گیا۔ وہ اس شوخ و شنگ پری پیکر سے خیالوں ہی میں باتیں کرنے لگا۔ اس کے پرکیف وجود سے اپنی خلوت کو آباد کرنے کا خیال ہی اس کی عاشق مزاجی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ منتخب روزگار حسن کا مالک بن جائے گا اس کا دماغ مستقل رنگین فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔

اس نے فراشوں کو حکم دیا کہ محلسرا کی آرائش و زیبائش نئے سرے سے کی جائے۔ حکم کی دیر تھی خدام کام میں لگ گئے دیواروں پر اطلس و کمخواب کے پردے لگے۔ منقش چھت پر آبی فانوسوں میں رنگین شمعوں سے ماحول کو ہفت رنگ اور فسوں خیز بنا دیا گیا۔ ٹھوس چاندی کے تخت کو سرخ مخملی پلنگ پوش سے آراستہ کیا گیا جس کے سرہانے اور پائینتی موتیوں کی جھالریں زمینوں کو چھو رہی تھیں۔ اور زر بفت کی چھت گیری کا سنہرا عکس مخمل میں آگ لگائے ہوئے تھا۔

شہزادہ ہمایوں خاں محلسرا کا بناؤ سنگھار اور سجاوٹ دیکھ کر بن پیے مست ہونے لگا۔ فیضی کے پاس قاصد پہنچا کہ اس عجوبۂ روزگار حسن کو حاضر کیا جائے۔ شہزادہ بہت بے چین ہے۔

نوشینہ شہزادے کی بے تابی اور بے چینی کو سن کر مسکرائی اور فیضی بیگم نے اس کی پشت تھپ تھپا کر کہا "میں نے اپنے فن کا کمال تجھے بخش دیا ہے اب میرا کام ختم ہوا بس آخری ہدایت یہ ہے کہ تو

سے وفاداری کا عہد کر چکی ہوں۔ اس کو نبھانے کے لیے خواہ جان پر کھیلنا پڑے۔ مجھ پر اعتماد کیجئے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ابوبکر شاہ بے تاب ہو گیا۔

شبینہ نے اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اور پھر بولی "میں عالم موجود سے قطعی متاثر نہیں ہوتی کیونکہ میں خود کو عام لڑکیوں سے علم، عقل اور حسن میں برتر سمجھتی ہوں۔ میرے اسی پندار نے آپ کو چونکایا تھا اور اسی پندار نے میرے دل میں تمہیں جگہ دی ہے۔ وہ پہلی بار اس سے تم سے مخاطب ہوئی۔ ابوبکر شاہ تم اگر یقین کر سکو تو کہہ دوں کہ میری ذات کبھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا جرم نہیں کرے گی۔ تمہاری محبت کو شرمندہ نہیں کرے گی۔"

ابوبکر شاہ اس کی اس گفتگو سے دیوانہ ہو اٹھا اس نے وارفتگی سے اس کے دونوں گال اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اپنا سر شبینہ کے سر سے لگا دیا اور بولا "مجھے ہر اس بات کی اجازت ہے جس سے فیروز شاہی غلاموں کے دلوں پر پڑے زخموں کا اندمال ہو سکے۔"

شبینہ کے چہرے پر شفق سی پھوٹ آئی۔

صبح سویرے شبینہ نے آدم خاں کو طلب کر لیا جو خود بھی شبینہ پر فریفتہ ہو چکا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا آیا۔ تخلیہ میں شبینہ کا اسے بلانا اس کے لیے اور بھی فرحت افزا تھا۔ شبینہ نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔

"سچ بتا کیا تو اس گروہ پر ہونے والے ظلم و ستم پر افسردہ ہے؟

شاہی محلات جا رہی ہے ہر قدم سنبھل کر اٹھانا ان گلیوں میں اپنا مقصد پانا سمندر میں سے موتی نکالنا ہے۔"

دوسرے روز فیضی بیگم نوشینہ کو لے کر سامانہ پہونچ گئی۔ چند سپہر آرام کر کے سر شام ہی سے اس نے نوشینہ کا سنگھار شروع کر دیا اور جب مکمل سنگھار کے بعد فیضی نے اسے دیکھا تو مبہوت رہ گئی۔

رات آئی تو بلاوا آیا۔ حسن کی سجاوٹ کے سارے ہتھیاروں سے لیس کر کے نوشینہ کو شہزادے کی محلسرا میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں شہزادہ ہمایوں خاں بہت بے چینی سے ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے سامنے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا نوشینہ کے سنہری بالوں میں ریشمی جوبات پر موتیوں کا کام بنا ہوا تھا۔ شہزادے کی آنکھیں زلفوں کے سنہرے جال سے نکلیں، باریک نقاب میں چھپے بدلی کے چاند سے چہرے کی بلائیں لیں، جھلمل کرتے لباس میں سے جھلکتے بدن پر نظر بن پھسلیں اور پھر مہندی رچے نازک پیروں کی پازیب تک پہنچ کر حسن کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گئیں۔ نوشینہ خود اس کی نگاہوں کو پڑھ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر بڑی قاتل مسکراہٹ تھی۔

"شہزادے۔ کیا بیٹھنے کو بھی نہیں کہو گے؟" وہ ادا سے دوسری طرف گھوم گئی اور شہزادے کی دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی وہ آگے بڑھا اور نوشینہ کا ہاتھ تھام کر بولا "صرف حسین ہوتیں تو حسن مجسم کہہ کر تعریف کی جاتی مگر تیرے تو ہر پہلو سے ایک نیا رنگ پھوٹتا ہے۔ ہم تیری تعریف کو مبالغہ آمیز سمجھے تھے لیکن اب سوچ رہے ہیں کہ کس کس چیز کی تعریف کی جائے، تجھے دیکھ لیا مگر نظریں پیاسی کی پیاسی ہی رہیں۔ سچ بتا کیا اس

دنیا کی مخلوق ہے یا جنت سے اتاری ہوئی کوئی حور ــــ؟"

نوشینہ نے اپنی نازک سی ناک چڑھائی اور چہرہ کا نقاب ذرا سا سرکا کر کہا "شہزادے! جنت میں بھی مجھ سے زیادہ حسین حور نہ پاؤ گے۔"

شہزادہ زور سے ہنسا "خوب ـ! غرورِ حسن اپنے عروج پر ہے لیکن اس وقت ہمیں یہ غرور ہی پیارا ہے۔ آؤ ہمارے قریب آؤ ہم ہی اس بے پناہ حسن کے ناز انداز اٹھا سکتے ہیں۔ ہم سا قدر دان بھی کوئی نہ ملے گا۔"

نوشینہ کی نگاہوں میں اسلام خاں کا وجیہہ سراپا گھوم گیا۔ مردانہ وجاہت و شجاعت کا پیکر علم کا شیدائی فنونِ حرب کا ماہر اسلام خاں جس کی آنکھوں میں نرم نرم محبت ہوا کرتی تھی شہزادے کی طرح ہوس نہیں۔ نوشینہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اشکوں سے بھری آنکھوں کا افسوں جاگ پڑا۔ شہزادے نے جھک کر اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ نوشینہ سنبھل گئی پھر مسکرا کر بولی "فیضی بیگم کو معلوم تھا کہ ہیرے کی قدر جوہر شناس ہی کر سکتا ہے میں آج کسی شہزادے کے پہلو میں بلا وجہ ہی نہیں ہوں۔ شہزادے نے مسکرا کر قریب رکھی صراحی سے جام بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ دوسرے جام نے نشے کو تیز کر دیا بہکے بہکے قدموں سے وہ نوشینہ کے قریب پہونچا اور اسے اپنی باہوں میں بھر لیا اور اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی وہ کسمساتی رہی مگر شہزادہ اسے اپنے میں سمیٹتا رہا۔ یہ سمٹی تو وہ پھیلتا یہ پھیلتی تو وہ چھا جاتا شراب کا نشہ اور نوشینہ جیسی حسینہ کا قرب وہ انسانیت کے جامے سے باہر ہو چکا تھا۔ رات کے اندھیرے نے انسان کی ذلالت کا یہ منظر دیکھا اور

بولی "فیروز شاہ کے غلام غیور، بہادر اور با وفا ہوتے ہیں۔ میں بھی انھیں کی اولاد ہوں اگر آپ مجھ سے لگاؤ رکھتے ہیں تو آپ کو ان پر بھی اعتماد کرنا ہوگا۔"

ابوبکر شاہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا "لڑکی ـ! تو ہم سے اس بات کا وعدہ لے رہی ہے جس پر ہم پہلے ہی سے عامل ہیں۔ فیروز شاہی غلاموں سے ہمیں ہمدردی ہے۔ بچے ہوئے لوگ ہماری ہی پناہ میں ہیں۔ ہم انھیں حق بجانب سمجھتے رہے ہیں۔ اور پھر کیا تیرے ساتھ ہمارا عمل اس بات کی تائید نہیں کرتا۔

"مجھے اعتراف ہے۔"

"تب پھر اور کیا چاہتی ہے ہم تیری شیریں زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا احترام کریں گے۔

"میں اتنی اجازت چاہتی ہوں کہ اگر میں کسی سے ملنا چاہوں تو مجھے روکا نہ جائے اور اپنے پاس کسی کو بلانا چاہوں تو اجازت دی جائے۔"

ابوبکر شاہ نے غور سے اسے دیکھا اور بولا "تو کس سے ملنا چاہتی ہے؟"

نوشینہ نے اس کی آنکھوں میں بے چینی دیکھی اور چہرے پر افسردگی وہ اس کے قریب تر آ گئی اور دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور آہستہ سے بولی "دیکھئے میری آنکھوں میں آپ کو کون نظر آتا ہے۔ یہ آنکھیں کسی کے اعتماد کو مجروح کرنے والی نہیں ہیں۔ ابوبکر شاہ ـ ان میں کسی کے داخلے کا صرف ایک دروازہ ہے اور واپسی کا کوئی نہیں۔ ہماری وفا مثال بن چکی ہے۔ اور میں آپ

"تو اتنی دل شکستہ کیوں ہے۔؟" ابو بکر شاہ نے اسے اپنے قریب بٹھا کر کہا۔ "ہم تجھے یقین دلا چکے ہیں کہ ناصرالدین کو سبق ضرور دیں گے بس کو سزا دینے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس نے تجھ جیسی دانشمند لڑکی کو ستایا ہے۔ تو ہمارے عروج کی خواہش مند ہے۔ یقیناً تیرا خیال پورا ہوگا اور وہ دن آئے گا اور پھر تو ابو بکر شاہ کی نوازشیں دیکھنا۔ تیرے لیے آج ان کا تصور بھی محال ہے"۔

"فی الحال میں آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں"۔ وہ موقع دیکھ کر بولی۔

"ہم اپنی زندگی نچھاور کر دینے کا وعدہ بھی دے سکتے ہیں" وہ شوخی سے بولا۔

"اوں۔ ہوں۔ ابو بکر شاہ کی زندگی مجھے بہت عزیز ہے؟"

"آپ کی سنجیدہ طبیعت، بردباری، تدبر اور علم دوستی کی بنا پر۔ اسی لیے کہ آپ ایک سپاہی کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ غیر ذرشاہی غلاموں کی لڑکیاں مرد کو سپاہی کے روپ میں دیکھنا پسند کرتی ہیں۔ جن کا طرۂ امتیاز شجاعت اور جاں بازی ہوتا ہے"۔

"اور اگر ہم بادشاہ بن گئے تب۔؟" ابو بکر شاہ نے امتحان لیا۔

"ایک بہادر سپاہی حکمراں بن کر اپنے عوام کی حفاظت زیادہ بہتر انداز پر کرتا ہے"۔

"ماشاءاللہ۔ تیری زبان دلوں کو تسخیر کرنے کا فن جانتی ہے اب تا کہ ہم سے کس بات کا وعدہ چاہتی ہے"۔

شبینہ نے لوہا گرم دیکھا تو ابو بکر شاہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر

تاریکی کچھ اور گہری ہوتی چلی گئی۔

صبح بے سدھ پڑی نوشینہ کی آنکھ کھلی تو وہ خوابگاہ میں تنہا تھی اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر گالوں پر پھیلے اور تکیہ میں جذب ہو گئے۔

وہ خود کلامی کے انداز میں بولی "اسلام خاں آج سے میرا تمہارا ہر تعلق ختم ہو گیا۔ تمہاری زندگی تمہاری روح تمہاری نوشینہ اپنا خزانہ لٹا چکی ہے۔ مجھے اپنے ماں باپ سے کیے ہوئے انتقام کے عہد کو پورا کرنا ہے خواہ سارے خزانے لٹ جائیں۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور اچانک ہی اس کی نظر اپنے برہنہ جسم پر پڑی تنہا ہونے کے باوجود وہ شرم و حیا سے سرخ ہو گئی۔ اپنے جسم پر چادر ڈالی اور نفرت سے بھرپور لہجہ میں بولی ناصرالدین شاہ میرا انتقام بہت جلد تجھ تک پہنچے گا۔ میرے غم سے تڑپتے دل کو اس دن قرار آئے گا جب تو اپنے بیٹے ہمایوں خاں کے لیے تڑپے گا۔ میں وہ زہریلی ناگن بن چکی ہوں جو تم سب کو ڈسے گی۔

وہ اٹھی تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی ہار چکی ہے۔ نیلمی بیگم کی تربیت کے باوجود وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ گزری رات نے اس کے نصیب میں ایک حادثہ رقم کیا تھا ایک سانحہ ترتیب دیا تھا جس کا ماتم اسے ہمیشہ کرنا تھا۔

ابو بکر شاہ نے آدم خاں کو اپنے امراء میں شامل کر لیا تھا اور شبینہ پر عنایتوں کی بارش کر دی۔ علم دوست ابو بکر شاہ کو شبینہ کی عالمانہ گفتگو نے مسخر کر لیا تھا۔ وہ اکثر اپنا فارغ وقت شبینہ کے ساتھ گزارتا

اور گھنٹوں بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا۔ مذہب، تاریخ، طب، فلسفہ اور حکومتوں کے عروج و زوال کی تاریخ، شبینہ ہر موضوع پر بے تکان بولتی۔ اور ابوبکر شاہ کو اپنا اسیر کرتی چلی جاتی۔ ابوبکر شاہ کے دل میں اس کے لیے ایک عجیب انداز کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ شبینہ کو چاہتا بھی بہت تھا اور مرعوب بھی تھا۔ اگرچہ خلوت میں وہ شبینہ کے پاس صرف مرد بن کر پہونچتا تھا لیکن بے محابہ اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ شبینہ بڑے لطیف پیرایے میں اظہار محبت کو پسند کرتی ہے۔ وحشیانہ انداز اسے ناپسند ہیں اور غیر ارادی طور پر ابوبکر شاہ وہی کرنے لگا تھا جو شبینہ کا منشا ہوتا ان عادتوں کو اختیار کرتا جا رہا تھا جو شبینہ کو پسند تھیں۔ اسے اپنے مزاج کی تبدیلی کا شاید احساس بھی تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے مصاحبوں سے رائے مشوروں کے بعد اٹھا اور شبینہ کے رہائشی حصہ کی طرف چل پڑا۔ شبینہ کے پاس وہ ہمیشہ اچانک ہی پہونچتا تھا۔ اندر اطلاع کر کے وہ دیوان خانہ میں پہونچ گیا۔ شبینہ سبز رنگ کے اونی لبادے میں ملبوس تھی جس پر ریشم کا کام بنا ہوا تھا اور بڑے بڑے بالوں والی فر کا جالر لگا تھا۔ بناؤ سنگھار سے بے نیاز حسن اپنے فطری انداز میں اور بھی دلفریب لگ رہا تھا۔ سنہری گھونگھر دار بالوں کے گچھے اس کے گالوں پر جھوم رہے تھے۔ ابوبکر شاہ کی آمد کو سن کر شبینہ استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ مسکراتا ہوا اندر آیا اور شبینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا ؎

فغاں میں لولیانِ شوخ و شیریں کار شہر آشوب

(اگر یہ شوخ و شنگ موتی جیسے شیریں لوگ شہر میں نکل جائیں تو غدر مچ جائے، ہنگامہ ہو جائے)

شبینہ نے اسے قالین پر بٹھا کر کہا "صرف غدر ہی نہیں" اور مسکرا کر دوسرا مصرعہ پڑھ دیا ؎

چناں بردند صبر از دل چوں ترکاں خوان یغمارا

(بلکہ حسن کی تباہ کاریاں ایسی ہوتی ہیں جیسے خونخوار ترکوں نے خلفاؤں کے خوان الٹ پھینکے تھے)

"سبحان اللہ۔" ابوبکر شاہ جھوم کر بولا۔ شبینہ نے اسے نہ صرف جواب دیا تھا بلکہ تنبیہی اشارہ بھی کر دیا تھا اور ایک ہی شعر میں ساری بات ہو گئی تھی اس نے شبینہ پر تعریفی نگاہ ڈالی اور بولا۔ "بہت برجستہ جواب دیا ہے تو نے مگر بڑا تلخ ہے۔ ویسے یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ مجھے اس شعر کا دوسرا مصرعہ یاد نہیں تھا۔"

"اسی لیے میں نے یاد دلا دیا کہ مستقبل کا شہنشاہ چوکنا ہو کر رہے" شبینہ نے سر جھکا کر کہا۔

"ہم محسوس کر رہے ہیں کہ تو ہمیں کسی خاص راستہ پر چلانا چاہتی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "میں خود دامن پکڑ کر آپ کی رہنمائی میں چلنا چاہتی ہوں۔ اپنا راستہ تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ میں آپ کو اس راہ کا مسافر دیکھنا چاہتی ہوں جو عروج و کمال کی طرف جاتی ہے۔ ہمیں مغلوں نے بے حال کر دیا ہے پست ہمت کر دیا ہے اگر آپ جیسا صاحب کردار اور علم و فن کا شیدائی حکمراں ہمیں مل جائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔"

تقاضا۔ میں بھائی صاحب سے اس کی وہ کتابوں کو حاصل کر کے اسے بھیج دوں جن پر انھوں نے اپنے دستخط کیے تھے۔ مگر میں۔!"

کہاں ہے اس کا رقعہ۔ اللہ جانے۔ شاعری کی ہوگی اس میں بھی۔ بیسرہ ہنس دی۔

نہیں بی۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کے آنسو تحریر میں ڈھل گئے ہوں۔" نوشابہ نے کہا: "مجھے تو بڑا برا لگا۔ محبت کا روگ چاہے سچا ہو کہ جھوٹا۔ پر اثر ضرور ہوتا ہے۔ بیسرہ۔ وہ تو اپنے خط میں رو رہی تھی۔ مگر میں ابھی اس گھر میں نئی ہوں۔ میری رسائی بھلا ان تک کہاں؟ اور پھر ہماری ساس اماں ایک دم سے کوری ہیں۔ نئی دلھن کو جیٹھ سے باتیں کرتے دیکھ کر جانے کتنے گز اونچی اچھل جائیں گی۔ میں نے تو سچ وہ خط ہی تلف کر دیا۔ "ان" سے بھی نہیں کہا۔ کہوں بھی کیا۔ خبط کی کہانی۔!"

مگر ایک بات ہے نوشابہ" زہرہ بولی "اتفاقاً میری نظر بھی شباہت صاحب پر پڑ گئی تھیں بس وہیں جم کر رہ گئیں۔ اف فوہ۔ مردوں میں اتنے خوبصورت لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ بھلا تم نے انھیں دیکھا؟"

ہاں" نوشابہ مسکرائی "رونمائی کے وقت دیکھا تھا۔ بہت خوبصورت ہیں۔ لڑکیاں ان پر گرتی ہیں تو بیجا نہیں ہے۔!"

ارے کسی صورت سے ہم سے بھی ملواؤ۔" زہرہ گھگھیائی "ایک بار جی بھر کے دیکھ لیں۔ آج تو وہ بھی دعوت کے موقعہ پر ہوں گے۔ بس، میں تو اپر مضمون بھائی کے کمرے میں گھس جاؤں گی اور جھانکوں گی اچھی طرح۔!"

(باقی آئندہ)

چوتھی قسط

ماشاءاللہ۔ دلھن سے کہو۔ وہ دیکھے گی۔ تم نے اجازت دی تو سامنے نکل کر لڑکے سے گفتگو بھی کرے گی!"

یہ اور اچھا رہے گا" الیاس احمد ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے "بس باقی ٹانک میں نے آپ کے لیے تجویز کر دیا۔ اب بستر چھوڑ دیجئے اور صحت مند ہو کر پہلے کی طرح چلیے پھریئے۔ آپ کے پڑنے سے باورچی خانہ بھی سو گیا۔ سچ کہتا ہوں کہ شاید مہینہ بھر سے میں نے کوئی مزیدار چیز نہیں کھائی۔ نہ قیمہ بریانی، نہ کباب ماش کی دال، کل دوپہر کو نوکر کا دوپیازہ کھایا تھا ابھی تک دانت کھٹے ہیں۔"

کیوں۔؟" وہ غصہ سے بیٹی کی طرف مڑیں "آنا بھی سلیقہ نہیں کہ ایک نظر باورچی خانہ پر ڈال لیا کرو۔ اللہ رکھے دلھن ... دنوں سے ہے اس سے چلنا پھرنا مشکل۔ بچوں ہی کو سنبھال لیتی ہے کمال کرتی ہے۔ مگر تم کو کیا ہوا ہے۔ ذرا ابو اللطیف کے ساتھ مل کر ڈھنگ کی ایک آدھ چیز پکوا لیا کرو۔ نگوڑا پکے آم کا دوپیازہ کوئی سالن ہے۔ نام ہی سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ الیاس کے دانت کیسے نہ کھٹے ہوں گے!"

امی یہ محاورہ ہے دانت کھٹے کر دینا" ماریہ ہنسنے لگی "ہم نے بھیا کے دانت کھٹے کر دیے۔ ہے نا؟"

اچھا اب کہہ رہا ہوں کہ رات کے کھانے میں مصالحہ دار مرغی اور گرگرے پراٹھے کھاؤں گا۔ بعد کو فروٹ کسٹرڈ!" الیاس احمد نے کہا۔

پیار سے ماریہ کو دیکھتے ہوئی بڑی بی بولیں "جا میری بچی

جو کہہ رہا ہے وہ پکا دے۔ اللہ تیرا نصیبہ اونچا کرے۔ میری بیٹی کتنی اچھی!"

"امی کیا آپ جاگ رہی ہیں؟" الیاس احمد کی بیوی سفینہ نے پردہ ہٹا کر کمرے میں جھانکا۔ اور خوش ہو کر بولیں۔ "اللہ کا شکر ہے آج امی کو میں بیٹھا دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آپ سو رہی ہیں پتہ ہوتا کہ یہاں رازداریاں ہو رہی ہیں تو پہلے ہی بھاگ کے آتی۔ ارے۔ امی اتنی مشکل سے عمار سویا ہے کہ بس کیا کہیں تھوں چنے چبوا دیے لڑکے نے۔ اب وہ سویا ہے تو چپکے سے اٹھ کے آئی ہوں!"

"بی بی آئی کیوں ہو؟" بڑی بی نے کہا اور محبت پاش نظروں سے بہو کو دیکھتی ہوئی بولیں۔ "تھوڑی دیر بچے کے پاس لیٹ کے آرام کر لیتیں۔ دن بھر تو نچائے رکھتا ہے۔ مگر اس وقت سُلا کیوں دیا۔ رات کو پھر تنگ کرے گا"

الیاس احمد اور ماریہ اپنے اپنے کام سے جا چکے تھے۔ بڑی بی اب اتنی چاق تھیں کہ تکیوں پر نیم دراز بہو سے ماریہ کے بیاہ کی باتیں کرتی رہیں۔ سفینہ کچھ دنوں بعد پھر ماں بننے والی تھیں۔ وہ اپنی ساس کے پہلو نیم دراز ہو گئیں۔ بڑی بی ان کے گھنے گھنے بالوں میں اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے کنگھی کرتی رہیں۔ باتیں کرتی رہیں اور سفینہ نیم غنودگی کے عالم میں ہوں ہاں کیا کیں۔

ماریہ ماں کے حسب الحکم بوا لطیفن کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں۔ لیکن اس کے حواس خمسہ ماؤف ہو رہے تھے! اپنی تقدیر کا

روانی رشتے میں منسلک نہ کرتیں تب بھی میں آپ سب بد شکلوں کے لیے بے ضرر ہی تھا!"

"اے ہاں۔ لو۔ میں پوچھنا ہی بھول ہی گئی!" میموٹے نوشابہ کو کھسوٹ کر پوچھا۔ "تمھاری رازدار سہیلی کیا آج بھی نہیں آئیں؟ توبہ ہے۔ اس کے بے مروتی سے بھی۔!"

"کون؟۔ رضوانہ۔؟" نوشابہ نے چپکے سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں گئی تھی اس سے ملنے" زہرہ بولی "عجیب سی ہو کر رہ گئی ہے پہلے اتنی حسین تھی اب تو جیسے کہ بیمار ہو کچھ۔ کھسیائی ایسی اپنی امی کے پاس بیٹھی گاجریں پھیلا رہی تھی۔"

"گاجریں۔؟ رضوانہ اور گاجریں۔ کتنی غیر شاعرانہ حرکت ہوئی!" سمیرہ ہنس دی۔ "ارے کیا تمام شاعروں کو اس نے طلاق دے دی؟" میں نے پوچھا کہ بی بی یہ کیسا انقلاب آیا ہے تمھاری زندگی میں!"

زہرہ ہنستی ہی رہی "کہنے لگی کہ بڑی زبردست ذہنی ٹھوکر لگی ہے آنکھیں کھل گئیں ہیں اب امی نے کہا ہے کہ گھر کا کام کاج ہی سیکھو لو۔ سو یہ گاجریں دے کے بٹھال دیا ہے۔ حلوہ بناؤں گی۔ ایمان سے مجھے بڑی ہنسی آگئی!"

"اس کی ذہنی ٹھوکر کا حال مجھے معلوم ہے" نوشابہ چپکے سے بولی اور عظمت کو دوسری لڑکیوں سے فقرہ بازی میں مشغول دیکھ کر ادھر سے پیٹھ پھیر لی اور آہستہ سے بولی "سنو۔ وہ بے چاری ہائے جیٹھ صاحب پر تن من سے واری تھی۔ ان تلوں میں تیل نہیں تھا بے چاری نے منہ کی کھائی۔ کل شام کو اپنے ملازم کو رقعہ دے کے بھیجا

رہ گئی: فرخندہ جلبلائی: یاد رکھیے آپ صرف ایک پر حلال ہوئے ہیں باقی سب پر حرام مطلق ہیں آئندہ سے دستک دے کر یا آواز لگا کر آیا کیجئے!"

محترمہ۔ محترمہ۔ عظمت بھی دکھا دے کو جلبلائے: "آپ کون سے جنم کی ہانک رہی ہیں۔ میں آپ کو بتا دوں کہ اللہ میاں نے ڈاکٹر کو عام خاص سب پر حلال کر دیا ہے۔ واہ جناب۔ آپ کسی بری بیماری میں مبتلا ہو کر کلینک میں آتی ہیں تو کیا پوری نقاب میں ڈھک کے آتی ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ کا جگر بڑھ گیا ہے تو کیا آپ ـــ"
"ہمارے دشمنوں کا جگر بڑھ جائے!" فرخندہ بولی: "مثال کے لیے نگوڑی میں ہی رہ گئی ہوں"

آج کی رات اور معاف کر دو بھائی" سطوت بولی: "حلال حرام کی موئی کیا بحث اٹھی۔ یہ ڈاکٹر ہوں گے اوروں کے لیے۔ ہمارے تو اللہ رکھے اکلوتے دولھا بھائی ہیں۔ یوں بھی پردہ زردہ جائز نہیں! بے پردگی خطرناک ہے!" فریحہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔
کیوں آپا جان بھلا خطرناک کیسے ہوا: عظمت نے پوچھا۔
میرے لیے نہیں" سکون کی سانس لے کر فریحہ بولی: "آپ نے آپا جان کہہ دیا ہے۔ خدا آپ کو اچھا رکھے۔ صاحب نصیب کرے چاند سا بیٹا دے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ دولھا بھائی کا رومینٹک رشتہ نگوڑا نامراد سالیوں کے لیے کچھ دبیا ضرور ہے؟"
جی نہیں۔ معاف کیجئے۔ میری نظر بھلا یوں بھی کالے کلوٹے سے اور بے ناک سے چہرے دیکھ کر بیزار ہو چکی ہیں آپ مجھے ایک

فیصلہ اس نے سن لیا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ اب اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں۔ امی نے جلد سے جلد اس کا گھر بسانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ٹھیک بھی تو ہے۔ کب تک وہ بھائی پر بوجھ بنے گی۔ اس کے بعد شاید امی بھی صحت مند ہو جائیں۔ جوان بیٹی بجائے خود ایک بیماری ہے۔ جس قدر جلد اس کا دفعیہ کیا جائے اسی قدر اچھا۔

لیکن وہ رہ رہ کے چونک سی پڑتی تھی۔ ایک کانٹا سا شہ رگ کے قریب کھٹکنے لگتا تھا۔ کس کی یاد کا کانٹا تھا وہ۔ کس کی محبت چٹکیاں لے رہی تھی۔ کہ ہر چٹکی پر رگ جاں کا لہو سوکھا جا رہا تھا۔ اس نے پلکوں ہموار خطے پر نظریں جما دیں۔ ایک سرد آہ اس کے سینے میں خراش ڈالتی لبوں تک آئی اور لبوں کو خشک کر گئی!۔

کوئی نہیں جو درد دل جان سکے
در محبوب تک رسائی ناممکن۔
کسی کو اس کے نالہ نارسا کی خبر نہیں۔
دعاؤں میں اثر نہیں۔
دوائیں بیکار،
آہیں صرف سانسیں بن کر رہ گئیں۔
آنسو پلکوں سے گرے اپنی آب کھو بیٹھے۔
بہار پر شباب آیا نہ تھا کہ خزاں کی زردی چھا گئی۔
اب کہاں وہ مرکز محبت۔
اور کہاں یہ بے نام گمنام سی محبت۔

عجیب سا سنگدل آدمی تھا۔ محبت پاش نگاہوں کا بار بھی اپنے
چہرے پر محسوس کرنا پسند نہ کرتا تھا!۔
احساس حسن و جمال اور اس قدر۔
مردانگی، خود مختاری، علمیت اور برتناری کا یہ غرور۔ کہ کسی
ذرۂ بے مقدار کی ستائش بھی سننی گوارا نہیں۔
اللہ اللہ۔ بے شک بکنے والوں نے چاند کو مٹھی میں لے لیا
مگر حرماں نصیب چکوری، چاند سے اب بھی اتنی ہی دور ہے۔ اس
کی تقدیر میں روشنی کے دیوتا نے اندھیرے لکھ دیے ہیں۔ وہ ازل
سے سرگرداں اور محروم ہے۔ ابد تک چاند کے چہرے کا طواف کرتی
رہے گی۔ اس تک پہنچ نہ سکے گی!۔
شباہت صاحب سچ سچ آپ کہاں اور میں کہاں۔؟
اس سے پہلے کہ میرا دامن سلگ اٹھتا۔ آخر آپ تک پہنچتی میں
آپ سے بڑی دور ہو گئی۔ جان بوجھ کر اپنے درمیان فاصلے پیدا
کیے۔ میرا مقدر آپ کو چپکے چپکے چاہے جانا ہے۔ اور مرجانا ہے۔
کون پہچان سکے گا۔ خوش قسمت نقیب ناریہ خس کی طرح سلگ سلگ کر یوں
یکایک بھسم ہو گئی!۔
اپنے حسین کرشن کی داسی میرا۔ جس کی محبت کے گیت بے ساز و آواز
بجتے ہیں کوئی سن نہیں سکتا۔ محبت ایک نشہ ہے۔ نہ کبھی ہوش آئے
نہ آنکھیں کھلیں نہ حواس بیدار ہوں اور انسان محبت کے نشے میں چور
لڑکھڑاتا ہوا قبر کی منزل کی طرف بڑھ جائے!۔
محبت وہی ہے جو چپکے چپکے کی جائے۔ جس کا ادراک خود محبت

کو میری نحوست سے بچانا۔ انھیں ان کے بچوں کے سر پر سلامت رکھنا
میرے پیارے بھائی کی گرہستی بنی رہے۔ میرے اللہ۔ میرے اللہ
وہ بھولی چلی تھی اپنی نحوست ایں بتلاتی۔ بھول گئی تھی اپنا مقدر پر
اس پر پاگل پن طاری ہونے لگا۔ وہ خود سے لڑنے لگی کہ اپنے سوتے
ہوئے حواسوں کو جگائے رکھے۔

پورا گھر حسب مرضی سجایا جا چکا تھا۔ اب آخری مردانہ کمرہ باقی
رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر عظمت علی خاں نے باقاعدہ اپنا کلینک کھول لیا تھا
پچھلے روز بڑے اعلیٰ پیمانے پر کلینک کا افتتاح عمل میں آیا تھا اور
آج ایک شاندار ایٹ ہوم عظمت کے دوستوں اور نوشابہ کی
سہیلیوں کو دی گئی تھی۔ پرلی طرف صحن میں باورچی مصروف تھے
اندر باہر ملازم دوڑتے پھر رہے تھے!۔
گھر میں اتنی گھما گھمی چہل پہل اور شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز
سنائی دینی مشکل تھی! بڑے ہال میں بزرگ خواتین پاندان سامنے
رکھے دنیا بھر کے موضوعات پر طبع آزمائی کر رہی تھیں۔ ٹی، وی لاؤنج
میں نوشابہ کی بیسوں سہیلیاں اکٹھا تھیں ابھی معزز مہمانوں کی آمد
میں دیر تھی۔ لہٰذا کچھ دل بہلائی کے لیے ڈاکٹر عظمت بھی بیوی کے
پاس آ بیٹھے تھے۔ لڑکیوں نے دکھاوے کو غل مچایا۔
"آپ کے ڈاکٹر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ سے پردہ جائز نہیں

یا انھیں نرسنگ ہوم لے جاؤں ۔ !"

"تم نے تو مارے ہول ڈال دیا بوا!" ایک بیوی بولیں: "لعن اللہ رکھے دو بار اس کٹھن منزل سے گزر چکی ہے۔" یہ کہتے کہتے تین چار بزرگ خواتین امی کے ساتھ سفینہ کے کمرے میں چلی گئیں۔ سفینہ کے دو بچے تھے۔ آعصار اور عمار ایک لیڈی ڈاکٹر نے کچھ تشویش ظاہر کی تھی: تیسرے بچے کو جلدی نہیں ہونا چاہیے لیکن اس مرحلے سے آسان گزر جانے کے بعد سفینہ کو ڈاکٹر کی ہدایت یاد نہ رہ گئی۔ ابھی ان کی حالت دگرگوں تھی۔ تکلیف کے مارے ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہی تھیں۔ چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ اودے ہو گئے تھے۔ سارا بدن اس سردی میں بھی پسینے میں نہا رہا تھا۔ امی کا دل دھڑک اٹھا۔ بیبیاں بھی متوحش ہو گئیں۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ بڑی جلدی جلدی انھیں نرسنگ ہوم لے جایا گیا۔ اب کہاں کی شادی کہاں کے سہاگ گیت۔ بزرگ خواتین سفینہ کی والدہ بڑی بہنیں ان کے ساتھ نرسنگ ہوم چلی گئیں۔ دوسری خواتین دھک دھک کرتی روشنی میں موزنوں کی طرح بیٹھی خوفزدہ انداز میں سرگوشیاں کرتی رہ گئیں۔ الیاس احمد بھی جا چکے تھے!

خائف و متوحش ماریہ شرم و حیا بھول کر کمرے سے بھاگ کے سفینہ کے پیچھے پیچھے باہر تک چلی گئی تھی۔ پھر ان کی کار اندھیرے میں گم ہو گئی اور وہ دل تھامے کھڑی رہ گئی۔ جھلمل کرتے آسمان پر اس کی نظریں پڑیں۔ دل سے ایک ہوک نکلی۔ پروردگار۔ بھابی

کرنے والے کو بھی نہ ہو۔ وہ اسی فکر و خلش میں غلطاں رہی کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟:

کیا میرا پوشیدہ جنون بھی ایسا ہی نہیں ہے؟: وہ گم صم ہو رہی تھی لیکن اسے اپنے خالص جذبۂ محبت پر ایمان تھا کہ رنگ لائے گا۔

"بیٹی تم رو رہی ہو۔ آماں نواب اچھی ہیں۔ کیا بات ہے؟" بوا پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں تو۔ بوا!" وہ جھینپ گئی: "شاید پتیلی کا ڈھکن اٹھاتے وقت بھاپ لگی تھی۔ تکلیف سے آنسو نکل پڑے۔"

"تو پھر جاؤ۔ رہا سہا ہم دیکھ لیں گے!"

"اچھا بوا جی ۔!"

دوسرے روز الیاس احمد اپنے ساتھ سیٹھ کرمانی کے صاحبزادے اشہر کرمانی کو لے کر آئے۔ ان کے اعزاز میں بڑا پرتکلف عصرانہ دیا گیا ان کے اخلاق، ادب تمیز کو دیکھ کر اگر بھابھی سفینہ متاثر ہو گئیں تو الیاس احمد کا شاہانہ کارخانہ دیکھ کر اشہر بھی سمجھ گئے تھے کہ خاندان ٹکر کا تھا!

بہ ہزار خرابی امی نے بھی پردے تک آکر ہونے والے داماد کو دیکھا اور پسند کر لیا۔ قبول صورت تھے۔ اونچا پورا قامت تھا۔ گفتگو کا انداز شریفانہ تھا۔ امارت کا احساس کا چھچھورا پن نہ تھا! باطن کی خبر خدا جانے۔ ماریہ کا نصیب اچھا ہوگا تو برا باطن بھی بھلا ہو جائے گا!

اگلے روز انھوں نے ضروری گفت و شنید کے لیے اپنے والد محترم

کو زبردستی بھیجا۔ ان کی دانست میں اتنی عجلت نامناسب تھی۔
مول بھاؤ کرتے کرتے انھیں تجربہ ہو گیا تھا کہ پسندیدہ چیز کے
خریدنے میں بے چینی ظاہر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی قیمت بڑھ
جاتی ہے۔ لاپرواہی ظاہر کرنے سے بیچنے والا دام گرا دیتا ہے
لیکن انھوں نے بزنس ٹیکٹ اٹھا کے رکھ دیا طاق پر۔ نہ صرف
باپ کو بھجوایا بلکہ خود بھی تشریف لائے اور ایک طرف شرمائے
سے بیٹھے رہے۔

پردے کے پیچھے آرام دہ کرسی پر امی اب بھی بیٹھی تھیں اور
سیٹھ صاحب سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے بوڑھے چہرے
پر ایک طویل عرصہ بعد مسرت کی پرچھائیاں کانپتی نظر آ رہی
تھیں۔ جب سیٹھ صاحب نے اپنا عندیہ ظاہر کیا کہ میں جلد از جلد
رمضان شریف سے قبل اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں
رمضان المبارک میں شادی بیاہ مجھے پسند نہیں بات عید
کے مہینے میں جا پڑے گی۔ بہن محترمہ۔ آپ کی مرضی ہو تو بس
ہفتے عشرے میں یہ نیک کام انجام پذیر ہو جائے۔ آپ کو
تیاری ہی کیا کرنی ہے۔ میں عرض کیے دیتا ہوں کہ مجھے صرف
آپ کی بچی چاہیے۔ اور جہیز، جوڑے، تحفے تحائف کے بہانے
کوئی چیز میں لینا گوارہ نہیں کروں گا۔ خدا کا دیا سب کچھ اس
کی قسمت کا میرے پاس ہے!"

"بھائی صاحب! یہ کہہ کر آپ نے مجھ غمزدہ کا دل خوش کر
دیا ہے اور بہ اللہ کی خوشنودی اور اجرِ عظیم کے مستحق بھی ہو گئے

دیوار گیر بڑے کلاک نے بلند آواز میں گیارہ بجائے۔ رات
بڑی خوبصورت تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آسمان پر
پورا چاند ہولے ہولے تیر رہا تھا! مدھم سے ستارے دور دور
چمکتے ہوئے پلکیں جھپکا رہے تھے۔ دالان میں تیز روشنی بڑی خیرہ
کن ہو رہی تھی۔ سب بیویاں لپکا لگے زرو زر و کپڑوں میں جگمگاتی
ہنستی بولتی زندگی سے بھرپور لگ رہی تھیں۔ خوشی کا وقت تھا
مگر دفعتاً ایک مسرت بخش تماشے کا سین بدل گیا بے سان وگمان
الیاس احمد نے ایک ہزار روپیے کے نوٹ ماں کے ہاتھ پر رکھے کہ
سب کو نیگ دیجئے۔ بڑی چچی نے زندہ دلی سے قہقہہ لگا کر ڈھولک
پر پہلی تھاپ لگائی ہی تھی کہ اندر بڑے کمرے سے اچانک بوا لطیفن
بوکھلائی ہوئی نکلیں۔

"کیا ہوا۔ بوا جی۔ گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟" امی وحشت زدہ ہو
گئیں۔ شور و غل ختم گیا۔ سب بوا کو گھورنے لگے۔

"اے بیگم جی۔ ارے دلھن ہلکان ہو رہی ہیں۔" بوا جی نے
بدحواس ہو کر کہا: "تھوڑی دیر پہلے ہی درد میں لگیں۔ بہت ضبط
کیا۔ مگر اب تو بے قابو ہوتی جاتی ہیں۔ میں کانی لے کر گئی تھی۔
مگر انھیں ہوش کہاں؟"

"اللہ مبارک کرے۔ نیا بچہ مبارک قدم ہے۔" چچی ہنس دیں
بھائی کو دادا کی صورت دیکھنی نصیب ہوئی!"

"اٹھی جا رہے دیکھیے۔" الیاس احمد بے تاب ہو گئے "کیا
کیفیت ہے۔ اگر ضرورت ہو تو میں لیڈی ڈاکٹر کو فون کیے

باجی بولیں۔

"دن بھر تو آپ ایک پاؤں پر پھرتی رہیں" الیاس ہنستے ہوئے بولے "آپ میں کہیں سہاگ گانے کی سکت ہے بھلا؟"

"تم ڈھولک اٹھاؤ تو سہی۔ ہم میں تو اتنی سکت ہے کہ گاتے گاتے صبح کر دیں اور وہ طاقت گھٹے نہ گیت ختم ہوں" انھوں نے قہقہہ لگایا۔

"اچھی بات ہے" الیاس بھی ان کے قہقہے میں شامل ہو گئے "میں کرم الٰہی صاحب کو بھیج کر ابھی منگوائے لیتا ہوں۔ مگر ایک شرط ہے"

"اے میاں وہ کیا" ایک بڑی بی بولیں "یہاں شرطیں وطیں نہ گنواؤ۔ بہن کا بیاہ ہے۔ ڈھولک پر تھاپ پڑنے سے پہلے سیدھے ہاتھ سے نیگ رکھ دو۔ اچھی سالیاں ہیں کہ مفت میں گانے پر تیار ہیں۔ یہی تو موقعہ ہے جیب میں ہاتھ ڈال کے لینا چاہیئے"

"آپ سب کا نیگ سر آنکھوں پر، خدا ہم سب کو مبارک کرے" الیاس احمد فرط مسرت سے آبدیدہ ہو گئے! "نیگ بھی لاتا ہوں اور ڈھولک بھی۔ ۔ !"

"اے بہن۔ لڑکی کو کمرے ہی میں بند کر کے کیوں بے چاری کا اچار ڈال رہی ہو — ایک اور بڑی بی بولیں "یہاں سب میکے والے ہی تو ہیں۔ اسے بھی یہیں لا کے بٹھاؤ۔ آج ایک دن اور بے تکلفی سے ہنس بول لے۔ کل سے تو مار گردن جھکائے جھکائے اسے سسرال میں رہنا ہی ہے!"

"ہاں امی بلا لیجئے نا ریہ کو بھی اسی محفل میں" الیاس احمد نے کہا "مگر وہ شاید نہ آئے۔ بہت شرمائی ہے!"

ہیں" امی نے جواب دیا "آپ ان مرحوم کے دوست تھے۔ جانتے ہیں کہ ابھی جنت نصیب کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہوگا۔ وہ ہوتے تو آج بات ہی اور ہوتی۔ مگر"

"بہن صاحبہ۔ بچوں کو احساس کیوں دلایا جائے کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ ہٹ چکا ہے" سیٹھ صاحب نے مزید جنت خریدی بولے "الیاس میاں مجھے باپ کے بجائے سمجھتے ہی ہیں اور میں آپ کی بچی کو اپنی حقیقی بیٹی سمجھ کر لے جاؤں گا۔ بہو بنا کر نہیں۔"

"خدا آپ کو اس کا صلہ دے بھیا" اب امی کی آواز گلوگیر تھی "میں یہ کہہ رہی تھی کہ جلدی مجھے اس لیے ہے کہ مرحوم کے بعد میں اتنی بیمار اور کمزور ہو گئی ہوں کہ مجھے اپنی زندگی کا اعتبار نہیں۔ لڑکی کا فرض جتنی جلدی ادا ہو جائے اچھا ہے۔ آپ نے جو خدا لگتی باتیں کی ہیں۔ اس سے تو میرا دل چاہتا ہے کہ کل کا کام آج ہو جائے!"

"انشاء اللہ۔ انشاء اللہ" وہ صاحب موٹی آواز کو مزید موٹی کر کے مسکرا کے بولے "جیسی آپ کی خوشی۔ تاریخ تو بہر صورت آپ ہی مقرر کریں گی۔ فرمائیے تاکہ بارات لے آؤں۔ آپ کی خوشی مجھے اتنی منظور ہے کہ جیسا کہ آپ نے فرمایا کل کا کام آج ہو جائے تو یہ بھی ناممکن نہیں۔ حکم دیجئے۔ بعد مغرب بارات لے آؤں گا"

ہکا بکا سی بے چاری بڑی بی اس عنایت زادہ پر گھبرا کر بہو کی صورت دیکھنے لگیں۔ حد سے بڑھا ہوا خلوص، ہکاری منافقت۔ الیاس احمد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا "چچا صاحب" آپ

لڑکی والے ہیں۔ بے شک آپ شام تک بارات لے آئیں گے آپ کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ مگر خدا کے لیے لڑکی والوں کو اپنی ناک رکھنے کا موقع دیجئے۔!"

سیٹھ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا: "الیاس میاں۔ بیٹے۔ ناک رکھنے کے سلسلے میں لوگ اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ پھر سنبھالے نہیں سنبھلتے اور اخیر میں چل کے ناک کٹ ہی جاتی ہے!"

"کیا فرمایا ہے حضور آپ نے:" الیاس احمد نے فوری داد دی۔

انھوں نے نہایت خوشدلی سے اپنے قہقہے کو ایک بار پھر دہرا دیا! ان میں دیر تک گفتگو ہوا کی۔ سیٹھ صاحب اپنے قول کے پکے تھے۔ اٹھتے اٹھتے عقد کی تاریخ لے ہی کے رہے۔ ابھی تک امی کا یہ حال تھا کہ کہیں ماریہ کی بات پکی نہ ہونے سے گھبرائی جا رہی تھیں۔ اب یہ ہوا کہ بیاہ کی تیاری میں بے حواس ہوگئیں۔ الیاس احمد نے تسلی دی۔ سفینہ نے اطمینان دلایا کہ وہ اپنے گھر کی ساری خواتین کو بلالیں گی۔ اور ہفتے بھر میں ہاتھوں ہاتھ ساری تیاری ہوجائے گی۔ امی آنچل پھیلا پھیلا کر اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکیں۔

الیاس احمد نے کاروباری مصروفیات اپنے منیجر صاحب کے سپرد کر دیں اور خود معہ بیوی کے شادی کی تیاری میں لگ گئے!

ماریہ بوکھلائی سی تھیں! جس روز بھابی کے خاندان کی چھوٹی بڑی خواتین اس کے دالان میں جگمگانے لگیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اب کوئی بھی معجزہ تقدیر کے پلٹنے کا کام نہ کرے گا۔ اسے حیرت تھی۔ آخر کیوں چاہتی ہے کہ تقدیر پلٹے؟ اب کیا برائی ہے۔ وہ ایک

بڑے گھر سے اٹھ کر دوسرے بڑے گھر جا رہی تھی! پھر یہ بےچینی یہ اضطراب یہ خلش آخر کیوں۔ وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ تنہائیوں میں جیا کا قرار اور بھی اڑ گیا۔ اتنی جلدی یہ کام ہو رہا ہے۔ ابھی کل تک سلام پیام ہی کا ٹھکانا کہیں نہیں تھا نہ کہ آج وہ زرد کپڑوں میں ملبوس آ بیٹھی ہے۔ کیوں ہو رہی ہے اتنی جلدی۔ خداوندا رحم کرنا۔ میری نحوست کوئی گل اور نہ کھلائے! دل ہی دل میں وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتی!

شادی سے ایک دن قبل بڑے اعلیٰ پیمانہ پر سانچق اور مہندی کی رسمیں ادا کی گئیں سیٹھ صاحب خود تو فضول خرچی اور بیکار رسموں کے خلاف تھے۔ مگر بہو کے لیے بڑا قیمتی طلائی گلوبند اور ٹیکہ بھجوایا۔ کیا دن جوڑے بھیجے۔ سارا سامان جدید ترین اور قیمتی تھا! سب ماریہ کی خوش بختی پر نازاں تھے!

دوسرے دن شادی تھی! مہمان اور میزبان تھکے ہارے سے مگر بے حد خوش و خرم دالان میں بچھے فرش پر لیٹے بیٹھے پرمسرت باتیں کر رہے تھے!!

الیاس احمد بھی تھے اور بے حد خوش تھے! سفینہ کی بہن باجی زیبا نے کہا: "الیاس بھیا ایک کسر رہ گئی ہے اس دھوم دھام میں اس طرف تم نے دھیان نہیں دیا۔؟"

"فرمایئے باجی۔ وہ بھی پوری کر دوں:" الیاس احمد نے کہا۔

"بھاٹک پر شہنائی اور گھر میں ڈھولک بجے بغیر بیٹی کی شادی کیسی؟ ڈھولک منگوا دو تو ہم سہرے اور سہاگ گائیں:" زیبا

بشریٰ رحمن

Rs. 24/-

THE HAREEM

Nov. 84

Rs. 1/50

نسیم انہونوی

ایڈیٹر

اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی سالانہ قیمت اس حریم تک ختم ہو گئی۔

ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۴۴۵۵۹ | ٹیلیفون نمبر رہائش ۔ ۴۵۳۴۴

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۴ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے

ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی و شفیق النساء بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۴) فہرست مضامین نومبر ۸۴ء نمبر (۱۱)

اڈیٹر و نگراں: نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم غزالہ ـــــ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری	"	تیئیس روپیہ

وی۔ پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ زائد فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

غیر ممالک سے

پچھتر روپے یا اس کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری اور ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔ • حریم ہر انگریزی ۵ رکو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے، ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ر کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ر کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ر تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ قیمتاً جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں آفس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا

ایک صاحب نے لکھا ہے "ویسے تو آپ پکے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن ہم عورتوں کے سلسلے میں آپ کے خیالات عجیب ہی نہیں بیہودہ نظر آتے ہیں۔ آپ کی تحریروں سے جو لمعات میں پڑھتی ہوں یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ عورتوں کی تعلیم اور ان کے ملازمت کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ اگر آپ نے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے تو یقیناً اس حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے کہ پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ انھوں نے دنیا کو مساوات کا سبق دیا اور مردوں اور عورتوں کے فرق نابرابری کو مٹا کر انھیں برابری کا درجہ دیا۔ اس سے پہلے عورت ایک جنس حقیر تھی مرد کو اس پر ایسی سبقت حاصل تھی کہ وہ چاہتا تو اسے پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا کرتا تھا۔ وہ اسے ایک جائداد کی طرح رہن بیع کر سکتا تھا اسے اپنے نفس کی آگ بجھانے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اس کی کوئی عزت و وقعت نہ تھی لیکن ہمارے نبی اکرم صلعم نے اسے ایسی عزت دی، ایسا عروج بخشا کہ دنیا دنگ رہ گئی کہ ٹھکرائی جانے والی جنس مردوں پر بٹھائی جانے لگی۔ اسکو ایسا درجہ بخشا گیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ کہیں بھی اسے مرد سے کمتر نہیں بتایا گیا، لیکن آپ اس کو پھر نیچے گرانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حریم آپ عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے شائع کرتے ہیں، لیکن عورتوں کی فلاح اسی طرح ہو سکے گی کہ وہ تعلیم پائیں۔ وہ گھروں سے باہر نکلیں۔ یعنی ایک جاہل قیدی کی سی زندگی گذاریں۔ آپ کو نہیں معلوم کہ نئی نسل کی تعلیم یافتہ خواتین آپ کا مذاق اڑاتی ہیں اور آپ کو عورتوں کا دوست نہیں دشمن سمجھتی ہیں۔ خدا خدا کر کے کچھ روشن خیال مردوں نے عورتوں کو پردے کی قید و بند سے نکالنے کی تحریک شروع کی۔ انھیں علم سے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے انھیں کامیابی نصیب ہوئی اور آج وہ ہر ترقی کے میدان میں رواں دواں ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ پھر گھروں کی چار دیواریوں میں قید ہو کر مردوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے جو فروغ انھیں حاصل ہوا ہے وہ خاک میں مل جائے۔ گو میں جانتی ہوں کہ آپ کا جادو اب ہم پر نہیں چل سکتا۔ آپ کچھ بھی لکھیں، اس کا اثر نہ ہوگا، جیسا کہ آپ خود بھی محسوس کر رہے ہوں گے، اس لئے آپ اپنے وقت بے وقت کی راگنی نہ الاپئے تو بہتر ہوگا۔

آخر میں ان صاحبہ نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ ایک آفس میں باعزت اسٹینو کی پوسٹ پر کام بھی کر رہی ہیں۔

اس طرح کے اکثر خطوط مجھے ملتے رہے ہیں اور ملتے رہتے ہیں۔ جنھیں مسکراتے ہوئے پڑھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا کرتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی انھیں اپنے لمعات کا بحث بنا کر جواب بھی دے دیا کرتا ہوں، یہ خط بھی زیر بحث ہے۔ خط لکھنے والی بہن تو ہوں گی نہیں، بھابھی ہی ہوں گی۔ نام پتہ لکھنے کی انھیں شاید اس لئے جرأت نہ ہو سکی کہ کہیں امی جان خبر نہ لے ڈالیں، بہرحال جواباً لکھ رہا ہوں کہ میں ایک متبحر عالم دین نہیں بلکہ جاہل اجہل انسان ہوں لیکن قرآن و احادیث کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ تاریخ اسلام کے بھی اکثر صفحے نظر سے گذرے ہیں، لیکن اسلام نے عورت کو کیا دیا ہے اور اسے قعر ذلت سے نکال کر جس بلند مقام پر پہنچایا تھا اس سے بھی واقف ہوں اور اسی واقفیت کی بنا پر میں حریم میں لکھا کرتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ جن صاحبہ نے یہ خط لکھا ہے وہ نہ جانے یہ کیسے لکھ رہی ہیں کہ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہوں یا انھیں گھروں کی چار دیواری میں قید رکھنے کی تلقین کیا کرتا رہا ہوں

• عورت میں شرم و حیا ضروری ہے۔ عورت کو چاہیئے کہ عورت رہے۔ اسی میں اس کی فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے، قدرت کی یہ ہدایت ہے جس قدر عورت شرم و حیا سے قریب تر ہوگی، اس کی حقیقی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا اور جس قدر دور ہوگی۔ اتنے ہی اس کے مصائب بڑھیں گے۔

——— زول ہما

نے خود اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلائی اعلیٰ تعلیم پردے کے ساتھ لال باغ گرلس کالج میں ہوئی اور اس پر یا اپنی بیوی پر کبھی ایسی قید نہیں لگائی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ نہ حریم میں کبھی اس طرح کی باتیں میں نے لکھی ہیں۔

در اصل میں تعلیم کا مخالف نہیں، لیکن اس تعلیم سے مجھے اختلاف ضرور ہے جو عورت کو پھر اسی مقام پر پہنچا دے، جہاں سے اسلام نے اٹھا کر اسے سربلند کیا تھا۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ انگریزوں کی رائج شدہ تعلیم میں عورتوں کے لئے تعمیر سے زیادہ تخریب کے پہلو ہیں اور کون نہیں جانتا کہ تعمیری باتوں سے کہیں زیادہ اثر تخریبی باتوں کا ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کی بیشتر تعلیم یافتہ خواتین بہک گئی ہیں، ان کے طرز انداز، ان کے لباس، ان کی چال ڈھال اور ان کا رہن سہن غیر اسلامی ہو کر رہ گیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اچھائی کو چھوڑ کر برائی کی طرف راغب ہو جائے۔

میں واقعی اس کے سخت خلاف ہوں کہ عورتیں تعلیم اس لئے حاصل کریں کہ ملازمت کرنے لگیں۔ ضرورت اور مجبوری کی حالتوں میں مخالف نہیں، لیکن خواہ مخواہ عورتیں تعلیم حاصل کر کے اسٹینو اور پرائیوٹ سکریٹری بننے لگیں یہ اچھا نہیں اور یہ منشاء اسلامی کے بھی خلاف ہے۔ کیا رسول کریمؐ نے عورت کو اس طرح دھکے کھانے کی اجازت دی ہے جس طرح آج وہ مردوں میں چلتی پھرتی ریلوں یا بسوں میں سوار ہوتے دیکھی جاتی ہے۔ کیا بانیٔ اسلام کی تعلیمات سے اسکو جائز ثابت کیا جا سکتا ہے۔

عورت اور مرد کو اسلام نے جو مساوات دی ہے بہر حال یہ نہیں کہ جو کچھ مرد کرتا ہے وہی عورت بھی کرے ورنہ مساوات قائم نہ رہے۔ ایک تاجر کے پاس ایک دوکان تھی اور ایک قلمی آم کا باغ تھا اسکے دو بیٹے تھے۔ مرنے سے پہلے اس نے اس بیٹے کو دوکان دے دی جو دوکانداری میں ماہر تھا اور اس کا تجربہ رکھتا تھا۔ دوسرے کے نام باغ لکھ دیا، اس لئے کہ اسے کاروبار سے دلچسپی نہ تھی وہ دیہات کی زندگی پسند کرتا تھا اور اسے باغات اور کاشتکاری سے دلچسپی تھی۔ اگر تاجر ایسا نہ کرتا تو اس کی دوکان اور باغ دونوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ [illegible] نے عورت و مرد کی مساوات کا اعلان اس طرح نہیں کیا ہے کہ دونوں ایک ہی طرح کے کام کریں۔ اسلام نے جسمانی ساخت اور قویٰ کے اعتبار سے کاموں کی تقسیم کر کے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ مرد باہر کی دنیا میں محنت مشقت کر کے روزی کمائے اور اپنے اہل و عیال کو روزی مہیا کرے۔

اسی طرح عورت کو گھر کی ملکہ بنا کر اس پر یہ فرض عاید کیا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر بار اور بال بچوں کی دیکھ ریکھ کرے۔

آج جو عورتیں ملازمت کر کے بے حرمتی کے ساتھ آفسوں کو جاتی ہیں۔ کیا انھیں کے متعلق حضور سرور کائنات نے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ شیشے کی طرح نازک ہیں، کیا ہمارے رسول نے اختلاط مرد و زن کو نہیں روکا تھا۔ کیا اس سے بدتر اختلاط مرد و زن اور کوئی ہو سکتا ہے کہ عورتیں مردوں کی بھیڑ میں ان کی دست درازیوں کو برداشت کرتے ہوئے گھبرا گھبرا کر بسوں اور ریلوں میں سوار ہو کر دفتروں کو جائیں۔ حضورؐ کا منشا تو یہ تھا کہ مرد باہر کے کاموں کو دیکھیں اور خواتین گھروں کو سنبھالیں۔ لیکن ملازمت کرنے والی خواتین پیغمبر اسلام کے منشا اور حکم کے خلاف جا رہی ہیں۔ وہ ایسے لباس پہنتی ہیں جو اسلامی شعائر کے یکسر خلاف ہے۔ وہ میک اپ کر کے، سینٹ و لونڈر میں اپنے کو بسا کر نکلتی ہیں، اس لئے کہ یہ عورت کی فطرت ہے۔ وہ گھر میں چاہے جس طرح رہے، لیکن گھر سے باہر نکلتے وقت بن سنور کر ہی نکلتی ہے۔ آفسوں میں کام کرنے والی خواتین نت نئی سج دھج سے جاتی ہیں جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مردوں کی بد نگاہی کا ہدف بنیں ـــــ

میں عورتوں کو گھروں کی چہار دیواریوں میں قید کرنے کا حامی نہیں جیسا کہ خط لکھنے والی اسٹینو صاحبہ نے لکھا ہے۔ اب رہا یہ کہ اس طرح انھیں مردوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑے گا۔ تو صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اول تو یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ مرد عورتوں پر بس ظلم ہی کرتے رہتے ہیں، لیکن زیادہ بحث میں نہ جاتے ہوئے اتنا ہی لکھوں گا کہ ایک مرد کا ظلم اس سے بہتر ہے کہ پچاسوں مردوں کے ستم سہے جائیں۔ کیا یہ باتیں کسی ستم سے کم ہیں جو روزانہ سروس پر جانے والی خواتین کو جھیلنا پڑتی ہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ سوچئے سو کیا تعلیم حاصل کر لینے اور آزادی کے ساتھ پھرنے سے عورت مرد کے ظلم و ستم سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ کمزوری عورت کی سرشت میں [illegible] فطرت نے ایسا کمزور [illegible] بلکہ اس کے خمیر میں شامل کر دی ہیں کہ وہ مرد کے ظلم و ستم سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ تعلیم حاصل کر کے ملازمت کرنے والی خواتین، مانیں یا نہ مانیں، لیکن انھیں مردوں کی چیرہ دستیوں سے مفر نہ کبھی رہا ہے نہ کبھی ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ گھروں کی ملکہ بن کر رہنے میں ہی عورت

کے لئے زیادہ امن اور زیادہ بہتری ہے۔ ویسے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عورت و مرد کو مساوی درجہ دیتے ہوئے بھی اسلام نے نان ونفقہ دینے کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ کسی مرد نے طلاق کے بعد عورت سے نان ونفقہ حاصل کرنے کی ڈگری حاصل کی ہو۔ یہ بات بھی اسٹیٹو صاحبہ کو سوچنا چاہیئے کہ اگر اسلام نے خواتین کو بھی مردوں ہی کی طرح باہر کی دنیا میں رہ کر کمانے کی آزادی دی ہوتی تو شرع میں نان نفقے کی ذمہ داری صرف مردوں ہی پر نہ ڈالی جاتی۔ اس لئے اگر ہٹ دھرمی نہ کی جائے تو یہ بات ماننا ہی پڑے گی کہ عورت و مرد کی مساوات میں فرق ہے، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ ان کے فرائض جداگانہ ہیں جو ان کی فطرت کے مطابق ان پر عائد کئے گئے ہیں۔ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسلام ہی سے نہیں فطرت سے بھی بغاوت کرنے کے مترادف ہے اور فطرت سے بغاوت کا انجام بدیر ہی سہی اچھا نہیں ہوتا۔

عورت کو تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہیئے لیکن اگر ایسی ہو جو اس کے فرائض منصبی سے تعلق رکھتی ہو تو بہتر ہوگی۔ میں بار بار لکھ چکا ہوں۔ میں پردے کا حامی صرف اس لئے ہوں کہ یہی طریقہ اختلاط مرد وزن کو روک سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی مجبوری کے تحت پردہ نہ کیا جاسکے تو بھی برقعے کے بجائے بے حیائی اور بے شرمی کو لباس نہ بنانا چاہیئے۔

میں خود ان شخصیتوں کا مداح ہوں جنھوں نے تعلیم اور آزادی نسواں کے لئے جد وجہد کی، انھیں یہ وہم وگمان بھی نہ ہوگا کہ تعلیم اور آزادی کے بعد عورت گمراہ ہوجائے گی اور اسلامی شعائر چھوڑ کر مغربی سانچے میں ڈھل جانا پسند کرنے لگے گی۔

<u>اکتوبر کا حریم</u>

میں ان ایام میں جبکہ حریم چھپتا ہے غزالہ کے گال بلیڈر کے آپریشن کے سلسلہ میں بیحد پریشان اور مصروف رہا، لیکن حریم بروقت تیار ہوگیا تھا؟ ——— ۶-۷ اکتوبر کو محرم کے سلسلہ میں تعطیل تھی اس لئے ۸ کو پوسٹ ہوجاتا لیکن خواہ مخواہ کے اس حصہ شہر میں کرفیو لگ جانے سے حریم کئی روز تیاری کے باوجود دفتری کے یہاں سے نہ آسکا تھا۔ پرچہ ۱۲ کو پوسٹ ہوا اس لئے ۲۰ سے ۲۵ تاریخ تک آنے والے شکایتی خطوط پر حریم دوبارہ نہیں بھیجا گیا۔

سرکاری محکموں کی زبوں حالی

ویسے تو موجودہ حکومت کے دور میں ہر محکمہ میں نراج سا پھیلا ہوا ہے، جس سے عوام کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، کاش اسے حکومت کے کرسی نشین بھی محسوس کرسکتے۔ کوئی کام وقت پر نہیں ہوتا۔ رشوت کھلے بندوں لی جارہی ہے اور روکنے والا کوئی نہیں، محکمہ ڈاک، ٹیلیفون اور ریلوے کی زبوں حالی سرفہرست ہے پوسٹ کا محکمہ انگریزوں کے زمانے میں اپنی کارکردگی کے لئے مشہور تھا لیکن اب یہ عالم ہے کہ جیسے کوئی نظم ونسق ہی نہ ہو۔ عام ڈاک کا تو خیر کوئی محاسبہ ہی نہیں ہوسکتا، جتنی چاہے تقسیم کی جائے، جتنی چاہے تلف کردی جائے، حد ہے کہ رجسٹرڈ آرٹکلس بھی وقت پر نہیں ملتے۔ دہلی سے چلنے والے رجسٹرڈ لفافے اور پیکٹ پندرہ پندرہ دن بعد وصول ہوتے ہیں۔ ڈاکخانوں کی مہریں اول تو لگتی ہی کم ہیں اور لگتی ہیں تو ایسی کہ تاریخ پڑھی نہ جاسکے۔ وی۔ پی کے ذریعہ کام کرنے والے تو مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اکتوبر میں آج ۲۲ تاریخ تک صرف ایک روز وی۔ پی کے منی آرڈر آئے ہیں جب سے امین آباد پارک کا ڈاک خانہ سارٹنگ آفس بنایا گیا ہے۔ بدنظمی کے اعتبار سے بدترین کہا جاسکتا ہے۔ وہاں جو کافی اسٹاف رکھا جاتا ہے نکارکرد اہلکار۔ جب بھی شکایت کیجئے، یہی جواب ہے کہ آدمی نہیں ہیں۔ کام کیسے ہو آدمی کیوں نہیں ہیں اس کا جواب افسران بالا بھی نہیں دیتے اس وقت سربراہان مملکت کو بس ایک ہی فکر ہے کہ کرسیاں نہ چھوٹنے پائیں۔ کرسی دلانے والے چاہے جس مصیبت میں گرفتار رہیں۔

ٹیلیفون شاید مہینے میں چند روز کام دیتے ہوں۔ رانگ نمبر ملنے سے کالس کی تعداد دوچند ہوجاتی ہے۔ شکایت پر ہفتوں کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ بل من مانی بنائے جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں داد فریاد بیکار ثابت ہوتی ہے۔ آزاد ہونے کے بعد ہر ملک کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ ان پر قابو پالیا جاتا ہے، لیکن ہندوستان میں رفتہ رفتہ دشواریوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ نظم ونسق کی یہ زبوں حالی کہاں جاکر رکے گی اور کب۔

حضرتِ امامِ حسین رض

تحریر:۔ تاج الدین، ایم اے اسلامیات

چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں واقعہ کربلا اور شہادت حسینؓ ایک ایسا دردناک سانحہ ہے جو ہر مسلمان کے دل میں حق و باطل کا ایک ایسا درس دیتا ہے جس سے ہم اپنی زندگی کو حقیقی معنوں میں اسلام کی قدروں میں سمو کر خالصتاً اسلامی رنگ ڈھنگ کو اپنا سکیں۔ شہادت امام حسینؓ در اصل جنگ تھی غیر جمہوری اور غیر شرعی عمل کے ساتھ یہ ایک فرد واحد کی جنگ نہیں تھی یہ حق و صداقت کے علمبردار اور اسلامی خلافت کو ملوکیت اور بادشاہت میں بدلنے والے عوامل کے درمیان جنگ تھی اور حضرت امام حسینؓ نے شہید ہو کر رہتی دنیا کے لئے یہ مثال دی اور ایک عظیم سبق دیا کہ حق کسی قوت اور حوادثِ زمانہ سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

سنہ ۶۰ھ میں یزید بن معاویہ جب تخت نشین ہوا تو بہت سارے مسلمانوں نے مجبور ہو کر اس کی بیعت کر لی۔ مگر چند عظیم اور معتبر اکابرین کرام ایسے تھے جو یزید کی بادشاہت کو غیر شرعی سمجھتے تھے اور یزید کے غیر شرعی مشاغل کے باعث اس کو پسند نہیں کرتے تھے ان میں حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پیش پیش تھے جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ وفات پا گئے تھے۔

یزید کو یوں بھی حسینؓ اور ابن زبیر سے خطرہ تھا۔ چنانچہ یزید نے فوراً مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو حکم دیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت امام حسینؓ کو طلب کر کے کسی رعایت کے بغیر یزید کے حق میں بیعت لے۔

ولید بن عتبہ حاکم مدینہ مزاجاً رحمدل اور امن پسند تھا اور جب اس نے حضرت امام حسینؓ کو یزید کا فرمان دکھا کر اس کی بیعت کرنے کو کہا تو حضرت امام حسینؓ نے فرمایا کہ مجھ جیسا آدمی خفیہ بیعت نہیں کر سکتا جب میں مناسب سمجھوں گا سب لوگوں کے سامنے بیعت کر دوں گا۔

پھر حاکم مدینہ نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے یزید کے لئے بیعت لینا چاہی مگر وہ بھی ایک دن کی مہلت لے کر گئے اور راتوں رات مکہ تشریف لے گئے اور حرم میں پناہ لی۔ حضرت امام حسینؓ بھی اپنے اہل و عیال کو لیکر مکہ تشریف لے گئے اس لئے کہ وہ اس غیر شرعی بیعت کو تسلیم کرنے پر کسی صورت بھی تیار نہیں تھے۔

ـــــــــــــــ

مسلمانوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو خلافت کو اہل بیعت کا حق سمجھتا تھا اور کوفہ میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی۔ ابو سلیمان بن صرد ان کا سردار تھا۔ یزید کی تخت نشینی کے وقت یہ لوگ فیصلہ کر چکے تھے کہ چونکہ یزید کی خلافت غیر شرعی ہے اس لئے اس کی بیعت سے انکار کیا جائے اور حضرت امام حسینؓ کو امیر المومنین بنایا جائے ـــ اسی دوران لوگوں کو یہ بھی خبر مل گئی کہ حضرت امام حسینؓ نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا ہے اور مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے مسلسل خطوط لکھ کر حضرت امام حسینؓ کو اپنے ہاں کوفہ آنے کی دعوت دی اور اپنی مکمل حمایت اور تحفظ کا یقین دلایا بلکہ چند بزرگ تو خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کوفہ چلنے کی دعوت دی۔

حضرت امام حسینؓ نے واقعات اور حالات کا جائزہ لیا۔ وہ جانتے تھے کہ یزید کے مقرر کردہ آدمی ان کو آرام سے نہ بیٹھنے دیں گے اور بیعت کے لئے مجبور کریں گے جب کہ یزید کی غیر اسلامی بیعت کرنا ان کی ذاتِ بابرکات کو گوارا نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیل کو اہل کوفہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ جب حضرت مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے اپنے دل کا حال بیان کیا اور حضرت امام حسینؓ کے لئے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اٹھارہ ہزار کوفیوں نے حضرت مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر حضرت امام حسینؓ کے لئے بیعت کر لی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر حضرت مسلم بن عقیل نے مکہ مکرمہ میں حضرت امام حسینؓ کو خط لکھا کہ اہل کوفہ آپ کے لئے جان و دل سے بیعت کر چکے ہیں اس لئے آپ فوراً تشریف لائیں۔

اس وقت کوفہ کا حاکم نعمان بن بشیر تھا جب اس کو مسلم بن عقیل کی آمد اور دیگر واقعات کا علم ہوا تو اس نے صلح پسندی کی وجہ سے کوئی

سختی کرنے کے بجائے لوگوں کو سمجھایا مگر بہت جلد یزید کو اس کے جاسوسوں نے کوفہ کی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ یزید نے نعمان بن بشیر کو برطرف کر کے عبداللہ بن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا اور ساتھ ہی سخت تاکید کی کہ ممکنہ خدشات کو سختی سے کچل دے چاہے مسلم بن عقیل کو ہی قتل کیوں نہ کرنا پڑے۔

عبداللہ ابن زیاد نے کوفہ کا حاکم بنتے ہی احکامات جاری کئے اور کسی بھی علاقہ میں حالات کی خرابی کا ذمہ دار اس علاقہ کے رئیس کو ٹھہرا کر سزائے موت دینے کی ایسی دھمکی دی جس سے کوفہ کے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ مسلم بن عقیل نے اب اپنی رہائش ہانی بن عروہ کے پاس رکھی اگرچہ وہ بھی حاکم کوفہ کے سخت احکامات سے خوفزدہ تھے مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ اور بالآخر ابن زیاد کو جب خبر ہوئی تو اس نے ہانی بن عروہ کو بلا کر سخت ڈرایا اور دھمکیاں دیں۔ مگر ہانی بن عروہ نے مسلم بن عقیل کو ابن زیاد کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا جس پر ابن زیاد نے انھیں مارا پیٹا اور زندان میں ڈال دیا۔

مسلم بن عقیل پریشان ہو گئے اور ایک بوڑھی عورت کے گھر پناہ لی مگر عبداللہ بن زیاد نے محمد بن اشعث کو ان کی گرفتاری کے لئے بھیجا۔ اشعث نے مکان کا محاصرہ کیا اور پھر مسلم بن عقیل کو جان کی امان کی یقین دہانی کرائی بلکہ وعدہ کیا۔ لیکن جب ابن زیاد کے سامنے ان کو لایا گیا تو اس نے حکم دیا کہ ہانی بن عروہ اور مسلم بن عقیل دونوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس سے قبل مسلم بن عقیل نے ابن اشعث کے ہاتھ ایک خط حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں روانہ کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اہل کوفہ ہرگز ہرگز قابل بھروسہ نہیں ہیں اور فوراً واپس مکہ کو لوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلم بن عقیل نے شروع شروع میں اہل کوفہ کا جوش و خروش دیکھ کر حضرت امام حسینؓ کو خط لکھ کر کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ اس خط پر حضرت امام حسینؓ نے اپنے اہل و عیال کے ہمراہ کوفہ تشریف لے جانے کا پروگرام بنالیا۔ بہت سارے عزیز و اقارب نے حضرت امام حسینؓ کو عراق جانے سے منع کیا اور آنے والے مشکل حالات کی نشان دہی کی۔ لیکن حضرت امام حسینؓ بخوبی جانتے تھے کہ یزید کی بیعت کے لئے ان کو کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا جائے گا اور یزید کی بیعت کرنا گویا شریعت محمدی کی خلاف ورزی تھی اور نواسۂ رسولؐ ایک بدعت اور غیر شرعی بات کے لئے اپنے اصول کو کس طرح بدل سکتے تھے۔ تاریخ اسلامی اس بات کی گواہ ہے کہ یزید کی حکومت اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کوئی بھی قدم اٹھانے سے دریغ نہ کر رہی تھی اور بعد میں آنے والے حالات نے اُمیہ خاندان کے عبدالملک نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کروا یا اور حرم پاک پر حملہ کر کے اس کو سخت نقصان پہنچایا۔

حضرت امام حسینؓ کا وجود تو اموی حکمرانوں کے لئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ اور حضرت امام حسینؓ حالات کو بخوبی سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے حق کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کے لئے خدا کی مرضی کے آگے لبیک کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنے دل سے فیصلہ کر کے کوفہ روانہ ہو گئے۔ ثعلبیہ کے مقام پر محمد بن اشعث کا بھیجا ہوا قاصد حضرت امام حسینؓ سے آ ملا اور مسلم بن عقیل کے قتل کی تمام روداد سنائی اور ان کا آخری پیغام بھی سنایا۔ لیکن اب وقت گذر چکا تھا شہادت کی منزل سامنے تھی۔ مسلم بن عقیل کے عزیز و اقارب اور برادران بھی حضرت امام حسینؓ کے قافلے کے ہمراہ تھے اور اب انھوں نے کسی بھی حالات کی پرواہ کئے بغیر اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

حاکم کوفہ ابن زیاد کو جب حضرت امام حسینؓ کی کوفہ کی طرف آمد کی خبر ہوئی تو وہ بوکھلا گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نواسۂ رسولؐ کی تشریف آوری سے کوفہ کے لوگ یزید کے خلاف ہو جائیں گے اور خود ابن زیاد کا بچنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے حضرت امام حسینؓ کو راستے میں ہی روکنے کے انتظام بند و بست کر لئے اور جب نواسۂ رسولؐ اپنے ہمراہ عزیز و اقارب کے چشمۂ فرات سے کچھ آگے ہی پہنچے تھے کہ کوفہ کا ایک سردار حر بن یزید تمیمی ہزار سواروں کے ہمراہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور حضرت امام حسینؓ کو گرفتار کر کے کوفہ میں ابن زیاد کے سامنے پیش کرنا چاہا۔ لیکن حق کے علمبردار نواسۂ رسولؐ نے اس سردار کو بار بار یاد دہانی کروائی کہ خود اہل کوفہ نے بلایا ہے۔ خود حر بن یزید تمیمی بھی ایک کوفی سردار تھا۔ حالات کی کشیدگی اور ابن زیاد کے شیطانی ارادوں کے باعث پہلے خود حضرت امام

واپس گھر لوٹ جانے کا بھی ارادہ ظاہر کیا اور ابھی گفتگو جاری تھی کہ کوفیوں کا ایک لشکر عمرو بن سعد کے زیر کمان آن پہنچا۔

ابن زیاد نے عمرو بن سعد کو حکم روانہ کیا کہ حضرت امام حسینؓ کو گھیرے میں لیکر یزید کی بیعت کے لئے مجبور کرے اور اگر سختی کرنا پڑے تو سختی کرے پانی بند کردے لیکن حضرت امام حسینؓ نے اپنے قول و فعل میں ایسی پختگی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور رہتی دنیا تک عیاں کر دیا حق کبھی باطل کے آگے نہیں جھک سکتا۔ اسی لئے انھوں نے کسی صورت بھی یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر کربلا کے ویران تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے اہل و عیال کے لئے پانی بند کر دیا گیا۔ بچے پیاس سے بلکتے رہے اور جوان پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئے۔ مگر ان ظالموں کے دلوں میں کوئی رحم نہ آیا۔ اگر کوئی شخص پانی حاصل کرنے کی غرض سے آگے بڑھتا تو اس کو زبردستی پیچھے دھکیل دیا جاتا اور زدوکوب کیا جاتا۔ اسی اثناء میں کوفہ سے ایک اور لشکر شمر ذی الجوشن کی سرکردگی میں آپہنچا۔ جس کو ابن زیاد نے یہ حکم دیا کہ اگر رشتہ داری کی وجہ سے عمرو بن سعد حضرت امام حسینؓ سے کوئی رعایت کریں تو ان کو برطرف کرکے فوج کی کمان خود سنبھال لے۔ اب اس نئے لشکر کی آمد کی وجہ سے حالات اور زیادہ کشیدہ ہو گئے اور مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

حضرت امام حسینؓ نے دیکھا کہ دشمن ہر قیمت پر جنگ کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے تو پھر آپ نے ہمراہ بہتر آدمیوں کی باقاعدہ صف بندی کی اور دس محرم الحرام ۶۱ھ کو کربلا کے میدان میں حق و باطل کا وہ معرکہ پیش آیا کہ جس کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ

قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تو بات مکمل طور پر صادق آتی ہے۔ حضرت امام حسینؓ کے ہمراہ صرف بہتر افراد تھے۔ خواتین کا کیمپ کچھ فاصلے پر لگا ہوا تھا اور پہلے پہل فرداً فرداً جنگ ہوئی۔ مگر بعد میں سنگدل اور ظالم دشمنوں نے یلغار کر دی۔ چار ہزار کے لشکر کے مقابلے میں اگرچہ حق پرستوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن حضرت امام حسینؓ نے ہمارے لئے ایک روشن سبق چھوڑا کہ افرادی برتری کبھی حق کو جھکانے پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کچھ ہی دیر میں حضرت امام حسینؓ کے ساتھی باری باری شہادت پاتے گئے، اور ایک ظالم جہنمی نے حضرت امام حسینؓ کو بڑھ کر شہید کر دیا۔ جنگ میں حضرت امام حسینؓ اس بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کو نیست و نابود کرتے ہوئے جہنم واصل کرتے گئے، اور دوسرے اہلِ بیعت کے افراد نے میدانِ کربلا میں حق کے اس معرکہ میں اپنی کمال جرأت و استقلال کے وہ روشن نشانات چھوڑے جو ان کی عظمت کے آئینہ دار ہیں۔ حضرت امام حسینؓ بھی مسلسل جنگ سے بہت زخمی ہو چکے تھے اور اس پر بھی وہ پیچھے نہ ہٹے اور بالآخر شہید ہوئے تو اس پر ایک بدبخت نے آگے بڑھ کر آپ کا سر تن سے جدا کر دیا اور نیزے پر لٹکا کر کوفہ میں ابن زیاد کے سامنے پیش کیا۔ جس نے سر مبارک کو یزید کے پاس بھجوا دیا۔

اس کے بعد کوفی لشکروں نے گھوڑے سے دوڑا کر تمام شہیدوں کی لاشوں کی بے حرمتی کی، اور سادات کو اپنے ہمراہ لے کر یزید کے پاس لے گئے اس جنگ میں مردوں میں سے صرف حضرت علی بن حسینؓ زندہ رہ گئے۔ جو اس وقت علیل تھے۔ اور بعد میں حضرت زین العابدینؓ کے نام سے مشہور ہوئے اور حضرت امام حسینؓ کی اولاد کا سلسلہ انہی سے چلتا ہوا آیا۔

واقعہ کربلا نے پورے عالم اسلام کے مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ جس نے بھی اس واقعہ کے متعلق سنا دھاڑیں مار کر رو دیا۔ اور حاکم وقت کی اسلام دشمنی کے خلاف اور اس اندوہناک ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور یہی جذبہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں پروان چڑھتا رہا، بنو اُمیّہ کے خاندان کے خلاف نفرت پیدا ہو کر شدید تر ہو گئی اور جب بنو اُمیّہ کا زوال آیا تو مسلمانوں نے بنو اُمیّہ کو بڑی بیدردی اور سفاکی سے ذبح کیا واقعہ کربلا میں جگر گوشۂ رسولؐ کے اس بیدردانہ اور سفاکانہ قتل کو نہ کوئی مسلمان برداشت کر سکتا تھا اور نہ خاموش رہ سکتا تھا اور لوگ تو پہلے ہی یزید کے خلاف تھے۔ اس واقعہ کے بعد تمام عالم اسلام میں بنو اُمیّہ اور خصوصاً یزید کے خلاف نفرت و حقارت کی ایسی لہر دوڑ گئی جس نے آنے والے حالات میں بنو اُمیّہ کو تخت سے اتار کر ان کے مُردوں کو قبروں سے نکال نکال کر روند ڈالا۔

بعد کے واقعات اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اگر حضرت امام حسینؓ اسلام کی سربلندی اور اس کے اصول کو اصلی خد و خال میں باقی رکھنے کے لئے اپنے سر کی قربانی نہ دیتے تو اسلام کی صورت مسخ ہو جاتی اور اسلامی اصول دھندلکوں میں گم ہو جاتے۔ اسی لئے حضرت

ناقابلِ فراموش

عفت موہانی

(گزشتہ سے پیوستہ)

میرے گھر کے سامنے چندریا نامی لیبرر رہتا تھا! سلوچی اس کی بیٹی بہت خوب صورت تھی۔ نام اس کا سلوچنا تھا مگر لاڈ سے سب سلوچی کہتے تھے۔ اس کی خوبصورتی اس کے لئے ایک عذاب بن گئی تھی۔ گلی کے بدمعاش اسے چھیڑتے اور آوازے کستے تھے۔ مگر جس گھر میں وہ جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے پر نوکر تھی۔ اس گھر کے لڑکے تک اس پر بُری نظر رکھتے تھے۔ اس کے ماں باپ کو اس کا احساس تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے۔ باپ مزدور تھا۔ اس کا کام پرچا نا فروری تھا۔ ماں کسی گھر میں ملازمہ تھی۔ وہ روز صبح سویرے جاتی اور شام کو واپس آتی۔ بھائی بہن چھوٹے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر باپ نے چاہا تھا کہ لڑکی کی شادی کر دی جائے۔ ایک لڑکا اس نے دیکھ بھی رکھا تھا۔ وہ سوائے اس کے کچھ خوشحال تھا اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ صورت شکل کے لحاظ سے نہایت بدنما بڑے بڑے دانت نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے۔ اور مزید بدنمائی یہ کہ وہ کانا بھی تھا۔ لیکن سلوچنا کے باپ کے نزدیک لڑکے کی بدنمائی قابلِ لحاظ نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بدنامی سے بچے۔ کیونکہ اب محلہ بھر میں سلوچنا کی آوارگی کا چرچا ہونے لگا تھا! سلوچنا اس بدصورت لڑکے سے شادی پر راضی نہ تھی وہ ماں سے صاف صاف کہتی تھی کہ جس گھر میں ملازم ہے۔ اسی نوکری غلامی میں زندگی کاٹ دے گی لیکن بدشکل لڑکے سے بیاہ نہ کرے گی۔ باپ کو خبر لگی اس نے لڑکی پر تشدد کرنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں لڑکے نے بھی سلوچنا سے ملنا اور اس پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔ ادھر باپ کی زیادتی اُدھر لڑکے کی زبردستی۔ محلے والوں کو ایک تماشہ ہاتھ آ گیا تھا۔ سب مل کر چندریا کو مشورہ دینے لگے کہ مزید بدنامی سے بچنے کے لئے جلد سے جلد لڑکی کو بیاہ دے تقریباً روز باپ بیٹی میں جھک جھک ہوتی تھی۔ ایک رات اسی مسئلہ پر باپ نے سلوچنا کو بہت مارا۔ اور اسے الٹی میٹم دے دیا کہ کل صبح کو اسی بدشکل لڑکے سے بیاہ کر دے گا! یہ کہکر وہ اپنے کام پر چلا گیا۔ ماں بھی لڑکی کو نصیحت کر کے چلی گئی۔ سلوچنا چھوٹے بہن بھائی کے لئے کھانا پکانے باورچی خانہ میں گئی۔ لوگوں نے بعد کو بتایا کہ وہ روٹی پکاتے پکاتے رہ رہ کر ہاتھ روک کر سامنے تکنے لگتی تھی۔ نجانے کیا سوچ رہی تھی!۔ بارہ بجے باپ کام سے واپس آیا۔ بیوی کو ساتھ لیتا آیا تھا۔ اور سلوچنا سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ مندر چلے۔ سلوچنا کچھ نہ بولی۔ باپ کے ساتھ رکشا کے اڈے تک گئی! باپ رکشا ٹھہرا رہا تھا کہ اس نے کہا۔ میں نے اپنی پیٹی میں پچاس روپے رکھ چھوڑے ہیں وہ لے کر آتی ہوں۔ اور گھر آئی۔ پھر کسی نے نہ دیکھا کہ اس نے کیا کیا۔ میدان صاف دیکھ کر اس نے ایک گلاس میں مٹی کا تیل لیا۔ دیاسلائی کی ڈبیہ لے کر غسلخانے میں آئی۔ دروازہ بھیڑا اور گلاس سر پر انڈیل کر تیلی دکھا دی۔ بس، ایک بھیانک چیخ ہمسایوں نے سنی۔ پھر گوشت جلنے کی بو آئی۔ سب نے غسلخانے سے دھواں نکلتے دیکھا۔ اور دروازہ کھولا تب دھڑام سے لڑکی نیچے گری۔ پوری طرح جل چکی تھی۔ بھیجہ پک گیا تھا۔ بال جل چکے تھے۔ آنکھیں ناک ہونٹ اور گال سب بھن گئے تھے! کسی نے اس کے ماں باپ کو خبر کر دی۔ سب دوڑے آئے۔ مگر تب تک وہ تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ماں کی گریہ و زاری دیکھی نہیں جاتی تھی۔ یہی کہہ کہہ کر سر زمین پر پٹخ رہی تھی کہ میری پلی پلائی بچی چلی گئی۔ اس کے دروازے کے سامنے ہم اکٹھا تھا سب یہی کہہ رہے تھے ابھی ادھر سے ہنستی ہوئی گزری تھی۔ ابھی ہم سے بات کی تھی!! اور ابھی ختم ہو گئی! پندرہ سولہ برس کی لڑکی گھبرا کر اس فیصلے پر پہنچی تھی کہ جب ماں باپ ہی اس کے حق میں اتنے ظالم بن گئے ہیں تو پھر اسے کون پناہ دے گا!! بس جان پر کھیل گئی۔ باپ بھی بیٹی کی لاش سامنے رکھے رو رہا تھا۔ مگر اب اس بدبخت سے ہمدردی کسی کو بھی نہیں تھی۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ تو نے اگر اس قدر ظلم نہ کیا ہوتا تو شاید یہ نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ اپنی بیٹی کا قاتل تو ہے۔ چاہے ظلم باپ کا ہو یا شوہر کا۔ جان عورت ہی کی لیتا ہے۔ اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔

والدہ کا چشم دید واقعہ سنئے! ان کے کوئی رشتہ دار بھائی تھے۔ بہت خوب صورت، پڑھے لکھے، اور بزدلی کی حد تک شریف، ماں نہیں تھیں، باپ اور ان کی بہن وہ خود۔ یتیم آدمی تھے۔ باپ حکیم تھے۔ انہی کی آمدنی پر مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ باپ کچھ سخت گیر اور کم گو تھے لیکن بیوہ بہن حد درجہ سنگدل اور بے رحم تھیں۔ باپ اور بھائی سے بڑا ظالمانہ سلوک کرتیں۔ چونکہ بیوہ تھیں اس لئے انہیں کوئی کچھ کہتا نہ تھا کہ کہیں بیوہ کی دل آزاری نہ ہو۔ ان کی خانگی

کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ظالم بنتی گئیں، گھر میں روپیہ پیسہ کافی سے زیادہ تھا۔ لیکن نہایت واہیات کھانا پکتا تھا۔ کسی بات کا انتقام لینے کی خاطر کبھی روٹیوں میں نمک کی کنکریاں ہوتیں۔ کبھی سالن میں مرچ اتنی کہ زبان پر نہ رکھا جائے۔ باپ اگر کچھ کہیں تو زبان درازی پر تیار۔ بھائی کا تو منہ کھولنا ہی ناممکن تھا۔ ان کے گھر کوئی آتا جاتا نہ تھا۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔ وہ خود بھی نہ کہیں جاتی تھیں اور نہ یہ گوارہ کرتی تھیں کہ کوئی ان کے ہاں آئے۔ بہر حال ایک مرتبہ ان کے پیچھے بیں کوئی چکر چلایا تو وہ بیٹے بھائی کا بیاہ کر کے ایک ملازمہ نما بھاوج لے آئیں۔ سب کا خیال تھا کہ شاید بھاوج کی موجودگی ان کی سنگدلی کو کم کر دے گی لیکن ہوا یہ کہ بے چاری بھاوج جو کسی طرح ان کی عزیز بھی ہوتی تھی ان کی سخت گیری کا نشانہ بن گئی۔ انھوں نے اسے خادمہ تو بنا ہی رکھا تھا!۔ لیکن ستم یہ کیا کہ کسی روز بھائی بھاوج کو اکیلے رہنے کا موقعہ نہ دیا۔ دونوں کے درمیان پلنگ بچھا کے لیٹیں۔ بھاوج تو کچھ نہ کہہ سکتی۔ بھائی بھی دل ہی دل میں گھوٹ کے رہ جاتے!۔

بہت سے دن یوں گزر گئے!۔ پھر غالباً اس ناقابل برداشت ماحول کا تذکرہ انھوں نے اپنے کسی دوست سے کیا۔ انھوں نے باپ سے بات کی اور کہا کہ ان کے نام سے جو کچھ جائداد ہے وہ انھیں دے دی جائے! بہن صاحبہ بھی تھیں۔ بہت برافروختہ ہوئیں۔ باپ کو بہکایا۔ اس قدر بہکایا کہ باپ نے بھی بیٹے کو خوب صلواتیں سنا دیں۔ برداشت کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹے نے بھی کچھ گفتنی ناگفتنی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ مگر بیٹے کی گستاخی باپ سے برداشت نہ ہوئی انھوں نے غصہ سے کہا کہ سامنے سے چلے جاؤ۔ منہ کالا کرو اور پھر اپنی شکل مت دکھاؤ!۔

طعنہ بیٹے کو کھل گیا۔ انھوں نے سوچا کہ ظلم سہنے کے بجائے اب ظلم کرنا بھی چاہیئے۔ لیکن اس طرح کہ ان کے ظلم کی کوئی تلافی بھی نہ ہو سکے۔ مطلب یہ کہ اپنی ذات پر ظلم کر کے سب کو دکھایا جائے کہ بدلے کی ایک صورت یہ بھی ہے!۔

چنانچہ انھوں نے بازار سے کوئی زہر خریدا۔ باپ حکیم تھے۔ انھیں بھی پتہ تھا کہ کیا چیز زہر ہوتی ہے اور کیا تریاق۔ چنانچہ زہر لاکے اسے کوٹا چھانا بھگویا اور مقررہ مدت کے بعد جب معلوم ہو گیا کہ قاتل زہر تیار ہو چکا ہے تو اطمینان سے پی لیا اور دروازہ بند کر کے پلنگ پر آ لیٹے۔

گھر کی فضا ایک ناگوار جھک جھک کے بعد کشیدہ ہو گئی تھی۔ بہر حال جب رات کے کھانے پر بیٹا نہ آیا تو والد صاحب نے ملازمہ سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ تو سہ پہر سے نہیں ہیں۔ مگر ان کا کمرہ بند ہے اور اندر سے کسی جانور کے غرانے کی آواز اس نے سنی ہے!۔

والد صاحب کو کچھ شک ہوا۔ باہر گئے۔ دروازے سے کان لگا کر سنا تو سب خاموشی تھی۔ اندر سے دروازہ بند پا کر انھوں نے بیٹے کو آوازیں دیں۔ دستک دی اور دروازہ بجایا۔ پھر اس طرح چیخے چلائے کہ مردہ بھی زندہ ہو تا۔ لیکن اندر بدستور سناٹا طاری رہا۔ اب تو بڑے میاں بدحواس ہونے لگے۔ آیا اس نے دروازہ الگ کیا اور پتہ چلا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ جوان خوب صورت بیٹا جس کی شادی ہوئے بمشکل ایک دو ماہ ہوئے تھے۔ پلنگ پر مردہ پڑا ہے۔ تکیہ پر دوسطری رقعہ رکھا ہے۔ کہ آپ نے منہ کالا کرنے کا حکم دیا تھا۔ کالا کر لیا۔ اب کبھی آپ میری شکل نہ دیکھیں گے۔ بڑے میاں غش کھا کر گر پڑے۔ بعد کی داستان المناک ہے کہ بیٹے کی قبر کے پاس باپ نے ایک چھپر ڈال کے رہنا شروع کیا کہ شاید رات دن کسی وقت بیٹا آواز دے لے!۔ کئی دن بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ بھی چھپر تلے مردہ پڑے ہیں۔ بہن پر باپ اور بھائی کی اموات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بیوہ بھاوج کو شدید تر کر کے گھر سے نکال دیا۔ سنا ہے کہ وہ باپ بھائی اور بھاوج کے بعد بہت عرصہ زندہ رہیں اور ان کے انتقال پر ان کی جمع جتھا کئی ہزار کی رقم دوسروں نے ہتھیائی!۔

میری عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ یہ واقعہ مجھے دھندلا سا یاد ہے۔ جس کی بعد کو صاف صاف تصریح میری دادی اماں نے کی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک زمانے میں شہر حیدر آباد میں دیوالی بہت دھوم سے منائی جاتی تھی۔ دیپ، چراغ اور قمقمے شہر کو جگمگا کے رکھ دیتے تھے۔ اور ہمیں ابا روشنی دکھانے کے لئے لے جاتے تھے! مغرب ہی سے ہم سب کار میں بیٹھ کر نکل ہی رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی بھکارن بچی ہاتھ پھیلا کر کار کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ والد صاحب نے اسے ایک روپیہ دیا اور وہ بے حد دعائیں دیتی چلی گئی! کسی کو اس کا خیال بھی نہ رہا۔ اور ہماری کار بھی شہر کی جگمگاہٹ میں گم ہو گئی۔ معلوم نہیں کون سے راستے سے اسی وقت نظام سرکار کی سواری گزری اور پولیس والوں نے تمام گاڑیوں کا رخ موڑ دیا۔ گاڑی اچانک ایک سنسان سڑک پر آ گئی۔ بلکہ یہ سڑک بھی نہیں۔ کوئی جنگل سا تھا۔ ہماری گاڑی اونچے نیچے راستے پر اچھلتی ڈگمگاتی چلی جا رہی تھی۔ رات کا سناٹا، تاریکی اور درخت عجیب سے گھنے اور اونچے نیچے

درخت ۔ جو وحشت ناک مقام تھا!۔ ہر لحظہ یہی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں گاڑی پھسل نہ جائے یا کوئی درندہ حملہ نہ کر دے۔ کوئی ڈاکو ان درختوں سے نکل نہ آئے۔ ڈرائیور چاہ رہا تھا کہ روشن راستے پر گاڑی لے جائے لیکن وہ راستہ ملتا کہاں تھا۔ ایک جگہ گاڑی تقریباً دو ڈھائی فٹ اونچے چبوترے سے اس طرح نیچے آئی کہ ہم سب بکھر کے رہ گئے!۔ اب کامل یقین ہو گیا کہ رات بھر یہیں بھٹکا کریں گے یا پھر کسی درندے اور کسی ڈاکوؤں کا شکار بن جائیں گے۔ ہم لوگ تو بچے تھے رونے لگے تھے۔ مگر بزرگ تک حواس باختہ ہو گئے تھے۔ ڈرائیور پریشان تھا!۔ اتنے میں اچانک سامنے سے ایک صاحب سفید لباس پہنے نکلے!۔ ان کی موجودگی میں سب کی ڈھارس بندھی۔ چچا جان نے اتر کر ان سے راستہ پوچھا اور بتایا کہ روشنی دیکھنے آئے تھے غلطی سے ادھر آ گئے اب راستہ نہیں ملتا! انھوں نے بتایا کہ سیدھے چلے جائیے۔ موٹر آہستہ آہستہ ان کے پیچھے چلی۔ کچھ ہی دور پہونچ کر روشنی دکھائی دی اور پھر آباد راستہ مل گیا۔ چچا جان کار سے اترے اور چاہا کہ ان رہنما صاحب کا شکریہ ادا کریں مگر اب جو دیکھتے ہیں تو ان صاحب کا کہیں پتہ نہیں۔!

خیر جناب گھوم پھر کے روشنی دیکھی۔ رات کے بارہ ایک بجے گھر پہونچ کر یہ قصہ دادی اماں کو سنایا تو وہ بولیں۔ تم نے پہچانا وہ صاحب کون تھے۔؟ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ دادی اماں نے کہا کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں۔۔۔ دوسرے دن چچا جان نے اپنے دوست احسان الدین صاحب کے ساتھ جا کر وہی راستہ پھر دیکھا اور بتایا کہ جدھر ہماری کار جا رہی تھی وہاں ایک نہایت خوفناک اندھا کنواں تھا۔ اگر ذرا بھی ہم آگے بڑھتے تو اس کنویں میں گر جاتے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ کون لوگ تھے کہاں گئے!۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صاحب خضر علیہ السلام ہی ہوں۔ مگر میرا پختہ یقین ہے کہ ہمیں اس ننھی سی بھکارن بچی کی دعاؤں نے بچایا۔ جو ایک روپئے میں انمول دعائیں دے گئی تھی۔

"تم سب کو اللہ اچھا رکھے۔ کبھی تم پر کوئی مصیبت نہ آئے۔ اللہ تم کو ہر بری گھڑی سے بچائے!!۔

یوں تو اور بھی بہت سے "تاثر انگیز ناقابل فراموش واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ جنھیں بیان کروں تو بڑا طویل مضمون تیار ہو جائے۔ لیکن یہ واقعہ ابھی حال ہی کا ہے۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ میں سحری میں کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھاتی۔ بس دو کپ چائے تین چار بسکٹ سے میری سحری ہو جاتی ہے!۔ یہ واقعہ جن دنوں کا ہے۔ ہم ایک ایسے مکان میں تھے۔ جہاں کچھ آسیبی خلل بتایا جاتا تھا!۔ اکثر اگر بتی کی خوشبو آتی۔ کبھی یوں لگتا کہ کسی کمرے میں لوبان جل رہا ہو۔ کبھی یوں معلوم ہوتا کہ کوئی دالان میں چل رہا ہو۔ مگر میں نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہ کی۔ مجھے یقین تھا جس گھر میں کوئی شخص تلاوت کرتا اور نماز پڑھتا ہو۔ وہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا!۔ بہر حال ہوا یہ کہ ـــ حسب معمول سحری کو سب جاگے، اس زمانے میں میری بھانجی اسما بھی میرے پاس تھی!۔ وہ اور خالدہ اٹھے! مجھ سے بھی اٹھنے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے ان سے کہا تم لوگ سحری کرو۔ چائے کے وقت تک میں بھی آ جاؤں گی۔ خالدہ اور اسما چلے گئے اور میں دقت گذرنے پر اٹھنے کا ارادہ کر کے میز پر آ بیٹھی کہ کسی افسانے کا مسودہ نامکمل تھا اسے مکمل کر لوں۔ اتنے میں ایک آہٹ سن کر رخ پھیرا تو کیا دیکھتی ہوں کہ دروازے میں ایک صاحب کھڑے ہیں۔ میز پر ہاتھ ٹیکے۔ سر پر شیروانی ہے۔ سفید پاجامہ اور سر پر کالی ٹوپی۔ شریف صورت۔! میں مارے دہشت کے اپنی جگہ برف ہو گئی۔ میرے منہ سے آواز تک نہ نکلی ایسی گھگھی بندھی کہ اگر وہ کیفیت دو منٹ اور قائم رہتی تو یقینی میرا دم نکل جاتا!۔ ان صاحب نے کہا۔

" آپ اٹھئے۔ جائیے! اور سحری کیجئے۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا!"

میں بے اختیار کرسی سے اٹھی اور یقین مانئے خدا گواہ ہے کہ میں ان صاحب کے پاس سے ہو کر باہر نکلی!۔ اب جو دیکھتی ہوں تو وہ غائب تھے!۔

ابھی تک وہ سارا منظر جوں کا توں میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔ ان کی آواز میرے دماغ میں گونجتی ہوئی ہے!۔ دوسرے دن یہ قصہ میں نے پھوپھی جان مرحومہ کو سنایا۔ انھوں نے کہا کہ بے شک اس گھر میں کچھ ہے۔ ہمارے ساتھ چھوٹے بچے ہیں! اور سب سے کہہ سن کر تیسرے چوتھے روز ہی وہ گھر خالی کر کے ہم لوگ موجودہ گھر میں آ گئے!! لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس گھر میں ان صاحب نے ہم میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا۔

بہو کا انتخاب

ریاض فاطمہ

"کوئی لڑکی دیکھی ہے تم نے۔؟" بڑی رازداری سے انھوں نے ہمارے کان کے بالکل قریب اپنا پوپلا منہ لاکر سرگوشی کی۔

"کیا مطلب۔؟" ہم ہونق سے ہوگئے "۔۔۔ کوئی لڑکی کیا مطلب خالہ جی۔؟ ہمیں تو اس وقت بھی ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آرہی ہیں"۔ ہم جو محض ازراہ نوازش ہی یہاں مہندی کی تقریب میں مدعو تھی۔ گھبرا کر بولی۔ (ازراہ نوازش" سے خدانخواستہ کوئی اور مطلب آپ نہ اخذ کر لیجئے گا۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مہندی میں صرف لڑکیاں ہی مدعو تھیں جب کہ ہمیں لڑکی کی صف سے والدین نے ڈھائی سال قبل نکال پھینکا ہے اور اس کا ثبوت ماشاء اللہ ڈیڑھ برس کی ہماری اپنی "لڑکی" ہے۔

خالہ بی برا سا منہ بنا کر بولیں "یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں بکھری نظر آرہی ہیں۔ لیکن میں تو اپنے چھٹن کے لئے کہہ رہی تھی"۔ ہمارا پھر سوالیہ چہرہ دیکھا تو مزید وضاحت کی "اپنے چھٹن کو ۔ تم نے دیکھا ہے ماشاء اللہ کیا چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے اور جب سے سٹیل مل میں نوکر ہوا ہے"۔ ان کا لہجہ پھر دھیما ہوگیا "تم جانو رشتوں کی جیسے بھر مار سی لگ گئی ہے"۔

"تو پھر کر ڈالئے نا انھیں میں سے کوئی رشتہ پسند" میں چڑ گئی۔ "کیا کہوں ان میں سے کوئی بھی مجھے پسند نہ آئی"۔ وہ بولیں۔

"تو پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہماری پسند کی ہوئی لڑکی بھی آپ کو پسند آہی جائے"۔ ہم نے سادہ سی ایک بات کہی۔ مگر وہ تو گویا ہماری بلائیں لینے لگیں۔ "ارے تمہاری پسند کی ہوئی پسند کیوں نہ آئے گی۔ تم خود بھی تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو۔ میری تو تم پر ہی نگاہیں تھیں۔ مگر تمہاری ماں ہی نہیں مانی"۔ وہ ایک سرد آہ کھینچ کر بولیں۔ (اب ان بیچاری کو کیا معلوم کہ ماں نے "نہیں" کی تھی یا ہم نے ہی منہ پھوڑ کر صاف صاف لفظوں میں امی جان سے کہہ دیا کہ خبردار جو اس لنگور سے ہماری قسمت پھوڑنے کے متعلق سوچا بھی گیا۔ چھت سے چھلانگ لگا کر جان دے دیں گے۔ مگر اس سے شادی نہ کریں گے"۔

گھر چھٹن میاں کا ہمارے قریب ہی تھا۔ کئی دفعہ آمنا سامنا بھی ہو چکا تھا۔ صحت بھولو پہلوان سے کچھ کم ہی ہوگی میٹرک کر کے کہیں سے کوئی ٹیکنیکل (معلوم نہیں اصلی یا جعلی) ڈپلوما حاصل کر لیا تھا ۔۔۔۔۔۔ کسی بھی لڑکی کو قریب سے گزرتے دیکھتا تو چندھی چندھی آنکھوں میں عجیب رونق سی آجاتی ۔۔۔۔۔۔ تیل سے چپڑے بالوں کو سنوارنے کے بہانے اپنا ہاتھ بالوں پر یوں پھیرتا جیسے سلام کر رہا ہو۔ لبوں سے فلمی گانے بے سری آواز میں ایسے گنگناتا جیسے مکیش یا رفیع بھی اس کے سامنے پانی بھرتے ہیں۔

"ارے کیا سوچ رہی ہو۔ کوئی لڑکی دھیان میں آگئی کیا"۔ وہ مسکرا کر بولیں۔ میں نے بھی چالاکی سے کہا "ہاں یہی سوچ رہی تھی۔ مگر ابھی تک تو کوئی آپ کے اسٹینڈرڈ کے مطابق سمجھ میں آئی نہیں"۔

"لمبی ضرور ہو۔ اور ہاں دبلی ہی ہو۔ مگر ایسی دبلی بھی نہیں کہ پھونک مارو تو اڑ جائے مناسب سی ہو۔ رنگ گورا ہو۔ تم جانو دلہن تو گوری ہی اچھی لگتی ہے۔ پکے رنگ نہ تو مجھے اور نہ ہی چھٹن کو پسند ہیں"۔ انھوں نے "لڑکی" کی مطلوبہ خصوصیات بیان فرمائیں۔ بس تھوڑی سی یہ بات وہ بھول گئیں کہ خود ان کے رنگ میں "کولتار" کی مماثلت تقریباً نوے فیصد ہے اور یہ کہ انکی صاحبزادیاں بھی ان سے ملتی جلتی ہیں۔ اب رہتے میاں چھٹن "تو" لڑکے" یعنی "مردذات" کے رنگ کا کیا دیکھنا۔ ؟ ہمیں اتنی دیر تک خالہ بی سے ہم کلام دیکھ کر ہماری دوست نسرین صاحبہ بری طرح سے تلملا رہی تھیں۔ "ادھر کونے میں کیا گھسی بیٹھی ہو۔ ؟ آکر ہمارے ساتھ مل کر گانے گاؤ نا۔ ؟"

ہم نے موقع غنیمت جانا اور اٹھ کھڑے ہوئے "بھولنا مت وہ بات"، ہمارے اٹھتے اٹھتے انھوں نے یاد دہانی کرائی۔

ہمارے ہاں ہر طرف یہی بات دیکھی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنے بیٹے، بھائی یا بھتیجے کی شادی کرنے چلتا ہے تو ہر چیز دیکھی جاتی ہے اور جہاں تک رہا "لڑکے" کا سوال تو اس کے لئے لڑکا ہونا ہی بہت کافی ہے تھوڑی بہت مناسب نوکری یا بزنس کا ہونا ہی سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ پہلے تو لڑکا میٹرک تک تعلیم یافتہ بھی کافی سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب سے عوام میں تعلیم کا شعور بڑھا ہے میٹرک پاس کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے تو انٹر اور بی اے تک تعلیم لازمی ہو گئی ہے۔ جبکہ لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کا خوبصورت، دراز قد، گورا رنگ اور اس کے والدین کی "مالی حالت" کا

بہتر ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو اپنے کام دھندوں میں لگ کر خالہ بی کی فرمائش بھول چکے تھے۔ لیکن ایک دن وہ جو ملیں تو بہت خوش خوش نظر آئیں خود ہی بولیں "میں نے چھٹن کے لئے لڑکی ڈھونڈلی ہے۔ رجب کی آٹھ کو شادی طے پائی ہے"

" اچھا کیسی ہے " ؟ ہم جو سمجھے تھے کہ ان کو بہو ڈھونڈنے میں کم ازکم نصف صدی اور لگے گی حیران رہ گئے۔

" اچھی ہے خوبصورت ہے۔ اکلوتی ہے۔ گلشن اقبال میں اس کے ماں باپ کی بہت بڑی کوٹھی ہے " بڑے فخر سے بولیں " اچھا بھئی مبارک ہو " میں تو یوں ہی سب کی خوشیوں میں خوش ہونے والی اس لئے جھٹ مبارک باد دے ڈالی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ ہم بھی گئے لڑکی واقعی بہت خوبصورت تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے والدین کی عقل پر پتھر کیوں پڑگئے تھے۔ مگر یہ عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا۔ پندرہ بیس دن بعد خالہ بی کے ہاں گئے کہ شادی والے دن تو یونہی دیکھا تھا۔ آج جاکر ذرا " تفصیلی " دیدار کرلیں۔ مگر گھر میں ہونق سناٹا تھا " بہو کہاں ہیں " میں نے برتن مانجھتی ہوئی خالہ بی سے پوچھا۔ ؟

ارے وہ تو میرے چھٹن کو ہی لے کر اڑ گئی۔ پندرہ دن بعد ہی اپنے گھر چلی گئی چھٹن بھی وہیں گھر داماد بن کر رہ رہا ہے۔ اے مجھے یہ معلوم ہوتا تو کوئی اپنی جیسی بہو لاتی "

حریمی دسترخوان

کوفتہ پلاؤ

سامان :- قیمہ باریک سادہ یعنی چربی نہ ہو ۵۰۰ گرام پلاؤ کا چاول ۵۰۰ گرام گرم مسالہ پسا ہوا چار کا ایک چمچہ۔ پیاز بڑی دو یا تین آنڈی۔ لہسن ایک گٹھی بڑی۔ گھی ڈالڈا یا چکنی ۲۰۰ گرام بھنے چنے کا بیسن ۵۰ گرام۔ نمک حسب ضرورت سرخ مرچ پسی ہوئی حسب خواہش ہرا دھنیا ۵ گرام، ادرک ۵۰ گرام۔ خشخاش چار کے دو چمچے۔ دہی ۵۰ گرام۔ ہری الائچی ۴۔ لونگ ۴۔ تیز پتہ ۴۔ عرق کیوڑہ ۱۰۰ گرام بادامی جہاز مارکہ رنگ چار کا ایک چمچہ

ترکیب :- قیمہ کو اچھی طرح دھو کر سل پر پیس لیں۔ نصف پیاز کو لچھوں کی شکل میں کاٹ لیں، بقیہ نصف پیاز ادرک نصف دھنیا نصف خشخاش اور نصف لہسن کو باریک پیس لیں اور اسے قیمہ میں ملاکر ایک جان کرلیں۔ نمک گرم مسالہ اور سرخ مرچ بھی ڈال دیں ۔۔۔ اگر قیمہ اور مسالے باریک نہ پسے ہوں تو دوبارہ پیس لیں تاکہ خوب باریک ہوجائیں۔ ذرا سا چکھ کر دیکھ لیں کہ نمک ٹھیک ہے یا نہیں۔ اس کے بعد قیمہ کے چھوٹے چھوٹے کوفتے بناکر گھی ڈالڈا یا سرسوں کے تیل میں تل کر سرخ کرلیں (سرسوں کا تیل استعمال کریں تو پہلے دو سرخ مرچ اور دو جوے لہسن ڈال کر اچھی طرح کڑکڑائیں اور مرچ لہسن نکالنے کے بعد استعمال کریں۔ اس طرح تیل کی جھار محسوس نہ ہوگی)

اس کے بعد جو گھی بچے اس میں پیاز کے لچھوں کو گلابی کرکے بقیہ لہسن دھنیا اور ادرک پیس کر ڈالیں۔ ساتھ ہی دہی ڈال کر بھونیں۔ جب خوشبو اٹھنے لگے تو کوفتوں کو ڈال کر اتنا بھونیں کہ دہی کا پانی ختم ہوجائے۔ بھوننے کے بعد اتار کر رکھ لیں۔

چاولوں کو چن کر پانی میں بھگو دیں۔ ایک گھنٹہ تک انہیں پانی ہی میں رہنے دیں۔ اس کے بعد کسی بڑی پتیلی میں اندازاً دو کلو پانی ڈال کر جوش دیں۔ تیز پتہ، لونگ، ہری الائچی اور تھوڑا نمک بھی ڈال دیں۔ پانی پکنے لگے تو بھیگے چاولوں کو پانی سے نکال کر ڈال دیں۔ چند منٹ ابلنے دیں۔ پھر دیکھیں اگر چاولوں میں تین کنی آگئی ہو تو انہیں کسی باریک کپڑے میں انڈیل کر چھان لیں۔ اس کے بعد نصف چاول کسی بڑی قلعی دار پتیلی میں پھیلا کر کوفتوں کو مسالے سمیت چاولوں پر ڈال کر باقی چاولوں سے کوفتوں کو ڈھک دیں۔ اب پلاؤ کو دم کرنے کے لئے سخت آٹا گوندھ کر پتیلی کے سرپوش (ڈھکن) کو پتیلی پر آٹے سے اس طرح چپکا دیں کہ بھاپ نہ نکل سکے۔ تین اینٹیں رکھ کر درمیان میں انگارے رکھ کر پتیلی کو اینٹوں پر رکھ دیں اور ڈھکن کے اوپر بھی انگارے رکھیں۔ پندرہ منٹ بعد ڈھکن کھول کر دیکھیں کہ چاول ملائم ہوگئے یا نہیں۔ اگر ملائم نہ ہوئے ہوں تو دودھ کا چھینٹا دے کر پھر دم کریں۔ انگارے نیچے اور مزید رکھ دیں۔ جب چاول ملائم ہوجائیں تو عرق کیوڑہ میں رنگ کو گھول کر پتیلی کے نصف حصّہ پر چھڑک دیں نصف حصّہ سادہ رہنے دیں۔

کھانے کے لئے نکالتے وقت بڑی کفگیر سے اس طرح نکالیں کہ نیچے کا گھی و مسالہ بھی اوپر آجائے اور رنگین و سادے چاول مل جائیں۔

افسانہ

شرط

عذرا صاحبہ

"اماں کا دوسرا خط تھا جلدی گھر پہنچو۔"

میں دفتر سے چھٹی لینے کے چکر ہی میں تھا کہ بھائی کا فون آ گیا "آ کیوں نہیں رہے ہو؟" لہذا میں بغیر چھٹی منظور کروائے گھر روانہ ہو گیا۔

"میاں مبارک ہو" گھر میں داخل ہوتے ہی منجھلے ماموں میرے گلے لگ گئے "رشتہ پکا ہو گیا" ان کی باچھیں پھیل کر کانوں سے جا لگی تھیں۔

میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، صحن میں سرخ اور سفید کاغذ میں لپٹے ہوئے مٹھائی کے ٹوکرے خطرے کا نشان بنے ہوئے تھے۔

اماں میں نے بوکھلا کر آواز لگائی۔

اماں جلدی سے دالان سے نکل کر آئیں میری شکل دیکھ کر الٹے پاؤں اسٹور میں گھس گئیں۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری آواز لگاتا وہ موٹا سا کالا مرغا پکڑے آئیں اور میرے سر پر گھمانے لگیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اماں کے ہاتھ سے مرغا جھپٹ کر صحن میں چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو تمہارے جیسے بھگوڑوں کے ساتھ ہوتا ہے" بھابھی اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

برآمدے میں تخت پر لیٹی ہوئی بوا بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں "ارے کیا افراتفری مچا دی ہے ذرا بچے کو دم تو لینے دو" میرے لئے اتنا ہی غنیمت تھا بے بسی کے عالم میں بوا کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔

"اے میرے گھٹنوں سے لگ کر کیوں بیٹھ گئے ہو جاؤ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرو۔ تھوڑی دیر میں مہمان آنے والے ہیں" اب اماں، منجھلے ماموں اور بھائی کورس میں ہنس رہے تھے۔

یہ پچھلے سال بھر سے منجھلے ماموں اور اماں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔

وہ واجبی شکل و صورت کی عام سی لڑکی تھی۔ میٹرک میں دو مرتبہ فیل ہو کر بمشکل تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔ البتہ اماں کے لئے اس کی ایک یہ خوبی کافی تھی کہ وہ منجھلے ماموں کی سسرالی رشتہ دار تھی۔ جب کہ منجھلے ماموں کی نظر میں اس کی دو خوبیاں بہت اہم تھیں یعنی اکلوتی اور صاحبِ جائداد اور میں ان ہی جملہ خوبیوں کی وجہ سے اس رشتے سے الرجک تھا۔

میں حسبِ مقدور زبانی ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ خیال تھا سمجھدار لوگ ہیں تنگ آ کر یہ سلسلہ ختم کر دیں گے لیکن یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ ان کی سمجھداری کا آخری حملہ اتنا بھرپور ہو گا کہ میرے لئے رشتے سے انکار تو کیا اعتراض کی گنجائش بھی نہیں رہے گی۔

پھر وہی ہوا جو گھر والے چاہتے تھے۔ منگنی کی رسم ہوئی، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوئی۔ میرے حصے میں ایک عدد انگوٹھی، ایک ہزار ایک روپیہ اور مستقل دل جلانے کا سامان آیا کیونکہ منگنی کے بعد بھی گھر والوں کی مصروفیت کا وہی عالم تھا جو منگنی کے پہلے تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا ان کی مصروفیت کا خمیازہ مجھے اپنی شادی کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

میں اب بھی جان چھڑانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔

کوئی طریقہ....

کوئی بہانہ.....

کوئی راستہ....

جو مجھے اس مشکل سے نکال سکے۔

لڑکی کی ایک کمزوری زیادہ واضح تھی یعنی وہ کند ذہن تھی۔ جس کا ثبوت اس کا میٹرک میں دو بار فیل ہونا تھا۔ اگر اس سے شادی کے لئے ایف اے کی شرط لگا دی جائے تو کیسا رہے؟ یقیناً اس شرط کو پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو گی۔ ویسے بھی اسے پڑھائی چھوڑے دو تین سال ہو چکے تھے۔ لہذا نئے سرے سے کتابوں میں سر کھپانے کی کون زحمت کرے گا۔ اس طرح میری طرف سے شادی سے انکار تو نہیں البتہ انکار کے قریب بات ضرور بن جائے گی۔ دوسرے اکلوتی اور صاحبِ جائداد ہونے کی وجہ سے اس کے لئے رشتوں کی کمی نہیں تھی اس لئے اس کے ماں باپ میری شرط پوری کرنے میں فضول وقت ضائع کرنے کی بجائے ضرور منگنی توڑنے کو ترجیح دیں گے۔

بات بننے کی کچھ کچھ امید بندھنے لگی تھی۔ پہلے تو اماں نے میری بات کو مذاق سمجھا لیکن جب میں نے سنجیدگی سے اپنی بات پر زور دیا تو وہ خاصی فکر مند ہو گئیں۔

اماں، ہوا، بھابھی اور منجھلے ماموں کے درمیان کافی دیر صلاح مشورے ہوئے اور پھر بھابھی تحقیق و تفتیش کرنے میرے پاس آ پہنچیں۔

" تمہاری اپنی کوئی پسند ہے ؟" انھوں نے چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا۔

" نہیں "

" یہ رشتہ پسند نہیں ؟"

" اب تو منگنی ہو گئی ہے " میں نے گول مول جواب دیا۔

" پھر شرط لگانے کا کیا تک ہے ؟" وہ چڑ گئیں۔

" ہے تک " میں ڈھیٹ ہو گیا۔

" تمہارے بھائی نے تو شادی پر ایسی کوئی شرط نہیں رکھی تھی " وہ مجھے شرم دلا رہی تھیں۔

" ان کی مرضی، ویسے رکھ لیتے تو سکھی رہتے "

یہاں پر آ کر تفتیش کا سلسلہ رک گیا۔ بھابھی مزید ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئیں۔

بوا کی طرف سے بلاوا تھا۔

" تمہیں لڑکی سے گھرداری کروانی ہے کہ پڑھائی کی کلاس لگوانی ہے جو موئی ایف اے والی شرط لگانے بیٹھ گئے ہو ؟ اگر تمہیں ایسا ہی شرطیں لگانے کا شوق تھا تو منگنی سے پہلے منہ سے پھوٹے ہوتے۔ ہم بھی کچھ سوچ سمجھ لیتے اور لڑکی والوں کو بھی سمجھا لیتے۔ اب گھر والوں کو پریشان کرنے سے تمہیں کیا مل رہا ہے ؟"

میں چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ اور بات تھی کہ بوا کو میری خاموشی اتنی ہی بری لگ رہی تھی جتنی کہ بھابھی کو میری زبان درازی۔ اس طرح یہ انٹرویو بھی جلد ختم ہو گیا۔

البتہ منجھلے ماموں سے جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی کیونکہ یہ معاملہ براہِ راست ان کی سسرال سے تھا اس لئے وہ جہاں مجھے دیکھتے گھیر لیتے۔

" میاں، ایف اے کر کے کیا لڑکی کے سرخاب کے پر نکل آئیں گے ؟"

" دیکھئے ماموں۔ سرخاب کے پر والی بات آپ خود کر رہے ہیں " میں نے انھیں چکر دینے کی کوشش کی۔

" میاں، ابھی تو مشکل ہے اس کو ڈھنڈورے میٹرک کا امتحان پاس کرنا۔ مشکل تھا اور تم ایف اے کی بات کر رہے ہو " وہ اپنی سادگی میں لڑکی پر غصہ کرنے لگے۔

اس کا مطلب ہے آپ میری شادی کو ڈھنڈورے کر رہے ہیں ؟ میں ان کی بات پکڑ لی۔

" اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تم کون سے اس سے عدالت میں مقدمے لڑوانے ہیں "

جواب دہی کا سلسلہ جاری تھا، پہلے کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد پہلا ــــــ اور ہر پھیر کر سوئی وہیں پر ٹوٹتی تھی کہ ایف۔ اے کی شرط کیوں رکھی ہے ؟

کراچی سے بھائی جان کا فون آیا۔

بھابی نے بڑے فاتحانہ انداز میں ریسیور میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

" کرو بات !"

" بھئی، یہ ایف اے کا چکر کیا ہے، سیدھی بات کیوں نہیں بتاتے ؟ "

وہ ہنس رہے تھے۔

" آپ کو بھابی نے میرے خلاف بھڑکایا ہوگا ؟"

کیا کہا ؟ وہ چیخ کر بولیں۔

" میں بھائی صاحب سے بات کر رہا ہوں " میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ انھوں نے مارے غصے کے میرے ہاتھ سے ریسیور چھین کر اپنی مکالمہ بازی شروع کر دی " مجھے کیا ضرورت ہے کسی کو کسی کے خلاف بھڑکانے کی " وہ کہہ رہی تھیں۔

میں بھی یہی چاہتا تھا۔

اماں کی عادت تھی کہ انھیں کوئی بات بری لگے یا کسی سے ناراض ہوں تو چپ سادھ لیتی تھیں۔ اس لئے اب بھی وہ اپنی خاموش ناراضگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ ابامیاں نے خط کے اختتام پر مجھے نافرمان اور گستاخ وغیرہ کے خطاب سے نوازتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اپنی ضد پر قائم رہا تو وہ مجھے عاق کر دیں گے۔

حالانکہ اماں کو میرے طرزِ عمل سے سب سے زیادہ تکلیف اور پریشانی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود انھیں ابامیاں کا خط بالکل پسند نہیں آیا۔

" انھیں اطلاع کرنے کون بیٹھ گیا تھا ؟" یہ بھابی فرما رہی تھیں اور یہ کوئی ایسی ناقابلِ برداشت بات نہ تھی۔

چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ میں واپس کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اماں باپ کے اولاد پر حقوق کے تفصیلی بیان کے متعلق بھابی کی طرف رُخ کر کے پوچھنے لگیں۔

"میں نے تو دادا میاں کو اطلاع بھیجی کہ بھابی جلدی سے بلالیں حالانکہ مجھے یقین تھا کہ یہ بھابی کا ہی کام تھا۔

"ان سے تو کوئی مشورہ کرنا فضول ہے، ہمیشہ الٹی سیدھی ہانکتے گئے ہیں۔۔۔ بھلا کوئی تک ہے بچے کو عاق کرنے کی دھمکی دینے کا؟"

ماں کی محبت نے میرا حوصلہ بڑھادیا۔ میں اپنی شرط کو قائم دائم چھوڑ کر واپس اپنے کام پر چلا گیا۔

انتظار کرتے کرتے دو ماہ گزر گئے، گھر سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔

ایک روز بھابی کا فون آگیا۔

"اماں اور دادا میاں کے پاس دونوں جا رہی ہیں۔۔۔ میں اپنے میکے جا رہی ہوں اور۔۔۔ اور سب خیریت ہے۔" میں انتظار ہی میں تھا کہ وہ کوئی خبر سنائیں کوئی اطلاع دیں لیکن انھوں نے "خدا حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا۔

اب انتظار تو نہیں البتہ عجیب سے پچھتاوے کا احساس رہنے لگا تھا۔

ایک دن منجھلے ماموں کا خط ملا۔ صرف ایک سطر لکھی تھی جس سے ان کی ناراضگی کا بھرپور اظہار ہو رہا تھا۔

"تمہارے اماں، ابا آ رہے ہیں۔"

میں فوراً گھر پہنچ گیا۔ گھر پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں منجھلے ماموں کے گھر چلا گیا۔

دروازہ کھولنے والی کوئی لڑکی تھی۔

دبلی پتلی سانولی اور جانی پہچانی سی۔۔۔ میں دروازے میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"سب لوگ ایئرپورٹ گئے ہیں۔" اس نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کی دھیمی آواز نے اس کے چہرے کی ملائمت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

میں دروازے میں داخل ہوا تو جاتے جاتے رک گئی۔۔۔

"میں نے ایف۔ اے پاس کر لیا ہے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایف اے پاس۔۔۔ میں بھونچکا کھڑا تھا۔۔۔ اور وہ مسکرا رہی تھی۔

افسانہ

نفسیاتی مریض

راشدہ بشیر

پتہ نہیں کیوں میں تنہائی محسوس کرتی ہوں، مجھے ہمیشہ تشنگی سی محسوس ہوئی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے والدین مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ میں جو چاہتی ہوں مجھے وہ نہیں کرنے دیتے۔

سبحان اللہ کیا سوچ پائی ہے۔ پتہ نہیں ہمارے دماغ میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے پگلی تیرے والدین تجھے بے تحاشہ چاہتے ہیں یہ سب تیرا وہم ہے۔ آمنہ نے ہمیشہ کی طرح بحث کرتے ہوئے کہا۔

لیکن افشاں اگر وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں تو مجھے پھر یہ احساس کیوں ہے —؟

اچھا چل چھوڑ ان باتوں کو یہ دیکھ میں نے یہ گلاب جامن کیسے بنائے ہیں۔ میں نے اس کا خیال بٹانے کے لئے اس کے منہ میں پورا گلاب جامن بھر دیا۔

اے افشاں! آمنہ نے اپنی چھت پر سے آواز لگائی!

کیا ہے!

ادھر آ ذرا بات سن ایک بہت خاص بات ہے۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ شفق کی مانند سرخ ہو رہا تھا۔ اور سورج کی کرنوں کی طرح اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ارے واہ آج تو بہت خوش نظر آ رہی ہے۔

ہاں بات ہی کچھ ایسی ہے یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ مزید گلنار ہو گیا۔ وہ تو عابد کو جانتی ہے نا وہی جو ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔

ہاں کیا ہو گیا اسے؟ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ .... وہ مجھے چاہتا ہے نا اور میں بھی اسے بہت چاہتی ہوں۔ آمنہ نے جلدی جلدی مجھے بتایا۔

اوہ تو یہ بات ہے میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ آمنہ کیا تو مجھے دل سے اپنی سہیلی مانتی ہے۔

ہاں کیوں نہیں آمنہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے [illegible] تو پھر اپنے ماں باپ کو دھوکا مت دے۔ کتنا [illegible] کرتے ہیں وہ تجھ پر اور تو ان کے اعتماد کو یوں سر عام نیلام کر رہی [illegible] ذرا سی [illegible] بات کا اگر انہیں پتہ چل گیا تو یہ سب جوانی کے جذبے ہیں [illegible] ہوگی تو یہ باتیں سوچ کر بھی ہنسے گی۔

افشاں تجھے میرے جذبوں کا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ عابد میرا حق ہے مجھے گھر میں محبت نہیں ملی تو گھر سے باہر ڈھونڈنا میرا حق تھا اس نے غصے سے کہا۔ افشاں تو نہیں جانتی وہ میرا کتنا خیال رکھتا ہے میری ایک ایک بات کو غور سے سنتا ہے اور اس پر دھیان دیتا ہے۔

اب کی بار آمنہ نے نہایت غرور سے کہا کہ جیسے اسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ میں نے ذرا مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کہا۔ آمنہ تجھ سا بھی کوئی نادان ہوگا جو یہ کہتا ہے کہ وہ تجھے سمجھتا ہے۔ ذرا ایک لمحہ کو سوچ۔ تیری ماں جس نے تجھے جنم دیا۔ تیرا باپ جس نے دن رات ایک کر کے تیرے واسطے پیسہ کمایا اور جن کے سائے میں پل بڑھ کر تو جوان ہوئی وہ تجھے کم سمجھتے ہیں اور تیرے یہ ڈیڑھ مہینے کے عشق میں عابد تجھے تیرے ماں باپ سے بھی زیادہ سمجھنے لگا ہے یہ سب بکواس ہے۔ ممکن ہے تجھے میری باتیں بری لگ رہی ہوں لیکن میری ایک گزارش ہے کہ ان تمام باتوں پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔ تب اس نے ایک ناگوار سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر اماں کی آواز پر جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر گئی۔

اب آمنہ کا دستور بن گیا تھا جب بھی آتی صرف عابد کا ذکر اس کے منہ سے ہوتا۔ میں اسے ہمیشہ سمجھاتی لیکن اسے میری باتیں کبھی پسند نہ آئیں۔ اور وہ بے زار کن تاثر چہرے پر لے کر کہتی ساری دنیا میری دشمن ہو گئی ہے کوئی میری خوشی نہیں چاہتا۔ شاید وہ میری باتوں کا برا مان گئی اور اس نے میرے گھر آنا بہت کم کر دیا۔ ایک دن آمنہ کی چھوٹی بہن ثریا میرے پاس آئی اور کہا کہ اماں بلا رہی ہیں۔ مجھے ایک دم پریشانی سی ہوئی کیونکہ آج تک انہوں نے مجھے کبھی اس طرح نہیں بلایا تھا۔ میں جلدی سے دوپٹہ سر پر رکھتی ہوئی ثریا کے ساتھ اس کے گھر پہنچی۔ اماں نہایت پریشان لگ رہی تھیں اور اس پریشانی نے ان کے ماتھے کی لکیروں کو اور واضح کر دیا تھا۔ میں نے پریشانی سے پوچھا اماں سب خیریت تو ہے۔ ہاں اماں نے جواب دیا۔ بیٹی خیریت ہوتی تو

اس وقت کیوں بلاتی ہیں میں نے ان سے بات پوچھی تو کہنے لگیں بیٹی یہ پوچھنا ہے نا اس نے انجینئر کے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتی ہے کہ شادی کروں گی تو صرف عابد سے ہی کروں گی۔ ورنہ زہر کھا لوں گی۔ میری بچی خود سوچ وہ اپنا پیٹ اس مہنگے زمانے میں نہیں بھرتا۔ اس کا کیسے بھرے گا۔ پھر اس کے بال بچے ہوں گے۔ تو مسائل اور بڑھیں گے۔ اور یہ نازوں پلی ان حالات میں نہیں رہ سکے گی۔ اس کے ابا الگ گم سم ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ دھمکیاں بھی دیں۔ لیکن اس کی بس ایک ہی بات ہے۔" اماں کی آواز رندھ گئی۔ انھوں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا وہ بات ہو گئی تھی۔ میں نے پوری بات پر سوچا اور اماں کو تسلی دی۔ پھر میں آمنہ کے کمرے کی طرف بڑھی، اسے سمجھایا لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔

پھر ایک دن اطلاع ملی کہ آمنہ کی عابد سے شادی ہو رہی ہے، میری آنکھوں کے سامنے اماں اور اس کے ابا کا چہرہ گھوم گیا۔ کیسے برداشت کیا ہوگا انھوں نے یہ میں نے دکھ سے سوچا۔ اس وقت مجھے آمنہ سے نفرت ہونے لگی۔

آمنہ کے متعلق اماں سے اطلاع ملتی رہتی تھی۔ ان کے مطابق آمنہ بہت خوش تھی اور اپنے خاوند عابد سے کہتی تھی کہ میرے والدین نے میرے اوپر سب سے بڑا احسان کیا ہے کہ تم سے شادی کر دی۔ ایک سال بعد اطلاع ملی کہ آمنہ کا بیٹا ہوا ہے۔ اماں اپنے نانی بننے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں۔ بیٹے کی سالگرہ پر وہ اماں کے یہاں آئی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کیونکہ وہ نہایت کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ ارے آمنہ یہ تو نے کیا حالت بنا رکھی ہے میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ نہیں بس اس ننھے کامران نے مصروف کیا ہوا ہے اور پھر گھر یلو ذمہ داریاں بھی بہت ہیں ایک تو عابد کا خاندان ہی اتنا بڑا ہے کہ روٹیاں پکا پکا کر ہاتھ دکھتے ہیں۔

اس ملاقات کے بعد پھر اکثر اس کی اور میری ملاقات ہونے لگی، کبھی کہتی آج کامران نے چابی سے چلنے والی گاڑی کی فرمائش کی تو عابد نے اس کے منہ پر دو تھپڑ جڑ دیئے اور کہا گھر کے خرچے پورے نہیں ہوتے اور تو مہنگے کھلونوں کی فرمائش کرتا ہے بس اس بات پر میرا اور اس کا خوب جھگڑا ہوا ہے۔ اس طرح تقریباً روز ہی کسی نہ کسی جھگڑے کی اطلاع ملتی۔ اس طرح گھریلو ذمہ داریاں جوں جوں بڑھیں ان کے مراسم مزید کشیدہ ہوتے چلے گئے اور ایک دن ۔۔۔ یہ خبر قیامت بن کر ہم پر ٹوٹی کہ آمنہ کو طلاق ہو گئی ہے۔

آج آمنہ پھر اسی دہلیز پر کھڑی تھی جہاں سے پانچ سال پہلے اپنی ضد سے نکلی تھی یہ وہی دہلیز تھی جس کے بارے میں آمنہ نے کبھی کہا تھا کہ میرے لئے اجنبی ہے اور اس دہلیز پر اس کے بوڑھے والدین کھڑے تھے۔ جن کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ انسے محبت نہیں کرتے اور اسے سمجھتے نہیں ہیں۔ آمنہ کی ماں نے آگے بڑھ کر بیٹی کو سہارا دیا اور اس برگد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا بیٹی بیٹری نظر صرف اس تک دیکھ سکتی تھی لیکن میں اس کے بہت آگے تک دیکھ سکتی ہوں اور آمنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی معلوم نہیں اپنی اس ضد پر یا اپنے والدین کی بے کسی پر۔

"سرمایۂ حیات"

محبت کا ٹیکہ، ارمانوں کا جھومر، آرزوؤں کی نتھ، پیار کا گلوبند، شوق کی چمپا کلی، اطاعت کی چوڑیاں عزت کے کنگن، سہاگ کا ٹیکا، تمناؤں کے جھمکے، وفا کی انگشتری، ایثار کی پازیب، حفاظت کے جوشن، خلوص کے دست بند، شرم کی بجلیاں، یہ وہ زیور ہیں جو مشرقی عورت کا "سرمایہ حیات" ہیں۔

(ریشمان عباس۔ الدور)

پیٹی کا راز

ماں بننے کے بعد سمجھ میں آسکا

ثمینہ طاہرہ

ہمارے لئے یہی کپڑا رہ گیا ہے۔ کتے کے کفن جیسا۔ اس کا جی چاہا
جھر جھر کرکے اس پھولدار دوپٹے کو انگاروں پہ رکھ دے اور دوسرے
ہی لمحے وہ شعلہ جوالہ بنی اماں کے سامنے کھڑی تھی۔

اماں میں یہ دوپٹہ ہرگز نہیں لوں گی۔ جو اچھی چیز ہوتی ہے وہ یہ
پیٹی نگل لیتی ہے۔ اس نے جست کی بڑی بڑی سی پیٹی کو ٹھوکر مار کر کہا۔

اماں تلملا کر غرائیں دفعان ہوتی ہے یہاں سے کہ دوں ایک چپکی۔
مگر وہ کھڑی وہیں تابی بکتی رہی۔ جب خوب بک جھک چکی تو خود ہی
تھک کر باہر چلی آئی۔

اس آبائی پیٹی سے اسے سخت نفرت تھی جسے اماں اپنے ساتھ جہیز
میں لائی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو اس پیٹی کو ڈائنا مائٹ سے اڑا دیتی۔
اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اماں کو اس پیٹی کا پیٹ بھرتے دیکھا
تھا۔ اس سے چھپا کر اب تک جانے کیا الم غلم اس پیٹی میں ڈال چکی تھیں۔
مگر اس کا پیٹ بھرنے میں ہی نہیں آتا تھا۔ ادھر شمسہ کو بھی قرار نہیں
تھا۔ جونہی اماں نے کوئی چیز چھپائی۔ اس کے ترمرے لگ گئے۔ مگر اماں
کو کب اس کی پرواہ تھی۔ وہ انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ اپنے اس
عمل کو جاری رکھے ہوئے تھیں۔ خاص طور پر جب وہ کسی ملنے جلنے والے
کی شادی سے واپس آئیں تو اس عمل میں زیادہ تیز رفتاری آجاتی۔
ایسے میں اگر کبھی شمسہ پاس آجاتی تو اماں کھٹ سے ڈھکن کو انتہائی سرعت
کے ساتھ زوردار دھماکے سے بند کرتیں۔ اور یہ دھماکہ اس کے ننھے
سے ذہن کے لئے اس دھماکے سے کم نہ ہوتا جو امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم
گراتے وقت کیا تھا۔ آخر اس پیٹی میں کون سے اسرار چھپے تھے۔
جو اماں اس بری طرح اس پر فریفتہ تھیں۔ اس کے ذہن میں کئی بار
یہ سوال ابھرتا مگر جب کبھی اس نے اماں سے اس بارے میں پوچھا۔
اماں کے تیور یکدم بدل جاتے اور وہ اسے ادھر ادھر کے کاموں میں الجھا کر اسکے تجسس
کو مزید ہوا دیتیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ اسکی پیٹی کے اندر دیکھنے کی خواہش شدت اختیار کرتی گئی۔
اور وہ جھنجھلاہٹ میں اماں سے لڑتی رہتی تھی کہ بدزبانی کرنا اور جھگڑنا اس
کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اور اس واقعے کے بعد تو اسے پیٹی سے سخت چڑ ہو گئی۔
ہوا یہ کہ اس دن اماں بازار سے بہت خوبصورت سوٹ کا کپڑا لائیں جو کافی
مہنگا بھی تھا۔ آسمانی زمین پر بڑے بڑے گلاب کے سرخ سرخ پھول
بنے تھے۔ اسے انھوں نے آناً فاناً غائب کر دیا۔ یہ سوٹ دیکھ کر شمسہ کا دل
بری طرح مچلا تھا۔ اتفاق سے اس کے اسکول میں مینا بازار تھا اور اس
موقع پر پہننے کیلئے اسکی نظر انتخاب اس سوٹ پر پڑی۔ اور وہ اماں سے یہ سوٹ ہتھیانے کی ترکیبیں
سوچنے لگی۔ اس مقصد کے لئے اس نے دو تین روز اماں کی ٹانگیں بھی دبائیں اور ان
کے الٹے سیدھے کام بلا چوں و چرا نہ صرف چائے بنا کر دی بلکہ پکوڑے بھی تل
کر دیئے تھے۔ حالانکہ اماں کا یہ نامعقول سا بھانجا اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا
تھا۔ جو ہر دس پندرہ روز کے بعد آدھمکتا تھا اور اماں اس پر ایسے واری صدقے
جاتی تھیں گویا مدت کے بعد محاذ جنگ سے لوٹا ہو۔ ان کے اس والہانہ
پن کے سبب شمسہ کو اس سے سخت خار کھاتی۔ مگر یہ سوٹ حاصل کرنے کے لئے
اس نے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور پھر ایک دن اس نے اماں کا
موڈ دیکھ کر بڑے چاؤ کے ساتھ ان سے سوٹ کا مطالبہ کر دیا۔ مگر ان کا خوشگوار
موڈ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ اور انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ لڑ جھگڑ کر بھی
دیکھ لیا مگر اماں ٹس سے مس نہ ہوئیں اور شمسہ اس سوٹ پر لعنت بھیج کر نہ صرف
چپکی ہو رہی بلکہ اسے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ حضرت اسرافیل کے صور
پھونکنے سے مردے قبر سے نکل سکتے ہیں مگر جو چیز اس پیٹی میں دفن ہو جائے
اس کا نکلنا ناممکن ہے

مگر شمسہ بھی دل میں تہیہ کئے ہوئے تھی کہ کسی دن اس پیٹی کو کھول کر رہے گی اس
کا موقع ایک دن اسے مل گیا۔ اس دن پڑوس میں شادی تھی۔ اس نے اماں کو تو بھیجا
کر بھیج دیا اور خود پڑھنے کا بہانہ کر کے گھر ہی میں رہی۔ حالانکہ پڑھائی کا اسے قطعی شوق نہیں
تھا علم بیل ہے ذہن میں پہنچ گئی تھی۔ کیوں کہ اماں کو اسے پڑھانے کا بے حد شوق
تھا۔ ان کا خیال تھا کم از کم میٹرک تو کرے تاکہ ڈھنگ سے بات کرنی تو آجائے
ورنہ شمسہ تو سرے سے اسکول جانے کے ہی خلاف تھی۔ آج جو اس نے پڑھنے
کا نام لیا تو اماں سمجھیں ان کی دعاؤں کا اثر ہے سو وہ اکیلی ہی چلی گئیں۔
ان کے جانے کے بعد اس نے احتیاطاً سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور
انتہائی دھڑکتے دل کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے تالا کھولنے لگی سارے تجسس

کہ اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ ابھی اس نے چابی تالے میں گھمائی ہی تھی کہ دروازہ زور سے بجنے لگا۔ شاید اماں واپس آگئیں۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ جلدی سے حواس درست کئے اور چابی چھپا کر باہر آئی اور دروازہ کھول دیا۔ مگر سامنے اماں کی بجائے ان کے لاڈلے بھانجے سہیل کو دیکھ کر اس کے تو بدن میں آگ لگ گئی۔ انتہائی طیش کے عالم میں کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی "اماں گھر میں نہیں ہیں۔ آجائے ہیں منہ اٹھائے" اس کے اس توہین آمیز انداز پر وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

اب اُلوؤں کی طرح منہ اٹھائے کیا کھڑے ہو آہی گئے ہو تو اندر مرو۔ اس نے پورے غصے کے ساتھ کہا۔

کب تک آجائیں گی خالہ؟ سہیل نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کمر پر لہراتے ہوئے لمبے بالوں کی چٹیا کو دیکھ کر پوچھا۔

جلدی آجائیں گی۔ شمسہ نے یوں کہا جیسے اس کی بات کا جواب دے کر اس پر احسان کر رہی ہو۔

"تم بیٹھو میں ذرا تمہارے لئے راتب تیار کر لوں۔"

شمسہ نے اس کی ارمان بھری نظروں کے جواب میں کہا تو سہیل سٹپٹا کر رہ گیا۔

اس کے عین موقع پر ٹپکنے سے شمسہ کو اس قدر غصہ آرہا تھا کہ سنکھیا مل جائے کہیں سے تھوڑی سی تو وہ چائے کے ساتھ گھول دے۔ کمبخت نے سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا اور اس دن کے بعد سے تو وہ سہیل کی ایسی بیری ہوئی کہ اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں رہی تھی ــــــ

جب اس نے میٹرک کر لیا تو اماں نے اس بھاری سل کو سینے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ ان کا لاڈلا بھانجا بی اے کے بعد اب بینک میں لگ چکا تھا اور خالہ کا شمسہ کو بہو بنانے کا مطالبہ زور پکڑ گیا تھا۔ بات تو بچپن سے ہی طے تھی اور سہیل کو تو اس کا علم بھی تھا مگر شمسہ سے اس بات کا چھپایا گیا تھا۔ اور آج شام کو خالہ خالو آرہے تھے تاریخ طے کرنے۔ سو اماں نے سوچا اب شمسہ کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔

میں کہتی ہوں یہ کھلنڈراپن اب ختم کرو اب شام کو خالہ آئیں تو ان کے سامنے ڈھنگ سے رہنا۔ ویسے بھی تمہارے ابا تمہارا رشتہ بچپن سے ہی سہیل کے ساتھ طے کر گئے تھے۔

اب سہیل کے اماں کے گھٹنے سے لگے رہنے کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا اور ابا کو اللہ معاف نہ کرے ـــــ یہی کھونٹا نظر آیا تھا مجھے باندھنے کے لئے۔ اس بدزبان کے منہ سے باپ کے متعلق یہ سن کر اماں سراپا قہر بن گئیں ان کے منہ سے کف جاری ہو گیا "ناہنجار اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تکلی پر چڑھا دوں گی توبہ کیا زمانہ آگیا ہے بالشت بھر کی چھوکری اور چلی ہے اپنے بیاہ کے معاملے میں ٹانگ اڑانے میرے منہ لگتی ہے بے حیا دور ہو جا میری نظروں سے" اور وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

شام کو خالہ آئیں تو اماں نے بڑے ٹھسے سے بیاہ کی ایک ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔ شادی کی تاریخ کیا طے ہوئی اماں نے گھر میں بھونچال مچا دیا۔

اے بیٹی شمسہ ذرا ادھر آنا اماں اس طلسمی پیٹی کو کھولے کھڑی تھیں اور بتیس تینتیس جوڑے نکال کر سامنے ڈھیر کئے ہوئے تھیں اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا وہ قریب آئی پیٹی کا ڈھکن بدستور کھلا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اماں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ پیٹی مختلف چیزوں سے لبالب بھری ہوئی تھی وہ آنکھیں پھاڑے جلدی جلدی اندر دیکھ رہی تھی مبادا اماں بند نہ کر دیں مگر اماں بے نیاز کھڑی تھیں۔ شمسہ یہ لو پیٹی کی چابیاں ہیں تو چلی بازار لچکا بانکڑی خریدنے تم سنبھالو میں بوڑھی جان کب تک اسے کھولتی اور بند کرتی رہوں گی۔ اور ہاں یہ سامنے سوٹ اس دوسری اٹیچی میں رکھ دو شام کو درزی کے وہاں چلنا تم میرے ساتھ۔" اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا وہ سب کچھ بھول بھال کر کپڑے سنبھالنے لگی۔ اماں کا یہ روپ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس لئے اسے ٹوٹ کر ان پر پیار آرہا تھا۔ ایک ماہ پلک جھپکنے میں گزر گیا اور وہ اس گھر سے رخصت ہو گئی

شادی کے بعد یہ کھلنڈری بالکل تبدیل ہو گئی۔ اس پیٹی کی افادیت کا اندازہ اسے جلد ہی ہو گیا۔ پیٹی تھی کہ عمرو عیار کی زنبیل جس چیز کی ضرورت ہوتی واٹر سیٹ، ٹی سیٹ، ڈنر سیٹ، بیڈ سیٹ اس پیٹی سے برآمد ہو جاتا۔ شادی کے بعد اس نے گھر کو اپنے سلیقے اور حسن سلوک سے اس طرح جنت بنا دیا تھا کہ خالہ نہال ہو ہو جاتیں اور سہیل اس پر فخر کرتا۔

شادی کو پانچ سال گزر گئے وہ دو پیارے پیارے بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ سہیل کی ترقی ہو گئی تھی۔ اس دن وہ ننھی روما کے بالوں میں سرخ ربن باندھ رہی تھی کہ سہیل آ گئے اپنی ترقی کی خوشی میں وہ اس کے لئے دو بہت خوبصورت سوٹ لائے تھے شوخی سے بولے، بھئی بہت بھوک لگ رہی ہے جلدی سے ہمارا راتب دے دو وہ ہنستی ہوئی اندر چلی گئی اس نے ننھی روما کے گال تھپتھپائے اور دونوں میں سے زیادہ قیمتی سوٹ پیٹی میں ڈال دیا۔

تبصرا

اس وقت ہمارے سامنے ماہنامہ "گگن" کا "مذاہب عالم نمبر" ہے۔ یہ رسالہ پچھلے اڑتیس سال سے بمبئی سے نکل رہا ہے اور اس کے ایڈیٹر ہیں شمس کنول اور شریکِ قلم ہیں ان کی اہلیہ شہناز کنول۔

یہ نمبر اس جذبے کو تقویت دیتا ہے جو ہمیں رسول کریم حضرت محمدؐ کی اس حدیث میں نظر آتا ہے کہ "ہر مذہب کے بزرگوں کی عزت کرو" اور ہم کسی مذہب کسی دھرم کی اور اس کے بزرگوں کی عزت اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمیں ان کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہوں۔ اس نمبر سے ہمیں یہی مفید معلومات ملتی ہیں۔ انہیں موضوعات کے حساب سے بہت سے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر بات بیش از معلومات ہے۔ ہر باب کو ایک عنوان موضوع کے اعتبار سے دیا گیا ہے۔ جیسے "پیام زندگی"، "نظام حیات"، باب آگہی، علم وعرفان، تاثرات، خود آگہی، نشانِ راہ، ایشور اللہ تیرے نام، بیرونِ شہر، شادی عوام، آستانے، عالم میں انتخاب، لطائف و حکایت (فرہنگ)، سورج کبھی تماشائی، ملے گی تالہ دل، وغیرہ

یوں تو ہر باب علمی ہے لیکن خصوصیت سے جن کا ذکر کرنا چاہئیے ان میں پہلا ہے باب آگہی —— اس کے تحت وہ مضامین ہیں جو تمام بڑے مذاہب اور دھرموں کا تعارف کراتے ہیں یہ مضامین تمام مذاہب کے مستند اور سنجیدہ عالموں سے لکھوائے گئے ہیں تاکہ صحت مند معلومات فراہم ہو سکیں اس کے علاوہ مضمون شروع ہونے سے پہلے اس مذہب کے بزرگ یا بانی کی سوانح اور مکمل تعارف بھی دیا گیا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اسلام پر لکھا ہے فادر کرسٹیس ٹرول نے عیسائیت پر، بھکشو سنالی نے بدھ مت پر اور ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا نے ہندو دھرم پر اسی طرح بقیہ مذاہب پر دوسروں نے لکھے ہیں۔

علم وعرفان کا باب قطعی عالمانہ ہے۔ اس میں مختلف دانشوروں، ادیب وصحافی اور سنجیدہ اہل قلم نے مذہب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جیسے مذہب اور طب، مذہب پر سائنس کے اثرات، مذہب اور روحانیت، اسلام اور دولت، ہندو فلسفۂ زندگی، مذہبی رسم ورواج، مذہب اور قومیت، بائبل، قرآن، بت پرستی اور قدیم مذاہب، جنت و جہنم، شجرہ آل رسول، عربوں کی تاریخ مختلف مذاہب میں خدا —— ایسے ہی تقریباً ۳۵ مضامین اور ہیں۔

ایشور اللہ تیرے نام —— اس باب میں صوفی، سنت اور پیروں فقیروں کا پورا حال تعارف اور تعلیم درج ہے۔ بیرونِ شہر عنوان سے دنیا کے تمام ہی قبیلوں (متمدن، وحشی، نیم وحشی) کے سلسلے میں بہت دلچسپ معلومات دی ہیں جو نرمی قصوں سے ہٹ کر حقیقت پر مبنی ہیں۔ شادی عوام تمام مذاہب کے تہواروں اور میلوں کی تصویر کشی کرتا ہے کہ کونسا تہوار کیوں منایا جاتا ہے اہل علم نے مذہب کے مختلف پہلوؤں کو لے کر اپنے تاثرات بیان کئے ہیں —— "کیا آج مذہب کی ضرورت ہے" (کالا در ایڈر ڈبے پریرا) "ہمیں مذہب کے غلط استعمال سے بچاؤ" (ڈاکٹر محمد حسن) "مذہب اور کمیونزم" (گوپال متل) "منکر، کافر اور موحد" (پی۔ ایس۔ رنگین) "ہندو مسلم تہذیبی اثرات" (ادارہ) "خدا ہے" (محمد عبدالجبار الخیری) "مذہب اور موسیقی" "حلال وحرام" (شمس کنول) اس قسم کے مضامین سے نت نئی معلومات ملتی ہیں۔ عالم میں انتخاب ان تاریخی اور مقدس شہروں کا باب ہے جو مختلف مذاہب میں اہم ہیں جیسے مکہ، مدینہ، کاشی، فلسطین، وغیرہ —— ان کا مذہبی تعارف بھی ملتا ہے۔ لطائف وحکایت مذہبی فرہنگ ہے۔ اس میں مذہبی شخصیتیں، مقامات، کتابیں، اور اسی طرح کی اصطلاحات کو بہ وضاحت بتایا گیا ہے۔ جیسے —— جنیو، پل صراط، کسپیو، سامری، آذر، رلی، ہامان، بیت العتیق، اعراف، گیہ ریوا، کپیل، اگستیہ، آمنا اریہ، یزدانی، ہرزل فیلو، ذور صالح دیاحد، دجی، کتھا، گائتری، لیسادا، اربندو، اعلان بل فور، لوح، اسکوریئل، توریت، مسیحا، صفا، وغیرہ۔ یہ فرہنگ تقریباً ڈیڑھ سو (ایک سو پچاس) صفحات پر مشتمل ہے اور حیرت انگیز معلومات کی حامل ہے —— اور قلم تکلّف "پر" [illegible] نئے انداز کا تبصرہ دیا گیا ہے۔

غرض ۶ سو ۱۱ صفحات کا یہ ضخیم نمبر علمی اور معلوماتی اعتبار سے اتنا وسیع کینوس رکھتا ہے کہ چند سطروں میں اس پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور آخر میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مذہبی معلومات پر مبنی ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس کی پڑھے لکھے لوگوں میں قدر ہوگی۔ اس کی قیمت ایک پچاس روپے ہے اور لائبریریوں، تعلیمی اداروں اور دیگر اداروں کے لئے =/۱۲۵ روپے۔

منگوانے کا پتہ ——

گگن میگزین، معرفت اکمل پرنٹنگ پریس ۱۱۱/۸ نواب مسجد
مسجد اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

میں اپنے ملک کے کروڑوں غریبوں کی حالت سے باخبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میرا دل چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ رہتا ہے۔ مجھے صرف انھیں کا خیال رہتا ہے کیونکہ کروڑوں ناداروں اور غریبوں کے دلوں میں رہنے والے خدا کے سوا میں کسی اور خدا کو نہیں جانتا۔

—— مہاتما گاندھی

بے توجہی کے شکار اور محروموں کی بستی میں ایک نیا سورج طلوع
۔ جن خاندانوں میں زیادہ تر یا صرف اجرت پر کام کرنے والے مزدور ہیں۔
جو چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔
جن کے پاس گزر اوقات کے لئے کوئی مستقل کام نہیں ہے۔

ایسے تمام خاندانوں کو

صنعت، ملازمت یا کاروبار کرنے کے لئے

کاروباری اور مستقل سرمایہ

بغیر گارنٹی کے

امدادی قرض کی شکل میں

تمام ضلعوں کے شہری علاقے میں فراہم کیا جائے گا۔

موجودہ مالیاتی سال ۸۵-۱۹۸۴ میں ایک لاکھ افراد کو مستفید کرنے کا نشانہ

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی ہر سلسلہ صرف ایک خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے، بشرطیکہ خبر ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ صاف صاف مختصر ترین الفاظ میں لکھی گئی ہو اور نمبر خریداری و پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔

• ۲۰ تاریخ بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

غزل جعفری (آرہ) میری بہن طاہرہ خاتون اور بہنوئی اعجاز احمد کو اللہ پاک نے ۱۷ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو ۳ ½ بجے دن میں ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• رضیہ شاہین (ویشالی) میری خالہ زاد بہن ناجدی توحید اور بہنوئی توحید الناصر کو اللہ پاک نے چوتھی بار ۲۴ر جولائی ۱۹۸۳ء بروز منگل بوقت ½ ۹ بجے ایک دختر عطا فرمائی نام رخشی قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• نکہت بانو لاری (گونڈہ) میری آپا مسرور جہاں اور بھائی محسن نذیر کو اللہ پاک نے ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے۔ آپا جان اور بھائی جان کو دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

• زبیدہ اختر، سائرہ بانو (آمبور) ہمارے ماموں چچا جان حاجی احمد اللہ صاحب و ممانی ساجدہ احمد صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے ۵ر ستمبر ۱۹۸۳ء بروز ہفتہ بوقت ۸ بجے صبح ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام منصور احمد رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

پیغاماتِ نشاط

• حاجی عبداللہ صاحب مشرقی نیا گاؤں، لکھنؤ) کے فرزند دلبند عبدالحی سلمہ (ایم اے، ریسرچ اسکالر) کی شادی حاجی کریم بخش مرحوم کی صاحبزادی پروین جہاں سلمہا کے ساتھ عمل میں آئی۔ اس سلسلہ میں حاجی عبدالستار صاحب نے ۲۰ر اکتوبر کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ اپنی رہائش گاہ پر دی، جس میں ان کے اعزہ اقربا اور معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم ابہولوی)

• مسز اشرف جہاں صاحبہ (ہلی بوٹ ہاؤس بمبئی ۸) کی صاحبزادی شمیم بیگم سلمہا کا عقد نکاح ہمراہ انیس الرحمٰن سلمہ (فرزند مرحوم حفیظ الرحمٰن مرزا۔ آگرہ) ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو ساڑھے چھ بجے۔ بیگ محمد باغ محمد علی روڈ بمبئی میں بحسن و خوبی عمل میں آیا۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم ابہولوی)

• سید زینت افزا لبیب نگر، بنگلور) میری بھانجی عشرت افزا سلمہا کی شادی نثار احمد ایم بی بی ایس (فرزند الحاج ایم ایم شیخ) کے ہمراہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو اور میری بھتیجی زیبا نسرین سلمہا کی شادی شیخ فاروق (فرزند ایم محبوب جان) کے ہمراہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں جوڑوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• میرے کرم فرما ڈاکٹر داور حسین صاحب (مشرقی نیا گاؤں لکھنؤ) کے فرزند دلبند عزیزی خورشید احمد سلمہ کی شادی نجمہ سلمہا (دختر نیک اختر وجاہت علی صاحب، سندیلہ) کے ہمراہ یکم نومبر ۱۹۸۳ء کو بمقام سندیلہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر داور حسین صاحب نے اپنے اعزہ و اقربا اور معززین شہر کو ۲ر اکتوبر کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم ابہولوی)

انتقالِ پُرملال کی خبریں

افسوس صد افسوس کہ نسیم بکڈپو کے سب سے قدیم کارکن ظہور محمد نزی صاحب کا ۱۴ر ۱۵ر کی درمیانی شب میں میڈیکل کالج میں انتقال ہو گیا۔ ظہور محمد مرحوم نسیم بکڈپو میں ۱۹۴۳ء سے کام کر رہے تھے، وہ ایک ایماندار محنتی اور مخلص انسان تھے، جلدسازی کے ایسے فن کار تھے کہ ان کا ثانی مشکل

ہی سے مل سکتا تھا۔ چند ماہ سے وہ علالت کے باعث دفتر نہیں آ رہے تھے لیکن اِدھر چند روز سے آنے لگے تھے ۱۳ اکتوبر کی شام کو اچھے بھلے رخصت ہوکر دفتر سے گئے۔ خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ وہ پھر کبھی دفتر نہ آسکیں گے لیکن اسی شب ان پر دل کا دورہ پڑا۔ انھیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا اور ۲۴ گھنٹے بعد ہی وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرحوم بڑے پابند صوم و صلوٰۃ تھے اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ۱۹ اکتوبر کی سہ پہر کو انھیں کھدرے کے قریبی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (شریک غم۔ نسیم انہونوی)

• بی عقیلہ انجم (پرنام بٹ) میرے ماما محترم عبدالستار پاشا ایک مختصر علالت کے بعد ۲۲ ستمبر ۸۳ء بروز ہفتہ بوقت صبح سات بجے مدراس میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑے نیک خوش اخلاق اور غربا پرور تھے۔ عوام میں بڑے ہردلعزیز تھے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں صبر جمیل عطا فرمائے۔

پسندیدہ ناولوں کے نئے ایڈیشن

چارہ گر	بشریٰ رحمٰن	-/۲۴
عندلیب	سلمیٰ کنول	-/۳۰
انتظار سحر	ہاجرہ نازلی	-/۲۴
روپ	رضیہ بٹ	-/۲۴
تیری آنکھوں کے دیئے	عطیہ پروین	۱۶/۵۰
بہاریں پھر بھی آتی ہیں	〃	-/۱۸
نائلہ	〃	۲۲/۵۰

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، ساتھ ہی موزوں اور بامعنی ہو۔ شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جس ماہ کے پرچے میں شعر چھپنا ہو، اس سے پہلے ماہ کی ۲۰ تاریخ تک وصول ہونے والے اشعار ہی شریک اشاعت کئے جاتے ہیں۔ دسمبر کے لئے عنوان ہے "اشک" جنوری کے لئے "شوق"

وفا کی شرط اول ہے نثارِ شمع ہو جانا
کوئی پروانہ کہہ دینے سے پروانہ نہیں ہوتا

مرسلہ: بی نیرہ بانو (پرنام بٹ)

جان تم پر نثار کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

مرسلہ: سمیعہ صبا

جاں نثاران کی محبت پہ کریں گے ہم بھی
گر ملے ان کی محبت سے محبت کا جواب

مرسلہ: کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)

اے دوست تجھ پہ عید کی خوشیاں نثار ہوں
جلتی رہے گی شمع تری انجمن سے دور

مرسلہ: تحسین تبسم عطیہ سلطانہ (آمبور)

سو جان سے ان کی اس شانِ تغافل پر نثار
بے رخی کرتے ہیں لیکن بے رخی ہوتی نہیں

مرسلہ: صوفیہ مظفر (جمشید پور)

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
یہ جانِ بیقرار ہے تجھ پر نثار کیوں

مرسلہ: بی عقیلہ انجم (پرنام بٹ)

تمہارے دردِ محبت پہ جاں نثار کریں
یہی ہے حاصلِ الفت تو کیوں نہ پیار کریں

مرسلہ: قرۃ العین حیدر (اندریا)
مرسلہ: نگہ افصار (مجشگل)

مکمل طور پر مجرم بن گیا ہوں۔ اس لیے واجب سزا ہوں شاہِ ہند
چاہیں تو..... ابوبکر شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور بولا، جن
سے محبت کی جاتی ہے ان کو پھولوں کی طرح رکھا جاتا ہے۔ شبینہ کے
چہرے پر ایک شرمگیں مسکراہٹ پھیل گئی۔ ابوبکر شاہ نے پہلی
مرتبہ کھل کر چاہت کا اعتراف کیا تھا۔
"ابوبکر شاہ تمہاری عنایات تو فیروزی غلاموں پر اور میری ذات
پر بے حساب ہیں۔ ہم نے وفا شناس ماؤں کا دودھ پیا ہے اور غیور
باپوں نے ہماری تربیت کی ہے۔ اسی لیے ہم حق گوئی سے نہیں
جھجکتے۔ اور اپنے محسن کو ہر خطرے سے آگاہ کرتے ہیں۔ خواہ اس
میں اپنی ہی جان کا خطرہ کیوں نہ ہو"
"کیا ناصر الدین کے علاوہ اور بھی کوئی ہم سے پرخاش رکھتا ہے"؟
ابوبکر شاہ بات کی تہہ تک پہنچتا ہوا بولا۔
"تم ایک شجاع باپ کے بیٹے ہو اور دانا و بینا شہنشاہ۔ حکمرانی اور ملک گیری
کے دھندوں سے مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتے ہو۔ لیکن جتنا میں جانتی ہوں
اس سے آگاہ کرنا میرا فرض بن جاتا ہے۔ تمہاری یہ فتح بڑے دور رس
نتائج سامنے لائے گی۔ تم نے بہت بڑے محاذ کو سر کیا ہے لیکن
دشمن کو کمزور مت سمجھو جبکہ ابھی وہ اس دنیا میں موجود ہے۔ ناصر الدین
کو اپنے بیٹے ہمایوں خان سے مدد مل سکتی ہے۔ جو سامانہ کا حکمران ہے
تمہیں چاہیے کہ فوری طور پر سامانہ پر حملہ کر دو سانپ کا بچہ بھی موذی ہی
ہوتا ہے اسے بھی رحم کا مستحق مت سمجھو"
ابوبکر شاہ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔

چوتھی قسط

ابوبکر شاہ مبہوت سا شبینہ کو تک رہا تھا۔ محبت کا یہ جداگانہ انداز
اس کے لیے قطعی طور پر نیا تھا۔ وہ سوچنے لگا شبینہ کا یہ والہانہ پن یہ
محبت یہ خدمت اور جاں نثاری کا احساس کتنا پیارا ہے کتنا بلند ہے
ارفع ہے اعلیٰ ہے۔ کیسی لڑکی ہے جو دل اور جان سے محبت کرنے کا
مفہوم صحیح معنوں میں سمجھتی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور شبینہ کو اپنی
بانہوں میں لے کر بولا۔
"تیرا ساتھ رہا تو ہم سارے جہان پر حکومت کر کے دکھا دیں گے"!
شبینہ نے خود کو اس سے بہ آہستگی الگ کیا اور بولی: مجھے لگتا ہے کہ
ابوبکر شاہ بہت کچھ جانتے ہیں"
وہ مسکرایا اور بولا "ہم ناصر الدین کی طرف سے غافل نہیں ہیں اسی بات
سے باہر اسی لیے گئے تھے کہ ناصر الدین نے اگر حملہ کیا تو کس طرف سے ہم محفوظ
رہ کر جوابی کارروائی کر سکیں گے
"تو پھر کیا سوچا ہے۔؟
"ہم اپنا لشکر ترتیب دیں گے۔ ہمارے ساتھ وہ سب ہیں جو ناصر الدین
کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے ہیں ان کی تعداد بے حساب ہے۔ ناصر الدین بھی
کمزور کچھ کر رہا ہے مگر اس کی موت ہی اسے یہاں لائے گی۔ ابوبکر شاہ
کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو خلد آشیاں حضرت فیروز
شاہ تغلق کی پاک رگوں میں تھا۔ نہ ہم بزدل ہیں نہ کمزور۔ تو دیکھنا
مستقبل ہمیں کہاں پہنچائے گا"
مجھے یقین ہے کہ تم بہت بلند پرواز ہو۔ میں جب تمہاری پناہ میں
آنے کے لیے نکلی تھی تب سے مجھے تمہاری ذات کی ان خوبیوں کا احساس

تھا: وہ بولی۔

ابوبکر شاہ پیار بھری نظر ڈال کر بولا، "تیرے بول اتنے میٹھے ہوتے ہیں کہ ہم حالات کی ساری کلفت بھول جاتے ہیں۔"

بات بھیگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شبینہ کے دونوں شانوں کو پکڑ کر بولا "تیری رفاقت اگر دائمی ہو تو ہماری ہر قسم کی تکان اتر سکتی ہے۔"

شبینہ نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور آہستہ سے بولی: "شاہ ابوبکر تمہاری جسمانی تکان اتارنے کے لیے تو اس قلعے میں بے شمار کنیزیں اور لونڈیاں موجود ہیں۔ مگر مجھے اپنی روح کی تازگی کے لیے وقف رکھو تم خود محسوس کرو گے کہ میرے پاس گزارا ہوا وقت تمہیں ذہنی طور پر کس قدر تر و تازہ رکھے گا اور تمہاری سوچ و فکر کو کتنی فرحت ملے گی۔ ویسے میں اول و آخر تمہاری ہی ہوں مگر میری خواہش ہے کہ مجھے جرعہ جرعہ پیو، میں ایک ہی سانس میں پینے والی چیز نہیں ہوں۔"

ابوبکر شاہ پیار سے دیوانہ ہوا اٹھا، "قسم ہے ذوالجلال کی میں نے اتنی پیاری گفتگو کرنے والی حور صفت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ تو صرف پیار کرتی ہی نہیں پیار کا مفہوم بھی سمجھتی ہے۔ میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر پینے کا قائل نہیں اور تجھے تو صرف دیکھ کر ہی سیراب ہو جاتا ہوں۔"

شبینہ نے خوش دلی سے سلام پیش کیا۔ آدھی رات تک ابوبکر شاہ اس کے ساتھ لطف مجلس اٹھاتا رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی شبینہ محلسرا لوٹ آئی۔

"ہم تاج و تخت کے مالک تو ضرور بن گئے ہیں مگر تجھے ہمارا کہا ہوا ایک بات شاید یاد نہیں رہا ہے۔"

"اگر بات حد ادب سے باہر نہ سمجھی جائے اور اس یاد فراموشی پر معاف کریں تو پھر وہ بات یاد دلا دیں جو مجھے ذہنی خلجان سے نجات دے سکے۔"

"تیرا ذہنی خلجان غلط ہے۔ ہم نے بہت پہلے یہ بات کہہ دی تھی کہ اگر ہم شکست خوردہ ہیں مگر کل ہمارا ہے۔ ہم ناصرالدین کو شکست دیں گے اور فتح یاب ہونے کے بعد تو دیکھنا تیرا مقام کیا ہوگا۔ البتہ ہمیں تجھ سے تھوڑا سا شکوہ بھی ہے۔"

شبینہ نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا تو محبت سے بھرپور و در شوق نظریں اپنی طرف دیکھتی ہوئی ملیں۔ شرم سے شبینہ کی نگاہیں جھک گئیں ابوبکر شاہ اٹھ کر اس کے قریب آیا اور کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر پیار سا دباؤ ڈال کر بولا: "ہم تجھے بہت بلند مقام دینا چاہتے تھے لیکن تو نے ہمیں روکا اور کہا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ تیری اور ہماری زندگی کا مقصد ایک ہی تھا ناصرالدین سے ظلموں کا حساب لینا اور وہ لیا جا چکا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اب کس بات کا انتظار ہے بہرحال ہم تیرے اعلیٰ کردار اور علم کی عزت کرتے ہیں اور آئندہ کرتے رہیں گے۔ ہمیں اپنے آپ پر بھی اعتماد ہے اس لیے تخت و تاج اور بادشاہت کا چھن جانا اور مل جانا ہمارے لیے اہمیت نہیں رکھتا نہ ہمارے قول و قرار کو حاضر کرتا ہے اب بتاؤ اس ذہنی خلجان کے ذمہ دار ہم ہیں یا تو۔"

...ہا مایوس ہو گیا۔

شبینہ کے لیے ایک محاذ اور تیار ہو گیا تھا جہاں اسے لڑنا تھا۔ وہ
اتنی تھی کہ کسی بھی مرحلے پر شکست اسی وقت ہوتی ہے جب اپنے
مدہ میں پھوٹ پڑ جائے اور دِلوں سے غداری کی ابتدا ہو۔ آدم خان
بھی اسے اب اعتماد نہیں رہا تھا، وہ جلد سے جلد ابو بکر شاہ سے ملنے
کی خواہش مند تھی اس نے کنیز کو بھیج کر اپنی آمد کی اطلاع کروائی۔ ابوبکر
شاہ نے حسب روایت پھول اور خوشبویات بھیج کر پیغام بھجوایا کہ
وہ مغرب کی نماز کے بعد خود اس کے پاس آئے گا۔ شبینہ آئندہ کے
بارے میں سوچنے لگی۔

بعد مغرب ابوبکر شاہ شبینہ کے پاس آیا۔ کل کے اور آج کے ابوبکر
شاہ میں فرق تھا، کل وہ سپاہی تھا آج شہنشاہ۔ اس کے چہرے پر
خوشی و طمانیت کے ساتھ ایک تمکنت بھی آ گئی تھی۔ تخت و تاج کا وقار
الگ ہی ہوتا ہے جو اس کے بشرے سے عیاں تھا۔ اس کے حرکات
میں ایک نمایاں فرق شبینہ کو محسوس ہوا۔ اس نے کھڑے ہو کر ابوبکر شاہ
کو سلام پیش کیا۔ وہ کچھ تعجب آمیز ہنسی کے ساتھ بولا، "کیا بات ہے؟
ہم کچھ بلند ہو گئے ہیں یا ہمیں تو تم ہی کچھ بدلی بدلی لگ رہی ہو۔"

"شاید ہم دونوں ہی تھوڑے بدل گئے ہیں۔" وہ بولی۔

"مطلب واضح کرو۔"

"پہلے تم ایک بہادر سپاہی تھے اور میں تمہاری شمشیر۔ اب تم
شہنشاہ بن چکے ہو تمہارا مرتبہ مجھ سے بہت بلند اور مجھ پر اس احساس کا
غلبہ ہے کہ اب میری حیثیت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔"

نوشینہ شہزادے ہمایوں خان کی زندگی میں کیا آئی وہ ہر بات
سے بے خبر ہو گیا۔ دن رات شراب پینا اور نوشینہ سے کھیلنا اس
کا دل پسند مشغلہ تھا۔ وہ نوشینہ کی ایک ایک ادا کا دیوانہ تھا۔ اس
کی آواز اس کا انداز رقص۔ اس کی شراب چھلکاتی آنکھیں، بدن
کا ساغر، ہونٹوں کے پیالے، زلفوں کی گھٹا۔ غرض وہ جتنا پیاس
بجھاتا اور بھڑکتی۔

ایک رات وہ نوشینہ کے پاس آیا تو کچھ فکر مند سا تھا۔ نوشینہ
نے اس کے قریب بیٹھ کر پیالہ شراب سے بھر کر اسے دیا اور بغور اس
کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ ہمایوں خان نے پیالہ ایک ہی سانس میں
خالی کر دیا اور پھر نوشینہ کی طرف بڑھا کر بولا۔ "اتنا پلا دے کہ ہم
کشمکش حیات کو بھول کر لطف و انبساط کی دنیا میں پہنچ جائیں۔"

"زندگی تو لطف و انبساط ہی کا نام ہے اور شہزادے ہمایوں خان
نے مقصد زندگی عیش و عشرت کیف و مستی ہی کو مقرر کیا ہے۔ وہ کون
ہے جو اس لذت آگیں مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے؟" نوشینہ
نے سوال کیا۔ شہزادے نے کچھ تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔
"تیری خیال آفرینی قابل ستائش ہے۔ بہت جلد بات کی گہرائی تک
پہنچ جاتی ہے سچ بتا تو نے کیسے جانا کہ ہمیں کوئی پریشانی ہے جو
تو نے سمجھی؟"

نوشینہ ایک ادا سے مسکرائی۔ کافر ادا نے انگڑائی لی اور بولی "تمہارا
ہمیشہ کے اور آج کے معمول میں میں نے فرق محسوس کیا۔ روز آنکھیں
میری قربت پا کر مدہوش کر دیتی تھیں۔ تم کشمکش حیات پر یقین ہی

نہیں رکھتے تھے، لیکن آج تمہیں مدہوش ہونے کے لیے مجھ سے پہلے شراب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب بتاؤ کہ وہ کون دشمنِ راحت و آرام ہے؟"

"اوہ۔ ایسا مت کہو۔ تو ہمیں دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے لیکن وقت ہمارا دشمن ہو رہا ہے۔ ہمارے بابا جان شاہ ہند ناصر الدین تغلق دہلی سے سامانہ پہونچ رہے ہیں اور ہمیں ساتھ لے کر وہ میوات میں چھپے ہوئے ابوبکر شاہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس بدبخت نے نہ صرف یہ کہ باباجان سے نافرمانی کی ہے بلکہ ان باغی غلاموں کو پناہ بھی دے رکھی ہے جن کی خباثت کی وجہ سے وہ دو بار شکست سے دوچار ہوئے وہ کم ظرف . . .

نوشینہ نے تڑپ کر شہزادے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تو نے ہمیں ٹوک کیوں دیا۔؟ ہمایوں خاں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"شہزادے۔ نوشینہ کچھ سنبھل کر بولی خدا کے لیے میرے سامنے جنگ و جدال کا ذکر مت کرو۔ میرا نازک سراپا اور کمزور دل ایسی ہولناک باتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"خیر ہوئی ورنہ تو نے تو ہمیں ڈرا دیا تھا ہم سمجھے کہ تو فیروزی غلاموں کی ہمنوا بن کر ہمیں کچھ کہنے سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ تو کیا جانے کہ آج کل اس پریشانی کا سبب وہ بھی ہیں۔"

نوشینہ کی آنکھوں میں بجلی سی چمکی اور بجھ گئی وہ ہمایوں کے سینے پر سر رکھ کر بولی "ہمایوں خاں مجھے دنیا میں کسی سے کوئی واہ

"زبان سنبھال کر بات کر آدم خاں، حرص و طمع سے تیرا خمیر ہے۔ میرے لیے یہ چیزیں کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہیں، لیکن تیرا سر کچلنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔"

"نوشینہ ان شاہی محلات اور یہاں کے کر و فر نے تیرا دماغ بھی خراب کر دیا۔" وہ بولا۔ نوشینہ کا چہرہ غیظ و غضب سے تمتما اٹھا اس نے ایک سخت نظر آدم خاں پر ڈالی اور منہ پھیر کر بولی: آدم خاں! فیروز شاہی غلاموں پر پے بہ پے پڑنے والی افتاد نے اگرچہ ان کے حواس مختل کر دیے ہیں مگر شکر ہے رب العزت کا میں بدبختی کی اس منزل پر نہیں پہونچی جہاں آبا و اجداد کی لاشوں پر ایوانوں کے محل کھڑے کیے جاتے ہیں۔ ضمیر بیچ کر مطلب براری کی جاتی ہے اور اپنی ذات کو سرِ عام نیلام کیا جاتا ہے۔ اور . . . .

میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ آدم خاں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ تو نے مجھ سے بے وفائی کی ہے اور میں جانتا ہوں میرا مقابل کون ہے تو نے ابوبکر شاہ کو مجھ پر فوقیت دی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ابوبکر شاہ پر تو کیوں ریجھی ہے۔ لیکن تجھے حاصل کرنا اب میری انا کا سوال بن چکا ہے۔"

خاموش رہو۔ نوشینہ زور سے چیخی تیرا دل گندگی کی دلدل ہے اور تیرے دماغ میں شیطانی مادہ ہے تو کیا ابوبکر شاہ سے مقابلہ کرے گا اس کا سا ظرف تو پیدا کر۔ مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کر کہ تو فیروز غلام ہو کر ایک بے حیا زندگی گزار رہا ہے۔ تف ہے تجھ پر۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور آدم خاں پیچ و تاب

"بہت بے صبر انسان ہے تو۔" شبینہ ناگواری سے بولی، "میں نے
محسوس کیا ہے کہ تجھے صرف اپنے فیروز شاہی گروہ سے ہمدردی ہے۔ ان
کی موجودہ حالت پر افسوس، تو ہر کام صرف اپنی ذات کے فائدے
کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ یہ کم ظرفی تجھ میں کہاں سے آئی کاومخان؟"
اس نے ایک زہریلا سا قہقہہ لگایا اور بولا "شبینہ تو نے مجھ سے کام
لیا ہے صلہ دینے کے وعدے پر اب تو مکر نہیں سکتی۔ میں پہلے ہی
کہہ چکا تھا کہ بادشاہوں کے عروج و زوال اور عوام کی پریشانیوں
سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں نے نہ وفاداری سیکھی ہے نہ غداری
میں صرف وقت اور حالات کے تحت خود کو بدلتا ہوں کسی کے لیے
وفادار بن کر خود کو ہلاکت میں ڈالنا میرے ہاں جائز نہیں۔ میں سب کے
کام کرتا ہوں اگر اچھا صلہ ملے۔"

"تب پھر میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔ غیر جانبدار شخص دنیا
میں کسی کا نہیں ہوتا۔ نہ تجھ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ زندہ رہنا
ہے تو شیر بن کر رہ بھیڑیوں والی صفت اپنا کر خود کو ذلیل
مت بنا۔"

"ان سب نصیحتوں کو چھوڑ۔ میں نے تیری خاطر خود کو تکلیف
دی ہے اور اب میں تیرا ساتھ چاہتا ہوں۔"

"میرا ساتھ کسی بزدل اور ابن الوقت انسان کے ہاتھ میں نہیں
آ سکتا جیسے اس خود غرض کا صلہ محرومی ہے اب تو جا سکتا ہے۔"
"میں نے خود کو کبھی محروم نہیں رکھا نہ کل اور نہ آج۔ البتہ تجھ
سے بگاڑ کر اس شاہی عنایات سے ضرور محروم ہوگی۔"

ہے نہ چاہ میں تمہارے لیے ہوں اور تم میرے لیے اور میں تمہارے
بغیر نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں الگ نہیں کر سکتی۔ یہ
ناممکن ہے قطعی ناممکن۔"

"جان جہاں تمہارے بغیر تو ہم بھی نہیں رہ سکتے۔" وہ اسے اپنے
قریب کھینچتا ہوا بولا۔

"میں نے تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑا ہے شہزادے لیکن تم مجھے
اب تنہا کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟"

"بخدا ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے مگر تو ہی بتا بابا جان کے حکم
کا کیا کریں؟"

"کیا بارگاہ عالی میں میرا ادنیٰ سا مشورہ قابل قبول ہوگا؟"
نوشینہ اس کی آغوش میں سما کر بولی۔

ہمایوں خاں کا عیاش ذہن عورت کے جسم سے آگے کچھ سوچ ہی
نہیں پاتا تھا۔ نوشینہ کے کان پر اپنے ہونٹ رکھ کر ہمایوں خاں
نے سرگوشی کی "حقیقت یہ ہے کہ ہم تیرے ہی دل و دماغ سے سوچنے
کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم خود تیرو تلوار سے دوری محسوس کرتے
ہیں اب اگر تو کوئی معقول مشورہ دے سکے تو اس پر ہم غور کریں
بابا جان کو مطمئن کرنا آسان نہیں ہے۔"

"بابا جان پہلے تمہارے باپ ہیں پھر شہنشاہ۔" نوشینہ مکاری
سے ہنسی "تم بیماری کا عذر پیش کر دو۔ چند دن پہلے تمہاری طبیعت
ناساز تھی اور دشمنوں کو کمزوری و ضعف کی شکایت ہوئی تھی۔ تم
جنگ کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکو گے، شاہی طبیب اس

بات کی تصدیق کریں گے۔ اور شاہی طبیب کو تمہاری مرضی کا پابند ہونا چاہیئے۔"

نوشینہ نے ایسا جال ڈالا کہ شہزادہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا اس لیے بخوشی اس تجویز پر صاد کیا اور خوش ہو کر بولا: "واللہ خوب بات سمجھائی، ہم یوں ہی تیرے دیوانے نہیں ہیں، اب ہم فکر و پریشانی سے آزاد ہیں ہمیں رنگین فضاؤں میں لے چل۔ صبح سے جنگ اور قتل و غارت گری کی باتیں سن سن کر ہمارا ذہن بڑا پراگندہ ہو رہا ہے کوئی ایسی چیز سنا کہ ہمیں سکون ملے۔ ہمارا دل مچل رہا ہے اسے راحت ملے۔ تیرے گلے میں وہ سوز و نغمگی ہے کہ ہماری روح وجد کرنے لگتی ہے آج بھی ہم تیرے جنوں خیز ترنم میں ڈوب جانا چاہتے ہیں۔"

نوشینہ نے مسکرا کر ساز اٹھایا اور ایک غزل شروع کی جو محبت بھی فراق و وصال، ملاپ اور جدائی کے جذبات سے پُر تھی۔ دلنشین اداؤں اور سریلی آواز کا جادو جاگ اٹھا تھا۔ شہزادہ مست ہوا جا رہا تھا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچی تو شہزادہ جھومنے لگا۔

گر قدم بر چشم ما خواہی نہاد
دیدہ در رہ مے نہم تا میروی

(اگر تم چاہتے ہو کہ مجھ تک میری آنکھوں پر چل کر آؤ۔ تو میں اپنی آنکھیں زمین پر رکھ دوں (بچھا دوں) کہ تم آؤ)

آواز کا حسن اور غزل کی رنگینی نے ایک سحر کی کیفیت پیدا کر دی تھی ہمایوں خاں بار بار اسی شعر کو پڑھنے کی فرمائش کرتا اور نوشینہ نئے نئے انداز سے اسے پڑھتی رہی۔ ہمایوں خاں محبت بھری نظروں

سے بھی باخبر تھی اور اس کی چاہت کے تقاضوں سے واقف تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہی وقت ہے جب وہ ابوبکر شاہ کے ذریعہ ظالموں سے بدلہ لے سکتی ہے اور اس موقع کو وہ جذباتی بن کر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تو صرف اپنی ذات کے عیش و آرام اور خوشی و مسرت کے لیے بہت کچھ حاصل کر سکتی تھی لیکن وہ خود غرض بن کر اپنے اس عہد سے دست بردار ہونے کے لیے بھی تیار نہیں تھی جو اس کے ماں باپ آخری وقت میں اسے سونپ کر گئے تھے۔

ابوبکر شاہ بڑے تزک و احتشام سے دارالسلطنت دہلی میں داخل ہوا لگاتار جنگوں نے ملک کا شیرازہ بکھیر رکھا تھا، عوام پریشان حال تھے، ہر شخص حکمرانوں اور امیروں وزیروں کے ظلموں سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ابوبکر شاہ نے تاج پوشی کی رسم اور فتح کا جشن ایک ماہ کے لیے ملتوی کر دیا۔ وہ سب سے پہلے عوام کے دلوں میں اعتماد بحال کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے راحتی کام شروع کروائے اور رفاہ عام کے لیے وزیر مقرر کیے۔

نگینہ کو بھی ایک آراستہ پیراستہ محل اور کنیزیں تفویض کی گئیں۔ لیکن ایک پورا عشرہ گذر چکا تھا اس کی ملاقات نگینہ سے نہیں ہوئی تھی نگینہ باہر کے حالات سے تقریباً لاعلم تھی۔ آخر اس نے آدم خاں کو بلوا بھیجا۔ وہ سر کے بل دوڑتا ہوا آیا۔ نگینہ کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا: "اب تو تجھے سب کچھ حاصل ہو چکا ہے، میری خدمات کا صلہ کب دے گی؟"

وہ اس کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ پھر آہستہ سے بولی: "ابوبکر شاہ۔ ہر انسان کی زندگی کا ایک مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اور اس میں کامیابی اسے کشادہ دل اور فراخ حوصلہ بناتی ہے لیکن جد و جہد کے زمانے میں وہ بڑا بے رحم ہوتا ہے، مانتے ہو اس بات کو؟"

وہ زور سے ہنسا۔ "تو خود بتا کہ تیری بات کی سچائی کا اقرار کریں یا انکار۔"

"فتح یاب انسان وسیع النظر ہوتا ہے اس لیے اقرار کر لیجئے" شبینہ نے پھر بگاڑ دیا۔

"ٹھیک ہے ہم اقرار کرتے ہیں:" وہ بدستور ہنستا رہا۔

"تو پھر مجھے بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہونے دیجئے۔ وہ دن ضرور آئے گا۔ ابوبکر شاہ جب ہم فاتح ہوں گے اس وقت تمہیں یہ حق دیں گے کہ تم ہم سے کچھ مانگو اور ہم فراخ دلی سے وہ چیز تمہیں پیش کر دیں:" وہ ذرا اکڑ کر بولی۔ ابوبکر شاہ نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور بولا۔ "جانم بہت بے صبرا انسان ہوں ہم اس دن کا انتظار کریں گے جب تم ہمیں کچھ مانگنے کا موقع دو گی لیکن اپنے اس وعدے کو فراموش نہ کر دینا:"

"کبھی نہیں۔" شبینہ نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ "حکمراں اپنے قول سے کبھی پھرا نہیں کرتے:"

پھر دونوں کے قہقہوں سے فضا گونج اٹھی۔

شبینہ کی زندگی کا مقصد صرف انتقام تھا۔ اگرچہ وہ ابوبکر شاہ کے لیے اپنے دل میں انوکھے جذبات محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں اکثر ابوبکر شاہ کا نام گونجنے لگتا تھا۔ وہ اس کے بغیر

سے نوشینہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ آخر اس سے صبر نہ ہو سکا۔ نوشینہ کے ہونٹوں سے پھوٹتے نغمے کو سن کر وہ مدہوش ہو گیا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر کر محبت کی مہر ثبت کر دی۔ گانا رک گیا اور نوشینہ شہزادے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پگھلتی رہی۔ انتقام کا جذبہ اسے ذلتوں کی خندقوں میں گراتا جا رہا تھا۔

جس وقت شمع دان میں لگی شمع بھڑک کر بجھی تب ہمایوں خاں چونکا اور باہر نکلا۔ صبح کی سرخی نے آسمان کا چہرہ لال کر رکھا تھا۔

*

عین وقت پر ہمایوں خاں کی طرف سے ناصر الدین محمد کو جنگ میں شرکت نہ کرنے کا معذرت نامہ ملا۔ وہ بہت جھنجھلایا لیکن معذرت نامے کے ساتھ ہی شاہی طبیب کا خط بھی تھا کہ شہزادہ معظم ابھی بیماری سے اٹھے ہیں اور ابھی مکمل شفایاب نہیں ہوئے ہیں کمزوری اور ضعف کی بنا پر انہیں جنگ سے معاف رکھا جائے۔

نوشینہ، شہزادے کی سوچوں پر قابض ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہا تھا۔ رنگ رلیوں کے دلدادہ شہزادے ہمایوں خاں کو دن رات شراب اور شباب کی ضرورت رہتی تھی۔ ایک ایک وقت میں وہ کئی کئی کنیزوں کو طلب کرتا۔ ناچ رنگ [illegible] سمجھتا۔ جام پر جام لنڈھائے جاتے۔ وہ کیف و مستی [illegible] ایک بوسے کی قیمت لگاتا۔ اتراتا، مچلتا، حسینائیں تازہ [illegible] دکھاتیں بولی بڑھاتیں اور پھر اس نیلام گاہ میں گل بدن [illegible] ہمایوں خاں ان سودوں کو منفعت بخش سمجھ کر خوشی سے پھول [illegible]

تھیل میں رات بھیگ جاتی اور لڑکھڑاتا ہوا حسن و شباب کے مجسمہ نوشینہ کے پاس پہنچ جاتا۔ جہاں پھر عشق و محبت کے نام پر ہوس کا بازار سجتا۔

ہمایوں خاں کو اس وقت بھی پتہ نہیں چلا کہ ناصر الدین تغلق کب اپنی فوج لے کر روانہ ہوا اور دہلی سے باہر نکل کر موضع کنڈلی میں ابوبکر شاہ کی عظیم فوج سے ٹکرا گیا۔ ابوبکر شاہ کی فوج میں وہ لوگ تھے جو اپنے عزیزوں اور پیاروں کی تباہی اور موت کے زخم سینوں پر لیے ہوئے تھے۔ جن کے دلوں سے آہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا اور جو ناصر الدین سے ذاتی انتقام لینے نکلے تھے۔ اپنے مجرم کو سامنے دیکھ کر وہ بھوکے شیروں کی طرح ناصر الدین کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی ادھوری زندگیوں نے مرنے یا مارنے ہی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہوش سے بیگانہ فیروزی غلام ایسی بے جگری سے لڑے کہ خود ابوبکر شاہ بھی حیران رہ گیا۔ دو روز ناصر الدین کی فوج نے مقابلہ کیا لیکن اس کا ستارہ گردش میں آ چکا تھا اور خون ناحق اپنا حق لینے آ گیا تھا تیسرے روز اس کی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی اور خود ناصر الدین بھی بھاگا۔ ابوبکر شاہ کی فوج نے اس کا پیچھا کیا اور اس کا مال و متاع لوٹ کر فتح کے شادیانے بجاتی واپس ہوئی۔ ابوبکر شاہ فتح و نصرت کے نشہ میں سرشار سب سے پہلے شبینہ کے پاس پہنچا اور بے اختیار ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔ شبینہ نے مسکرا کر اس کی پشت تھپکی اور پھر اسے بٹھا کر بولی: فیروز شاہی غلاموں کی طرف سے ممنونیت کا اظہار قبول کرو ابوبکر شاہ۔ تم نے

ہماری روحوں پر لگے زخموں کو اپنے ہاتھوں سے بھرا ہے ہم سب تمہارے شکر گزار ہیں۔"

"نہیں میری روح۔ نہیں یہ فتح تیری ہی عنایات سے ملی ہے۔ ہم نے ایک اجگر کا سر کچلا ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ ہم نے فیروزی غلاموں پر جو اعتماد کیا تھا اس کے نتیجے میں آج ہم سرخرو ہوئے ہیں۔ تم اگر وفادار ہو تو ہم وفا شناس ہیں۔ مانگو آج کیا مانگتی ہو۔؟"

"میرے تاجدار۔! یہ فتح اور کامرانی تمہیں اپنے عزم و ارادہ دل سے ملی ہے، میں اس میں خود کو شریک کر کے ایک بادشاہ کی برابری کرنے کا گناہ نہیں کر سکتی۔ تم عظمت و بلندی ہو اور میں تمہارا سایہ جو وجود کے ساتھ رہتا ہے مگر زمین پر۔ یہ تمہاری انتہائی فراخ دلی ہے کہ تم نے مجھے یہ اجازت مرحمت فرمائی کہ میں کوئی خواہش کروں۔ لیکن برا مت ماننا میرا ایمان ہے: ادعونی استجب لکم (تم مجھ سے مانگو (دعا) میں قبول کروں گا)۔"

ابوبکر شاہ خوش ہو کر مسکرایا اور بولا: "لڑکی۔! یقیناً یہ تیری دینداری ہے اور دیانت داری ہے کہ تو حق بات کہنے میں جھجکتی نہیں ہے۔ لیکن انسانوں کے انسانوں پر بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں ان کو تو مانتی ہو گی۔؟"

"یقیناً مانتی ہوں۔" اس نے اقرار کیا۔

"تب پھر ہمیں اجازت دے کہ آج ہم تجھ سے کچھ مانگیں۔"

شبینہ نے گردن ترچھی کر کے انکھیوں سے ابوبکر شاہ پر نظر ڈالی

بےچارے پر بیچارگی کتنا بوجھ پڑ گیا ہے۔ بچوں کی خبرگیری، پاگل بہن کی دیکھ بھال، بزنس کی مصروفیت۔ ارے پروردگار۔ رحم کر اس کے حال پر۔

بے گناہی گناہ بن گئی!

دفعتہً ماریہ اپنا لباس سمیٹ کر اٹھی۔ وہ ابھی تک اپنے مایوں کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ زرد شلوار، جس کے پائنچوں پر گوٹا ٹکا تھا زرد خوبصورت تراش کا شرٹ، جس کے گلے، آستینوں، دامن اور چاکوں پر بڑی خوشنما بانکڑی چمک رہی تھی۔ چکا لگا زرد ڈوپٹہ اس کے کندھوں پر تھا! ابھی تک اس کے جسم و لباس سے سہاگ کی مہک اٹھ رہی تھی! اسے اس حال میں دیکھنا اور ضبط کرنا بھی بڑا کام تھا!

اسے اٹھتے دیکھ کر بہت سی خواتین کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جانے کیا کرے گی۔ کمزور دل عورتیں لبوں تک آنے والی چیخوں کا گلا گھونٹ کے ایک گوشے میں سمٹ کے بیٹھ گئیں۔ جن کے دل مضبوط تھے وہ اسے سنبھالنے اور کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے نپٹنے کے لیے اٹھ گئیں۔ مگر ماریہ گرد و پیش سے لاپرواہ بڑھتی رہی اور ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس نے جھک کر ان کے چہرے سے چادر ہٹائی اور تھکی ہوئی ان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

ایک خاتون نے پوچھا: تم نے پہچانا۔ ماریہ یہ کون ہے؟ صورت جانی پہچانی لگ رہی ہے تعین کر نہیں!

آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے: وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

(باقی آئندہ)

پانچویں قسط

آج تو وہ ہیں ہی نہیں: نوشابہ نے کہا پھر ایک آہ بھر کر بولی: بیٹے واقعات سن کر خدا سے اس قدر خوف معلوم ہوتا ہے کہ بس دل چاہتا ہے ساری عمر توبہ و نصوح میں گزار دو۔ اللہ کی پناہ۔ معلوم نہیں اب ادھر کا کیا حال ہے؟:

کن کا حال۔ کیا ہوا۔ بتاؤ تو پوری بات: زہرہ نے کہا۔

تمہیں یاد ہے مٹی بائی اسکول میں اپنے ساتھ ایک لڑکی ماریہ پڑھتی تھی: نوشابہ نے کہا: اس کے والد نے ایک مرتبہ بیٹی کی سالگرہ کی خوشی میں اسکول بھر کی لڑکیوں کو اپنے مل کے کپڑے تحفتہً پیش کیے تھے!

ہاں کیوں۔ ماریہ نا۔ وہ تو یاد ہے مجھے: سمیرہ نے کہا۔ کیا ہوا بےچاری پر کیا حادثہ گزرا؟

صبح کو ماریہ کے بھائی سیٹھ الیاس احمد کا ملازم بھائی صاحب کے پاس خبر لے کر آیا تھا کہ ان کی بیوی کا زچگی کے دوران انتقال ہو گیا۔ بچی پیدا ہوئی تھی۔ وہ بھی چند گھنٹوں بعد مر گئی۔ خدا بچائے۔ الیاس صاحب شاید بھائی صاحب کے دوست ہیں۔ وہ ان کی بیوی کے مرنے میں چلے گئے! اماں بی نے گھر والوں کو پوچھا تھا۔ ملازم کہہ رہا تھا کہ بڑی بی بیہوش ہیں۔ اور ماریہ شدت غم سے پاگل ہو گئی ہے الیاس صاحب کا حال تباہ ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے الگ بلک رہے ہیں۔ اماں بی پر یہ سن کر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ خدا کا غضب ہے زہرہ۔ آج ہی ماریہ کی شادی بھی تھی، کیا عجیب خوفناک اور دل ہلا دینے والا حادثہ ہے:

میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں جاؤں وہاں۔ ایک وقت تو ماریہ اپنی ہم جماعت تھی نا؟" زہرہ نے دل تھام کر کہا: "وہ شاید ہم سب کو بھول چکی ہو۔ مگر ہم اسے نہیں بھولے۔ اس برے وقت میں اس کا ساتھ دینا انسانی فرض ہے۔ تم برا نہ مانو تو میں اور سمیرہ جائیں اس کے گھر۔!"

بے چین تو میں بھی ہوں۔ مگر میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی۔" نوشابہ نے کہا: "خدا ماریہ کو صبر دے۔ اس سے کہنا کہ نوشابہ بھی تمہیں یاد کر رہی تھی۔

اماں بی کچھ محسوس تو نہیں کریں گی؟" سمیرہ بولی۔

توبہ کرو۔ سال کے محسوس کرنے کی کیا بات ہے؟" نوشابہ نے کہا۔ سمیرہ اور زہرہ زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ وہ بدل کے سادہ لباس پہنا اور عظمت کے چھوٹے بھائی وجاہت کے ساتھ الیاس احمد کے گھر پہونچیں۔ وہاں اندر سے باہر تک سناٹا پڑا تھا۔ انہیں پتہ ہوا کہ شائد نوشابہ تک غلط اطلاع پہونچی تھی۔ لیکن ملازم سے پتہ چلا کہ اس وقت تک سب کچھ جہاں کا تہاں ہو چکا تھا۔ الیاس احمد کی بیوی اور بچی کی تدفین ہو چکی تھی۔ ان کی ضعیف بیمار والدہ موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار سول ہسپتال میں پڑی تھیں۔ اور ماریہ کو الیاس صاحب اپنی سسرال میں پہونچانے گئے تھے ان کے بچے تڑپ رہے تھے۔ ان کی ساس اپنے نواسوں کو لے گئیں۔ الیاس احمد نے ماریہ کو بھی ساتھ کر دیا تھا وہ خود پاگل ہو رہے تھے۔ گھر پر ایک ناگہانی برق گری تھی جس نے آناً فاناً سب کچھ جلا کر خاک کر دیا تھا!۔

نہ روئیں تو یا تو پاگل ہو جائیں گی یا دماغ کی رگیں پھٹنے سے ختم ہو جائیں گی۔

تو پھر۔!؟

بڑی دل ہلا دینے والی غمناک باتیں کر کے چچی اماں نے انہیں بالآخر رلا ہی دیا۔ اب اچھی ہیں۔!

اسے کون رلائے گا!۔

نہ روئے گی تو یہ عارضی پاگل پن مستقل ہو جائے گا اور پھر عمر بھر بے چاری پاگل خانے میں رہے گی!۔

کیسی منحوس شادی تھی۔ جس نے یہ دن دکھائے!۔

ایک بات اور سنی آپ نے؟۔

کیا؟۔

ارے۔ ماریہ اپنے منہ سے خود کو منحوس کہتی تھی۔ میں تو یہیں تھی نا۔ بار بار اپنے بھائی بھاوج اور ماں کو منع کر رہی تھی کہ اسے یوں ہی رہنے دیں۔ شادی کا تذکرہ تک نہ کریں۔ مگر نہ ماں نے سنی نہ بھائی نے۔ ان کا تجربہ تو تھا کہ کوئی خوشی کا کام انہیں سزا دلا دیتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ کیا ضروری ہے ہر بار ایسا ہی المناک تجربہ ہو۔ پھر دیکھئے کہ۔!"

"الیاس احمد کی شادی تو بہت دھوم سے ہوئی تھی!"

تو کیا۔ ان کے اپنے نصیب کی بات ہے۔! تجربے تو ماریہ کے منحوس ہوتے تھے۔

اس سے تو اچھا تھا کہ یہی بے چاری دنیا سے چلی جاتی۔ اب الیاس

جہاں شادی کی خوشی میں شادیانے بجنے والے تھے۔ وہاں موت کے نوحے
ابھرنے لگے۔ کیسی عجیب تقدیر تھی!۔
سمیرہ نے ملازم سے پوچھا: "اور۔۔ وہ صاحب کب آئیں گے تمہارے؟"
"ارے صاحب اس گھر کا تختہ ہی الٹ گیا ہے۔" ملازم نے پوری تفصیل
سناتے ہوئے کہا: "آپ صاحب اور ان کی ساس کا حال دیکھیں تو آپ
کو خود بھی غش آجاتا صاحب کبھی کو یقین نہیں آرہا ہے کہ اس وقت
گھر میں خوشیوں کے ڈیرے لگے تھے اور آج۔ اُف! اک سچ کہا ہے
کہنے والے نے کہ وہ سورج جو صبح کو تم پر نکلتا ہے۔ کس طرح ڈوبتا ہے
تمہیں نہیں معلوم۔ بہو بیگم کا کیس رات ہی کو بگڑ گیا تھا۔ وہ صبح تک
زندہ رہیں۔ بہت رہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ آپ کس سے ملنے آئی ہیں
بی بی۔؟"
"ماریہ سے۔!" دونوں کانپ رہی تھیں۔
"ماریہ بی بی کا دماغ آپے میں نہیں ہے صاحب۔" ملازم نے آہیں
بھرتے ہوئے کہا:
"جیسے ہی انھیں اپنی بھابی اور بچے کے مرنے کی خبر ملی۔ کیا کہوں صاحب
بس وہ اچانک ہنسنے لگیں۔۔! ان کی حالت اچھی نہیں۔ گھر تباہ ہو گیا
صاحب۔ ہمیں اب بڑی بیگم کی زندگی کی پڑی ہے۔ خدا انھیں کو
سلامتی دے۔!"
"یہاں کا کارخانہ ہی درہم برہم ہو چکا۔" وجاہت نے جھرجھری لے
کر کہا: "تم لوگ اب کیا کروگی۔ گھر چلو۔ الیاس صاحب، ماریہ وغیرہ
سب مرحومہ کے میکے میں ہیں۔ کیا وہاں چلنا ہے؟۔"

بہرے زندہ لاش بنے باہر سرہانے بیٹھے تھے ان کے پاس بہانے کے لیے
اب آنسو نہ تھے۔ وہ خشک آہیں بھر رہے تھے اور رہ رہ کر آسمان کی
طرف یوں دیکھ لیتے تھے جیسے بزبان حال آسمان والے سے اپنی تباہی کی
وجہ پوچھنا چاہتے ہوں۔ اپنا وہ گناہ کبیرہ جاننا چاہتے ہوں۔ جس
کی یہ سزا تھی! اور پھر آہ بھر کر فرش کو تکنے لگتے!۔
ماں کی موت پر بیٹی روتی ہے۔! مگر اس ماں کی بیٹی ہنس رہی تھی!
دالان میں گہرا سکوت تھا۔ اگر کوئی سننا چاہتا تو سانسوں کی آمد
شد کی آواز سن لیتا۔ اس بھیانک سناٹے کو وہ رہ رہ کر ماریہ کے قہقہے
زیادہ خوفناک اور لرزہ خیز بنا دیتے۔ وہ دالان کے ایک گوشے
میں بیٹھی بڑے مسرورانہ انداز میں خواتین پر نگاہیں دوڑا رہی تھی
جیسے کہ وہ سب کسی عظیم پُرمسرت تقریب میں شامل ہونے اور
ماریہ کی خوشی کو دوبالا کرنے آئی ہوں۔
عورتیں اس سے ڈر رہی تھیں!
"اللہ نہ کرے باجی۔ کہیں یہ اٹھ کر کسی کا گلا نہ پکڑ لے۔" ایک
بیوی نے بہت آہستہ سے دوسرے کے کان میں کہا۔
"ہوش ہی نہیں بے چاری کو۔ ہوش ہوتا تو پہلے وہی پھڑک کر
مر جاتی!۔ پھر بہن اب اس ناشاد کا کیا ہوگا؟"
"اسے رُلانا چاہیے۔ الیاس بھیا اپنے آپے میں کہاں تھے وہی کسی
ڈاکٹر سے مشورہ کرتے تو وہ بتاتا کہ ماریہ کو کسی طرح بھی فوراً رُلانا
چاہیے۔ آپ نے سنا نہیں تھا۔ ہاشم بھائی کے مرنے پر ان کی بیوی کو
اسی طرح سکتہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر وہ

ثابت نہیں ہوا۔"

"اسی کا دماغ درست رہے۔ بہت ہے۔ سنتا ہوں کہ خدا کھے جوان بہن تو پاگل ہی ہوگئی۔!"

آپ نے غلط نہیں سُنا۔!

تو پھر اب؟"

خدا بہتر جانتا ہے۔ کیا ہوگا۔ ایاس کے چھوٹے بچے، اکیلا گھر، باہر لاکھوں کا بزنس، کیسے سنبھالے گا! کہیں صدموں کی کثرت سے مر نہ جائے غریب۔"

رفتہ رفتہ غموں کی شدت میں کمی ہوتی جائے گی۔ پھر شاید کسی اچھی لڑکی سے عقد کر لے۔ ننھے ننھے بچوں کے لیے ماں کا وجود ضروری ہے۔

اندر خواتین بھری ہوئی تھیں۔ آج وہ سب کی سب خدا کے خوف سے لرز رہی تھیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ناسمجھ بے خبر انسان کو پتہ نہیں ہوتا۔ اگلا لمحہ اس کے پلے کیا لے کر آ رہا ہے۔ لازوال خوشی کہ ابدی غم۔

بہت سی خواتین وہ تھیں جو ماریہ کی شادی میں بہت پہلے سے آگئے رہی تھیں۔ خوشی خوشی انتظامات میں پھر رہی تھیں۔ ان میں ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ وہ سب بارات اور نوشہ کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

اور اب۔ کسی طرح بھی نہ چاہتے ہوئے انھیں بار بار موت کے فرشتے کا استقبال کرنا پڑا۔! وہ سکتہ زدہ دم بخود اور حد درجہ خائف تھیں۔ وہاں شور وشیون تھا ہی نہیں۔ ایاس احمد گونگے

کیسے چلیں۔ ہم تو نوشابہ کے خیال سے آگئے تھے کہ اگر ہو سکا تو ماریہ کو گھر لے چلیں گے۔" سیرہ بولی۔ "لیکن مرحوم بھابی کے میکے جانا مناسب نہیں۔ وہ لوگ یہیں کیا جائیں؟ گھر واپس ہو جائیں گے!"

آپ لوگ کچھ ٹھہریئے۔ بڑے صاحب نے یہیں واپس آنے کو کہا تھا وہ آتے ہوں گے۔ پھر اگر وہ فرمائیں تو آپ سفینہ بی بی کے میکے جا کر ماریہ بی بی کو ساتھ لے جایئے۔" ملازم نے رائے دی۔ "سچ یہ ہے کہ اس وقت ماریہ بی بی کو آپ ہی جیسی بہنوں کی ضرورت ہے۔ صاحب اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا غم دور کر سکیں وہ خود اپنے گھر کی تباہی پر زندہ درگور ہیں۔ خدا ان کے حال پر رحم کرے۔ کس طرح پچھاڑیں کھائی ہیں انھوں نے۔ دیوار سے سر ٹکرایا۔ بچوں کو کلیجے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اب اللہ پر کچھ ایسا کیوں ہو گیا!"

اچھا بابا وہ جو ماریہ کا بیاہ تھا، تو اس کا کیا؟ اس کی ہونے والی سسرال تک اس غمناک حادثے کی اطلاع گئی ہوگی۔" وجاہت نے پوچھا۔

گئی تھی۔ مگر ان لوگوں کی زندگی دیکھئے۔ نہ تو کوئی خیر خبر لینے آئے نہ ماں بچی کے جنازوں میں شرکت کی۔" ملازم نے کہا۔

زہرہ: "وجاہت ایک دم چوکنا ہو گیا۔ "تم دونوں جلدی سے اندر کمرے میں جاؤ۔ بھائی جان آ رہے ہیں!"

کہاں۔!" دونوں لڑکیاں گھبرا گئیں۔

گیٹ پر اترے ہیں کار سے۔ تم دیوان خانے میں چلی جاؤ۔!"

وجاہت نے کہا اور خود آگے بڑھ کر پورچ کے سرے پر آ کھڑا ہوا۔

نہ تھا کہ حالات کی سنگینی کو محسوس بھی کرتے! بے چارے ہجوم پر اپنی نظریں دوڑاتے کہ شاید ان میں انھیں اپنی پیاری ممی کی جھلک نظر آجائے اور وہ دوڑ کر ان سے چمٹ جائیں۔ پوچھیں۔ ممی کہاں چلی گئی تھیں آپ۔ اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ آپ کے بغیر ہم کتنے اکیلے تھے۔

الیاس احمد بچوں کو سینے سے لگا کر رو دیے تھے۔ انھیں جی بھر کے پیار کیا تھا۔ مگر عدم تحفظ کا جانکاہ احساس بچوں کے دل و دماغ سے دور نہ ہو سکا! ان کی وحشی نگاہوں سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی دم میں گھر سے بھاگ نکلیں گے! اور نجانے کہاں چلے جائیں گے!۔

الیاس احمد کے گھر سے لوگ ابھی گئے نہیں تھے۔ سفینہ کے تیسرے ہی دن بڑی بی چل بسی تھیں۔

باہر مرد دکھڑے بڑی خوفزدہ آوازوں میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ بے گناہ الیاس پر اچانک یہ کیسا قہر نازل ہوا ہے۔ ارے بے چارہ کم نصیب بہت اچھا آدمی ہے۔ بہت اچھا ہے۔ نیکی کا پیکر ہے رحمدل ہے۔ خوش مزاج ہے۔ غریبوں کا درد رکھتا ہے دل میں۔ باپ کی ریت خود بھی نبھاتا ہے۔ ہر سال عید پر ہزاروں روپے کے کپڑے غریبوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ اس نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی پاؤں تلے روندا ہو انسان کا دل دکھانا تو پھر بھی بڑی بات ہے!

افسوس افسوس! دوسرے صاحب نے کہا: تختہ ہی الٹ گیا۔ بیوی بچی اور ماں ایک ساتھ داغ مفارقت دے گئیں۔ نجانے کس گھر سے بہن کا رشتہ جوڑا تھا۔ آنے والی بہو کا قدم اس کے لیے مبارک

ملازم بھی ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے لمحے شباہت اوپر آئے۔ گھر کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ گلے میں مفلر لپیٹا تھا۔ ان کے چہرے سے گہرا حزن و ملال مترشح تھا! وجاہت کو دیکھ کر وہ کچھ متحیر سے وہیں رک گئے!۔

تم یہاں کیسے؟: انھوں نے پوچھا: الیاس سے کیا تمہارا کوئی ربط ہے؟

جی نہیں: وجاہت نے سوچ سمجھ کر کہا: الیاس صاحب کی مرحومہ ہمشیرہ شاید بھابی کی پرانی سہیلی تھیں۔ ان کی بدحالی کی کیفیت سن کر کبیرہ اور زہرہ کو میرے ساتھ یہاں بھیجا تھا کہ محترمہ ماریہ کو اپنے گھر لے چلیں۔ سب کے درمیان شاید ان کا غم کچھ ہلکا ہو سکے!

جن خواتین کے تم نے نام لیے وہ کون ہیں: شباہت نے پھر پوچھا۔

جی وہ بھابی کی سہیلیاں ہیں!۔

کہاں ہیں!۔

اسی برابر والے کمرے میں۔

ہوں۔!

بھائی جان۔؟

ہوں۔!

کیا۔!

کیا محترمہ ماریہ کو ہم اپنے یہاں نہیں لے جا سکتے ہیں؟

"میں کیا بتا سکتا ہوں" شجاعت نے کہا اور انگلیوں میں دبے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے کپ کی ٹرے میں اچھالتے ہوئے بولے۔ "وہ تو بالکل پاگل ہوگئی ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ میرے دوست الیاس کی بہن ہے۔ یہ تو الیاس کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا حالانکہ وہ میری شاگرد رہ چکی ہے اور ناممکن ہے کہ مجھے پہچانتی نہ ہو۔ لیکن۔ اس سے یہ فرمائش کرنا کہ وہ۔ میرے گھر چلے۔ کچھ نہیں سکتا کہ۔ ان حالات میں وہ اس مخلصانہ پیش کش کو قبول بھی کر سکے گی کہ نہیں" وہ ملازم کے اسٹول پر بیٹھ گئے۔

"تت۔ تو پھر۔ ہم لوگ اب جائیں؟" وجاہت بولا۔

"ہاں۔ میں کوٹھی کو مقفل کرنے آگیا ہوں۔ پھر الیاس کی والدہ کو دیکھنے اسپتال جاؤں گا۔ سنا ہے کہ وہ بھی اپنی سانسیں پوری کر رہی ہیں۔ خدا ہی جانے کہ اب کون سا صدمہ الیاس کے نصیب کا رہ گیا ہے۔ اگر خدا نہ کرے۔ خالہ اماں بھی۔ اوہ میں نہیں سمجھا کہ وہ اس کو ماں کے بعد ہوش میں آسکیں گی۔! الٰہی تیری پناہ۔ آدمی نہیں جانتا کہ کچھ دیر کے بعد اس پر کیا گزرنے والی ہے۔"

"سرکار۔ آپ فرمائیے تو میں سارے کمرے بند کرکے قفل ڈال دوں" ملازم نے دخل دیا۔

"یہی ٹھیک ہے۔" وہ بولے۔ ملازم چلا گیا۔

"تو کیا اب الیاس صاحب یہاں کبھی نہیں آئیں گے؟" وجاہت نے کہا۔

قسم لے لو۔ اتنا غصہ آتا ہے مجھے ان خود غرض لوگوں پر کہ جی چاہتا ہے گلا دبا کر جان سے مار ڈالوں۔ اب دیکھو۔ ایک ابد۔ مسافر۔ ایک ادھر تماشہ۔ اُف فوہ۔ یہ کہیں جائیں تو جائیں۔ ہمارے ان تماشائیوں کو جانتے ہیں۔ آپ نے سنا" وہ خواتین کی طرف دیکھ کر اور آنکھیں نکال کر بولی" بھابی سے میں نے لاکھ لاکھ کہا۔ بھابی اس طرح نہ لیٹیے۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔ اب اٹھ جائیے۔ آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ آپ بچوں کے رونے کی آواز بھی نہیں سن رہیں؟ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں بھابی۔ خفا مت ہوئیے۔ ہم سب نے کیا کیا ہے جو آپ اس طرح روٹھ گئی ہیں۔ ارے۔ میں نے ہزار ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پر سر رکھ دیا۔ مگر نہیں۔ وہ تو ایسی خفا ہوئیں کہ بس چلی ہی گئیں۔ ایک تماشہ یہ بھی کیا کہ اپنے ساتھ۔ اپنے ساتھ۔ وہ۔ بچی جو تھی۔ ارے میرے خدا۔ یہ جسم یہ اب کون تختے پر لیٹا جا رہا ہے۔ زندہ ہے کہ مردہ۔ لو بھلا میرا پاگل پن دیکھو۔ زندہ ہوتا تو آپ ہی آپ لیٹتا۔ مگر یہ ہے کون؟"

وہ وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

الیاس احمد کی پوری ہستی میں توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ عجیب سے زلزلے زندگی کی بنیادوں کو گہرائی تک ہلائے رکھے دے رہے تھے ان کے دماغ میں ایک عجیب سا حشر بپا ہوا تھا۔ کبھی وہ دیوانوں کی طرح اپنی مردہ ماں پر نظریں ڈالتے۔ کبھی اس طرف پلٹتے جدھر غمزدہ اور بکھری ہوئی زیبا باجی ان کے بچوں کو لیے بیٹھی تھیں۔ بچوں کے معصوم چہروں پر ایک ساتھ یتیمی اور بے سیری کے دکھ منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ مبہوت اور خوفزدہ سے سب کچھ دیکھے جا رہے تھے۔ اتنا ادراک

ہے۔ ان یادوں کو ثبات اور استحکام ملتا چلا جاتا ہے۔

وہ انسان جو زعم خود عرش و فرش کی خبر لاتا ہے۔ اتنا مجبور کیوں ہے کہ اپنے پر بیتنے والے کسی صدمہ کی تاب نہیں لا سکتا! قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ ذہن معطل ہو جاتا ہے۔ حواس مفلوج ہو جاتے ہیں اور آدمی، قدرت سے برسرپیکار رہنے کا دعوے دار قدرت سے ٹکرا جانے والا، قدرت کو للکارنے والا بے حقیقت چیونٹی بن کر رہ جاتا ہے!۔

الیاس احمد کی والدہ جو پیہم صدموں سے یونہی نیم جاں تھیں اپنی جوان بہو کی موت کا صدمہ نہ سہہ سکیں۔ سفینہ کے انتقال کی خبر فون پر سُنی تھی اور فرط غم سے بے ہوش ہو کر سر کے بل پیچھے کی طرف گری تھیں۔ نجانے دماغ کے کون سے حصے پر چوٹ آئی تھی۔ پھر انھیں آخر وقت تک ہوش نہ آسکا۔ بے ہوشی دائمی نیند میں تبدیل ہو گئی!۔ ان کی نعش گھر لائی گئی۔ میت ایمبولنس سے اتاری گئی۔ اور ساریہ نے یوں منھ دبا کر ہنسنا شروع کیا جیسے بے اختیار ہنسی پر اس کا قابو نہ رہا ہو۔ اسے ہنسی کے بیچ بدحواس وہ بولی۔

لو۔ بھیا۔ ایک اور:؛ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی"۔ یہ بھی شاید کوئی عورت ہی ہے۔ اب پھیھ۔ پھر۔ وہ نہلانے والی آئے گی۔ کیا خوب العلا عورت ہے کہ اپنے ساتھ ان مسافروں کا لباس بھی لاتی ہے پہناتی ہے۔ اور پھر۔ یہ مسافر:" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے ساکت و صامت کھڑے ہوئے حاضرین پر ایک بھیانک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ بیابانِ طلب، خود غرض، گونگے بہرے مسافر۔ کندھوں پر سوار ہو کر جانے کدھر چلے جاتے ہیں۔ ارے۔ تم نے تو تم سب۔ جیسا چاہتے ہو ہے

ان کی دماغی حالت بھی مشکوک ہے: شباہت نے جواب دیا
" وہ فرط غم میں دوڑے تھے کہ اس گھر کو آگ لگا دیں گے۔ میاں نے سمجھا بجھا کے تھام لیا۔ لیکن کون جانے کہ صدمہ کی شدت سے پاگل ہو کر وہی کر گزریں جو کہہ رہے ہیں۔ فی الحال انھیں قابو میں لانا ہے۔ اور یہ بہت مشکل ہے:

وجاہت نے ٹھنڈی سانس لی۔

نہ ہوا اور یہ سہرہ دم سادھے دروازے کی آڑ سے شباہت کو دیکھ رہی تھیں۔ کیا چہرہ تھا۔ کیسی کشش تھی۔ کتنی دلکش آواز تھی! اگر اس شمع حسن پر گر گر پروانے جان دینا چاہتے تھے تو حق پر تھے۔

اچھا: وہ یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے! "ایک نظر یہاں دیکھ لوں تو میں بھی چلوں۔!"

ملازم نے کنجیاں پیش کیں: سارا گھر بند کر دیا صاحب، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟:

"یہ تم لوگ خود کو چھٹی پر سمجھو: انھوں نے ملازم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایک دن یہ گھر پھر آباد ہوگا۔ اس کے مکین پھر آئیں گے۔ لیکن وہ وقت کب آئے گا۔ یہ میں نہیں جا سکتا۔ تم اپنے مالک کے وفادار رہے ہو۔ ان کی بہتری کے لیے دعا کرو۔ اور۔ اور رہی تم لوگوں کی تنخواہوں کی بات۔ تو۔ تمھیں میرے گھر کا پتہ تو معلوم ہوگا!؟۔

جی سرکار۔

میرے پاس آ جانا۔ تم سب کی تنخواہیں میں ہر ماہ ادا کر دیا

کروں گا!۔

جی سرکار۔

نہیں صاحب۔ مہربانی آپ کی۔ ہمارے مالک کا گھر برباد ہو گیا۔ خدا انھیں پھر سے شاد و آباد کرے۔" ملازم نے جواب دیا۔ "تنخواہوں کا کیا۔ اصل چیز وفاداری ہے صاحب۔!

ٹھیک ہے۔ پھر بھی۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ کرو۔!"

اچھا صاحب!"

وجاہت نے دو سو جیب سے نکالے اور ملازم کی طرف بڑھا دیے "کچھ تم رکھو۔ کچھ اپنے ساتھیوں کو دے دینا۔ اب۔ خدا حافظ۔

ملازم رخصتی سلام کرکے اور آنکھیں ملتا ہوا چلا گیا۔

"چلو۔ تم لوگ بھی چلو۔!" انھوں نے وجاہت سے کہا۔ "ٹیکسی سے آئے ہو؟"

"جی نہیں۔ میں سائیکل پر تھا۔ اور یہ دونوں رکشے پر۔!"

"گھر میں تو طوفان بے تمیزی برپا ہوگا!۔

وجاہت خاموش رہا!۔

وہ آگے بڑھ کر برآمدے میں کھڑے ہوگئے!۔ وجاہت نے لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ وہ لپکتی ہوئی پاس آئیں۔ زہرہ ہانپتی ہوئی بولی: "اے وجاہت۔ کیوں نہ ہمیں ماریہ کے پاس لے چلو۔!"

"ہاں۔ دیکھیں تو اس کا کیا حال ہے۔ اگر راضی ہوجائے تو ساتھ لے چلیں۔" سیمرہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"جوتے کھلوا دوگی کیا۔" وجاہت نے کہا۔ "بھابی کی مروت میں

تمھارے ساتھ یہاں تک آگیا تھا۔ بی بی اب سیدھی طرح گھر چلو۔ ان سنگین معاملات میں اپنی گوبر بلی کھوپڑی کا استعمال مت کرو۔ تھا را کیا۔ تم لوگ پلاؤ اور میٹھے ٹکڑے ٹھونس کر اپنے گھروں کی راہ لوگی۔ میرے لیے جواب دہی مشکل ہوجائے گی!۔ گیٹ تک چلو سڑک سے رکشا لے لیں گے۔ کیا؟"

"اپنا دل دکھ رہا ہے۔" زہرہ بولی۔

"قسم سے میں تو ماریہ کی شکل تک بھول گئی ہوں۔ دیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے تو نوشابہ کے کہنے سے یاد آیا۔ کوئی ساتھی ماریہ بھی تھی" سیمرہ نے کہا۔

"اللہ۔ کیسی کیسی سہیلیاں جدا ہو رہی ہیں۔" زہرہ نے بڑی گہری سانس لی۔ "رضوانہ اپنے ضبط کے ہاتھوں الگ ہوئی۔ ماریہ حواسوں سے جاتی رہی۔ کیا انقلاب ہے۔ خدا سب کے حال پر رحم کرے!"

وجاہت نے رکشا ٹھہرا لیا تھا۔ تینوں مایوس سے گھر چلے گئے!

دنیا ایک تماشہ گاہ ہے۔ جو تماش بین ہیں کبھی وہ خود بھی تماشہ بن جاتے ہیں۔ اس اسٹیج پر کھیلے جانے والے کھیل شاذ و نادر ہی دلچسپ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان کی یاد دل سے جلد محو بھی ہوجاتی ہے۔ اور بعض ایسے دل ہلانے والے ہوتے ہیں کہ مدت العمر جن کی یاد ذہن سے نہیں مٹتی!۔ جوں جوں وقت گزرتا

THE HAREEM
Dec. 84
Rs. 1.50
نسیم انہونوی

ٹیلیفون نمبر آفس ۔ ۲۲۵۵۰۹
اس جگہ سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی سالانہ قیمت اس حریم تک ختم ہو گئی
ٹیلیفون نمبر رہائش ۔ ۲۵۳۳۳

ماہنامہ حریم لکھنؤ

گذشتہ ۵۲ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ـــ اور
ہندوستان میں سب سے قدیم ماہنامہ ہے

بیادگار

سیّد محمد سلیم اہنوی و شفیق النساء بیگم سلیم اہنوی مرحوم

جلد (۵۳) فہرست مضامین دسمبر ۸۲ء نمبر (۱۲)

اڈیٹر و نگراں : نسیم انہونوی
معاونین : شوکت جہاں بیگم عزالہ ـــ جانی بیگم ردولوی

قیمت سالانہ

اعزازی خریداری	منی آرڈر سے	اٹھائیس روپیہ
مخصوص خریداری	"	چھبیس روپیہ
معمولی خریداری	"	تیئس روپیہ

وی۔پی سے پرچہ منگانے پر چھ روپیہ تائدی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

غیر ممالک سے

نعیں کے مساوی غیر ملکی سکہ رجسٹری ۱:۱ ر اپریل سے مختلف ممالک
بحستہ ہو بیمہ اسکے مساوی کے لئے مختلف فرحیں

• حریم میں شائع ہونے والے تمام ناول اور افسانے فرضی ہوتے ہیں کسی کے نام یا مقام اور حالات سے اتفاقیہ مطابقت ہو جائے تو حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔ • حریم ہر انگریزی ۵ ر ۶ ر کو قطعی روانہ کر دیا جاتا ہے ہندوستان میں لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریدار ۲۰ ر کے بعد اور دور دراز کے خریدار ۲۵ ر کے بعد شکایت کریں، ورنہ شکایتوں پر غور نہ کیا جائے گا۔
• پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ۲۰ ر تاریخ سے پہلے دفتر میں موصول ہو جانا ضروری ہے۔ ورنہ دوسرا پرچہ بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ اور نمبر خریداری ضرور لکھیں
آفس اور ترسیل زر کا پتہ دفتر نسیم بکڈپو ۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ
نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا یہ مضمون مجھے بے حد پسند آیا اس لئے اسے اس ماہ کے لمعات میں جگہ دے رہا ہوں ــــ

اس خاکسار کے پاس دہلی کے بیت الحکمۃ کی طرف سے ایک سیمنار کے سلسلے جب دعوت نامہ پہونچا تو اس میں فرمائش تھی کہ میرا مقالہ "عورت اور پردہ" پر ہو، سمجھ میں نہیں آیا کہ اس چبائے ہوئے نوالے کو کس طرح چبایا جائے، اس پرانی بحث میں کونسی ایسی بات کہی جا سکتی ہے جو اب تک نہیں کہی جا چکی۔ مقالہ لکھنا تھا اس لیے اس خیال سے لکھنے بیٹھ گیا کہ یہ پرانی بات شاید کسی نئے انداز میں بیان ہو جائے تو پہلے پردہ سے متعلق ذرا دل تھام کر احکام الٰہی سماعت فرمائیں، قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ سے فرماتا ہے

"مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی عصمت کی حفاظت رکھیں، اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو اس میں سے کھلا رہتا ہے اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ان لوگوں کے سامنے جیسے شوہر یا اپنے شوہر کے باپ، اپنے بیٹے، سوتیلے بیٹے بھائیوں کے بیٹے، اپنی بہنوں کے بیٹے، اپنی عورتیں اپنے غلام و مرد خدمت گاروں جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے یا ایسے لڑکوں جو عورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہوئے ہیں، وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح دھرکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے۔"

(النور ۴۰)

پھر سورۃ الاحزاب میں ہے:۔

"اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ (الاحزاب ۸)

ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد عورتوں کے لئے حجاب لازمی ہو گیا، مگر وہ باہر نکل سکتی تھیں جس کے لئے وہ نقاب یا جلباب برقع استعمال کرتی رہیں!

> اے عورت تو بے شک ایک پھول ہے، لیکن
> یاد رکھو پھول کانٹوں سے گھرا ہوتا ہے (شوپنہار)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ باہر نکلنے میں عورتوں کو اضطراراً یا ناگزیر حالات و ضروریات میں ہاتھ یا چہرہ کا کوئی حصہ کھولنا پڑے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ چہرہ اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کا حصہ ستر میں داخل نہیں ہے۔ عہد رسالت میں عورتیں نقاب یا جلباب کے ساتھ برابر نکلتی رہیں بلکہ غزوات میں بھی شریک ہوئیں، جنگ احد میں حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لاتی تھیں اور لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں، اسی جنگ احد میں ام سلیطؓ اور ام عمارہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں ہر طرف دوڑ کر آپ کی حفاظت کے لئے جان لڑاتی ہوئی نظر آتی تھیں ام عمارہؓ تو دشمنوں کے ہاتھوں زخمی بھی ہوئیں، اسی جنگ میں ربیع بنت معوذ خواتین کی ایک جماعت کے ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھیں۔ اور مجروحین کو اٹھا اٹھا کر مدینے لے گئی تھیں جنگ حنین میں ام سلیمؓ ایک خنجر ہاتھ میں لئے پھر رہی تھیں کہ اگر کوئی مشرک ان کے قریب آیا تو وہ اس کا پیٹ پھاڑ دیں گی، غزوہ خندق میں

حضرت زبیرؓ کی والدہ حضرت صفیہؓ نے بڑی بہادری دکھائی جب قریظہ کا ایک یہودی وہاں پہنچ گیا جہاں عورتیں تھیں، حضرت صفیہؓ نے اپنے خیمہ کی ایک کھونٹی سے اس کو ہلاک کیا اور عطیہ رسول اللہ کی ساتھ سات لڑائیوں میں آپ کے ساتھ رہیں، کیمپ کی حفاظت کرنا، سپاہیوں کیلئے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری ان کے سپرد تھا۔ حضرت عائشہؓ تو جنگ جمل کی سربراہی خود ہی کر رہی تھیں۔

ان مثالوں سے صرف یہ استدلال ہوتا ہے کہ انتہائی ضرورت اور مصیبت کے وقت عورتیں گھر سے باہر نکل کر میدان جنگ میں بھی کام کر سکتی ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ فرو مصیبت اور لڑائی جو یاد ہو، عورتوں کو محکمہ جنگ میں کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور دیدی جائے، کیونکہ عہد رسالت میں خواتین میدان جنگ میں کام کرتی رہیں یا ان کو کمانڈر انچیف اس لئے مقرر کیا جائے کہ حضرت عائشہؓ سپہ سالاری کا فرض انجام دے چکی ہیں حضرت عائشہ یا دوسری صحابیات جنگ میں خدمات انجام دینے کے بعد اپنے گھروں ہی کی طرف پلٹ آئیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق عورت کی اصلی راجدھانی اس کے شوہر کا گھر ہے، جہاں بخاری شریف کی حدیث کے مطابق وہ حکمراں بن کر رہتی ہے اور وہیں اپنی اس حکومت کے دائرے میں اپنے عمل کے لئے جوابدہ ہے،

(بخاری شریف کتاب الاحکام باب قول اللہ
"اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم)

وہ گھر کے اندر اس لئے نہیں رہتی ہے کہ مرد اس پر ظلم کر کے اس کو چہار دیواری میں مقید کر دیتا ہے، بلکہ وہ نسوانیت کی حیا، شرم، عظمت اور سطوت کا پیکر ہو کر گھر کی زینت بنی رہتی ہے اس میں اس کی نسوانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک بار حضرت اسماءؓ، رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔

اے رسول اللہ مرد ہم سے بازی لے گئے، رسول اللہؐ نے پوچھا اے اسماء کس طرح؟ عرض کیا مرد کے لئے نماز جمعہ فرض ہے، وہ اس کا ثواب سمیٹتے ہیں، نماز جنازہ میں شرکت کرتے ہیں جہاد میں جا کر شہید ہوتے ہیں یا غازی، اور عورتیں گھروں میں بیٹھ کر ان تمام ثواب سے محروم ہیں، وہ صرف بچے پالتی ہیں، مردوں کے لئے روٹی پکاتی ہیں۔

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسماء، تم عورتوں سے کہہ دو جن کی نمائندہ بن کر تم آئی ہو کہ مرد باہر کے اتنے کام کر کے مدارج پاتے ہیں عورتیں گھر بیٹھ کر بچوں کو تربیت دیتی ہیں، مردوں کے لئے

کھانا پکاتی ہیں، گھر کا سکون بہم پہونچاتی ہیں تو درجے میں تم دونوں برابر ہو، یہ نہیں کہ مرد کو زیادہ درجات ملیں اور تم کو کم۔

گھر کے اندر رہنے کے باوجود کون ایسے تمدنی معاشرتی . . . . . اور معاشی حقوق ہیں جو عورتوں کو نہیں دیئے گئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں، سورہ آل عمران میں ہے کہ "میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا۔ چاہے وہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو" (آل عمران ۲۰)

اور آج یورپ یا امریکہ کو اپنی صحیح یا غلط قسم کی آزادی نسواں پر جتنا بھی ناز ہو لیکن مسیحی یورپ کے ابتدائی دور کے ائمہ اور اولیائے کبار ہی تھے جن کی اور کرائی سوسسٹم کی تعلیم یہ تھی، عورت شیطان کے آنے کا دروازہ، شجر ممنوع کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی، مرد کو غارت کرنے والی ایک ناگزیر برائی، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت ہے، مگر تقریباً اسی زمانہ میں رسول اللہؐ نے ماں، بیوی، بیٹی کے جو مدارج بلند کئے اس پر آج بھی انسانیت ناز کرتی ہے، ایک شخص نے پوچھا رسول اللہ! مجھ پر حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے، فرمایا! تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا! تیری ماں کا' اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا! تیری ماں کا، اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا! تیرے باپ کا اللہ نے تم پر ماں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کر دی ہے، (بخاری کتاب الادب)

اسی طرح آپ نے فرمایا کہ دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے، (نسائی کتاب النکاح) یہ بھی فرمایا کہ جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہونچ گئیں تو قیامت کے روز میں اور وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں (صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات) خود رسول اللہؐ نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے اپنی محبت کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے صحیح معنوں میں نسوانیت کا درجہ بلند ہو گیا ہے۔

مگر ہمارے تجدد پسند حضرات ان مولویانہ مواعظ کو پردہ کی حمایت میں موثر دلائل قرار دینے کے لئے تیار نہیں وہ تو قرآن حکیم، حدیث شریف اور اسلامی روایات کی ایسی تاویلیں اور تعبیریں چاہتے ہیں جن سے موجودہ دور میں عورتوں کو وہی آزادی حاصل ہو جو غلط یا صحیح مغربی ممالک میں ہے اب سے بہت پہلے جسٹس امیر علی کی اسلامی حمیت اور غیرت پر مسلمانوں کو ناز تھا۔ انھوں نے اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سراسینز لکھ کر مسلمانوں کے بگڑے

ہوئے ذہن کو اسلامی بنایا، مگر انھوں نے اپنے زمانہ یعنی ۱۸۹۸ء کا ایک انگریزی رسالہ انیسویں سنچری میں یہ لکھنے میں تامل نہیں کیا کہ۔

" یہ لمبا برقعہ نقاب اور غلاف سیجو قیوں
کے آخری زمانہ میں رائج ہوا اور جس
قسم کا پردہ آج کل مسلمانان ہند
میں رائج ہے خلفاء کے زمانہ میں اس
کا کہیں نام و نشان نہ تھا
بلکہ برعکس اس کے اعلیٰ
طبقہ کی عورتیں بلا برقع
کے مردوں کے سامنے آتی تھیں،
ساتویں صدی ہجری کے وسط میں
جب خلفا ضعیف ہوئے اور تاتاریوں
نے اسلامی حکومت کو درہم برہم کیا تو
اس وقت اس پر نزاع ہوئی کہ عورتیں
اپنے ہاتھ منھ اور پاؤں اجنبیوں کے
سامنے کھول سکتی ہیں کہ نہیں "

جسٹس امیر علی کی اس پردہ در تحریر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انکی بیوی ایک انگلستانی خاتون تھیں، ان کی موجودگی میں وہ اس پردہ کی حمایت کیسے کر سکتے تھے جس کے احکام قرآن حکیم میں ہیں، مولانا شبلیؒ نے ایک طویل اور مدلل مضمون میں اس کا جواب دیا کہ پردہ کے متعلق تمام دنیا میں مسلمانوں کا جو طریقہ عمل رہا وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ میں عورتیں بغیر برقعہ اور نقاب کے باہر نہیں نکل سکتی تھیں، اور بجز کسی خاص حالت کے نامحرموں سے چھپی تھیں یہاں تک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے بڑا اور مقدم مسئلہ بن گیا تھا۔ (پردہ اور اسلام، مقالات شبلی جلد اول ص ۱۱۸)

مگر اب مسلمانوں کی معاشرت کا سب سے بڑا مقدم مسئلہ یہ بنا ہوا ہے کہ پردہ رہے کہ پردہ نہ رہے، یہ آواز بانگ درا بنی رہی تھی کہ عورتیں پردہ میں کیوں رہیں اسکے مقابلہ میں یہ آواز ضرور اٹھتی ہے کہ کیوں نہ رہیں، مگر اب یہ آواز خفیف اور کمزور ہوتی جارہی ہے، مگر دونوں فریقین کے دلائل میں جو فرق ہے وہ قابل غور ہے بے پردگی کے حامی مستقبل کو سامنے رکھ کر اپنے دلائل دیتے ہیں جن میں قیاسات، ظنیات اور احتمالات کو زیادہ دخل ہوتا ہے، پردہ کے حامی جو کچھ کہتے ہیں وہ ماضی کے مشاہدات، تجربات اور یقینیات پر مبنی ہوتا ہے بے پردگی کے حامی کہتے ہیں کہ سائنس کی ترقی سے جو غیر معمولی تمدنی، معاشرتی، صنعتی اور معاشی انقلابات پیدا ہورہے ہیں ان میں اپنے نصف بہتر کو گھر سے باہر نکال کر ان کو فعال اور متحرک بنایا گیا تو ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارا معاشرہ بھی صحت مند، توانا، خوشحال اور شاندار ہو سکتا ہے، ہم نے بھی گولڈا مائر، مسز اندرا گاندھی اور مسز تھیچر تیار کئے تو ہماری سیاست بھی بہت آگے بڑھ سکتی ہے مگر ممکن ہے کہ یہ محض خیالی جنت ثابت ہو، کیونکہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم جو سمجھیں یا خواہش کریں وہ ہو بھی جائے۔

پردہ کے حامی صدیوں کے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک کا معاشرہ خوشحال اور مادی حیثیت سے شاندار ضرور ہے، مگر وہ توانا اور صحت مند اس لئے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں کی بے پردگی کی وجہ سے ان کی خانگی، خاندانی، اخلاقی روحانی مسرتیں چھین لی گئی ہیں، اور کیا یہ تصور کرنا صحیح ہوگا کہ ہر زمانہ میں مسز تھیچر اور مسز اندرا گاندھی پیدا ہوتی رہیں گی۔ انگلستان میں وزارت عظمیٰ کے لئے کوئی ڈس رائیلی، کوئی گلیڈ اسٹون، کوئی چمبرلین، کوئی چرچل اور اٹیلی تو پیدا ہوتا رہے گا، لیکن ایک مسز تھیچر صدیوں کے بعد ہوتی ہیں، اور صدیوں کے بعد ہی دوسری مسز تھیچر پیدا ہوں، ہندوستان کی پوری تاریخ میں صرف ایک مسز اندرا گاندھی پیدا ہوئیں، اس کی تو امید کی جاتی ہے کہ ہر زمانہ میں ہندوستان میں کوئی نہ کوئی مرارجی ڈیسائی اور چرن سنگھ پیدا ہوتے رہیں گے، مگر شاید دوسری مسز اندرا گاندھی نہ پیدا ہو۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ولید بن عبد الملک، ہارون رشید، عبد الرحمٰن ناصر۔ نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، شمس الدین التمش، اکبر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب جیسے حکمراں پیدا ہوئے، ان پر مسلمانوں کو آج تک ناز ہے مگر اس پایہ کی کوئی مسلمان عورت حکمراں نہیں گزری۔ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی قرار دیا ہے کہ وہ جلیل القدر فرماں روا کیا بلکہ انبیاء پیدا کر سکتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی کو نبوت نہیں دی، عیسائیوں نے حضرت مریم کو تثلیث کے ذریعہ سے الوہیت کا درجہ دیا لیکن کلام پاک نے اس کی نفی پورے طور پر کی، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت مریم کے بطن سے

بن باپ کے حضرت عیسٰیؑ کو پیدا کیا، لیکن حضرت مریمؑ کو نبوت عطا نہیں کی، نسوانیت کی تکمیل بلکہ معراج اسی وقت ہوتی ہے جب عورت کی گود بھر جاتی ہے خواہ یہ گود بھرنے والا آگے چل کر نبی ہو، یا فلسفی یا ادیب یا فیکٹری کا مزدور ہی کیوں نہ ہو۔

پیرس کے صحافی اپنے ماضی کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ عورتوں کی خانہ نشینی کی وجہ سے معاشرے کے توانا، تندرست، خوشحال اور شاندار ہونے میں کب رکاوٹ ہوئی۔ بنو امیہ نے جو عرب امپائر بنائی اڈورڈ گبن کا بیان ہے یہ دو دو ہفتوں میں طے ہوتی تھی، اس کی سرحد ہندوستان اور تاتاریوں کے علاقہ سے پھیل کر بحر اوقیانوس کے ساحل تک تھی، بنو امیہ کی ایک شاخ نے اندلس میں جاکر حکومت قائم کی، تو بقول موسیو لیبان یہ یورپ کی حکومت کی سرتاج بن گئی، بنو عباس کے بعض حکمرانوں نے رومن امپائر سے ٹکر لیکر ان کو جزیہ اور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا، دولت عثمانیہ نے تو رومن امپائر کو ختم ہی کیا، اور ان کی امپائر رومن امپائر سے زیادہ شاندار بن گئی تھی، ہندوستان کی مغل حکومت بقول کے۔ ام پنیکر شاہ جہاں کے دور تک آتے آتے دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور اور متمدن ترین حکومت بن گئی تھی، ان تمام حکومتوں کے زمانہ میں عورتیں چراغ خانہ ہی بنی رہیں، میدان جنگ یا دفتروں یا کارخانوں میں کام کرتی نہیں پائی جاتی تھیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی نظر اسلام کی پوری تاریخ پر رہی، اس لئے انھوں نے عورت کی تخلیق کا مقصد امومت قرار دیا ہے، جس کی تکمیل جلوت کی ہوس میں نہیں بلکہ خلوت کی خودگیری میں ہوتی ہے، ان کے نزدیک امومت اپنی تکمیل کے بعد شفقت پیغمبری سے قریب ہوجاتی ہے، اور اسی امومت سے قوموں کی سیرت بنتی ہے، کہتے ہیں:۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است

زانکہ او را با نبوت نسبت است

شفقت او شفقت پیغمبر است

از امومت پختہ تر تعمیر ما

در خط سیمائے او تقدیر ما

(رموز بے خودی ص ۱۴۹)

اقبال نے اسلامی احکام ہی کے مطابق یہ قرار دیا ہے کہ عورت کا اصلی نگہبان مرد ہی ہوتا ہے، کہتے ہیں۔

اک زندہ حقیقت میرے سینے میں ہے مستور کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی

نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا

اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

مگر مرد کی نگہبانی میں رہنے والی عورت ہی مردوں کی سیرت بنانے والی، ان کے ناموس کا پردہ رکھنے والی قوت دین اساس ملت اور امین نعمت آئین حق اور رموز دین ہوتی ہے۔ مخدرات اسلام سے خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:۔

اے ردایت پردہ ناموس ما

تاب تو سرمایۂ فانوس ما

طینت پاک تو ما را رحمت است

قوت دین و اساس ملت است

کودک ما چوں لب از شیر تو شست

لا الٰہ آموختی او را نخست

اے امین نعمت آئین حق!

در نفس ہائے تو سوز دین حق!

(رموز بے خودی ص ۱۵۴)

اقبال کے نزدیک مخدرات اسلام سے مراد وہ خواتین ہیں جو چراغ خانہ بنی رہیں، وہ نہیں ہیں جو شمع محفل بننے کی کوشش کرتی ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے

وا رہی آغوش نازک پیکرے

خانہ پرور دو نگاہش محشرے

فکر او از تاب مغرب روشن است

ظاہرش زن باطن او نازن است

(رموز بے خودی ص ۱۵۰)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ پردہ سے متعلق احکام الٰہی ہوں یا حکیم الامت کی فلسفہ طرازی ہو، اس پر تھوڑی دیر کے لئے مذاکرہ، مناظرہ، مجادلہ اور مباہلہ تو کر لیجئے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں بے پردگی کی جو لہر نہیں بلکہ جو سیل رواں چل پڑا ہے وہ روکے نہیں رک سکتا۔ اسلامی ممالک کی عورتوں کی اکثریت باہر نکل پڑی ہے اور وہ زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ مردوں کی طرح اشرف المخلوقات میں داخل ہیں تو کیوں نہیں کائنات کی کھلی فضا میں کائنات کی تمام چیزوں سے مستفید ہوں

وہ چہار دیواری کے اندر کیوں رہیں عورت اپنے جسم کی ساخت اور دوسری حیثیت سے مردوں ہی کی طرح شہسواری کر سکتی ہے، موٹر چلا سکتی ہے، پائلٹ بن سکتی ہے، بندوق چلا سکتی ہے، پیرا کر دریا بھی عبور کر سکتی ہے، ہاکی کھیل سکتی ہے، ریاست کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے، بندوق چلا سکتی ہے سیاست کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے، تصنیف و تالیف افسانہ ناول لکھ سکتی ہے سائنس کے تجربات میں حصہ لے سکتی ہے، ملک کے فلاحی کاموں کو بہتر سے بہتر انجام دے سکتی ہے تو وہ چہار دیواری کے اندر صرف امومت کے فرائض کیوں انجام دینے پر قناعت کرے کیوں نہیں مردوں کی طرح زندگی کے تمام لذائذ سے متمتع ہو۔ ان کے لئے اخلاقی اور معاشرتی قدریں مردوں سے مختلف کیوں متعین کی جائیں۔

وہ ان کے تردیدی جوابات سننے کے لئے تیار نہیں بلکہ وہ دعویٰ کرتی ہیں کہ بے پردگی میں بھی وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں، جو اسلام چاہتا ہے۔

زمانہ ان کے حق میں قیامت کی چال چل چکا ہے اس لئے اب احکام الٰہی کے پابند بڑے بوڑھے زمانہ کو آیندہ کی نئی نسلوں کے حوالہ کر دیں کہ وہ انتظار کریں، اور دیکھیں کہ بے پردگی سے جو معاشرہ آئندہ کے لئے بنے گا، اس میں عورتیں۔ خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ، زینبؓ، ام عمارؓ، ام سلیمؓ، ام سلمہؓ، ام عطیہؓ، ام عمارہ وغیرہ بن کر رہیں گی، ان کے بیٹے ان کی نافرمانیوں کو حرام قرار دیں گے، ان کی بیٹیاں اپنے باپ کو قیامت کے روز رسول اکرمؐ کے ساتھ چلتے دیکھیں گی، وہ مردوں کی ناموس کی پردہ دار ان کے سرمایۂ ناموس کی تاب، دین کی قوت اور ملت کی اساس ثابت ہوں گی یا بے پردگی سے ایسا معاشرہ بنے گا، جس میں یہ عورتیں مردوں کی محض ذوق نظر اور سوز جگر کی تسکین بن کر رہ جائیں گی، یا یہ معاشرہ مرد نوازش۔ نائٹ کلب، گرل فرینڈ، گرل فرینڈ، کورٹ شپ آزادانہ خوش وقتی، عریانی، جوڑوں کا ناچ، کنواری مائیں، حسن گاہوں، باہنوں کو خوبصورت بنانے اور بال سنوارنے کی دوکانوں، مالش کدوں، حسن کی نمائش کے بے پناہ جذبہ فیشن کے قیمتی لباسوں اور حسن افزائی کے مختلف النوع سامانوں کی حرص کا معاشرہ ہو جائے گا، وہ خود بتائے گا کہ آئندہ کون سا معاشرہ مرتب ہو کر رہے گا۔

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردان خردمند

سالانہ قیمت میں اضافہ

چند در چند مجبوریوں کے تحت ڈرتے ڈرتے پھر ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے جو جنوری ۸۵ء سے کیا جائے گا۔ یعنی جن بہنوں کی خریداری جنوری سے شروع ہوتی ہے انھیں منی آرڈر سے چوبیس روپیہ روانہ کرنا ہوں گے۔ وی۔ پی پچیس روپیہ کا جائے گا۔ یہ اضافہ خصوصیت سے کاغذ کی گرانی کے باعث کیا جا رہا ہے جو سال رواں میں دس روپیہ ریم بڑھ گئی ہے۔ ساتھ ہی دوسرے مصارف میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جن بہنوں کی سالانہ قیمت نومبر یا دسمبر سے شروع ہوتی ہے ان سے سابقہ قیمت لی جائے گی

سالنامہ ۸۵ء

اگر آپ حفاظت سے حاصل کرنا چاہتی ہیں تو تین روپیہ اس کی رجسٹری کے لئے روانہ فرمائیں یا اجازت دیں کہ صرف دو روپیہ کا وی۔ پی کر کے سالنامہ بھیجا جائے ــ یہ ان بہنوں کے لئے ہے جن کی سالانہ خریداری دسمبر میں ختم ہوتی ہے اور وہ جنوری سے آئندہ خریداری کے لئے روپیہ منی آرڈر سے بھجوا دیتی ہیں یا ان بہنوں کے لئے ہے جن کی سالانہ قیمت جنوری ۸۵ء کے بعد کسی ماہ تک دفتر میں جمع ہے۔

- گاجر۔ ٹماٹر۔ سنترہ اور چقندر کا رس ملا کر نہار منہ دو ماہ تک۔ استعمال کرنے سے چہرے پر کی جھائیاں۔ داغ اور دھبے ختم ہو جاتے ہیں۔ چاروں چیزوں کے رس اندازاً دو دو تولے یعنی ۲۵۔ ۲۵ گرام ہوں۔
- ۲۵ گرام گاجر کا نیم گرم رس ۱۵ روز تک پینے سے پیٹ کے کیڑے مر جاتے ہیں۔
- گاجر کے پتوں کا عرق گرم کر کے ذرا ذرا سا ناک و کان میں ڈالنے سے آدھے سر کا درد جاتا رہتا ہے۔
- گاجر کو بھوبھل میں پکا کر اس کی قاشیں کاٹ کر شبنم میں رکھیں اور پھر ان کو نہار منہ شکر کے ساتھ کھائیں تو خفقان اور ضعف قلب کو فائدہ ہوگا۔
- گاجر اور شلجم ایک ایک تولہ پاؤ بھر پانی میں جوش دیں جب پانی آدھا رہ جائے تو شکر ملا کر نہار منہ تین روز تک پینے سے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر نکل جاتی ہے۔

آہ اندرا گاندھی

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ سربراہان مملکت کو اکثر قتل کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ پرانی مثل ہے کہ تخت یا تختہ، لیکن ایسے واقعات شاذ ہی ہوئے ہیں کہ خود ان افراد نے کسی سربراہ مملکت کو قتل کیا ہو، جو ان کی حفاظت کے لئے رکھے گئے ہوں۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں پہلا خطرناک قتل مہاتما گاندھی کا تھا، جنھیں اس لئے اپنی ہی قوم کے ایک نابکار نے قتل کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اکثریت کے ظلم وستم سے بچانا چاہتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے بعد اندرا گاندھی کی ہتیا کرنے والے ان کے نگہبان تھے اور انھوں نے اس بے دردی کے ساتھ انھیں مار ڈالا، جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ انتہائی شرمناک اور بزدلانہ حرکت تھی جو تاریخ ہند میں سیاہ حروف میں لکھی جائے گی۔ اندرا جی کا قتل ۳۱ اکتوبر کو ہوا تھا اور اس کی تفصیلات ریڈیو، ٹی۔ وی اور اخبارات کے ذریعہ لوگوں کو معلوم ہو گئی ہیں۔ اس لئے ہم انھیں لکھنا لاحاصل سمجھتے ہیں۔ البتہ اپنے دلی رنج والم کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں اس لئے کہ اندرا جی کی شخصیت عالمگیر تھی۔ انھیں صرف سربراہ ہند ہی کی حیثیت حاصل نہیں تھی، بلکہ ان کا وقار ساری دنیا میں تھا اور انھوں نے ہندوستان کو غیر ممالک کی نظروں میں جتنا بلند کیا تھا وہ انکا ایک غیر فانی کارنامہ تھا۔ اندرا جی چاہتی تھیں کہ ہندوستان میں رہنے والے سبھی فرقوں کے لوگ مل جل کر رہیں اور یہ کہ ہندوستان کے ٹکڑے نہ ہوں۔ افسوس کہ ان کی انھیں کوششوں نے ناعاقبت اندیشوں کو ان کا دشمن بنایا اور سازش کر کے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ لیکن اندرا جی اس طرح فنا ہو کر غیر فانی بن گئی ہیں۔ ان کو کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا اور آج بھی نعرے لگ رہے ہیں کہ اندرا جی امر ہیں۔

جنت دنیا

نتیجہ فکر جناب مصوّر لکھنوی

کون و مکاں میں گوہر یکتا کہیں جسے
وہ قصر نور، گنبد خضرا کہیں جسے

بے شک نظر سے دور مگر دل کے پاس ہے
وہ جنت خیال، مدینہ کہیں جسے

چلمن وہ جالیوں کی حریم رسول میں
بزم نیاز و ناز کا پردا کہیں جسے

وہ قبۂ جمیل۔ وہ مجموعۂ کلام
اللہ کی رحمتوں کا خزانا کہیں جسے

اب جو ملیں گے ہم نہ جدا ہونگے پھر کبھی
ایسا یقین، ہجر گوارا کہیں جسے

کیا کیا تھا دل میں سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکے
ایسا سکوت، عرض تمنا کہیں جسے

جو بھی وہاں گیا وہ شفایاب ہو گیا
وہ خاک پاک طیبہ، مسیحا کہیں جسے

رحمت بنا کے بھیجا ہے خالق نے دہر میں
ایسا حبیب، غیر بھی اپنا کہیں جسے

امن و سکوں جہاں میں اگر ہے تو بس یہیں
وہ ارض پاک، جنت دنیا کہیں جسے

نقش قدم پر ان کے وہ پیہم سجود شوق
اس درجہ بے خودی، کہ تقاضا کہیں جسے

طیبہ کا اشتیاق مصوّر نہ پوچھیئے
وہ فرط اضطراب، کہ سودا کہیں جسے

حضرت زینبؓ بنت علیؓ

تاج الدین

حضرت زینب بنت علی کرم اللہ وجہہ کے نام و شخصیت سے کون مسلمان ہے جو واقف نہ ہوگا واقعہ کربلا میں آپ اپنے بھائی حضرت امام حسین کے ہمراہ تھیں۔ آپ نے اپنے خاندان کے تمام مردوں کو ایک ایک کرکے شہید ہوتے دیکھا اپنے دو جگر گوشوں کی لاشوں گلے سے لگایا امام عالی مقام اور ان کے رفقا کی ہمتیں بڑھائیں. حالانکہ دل پاش پاش تھا اور آنکھوں سے سیلاب اشک رواں تھا۔ بھوک و پیاس کی شدت سے خود نڈھال تھیں لیکن صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

آپ کے ماں جائے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ اسلام کی ہی تاریخ میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں بہت اہم و عظیم واقعہ ہے۔ امام حسینؑ نے بچپن میں آغوش رسول میں پرورش پائی تھی آپ کے لئے آنحضرت صلعم نے جو امام حسینؑ کے نانا تھے فرمایا تھا کہ حسین مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ جناب زینب کی ولادت آنحضرت صلعم کی حیات میں ہوگئی تھی اور آپ کو بھی رسولؐ مقبول کی گود کا شرف حاصل ہوا۔ آنحضرت صلعم کے خانوادہ میں جنھوں نے آپ کی زیارت کی اور جن کو آپ کی سرپرستی حاصل ہوئی ان کے نصیب کا کیا کہنا۔ حضرت زینبؓ بھی خانوادۂ رسول میں وہ ہستی ہیں جو رسول مقبولؐ کی گود میں کھیلیں آپ کی مقدس شخصیت خواتین اسلام کے لئے ایک روشن مثال ہے کہ آپ معرکۂ کربلا کے ہولناک موقع پر نہ صرف اپنے پیارے بھائی امام حسینؑ کے دوش بدوش رہیں بلکہ اپنے دو جگر گوشوں کو بھائی پر قربان کر دیا آپ نے اپنے دو بیٹوں عون و محمد کے جسم پر اپنے ہاتھوں سے ہتھیار سجائے اور میدان کارزار میں بھیجا۔ آپ کی محبت آپ کے بھائی امام حسینؑ علیہ السلام کے ساتھ ضرب المثل ہے خواتین اسلام میں جناب زینبؓ کی شخصیت نہایت مقدس و محترم ہے۔ آپ کی شجاعت و ہمت صبر و رضا اسلام کے لئے آپ کی جاں نثاری زبان کی فصاحت و بلاغت قربانی و ایثار اور پاکیزہ کردار آپ کی ذات کے ایسے اوصاف ہیں جن میں تربیت رسول خدا کی جھلک صاف نمایاں ہے اور جن سے والد ماجد حضرت علی کی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔

مورخین کی رائے حضرت زینب کے سنہ و تاریخ ولادت میں مختلف پائی جاتی ہے۔ لیکن کثرت رائے سے ثابت ہے کہ آپ ماہ شعبان سنہ ۶ ہجری میں پیدا ہوئیں سنہ اور تاریخ پیدائش میں اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا یہ امر مسلمہ ہے کہ خانوادۂ رسولؐ مقبول کے حالات زندگی نہایت صحت و صفائی کے ساتھ اسلامی تاریخ میں محفوظ ہیں مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تاریخ کو بہت جگر سوزی محنت شاقہ سے برقرار رکھا ہے۔ جس کی مثال دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ ہر چند کہ خاندان رسالت کی خواتین عام عورتوں سے ملنے جلنے میں گریز کرتی تھیں ان کا وقار و عظمت اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ دوسری عورتوں کی طرح کھلے عام چل پھر کر زندگی گزاریں تاہم ان کی شخصیتیں اور صلاحیتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ان کی زندگی کے حالات مشہور و معروف ہوئے یہ مقدس و محترم خواتین اپنے گھروں میں خانہ داری کے کاموں سے فراغت پاکر عبادت و ریاضت میں مصروف رہتی تھیں۔ غیر مردوں سے سوائے ضروری بات کے کبھی ادھر ادھر کی باتیں نہ کرتی تھیں۔ البتہ ضرورت مندوں اور مسکینوں کی اعانت دل و جان سے کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر جناب زینب کی شخصیت و کردار کا پہلو مورخین کے سامنے کھل کر اس لئے آیا کہ آپ نے کربلا کے واقعہ میں ایسا اہم رول ادا کیا جو خواتین اسلام کے لئے رہتی دنیا تک باعث افتخار ہے۔ آپ نے اپنے خانوادہ کے ایک ایک مرد کے شہید ہو جانے کے غم کو جس صبر و استقلال سے برداشت کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ لٹے ہوئے قافلہ کی حفاظت کی۔ قافلہ کی دوسری بیبیوں کی ہمت بندھائی انھوں نے شہادت حسین کے بعد بھی اسلام کے تحفظ میں تقریریں کیں اور یزید کے سامنے جھکنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب یہ محترم قافلہ نہایت کس مپرسی کے عالم میں کوفہ و شام کے بازاروں سے لے کر ظالم حاکموں کے دربار دل میں مارا مارا پھر رہا تھا

تو اس وقت بھی جناب زینب نے حق پر قائم رہ کر باطل سے منحرف اور
نہایت بردباری کے ساتھ ہر مرحلہ کو سر کیا۔

جب حضرت زینبؓ کی عمر گیارہ سال ہوئی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ
نے اپنی لاڈلی بیٹی کا نکاح عبداللہ ابن جعفر کے ساتھ کر دیا۔ عبداللہ
ابن جعفر بچپن سے حضرت علی کی زیر نگرانی تھے اور ان سے تربیت یافتہ
تھے ذہین با اخلاق ایماندار و دیانتدار تھے کوئی کام بغیر حضرت
علی کی اجازت کے نہ کرتے تھے ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ بہتر نوجوان
حضرت علی کو جناب زینب کے لئے اور کون مل سکتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ
وجہہ نے خود نکاح پڑھایا آپ کا جہیز تقریباً وہی تھا جو آنحضرت صلعم نے
آپ کی والدہ فاطمہ زہرا کو دیا تھا۔

جناب عبداللہ کی شادی جناب زینب بنت علی سے ۱۷ ہجری میں
ہوئی۔ شادی کے وقت جناب عبداللہ بن جعفر کی عمر ۱۸ سال اور جناب
زینب کی عمر ۱۱ سال تھی۔ جب امام حسین علیہ السلام نے کوفہ کا ارادہ
کیا تو بہت لوگوں نے اس اقدام سے امام عالی مقام کو روکنا چاہا۔
جناب عبداللہ نے بھی امام عالی مقام کو کوفہ جانے کے خلاف رائے دی۔
لیکن امام حسین علیہ السلام کا پختہ ارادہ اور عزم مصمم دیکھ کر خاموش
ہو گئے لیکن آپ نے جناب زینب اور اپنے دو بیٹوں عون و محمد کو امام
عالی مقام کے ہمراہ کر دیا۔ آپ کے دونوں بیٹے جنگ کربلا میں روز
عاشورہ شہید ہوئے جب جناب عبداللہ نے اپنے فرزندوں کی شہادت
کی خبر سنی تو اللہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ سعادت مجھ کو نصیب نہیں
ہوئی تو پرواہ نہیں میرے دو بیٹے تو امام عالی مقام پر قربان ہو گئے۔
جناب عبداللہ بن جعفر نے خاصی طویل عمر پائی۔ آپ کی وفات ۸۰ ہجری
سے لے کر ۹۰ ہجری کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

جب امام حسین علیہ السلام مدینہ سے روانہ ہو کر ۳ر شعبان کو
مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو جناب زینب بنت علی اپنے بھائی کی ہم
سفر تھیں۔ ان کے شوہر جناب عبداللہ نے ان کو بھائی کے ساتھ اس
سفر پر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ لوگوں نے جناب زینب کو یہ
سفر اختیار کرنے سے روکنا چاہا اور کہا کہ کربلا کا سفر خطرناک ہے
لیکن جناب زینب نے کہا "بہن بھائی کو اس مصیبت میں کیسے چھوڑ سکتی
ہے جو ان پر آنے والی ہے" انھوں نے اپنے ماں جائے کے ہمراہ سفر کی
ایک ایک صعوبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ وہ امام عالی مقام
کی پریشانی و اضطراب کو دیکھتی رہیں اور وہ خوفناک گھڑیاں بھی سلگتی رہیں
جو کہ کوفہ سے برابر آ رہی تھی لیکن ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش
پیدا نہیں ہوئی۔ حضرت امام زین العابدینؑ سے روایت ہے کہ "جس روز
میرے والد شہید ہوئے اس سے قبل کی رات بھر میری پھوپھی زینب میری
تیمار داری کرتی رہیں صبح کو میرے والد نے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر
میں رو دیا اور میری پھوپھی بے قرار ہو گئیں۔ اسی موقع پر امام عالی
مقام نے اپنی بہن کو نصیحت کی اور کہا "میری عزیز بہن ایسا نہ ہو کہ
شیطان آپ کو صبر و قناعت سے روک دے۔ استقامت و تقویٰ
کو مت چھوڑیئے صبر و رضا پر ہر حالت میں قائم رہئے۔ دنیا میں
ہر شخص کو موت ہے۔ ہر چیز فنا ہو جائے گی بجز اس قادر مطلق کے
جس نے یہ تمام جہاں پیدا کئے۔ میری بہن! میرے نانا (صلی اللہ
علیہ وسلم) میرے والد علی مرتضیٰ مجھ سے افضل تھے۔ میری ماں فاطمہ زہرا
اور میرے بھائی حضرت حسنؓ بھی مجھ سے بہتر تھے۔ ان سب نے اللہ
تعالیٰ کے احکامات کی پیروی سے کبھی سرتابی نہیں کی۔ مجھ پر فرض
ہے کہ میں بھی اپنے خاندان کی پیروی کر کے جنت میں اللہ جل جلالہ
کے سامنے سرخ رو ہوؤں جان برادر! میں آپ کو وصیت کرتا ہوں
کہ میرے بعد میرے غم میں گریبان چاک نہ کرنا۔ نہ کسی اور طرح سے
حال تباہ کرنا میں نہیں چاہتا کہ خانوادۂ رسولؐ کی توہین ہو اور
دشمنان دین ہم پر ہنسیں آپ اور میرے خاندان کے تمام پس ماندگان
انتہائی صبر و رضا کا ثبوت دیں"

جناب زینب نے بھائی سے دریافت کیا "کیا یہ ممکن ہے کہ
آپ کی جگہ یزید میری قربانی قبول کرے؟"
امام عالی مقام نے اشک آلود آنکھوں سے جواب دیا "اے
بہن یہ ناممکن ہے" اس پر جناب زینبؓ زار و قطار روئیں لیکن
وقار و بردباری کے ساتھ۔

روز عاشورہ سے پہلی شب کو امام حسین علیہ السلام نے اپنے
تمام رفقاء کو خیمہ میں جمع کر کے تقریر کی اور عام اجازت دے دی کہ
نازک وقت آپہنچا ہے جو کل جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتا وہ
جہاں بھی چاہے چلا جائے لیکن جانثاروں کے قدم ذرا بھی نہیں ڈگمگائے
پھر امام عالی مقام زنانہ خیمے میں تشریف لائے اور خواتین کو خطاب کر کے کہا "صرف
ایک رات باقی ہے۔

مجبوری

یہ کہانی سماج کے لئے شرمناک بھی ہوسکتی ہے اور ایک تازیانہ بھی۔ مجبوری سے انسان کبھی کبھی کس طرح مجبور ہو جاتا ہے، اس کہانی کو پڑھئے اور سبق لیجئے۔

(وردہ بشیر)

میں معذرت خواہ ہوں مائی باپ، چودھری صاحب پر لگایا ہوا میرا الزام بے بنیاد ہے۔ قطعی چودھری صاحب نے زیادتی نہیں کی۔ میں نے انھیں صرف بدنام کرنے کے لئے یہ چال چلی تھی۔ مگر اب چونکہ میرا ضمیر مجھے چرکے لگاتا رہتا ہے اس لئے میں اپنے اس فعل پر نادم ہو کر آپ سے معافی کی درخواست کرتی ہوں۔"

سکینہ بی بی کے بھری عدالت میں یہ فقرے سن کر میں دم بخود رہ گئی۔ میں جو اس کی وکیل تھی اس کیس کی حقیقت کو روزِ روشن کی طرح جانتی تھی۔ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس میں واپس آتی عدالت نے سکینہ بی بی کو جھوٹا کیس اور توہین عدالت کے جرم میں تین ماہ قید کی سزا سنائی اور چودھری صاحب کو باعزت بری کر دیا۔ اس سارے انتشار میں میں بالکل خاموش رہی۔ آج جب کہ فیصلہ کا دن تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ کیس ضرور جیت جاؤں گی کیونکہ میں نے حق کے لئے لڑائی کی تھی اور محدود وسائل ہوتے ہوئے بھی اس کیس کے لئے ثبوت ڈھونڈے تھے مگر اب اچانک جب سکینہ نے یوں پلٹا کھایا تو لازمی ہے کہ میرا حیران رہ جانا لازمی بات تھی۔ میں چپ چاپ بیٹھی اس دن کو یاد کر رہی تھی جب سکینہ کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

میرا ٹرانسفر اس شہر میں ہوئے آج تیسرا دن تھا اور یہ تین دن گھر سیٹ کرنے ہی میں لگ گئے تھے۔ میرے ہمسائے سب بہت اچھے تھے۔ دائیں ہاتھ والی کوٹھی میں مسز ابراہیم رہتی تھیں۔ ان کے سرونٹ کوارٹر میں ایک عورت سکینہ اپنی بیٹی رانی کے ساتھ رہتی تھی۔ میرے کام کاج میں مدد کے لئے وہ اکثر آجاتی۔ وہ بہت خاموش عورت تھی مگر پھر بھی اس نے اپنے بارے میں مجھے بتایا کہ وہ کسی چھوٹے سے قصبہ سے تعلق رکھتی تھی۔ خاصی چھوٹی تھی جب اس کی شادی ہو گئی اور بدقسمتی سے شادی کے ایک سال بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی اس کی بیٹی رانی بھی شوہر کی وفات کے بعد پیدا ہوئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد سسرال والوں کے طعنے شروع ہوئے تو وہ اپنی بیٹی کو لے کر شہر آ گئی اور یہاں کام کاج شروع کر دیا۔ سکینہ اب بھی خاصی خوبصورت اور جوان لگتی تھی بس کچھ زمانے کی گرد سی جم گئی تھی جو اس کے چہرے کو دھواں دھواں سا کر دیتی تھی۔

ان ہی دنوں سکینہ نے اپنی بیٹی رانی کے رشتے کی فکر کرنی شروع کر دی اور بہت سوچ بچار کے بعد اپنی ہی برادری کے ایک لڑکے سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ وہ لڑکا غالباً کہیں کلرک تھا مگر سکینہ کی برادری میں کلرک کا عہدہ بہت بڑا سمجھا جاتا ہے سو قیمت بھی بڑی لگائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے رانی کا جہیز بیس ہزار روپے ٹھہرایا گیا۔ سکینہ بے چاری خود تو خوشیاں دیکھ نہ سکی تھی۔ اس لئے چاہتی تھی کہ رانی کا ہاتھ کسی اچھے لڑکے کے ہاتھ میں دے سو اس نے اپنی حیثیت سے کہیں اونچی چھلانگ لگاتے ہوئے یہ رشتہ قبول کر لیا۔

اب سکینہ کے دن رات پیسے کے انتظام میں گذرتے کبھی دائیں اور کبھی بائیں سے پیسہ جمع کر رہی تھی بیگم ابراہیم نے بھی غالباً دو تین ہزار دیا اور اتنی ہی مدد میں کر سکی کیونکہ نئی نئی نوکری تھی زیادہ پیسہ کہاں سے لاتی۔ سکینہ کے پاس کچھ اپنا ملا کر تقریباً دس ہزار ہو گیا مگر اب باقی دس کا انتظام کہاں سے ہو۔ اس خیال نے اس کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ پھر ایک دن وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی "بی بی جی میں سوچتی ہوں گاؤں جاؤں اور جا کر کچھ پیسے کا انتظام کروں یہاں بیٹھی کیا کروں گی" میں نے بھی اس کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ چلو رشتہ دار مدد کر دیں گے سو اس کو یہی مشورہ دیا کہ وہ گاؤں چلی جائے اور اسی شام وہ گاؤں روانہ ہو گئی۔

ڈیڑھ ہفتہ بعد سکینہ اور رانی گاؤں سے لوٹیں وہ سیدھی رانی کو سرونٹ کوارٹر چھوڑ کر میرے گھر چلی آئی۔ سکینہ کی عجیب حالت تھی رنگ جیسے ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور بالکل کسی خزاں رسیدہ پتے

کی بات کانپ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خاصی پریشان ہوئی اور اس سے پوچھا کیا ہوا سکینہ ٹھیک تو ہو۔ پیسے کا انتظام ہو گیا؟ اور میرے اس سوال کے جواب میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد جب آنسو تھمے تو بولی "بی بی جی میں نے کانوں سے کچھ نہیں پایا مگر سب کچھ گنوا آئی ہوں" "کیا؟" مجھے اس کی بات عجیب سی لگی۔

"ہاں بی بی جی میں نے وہاں ہر ایک کے آگے دامن پھیلایا مگر کسی رشتہ دار نے مدد نہیں کی اور آخر میں تھک کر چودھری کے ہاں چلی گئی اور جانتی ہیں بی بی اس نے کیا کیا۔ کچھ دینے کے بجائے میرا سب کچھ لوٹ لیا، میری آبرو۔۔۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اور میں اس کی بے چارگی کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی جو شاید وہ کبھی بھی بیان نہ کر پاتی خیر اس واقعہ کے بعد سکینہ اپنی بیٹی کو لے کر شہر لوٹ آئی۔

میں نے سکینہ سے پوچھا کہ آیا وہ چودھری کے خلاف کیس کرنا چاہتی ہے تو وہ کشمکش میں پڑ گئی کیونکہ ظاہر ہے کہ کیس کے لئے پیسہ درکار ہوتا۔ مگر پھر ہمت دلانے پر وہ کیس کرنے کے لئے رضامند ہو گئی۔ کیونکہ یہ میرے پروفیشن کی توہین ہوتی اگر وہ درندہ یوں کھلے عام پھرتا رہتا۔

سکینہ بی بی کا کیس میں نے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے عدالت میں چودھری کے خلاف عزت لوٹنے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ وہ چودھری جو خود کو بالکل محفوظ سمجھتا تھا۔ سکینہ کے اتنے بڑے قدم پر ہکا بکا رہ گیا۔ سارے علاقے میں سینہ تان کر چلنے والا آج عدالت کے سامنے پگڑی سر سے اتارنے پر مجبور ہو گیا۔ چودھری کے خلاف کوئی بھی شخص گواہی دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ظاہر ہے ہر ایک کو اپنی عزت پیاری تھی مگر پھر خوش قسمتی سے ایک دو ایسے گواہ مل گئے جو اس سانحہ کے وقت حویلی میں موجود تھے۔ پھر سکینہ کا میڈیکل چیک اپ بھی گواہی دے رہا تھا۔ سو آج مجھے پورا یقین تھا کہ اس کیس کا فیصلہ سکینہ کے حق میں ہوگا۔ مگر سکینہ کی غلط بیانی سے سب کچھ بکھر گیا اور یہ غلط بیانی میرے ذہن میں الجھن سی بن گئی تھی۔

جس وقت سکینہ کو عدالت کے احاطے سے باہر لے جایا گیا تو میں اس سے ملی۔ مجھے دیکھ کر وہ بولی "بی بی جی میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں" وکیل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اسے اکیلے میں لے گئی۔

"سکینہ یہ کیا کیا تم نے بیوقوف عورت آج ہم ہر حال میں جیت جاتے فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوتا مگر تمہاری بے عقلی نے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا آخر ہوا کیا تھا تمہیں۔" میں سکینہ کو جھڑک رہی تھی وہ خاموشی سے ہر بات سن رہی تھی پھر کچھ دیر بعد بولی "بی بی جی رات چودھری کی بیوی میرے گھر آئی تھی اس نے مجھے پچیس ہزار روپیہ دیا ہے کہ میں سارا الزام اپنے سر لے لوں اور چودھری صاف بچ جائے۔ وہ عزت دار ہے اور یہ واقعہ سب کچھ خاک میں ملا دینے کے لئے کافی تھا۔ پہلے تو میں نے انکار کر دیا مگر پھر بی بی آپ کو تو پتہ ہی ہے مجھے رانی کے بیاہ کے لئے بیس ہزار چاہئے کہاں سے لاؤں سو میں نے وہ پیسے لے لئے اور اب میں جلد سے جلد رانی کا بیاہ دھوم دھام سے کروں گی۔ آپ رانی کا خیال رکھئے گا۔"

سکینہ کی یہ باتیں سن کر میں سن سی رہ گئی "سکینہ تو نہیں جانتی کتنے کمینے انسان کو تو نے چھوڑ دیا ہے۔ تیری عزت گئی تو کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ لڑکا اب تیری بیٹی کو قبول کر لے گا۔ یہ سن کر کہ تو نے چودھری پر جھوٹا الزام لگایا ہے"

"بی بی یہ عزت تو امیروں کی ہوتی ہے، ہمارا کیا ہے۔ اب پیسے ہیں تو وہ لڑکا سب کچھ کے باوجود جھک کر رانی کو بیاہے گا، اور جب پیسہ نہیں تھا تو تم ہی بولو کیا وہ لوگ شادی کے لئے تیار تھے یا کسی نے مجھے دس ہزار قرض دے دیا۔"

"لیکن سکینہ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان عزت کے بدلے پیسہ حاصل کرے" میں نے اس سے سوال کیا "بی بی تمہیں کیا معلوم ہم غریب کیسے پیسے کماتے ہیں۔ کتنی ہی غریبوں کی ماؤں نے اپنی بیٹیوں کے جہیز یوں حاصل کئے تمہیں کیا پتہ" اتنا کہہ کر اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے اور میں حقوق انسان کی علمبردار خاموشی سے کھڑی ان چیخوں کو سن رہی تھی جن کا گلا اسی طرح گھونٹا گیا۔ جس طرح آج میرے سامنے ایک بے بس عورت نے اپنے اندر سے اٹھنے والی روح کی چیخ کو اپنے اندر ہی دفن کر دیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں ہار گئی ہوں، وہ تمام لا کی کتابیں مٹی کا ڈھیر لگنے لگیں۔ میں تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوئی یہ کہتے ہوئے، "اچھا سکینہ میں رانی کا خیال رکھوں گی۔"

آخری خط

ماشاء اللہ خاں

تم نے تو کہا تھا: "دوستی کے راستے بہت دور تک جاتے ہیں چلو! میں سہارا بنوں گی... لیکن یہ کیسا سہارا تھا کہ تم نے پہلے ہی پڑاؤ پر مجھے بے سہارا کر دیا ہے کیا حقیقت تھی اس وعدے کی؟ اب سوچو تو ذرا۔ تم اب لکھتی ہو میں مجبور تھی"... کیا تم اس وقت مجبور نہیں تھیں جب تم بڑے مان، کامل یقین اور مکمل اعتماد کے ساتھ مجھے اپنے وعدوں کی رسی میں باندھ رہی تھیں؟۔ مجبور تو تم اس وقت بھی تھیں کہ ایک کھیل کھیل رہی تھیں... "پیار کا کھیل" اور مجبور تم آج بھی ہو کہ اب تم کسی اور کی ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنی محبت "کا یقین دلا رہی ہو! ہو نا!! یہ کیسی محبت ہے؟ یہ کیسا کھیل ہے کہ تم ہار کر بھی مجھے اپنی جیت کا تمغہ بنا کر رکھنا چاہتی ہو — عورت بھی عجیب ہے۔! جو چیز اس کے پاس ہو، اس کی حفاظت نہیں کرتی... اور جو چیز اس کے پاس نہ ہو اس کی حفاظت کرتی ہے! جو چیز اس کی دسترس سے باہر ہو اس پر اپنی حکومت اور ملکیت کی مہر ثبت کر دینا چاہتی ہے۔

جو ہونا تھا وہ تو اب ہو ہی چکا! بے وفائی کا تیر تو کب کا کمان سے نکل چکا... اس کا پنچھی تو کب کا دم توڑ چکا۔ اب تم سے پوچھنے اور جاننے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟! اور اگر تم سے پوچھوں بھی تو کس تعلق سے؟ کہ وہ بھرم کب کا ٹوٹ چکا! جس طرح پیاز کی پرتیں اُتر جانے کے بعد اس میں کچھ نہیں رہتا... اسی طرح عورت کا خول اتر جانے پر بھی کچھ نہیں بچتا... وہ بالکل غائب ہو جاتی ہے اور اپنے ساتھ وہ محبت بھی لے جاتی ہے۔ جو صرف اس کے وجود سے وابستہ ہوتی ہے۔

ہم نے تم سے جو تعلق باندھا تھا اور تم نے ہمیں جو اٹوٹ یقین دلایا تھا۔ اس کے ٹوٹ جانے پر ہم تمہیں دوش نہ دیں گے کہ دنیا کے اس سفر میں ہم اس لاوارث اور یتیم بچے کی مانند تھے جو سر راہ چلتے راہوں میں اپنے بابا اور ماما کی پرچھائیاں ڈھونڈا کرتا ہے! ہم سے بھی بس اک یہی نادانی ہوئی تھی کہ تمہاری تو جا اور سہارے کو حقیقت سمجھ بیٹھے... یہ جانتے ہوئے کہ آج جو ہاتھ ہمارے سر پر یوں شفقت اور اپنائیت سے رکھ رہا ہے... کل کو اس کا اپنا اصل بھی مل جائے گا... اور ہم پھر سے انہی اندھیروں میں بھٹکنے کو رہ جائیں جہاں سے ہم کبھی روشنی کی ایک کرن دیکھ کر اس کے پیچھے ہو لئے تھے! چھچھوندر زمین کی تاریکیوں میں اپنے دن گزارتی ہے اور عقاب آفتاب سے آنکھیں لڑا کر اپنی عمر تمام۔ کسی عقاب کو اندھا دیکھا ہے۔؟.... اچھا ہوا کہ تم نے مجھے بینا کر دیا۔ اب میں چھچھوندر کی طرح اندھیروں کا نہیں رہا۔ بلکہ عقاب کی طرح روشنی میں آگیا ہوں۔

ہم آج تک خود فریبی میں مبتلا رہے اور یہ خود فریبی بھی کتنی بڑی نعمت ہے! انسان اس کھیل میں اتنا انجان اور بھولا بھالا بن جاتا ہے جیسے کچھ جانتا ہی نہیں... اپنے آپ کو مسلسل دھوکا دیتا رہتا ہے پھر بھی مطمئن رہتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں... اپنے آپ سے کھیلتا اور تسکین پاتا ہے... آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ جلنے مرنے کے خوف سے لاپرواہ۔! خود فریبی بھی واقعی بڑا خوبصورت کھیل ہے!!

پہلے پہل ہم روشنیوں سے ڈرتے اور اندھیروں سے پیار کرتے تھے لیکن اب ہمیں احساس ہوا ہے۔ اور ہم پر یہ حقیقت عیاں ہوئی ہے کہ بڑی فراخدل ہوتی ہیں یہ روشنیاں! بڑے بڑے ڈر، بڑے بڑے واہمے اور بڑی بڑی دہشتوں کو نگل جاتی ہیں یہ روشنیاں!! اندھیرے کمزور ہوتے ہیں، ان میں ڈر جاؤ تو اندر ہی اندر دھنستے چلے جاتے ہیں آپ! ہم آج تک انہی اندھیرے کنوؤں کے باسی تھے۔ آپ نے ہمیں "بیدار" کیا تو ہم نے روشنی کی جھلک دیکھی! ہمیں تو اب روشنی سے خوف آنے لگا ہے کہ ہر چیز عریاں ہو گئی ہے۔ ہر چیز اپنی اصلیت میں نظر آنے لگی ہے۔ بالکل اپنی حقیقت آپ!!! ہم اندھیروں میں تھے تو ہر چیز ڈھکی چھپی تھی، ایک سربستہ راز تھی، بالکل آپ ہی کی طرح! جی چاہتا ہے کہ پھر انہی اندھیروں میں بھٹک جائیں... پھر کوئی گھپ اندھیرا اور مہیب کنواں تلاش کر لیں اور وہیں ڈوب جائیں کہ یہ روشنی، یہ حقیقتیں، یہ عریاں سچائیاں تو نہ دیکھ سکیں۔

جب زندگی لوگوں کے ہاتھوں ستم اور محبوب کے ہاتھوں کھلونا

بن جائے تو اس زندگی اور اس تمنا کا کیا فائدہ ! اب تو ہم نے اپنے اوپر اتنا جبر اور صبر روا کر رکھا ہے کہ ہم آپ کا نام بھی نہیں لے سکتے یہ حق بھی اب ہم سے چھین گیا ہے۔ اس سے زیادہ مایوس کن بات اور کیا ہوگی کہ انسان ایک ننھی سی خواہش کرے اور وہی خواہش اُلٹے پتھر کی طرح اس کے منہ پر آن پڑے... یا شاید پھر مانگنے اور خواہش کرنے کا بھی ایک انداز ہوتا ہوگا جو کہ ہم میں نہ تھا ! ہم خواہش ایک ہی بار کیا کرتے ہیں [illegible] بار بار کی گئی خواہش بھکاری کی صدا بن کر رہ جاتی ہے۔ جو لوگ اپنی چاہت کے اظہار کا سلیقہ نہیں جانتے وہ اپنے محبوب کی چاہت کو کھو بیٹھتے ہیں ؟ اور ہم تو مانگنے کے انداز سے ہی ناآشنا رہے !! ہمیں اپنی اس کم مائیگی کا کوئی گلہ نہیں کہ گلہ کریں بھی تو کس سے۔ ؟ تم سے۔ ؟ ؟ بھلا مجبوروں سے بھی کوئی گلہ کرتا ہے کبھی۔

جن باتوں سے انسان کو کل لاتعلق ہونا ہے۔ بہتر یہی ہوتا ہے کہ ہم رفتہ رفتہ وہ عادتیں، وہ کمزوریاں ترک کر دیں۔ انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔ ہاں ! عادات بدلتے بدلتے دیر بھی لگ جاتی ہے... اور پھر جو راہیں بچھڑ گئیں... جو منزلیں اجڑ گئیں... جو راستے کٹ گئے... ان کی طرف اب لوٹ کر دیکھنا ہی فضول ہے مبادا کہ وہ زخم پھر سے رسنے لگیں۔ جنھیں ہم نے بڑی رازداری سے دنیا سے چھپا رکھا ہے ! ہم نے جس شیشے میں تصویر محبت بنائی تھی، مدت ہوئی وہ شیشہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکا.... کرچی کرچی.... ریزہ ریزہ ہو چکا ! ہم اپنی یادوں سے ان کرچیوں کو سمیٹتے ہیں تو ہماری انگلیں۔ ناکام انگلیوں سے لہو رستا ہے.... اور تمہارا عکس خون آلودہ ہو جاتا ہے ! ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا خون تمہاری زندگی کی مانگ سجائے !! شراب ہم پر نشہ نہیں کرتی۔ غم اب ہمیں پریشان نہیں کرتے۔ تہمتیں اب ہمیں بری نہیں لگتیں... شہر میں اب ہمیں رسوا نہیں کرتیں کہ اب ہم بدنامیوں کے ڈر سے خائف نہیں ! بخدا، ان دنوں ہم بہت مطمئن انسان ہیں۔ بہت ہی مطمئن۔

ہم کبھی کبھی بڑا ہی بے ضرر، ننھا سا جھوٹ بولتے ہیں اور اپنے اندر کی آواز کسی دوسرے کے سر تھوپ کر اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو ہم اتنا پھیل جاتے ہیں کہ بڑی سے بڑی بات کو بڑی آسانی سے اپنے اندر سمو لیتے ہیں.... اور بعض اوقات ہم اتنے سکڑ جاتے ہیں کہ چھوٹی سی چھوٹی بات ہم اپنے اندر سمو نہیں سکتے ! یہ پھیلنا اور سکڑنا ہماری لاشعوری خواہشوں کے تابع ہوتا ہے۔ جھوٹ جب دوسروں سے بولا جائے تو اتنا ضرر رساں نہیں ہوتا جتنا اپنے آپ سے بولا جائے تو ہوتا ہے۔ ! بعض سچائیاں ایسی ہوتی ہیں جنھیں مصلحتوں پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے ہمیں اب جو نصیحتیں اور نکات عطا فرمائے ہیں تو ہم آپ کو یقین دہانی کرواتے ہیں کہ ہمیں چنداں راہ دکھلانے کی ضرورت نہیں اب..... اور نہ ہی ہماری خاطر آپ پریشان ہوا کیجئے کہ بخدا ہم جیسے بھی ہیں..... جس حال میں بھی ہیں.. ہم بہت مطمئن اور سرشار ہیں کہ اب ہم اس طلسم سے جاگنا نہیں چاہتے۔ رہی جینے کی بات ! تو ہم کئی بار مرتے ہیں اور کئی بار جی اٹھتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے غم اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہمارے جینے اور مرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

نہ یہ تجدید وفا ہے اور نہ ہی لمحۂ محبت کہ جب ٹھنی ہی ٹوٹ گئی تو پھر اس پر آشیانہ کیسا ؟ جو راستے کٹ گئے.... جو راہیں بچھڑ گئیں، اب ان کی طرف لوٹ کر دیکھنا ہی فضول ہے..... لیکن ہمیں ان راہوں کی گرد مل جائے۔ اے کاش ! تو ہم انہیں اپنی جبیں بنا کر آپ سے آخری بار کہہ سکتے کہ۔

" آپ سے محبت ہماری ضرورت نہ تھی۔ آپ سے پیار ہماری اوقات نہ تھی.... لیکن آپ سے پیار اور آپ سے محبت ہماری زندگی تھی ! آپ کی آرزو ہماری زندگی تھی..... محتاجی نہ تھی !! ہم آپ کے محتاج نہ تھے.... ہماری زندگی آپ کی محتاج نہ تھی.... بلکہ.... ہماری زندگی آپ کے دم سے تھی۔ !"

قربتوں کے لطف سی بندش ٹوٹ جائے تو انسان ادھورا کر رہ جاتا ہے ! آج ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ وہ باتیں بھول جائیں یا وہ باتیں وہ عہد و پیماں بھول جائیں یا وہ باتیں، وہ عہد و پیماں بھول سکیں لیکن کچھ واقعے ذہن میں آپ ہی آپ یوں نقش ہو جاتے ہیں کہ زندگی مٹ جاتی ہے، وہ نقش نہیں مٹ پاتے۔ بعض اوقات تو ہم بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور کچھ بھی نہیں کہہ پاتے.... اور بعض اوقات ہم کچھ بھی نہیں کہتے اور بہت کچھ کہہ جاتے ہیں کہ اور کچھ کہنے اور جاننے کی گنجائش ہی نہیں رہتی ! کبھی کبھار ایک دوسرے کو

جاننے کے لئے عرصہ درکار ہوتا ہے اور مدتیں لگتی ہیں۔۔۔۔ اور کبھی کبھی یہ پرکھ، یہ پہچان، پہلی ہی جھلک پر یوں ہو جاتی ہے۔ جیسے مدتوں سے ہماری جان پہچان تھی۔۔۔۔ اور جب ملے تو یوں احساس ہوا کہ یہی ہماری سوچ تھیں۔۔۔۔ ہمیں تمہاری ہی جستجو تھی۔۔۔۔ یہی اس دل کا قرار تھیں۔۔۔ لیکن!۔۔۔۔ لیکن یہ سب خواب تھے، سب وہم تھے، ۔۔۔ جن کی نہ کوئی تعبیر تھی۔ نہ حقیقت!! یہ تصور محض ایک سراب تھا جس کے پیچھے ہم آج تک دیوانہ وار بھاگتے رہے۔ محبت کے اس کھیل میں ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا؟ کھویا اتنا کہ مزید کھونے کے لئے باقی کچھ نہیں رہ گیا۔۔۔ اور پایا اتنا کچھ کہ ہمیں اور کچھ پانے کی تمنا ہی نہیں رہی۔!

ہم لوگ ایک مکمل اور جامع انسان ہوتے ہوئے بھی کئی ایک متضاد شخصیتوں میں بٹے ہوتے ہیں کہ جو ہم محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار نہیں کرتے جو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ نہیں پاتے۔۔۔۔ اور جو ہم کہتے ہیں وہ "نہیں ہوتا جو ہمارا مطلب ہوتا ہے۔ ہم اوروں کو دھوکا دیتے دیتے خود کو بہت بڑا دھوکا اور فریب دیتے رہتے ہیں اور اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم خود سے مخلص ہوتے ہی نہیں!!

ایک وقت ہوتا ہے کہ انسان پیار کا بھوکا ہوتا ہے اور وہ طلب میں دوسروں سے بھیک مانگتا ہے کہ "کیا آپ ہمیں چند گھڑی کی خوشیاں نہیں دے سکتے؟" لیکن پیار کی بھیک مانگنے والوں کو جب اس بیدردی سے ٹھکرا دیا جائے تو۔۔۔۔ قربتوں کی وہ لطیف بندش ٹوٹ جاتی اور انسان بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔

" دکھ کسی انسان کے مرنے سے نہیں ہوتا
بلکہ اپنائیت اور محبت کے ان رشتوں کے
ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے جو اچانک بچھڑ
جاتے ہیں۔"

ضروری تو نہیں کہ ہمیں ہر وہ چیز مل جائے جس کی ہم تمنا کرتے ہیں اصل تو ہوتا ہی بڑا خود غرض اور جلد باز! دعائیں اور صدائیں بعد میں مانگتا ہے۔۔۔۔ قبولیت کی شرط اس کی غرض کو پورا کر دیا نہ کرے ہم اپنی تقدیر پر راضی ہیں کہ انسان میں تقدیر پر یقین کا مثبتی احساس نہ ہوتا تو یہ دنیا کچھ اور ہی ہوتی۔ قدم قدم پر ملنے والی چیں

چاروں طرف پھیلے دکھ، برداشت کی حدوں سے گذر جانے والے غم۔ انسان سب سہہ لیتا ہے اور برداشت کر لیتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بالآخر دکھوں۔ غموں اور اذیتوں کا بوجھ تقدیر کے نام سونپ دیتا ہے اور تقدیر چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا دوسرا نام ہے اس لئے بندے کو اس کی رضا کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔

ڈوبنے سے پہلے انسان بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ شاید کوئی تنکا ہی ہاتھ آ جائے اور جب انسان ڈوبنے کو ہی ہو تو وہ ایک لمحہ۔۔۔ فقط وہ ایک لمحہ! جب انسان ڈوب رہا ہو تو ساری زندگی کی فلم اس ایک لمحہ میں۔۔۔۔ پل بھر میں۔۔۔۔ تمام کی تمام۔۔۔۔ آنکھوں کے آگے گھوم جاتی ہے۔ مجھے مارنے کو اب تو زندگی بھر کے چھوٹے چھوٹے غم ہی کافی ہیں۔ لیکن آج میری محبت ڈوب رہی ہے اور جب یہ تحریر تمہاری نظروں سے گذرے گی تو یہ محبت اپنی گہرائیوں میں ڈوب کر مر چکی ہوگی جن گہرائیوں سے کبھی اس نے جنم لیا تھا۔۔۔۔ تمہارے لئے۔۔۔ تمہاری خاطر!! تمہارے ہی واسطے!!! جب یہ تحریر تمہاری نظروں سے گذرے گی تو میری محبت جسے امر رہنا تھا۔ ڈوب چکی ہوگی۔۔۔۔ دم توڑ چکی ہوگی۔۔۔۔ اپنی موت آپ مر چکی ہوگی۔

یہ میری محبت کا لاشہ ہے۔ اسے بڑی سادگی۔ تحمل اور احتیاط سے دفن کرنا کہ یہ شہرتوں کی تمنائی نہ تھی! میری محبت میں سچائی تھی، دیوانگی تھی، خلوص تھا وارفتگی تھی۔ وقار تھا، عہد تھا۔ ایمان تھا۔ جذبہ تھا۔ ایک شدت تھی۔ یہ ہر ملاوٹ سے پاک تھی۔ اس محبت کو دلہن میں نے بنایا تھا۔ اس کا سنگھار میں نے کیا تھا۔ لیکن افسوس! تم سے اس محبت کی پاسبانی نہ ہو سکی۔ آج یہ تمہارے بیمار کمرے درد انگیز تنہائیوں میں دم توڑ رہی ہے۔ افسوس! تم سے اس کی مسیحائی نہ ہو سکی۔ اس کے لاشہ پر کوئی پھول، کوئی کتبہ، کوئی نشانی نہ لگانا۔ اس کے سرہانے شور اور ماتم بھی نہ کرنا۔ کہ یہ مرنے میں بھی دہل جائے گی۔ میری محبت بڑی حساس اور آبرومند تھی۔ اس میں تم جیسی سنگدلی اور بے باکی نہ تھی۔ اس کے لاشہ کو فوراً ہی دفن کر دینا۔ دیر نہ لگانا۔ ورنہ یہ لاشہ تمہیں رسوا کر دے گا۔"

محبت سے متعلق ہمارا نظریہ اتنا فرسودہ ہے کہ اس پر چلنا کوئی عقلمندی نہیں! (تم) اور مجھ جیسے لوگوں نے محبت کو اتنا اپنا تنگ

اور محصور کر دیا ہے کہ اس کی آزادی اور وسعت سمٹ کر رہ گئی ہے!
محبت تو ایک لامتناہی جذبہ ہے۔ جس میں ارض و سما کی وسعتیں سما سکتی ہیں۔ جب ہم بچھڑے اور مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں سکتے تو ان کی یاد میں زندگی گھائل کرنے سے فائدہ!۔

"اب ہم سوئی محبتوں کو کیسے پکاریں؟ عشق کو کیوں کر جھنجھوڑیں؟ کہ یادیں تو وہ مزار ہوتی ہیں جن میں ہمارے ماضی کے حسین لمحات دفن ہوتے ہیں۔ مزار مٹ سکتے ہیں۔ مٹائے جا سکتے ہیں۔ مگر مٹتے مٹتے بھی وہ اپنا نقش نہیں چھوڑتے! قبروں اور مزاروں پر تو راہ چلتے لوگ بھی رک کر اپنے ہاتھ دعائے مغفرت کے لئے بلند کر دیتے ہیں اور پھر یہ تو ہمارا اپنا مزار ہے۔ ہماری یادوں کا مزار۔ ان حسین لمحات کا مزار جو پیدا ہونے سے پہلے مر گئے۔

تم ذہن سے ماضی کا بوجھ اتار پھینکو! یہ بوجھ اٹھائے پھرو گی تو مستقبل کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال نہ سکو گی۔۔۔ یونہی اکھڑی اکھڑی رہو گی۔۔۔ میرا اکھڑی اکھڑی محبوبہ پر تو شائد مرتا ہے۔۔۔ لیکن اکھڑی اکھڑی بیوی کو برداشت نہیں کرتا تو تمہیں پچھتانا ہے۔۔۔ اور نہ تم پچھتاؤ گی۔۔۔ کہ پچھتاوا قربانی اور فرض کی عظمت کو زائل کر دیتا ہے۔۔۔ اور پھر کسی کی خوشی کا سہارا لینا بھی تو ایک عظیم کام ہے۔
تمہیں تمہاری خوشیاں مبارک ہوں!۔
جائیے! اور محبت کی وسعتوں میں سما کر اپنی نئی دنیا آباد کر لو۔۔۔۔۔

اور ہاں! جاتے جاتے وعدہ دو۔۔۔ آخری وعدہ۔۔۔ کہ جو راہیں پیچھے چھوٹ گئیں۔ ان کی طرف مڑ کر نہ دیکھو گی۔!!!

• دفتر کو خط روانہ کرنے سے پہلے دیکھ لیں کہ آپ نے اس میں اپنا نام و پتہ لکھا ہے یا نہیں اکثر بہنیں شکایت لکھ دیتی ہیں، لیکن نہ تو اپنا نمبر خریداری لکھتی ہیں نہ نام و پتہ ایسے خطوط روانہ کرنا فضول ہوتا ہے۔

• لکھنؤ سے قریبی مقامات کے خریداروں کو ۲۰ تاریخ تک اور دور کے خریداروں کو ۲۵ تاریخ تک حریم نہ ملے تو دفتر کو خط لکھیں۔ دوسرا پرچہ بھجوا دیا جائے گا۔ لیکن جو بہنیں ۳۰ تاریخ کے بعد شکایت لکھیں گی انھیں پرچہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔ شکایت لکھتے وقت نام و پتہ کے ساتھ ہی نمبر خریداری بھی ضرور لکھیں۔

تبصرا

بارہ بنکی ۔ مؤلف جناب چودھری علی محمد زیدی (ردولی) سائز [illegible] صفحات ۳۱۲ کتابت طباعت اور کاغذ اعلیٰ، جلد دیدہ زیب۔
قیمت پچیس روپیہ۔ ناشر: رضی پبلیکیشن ردولی۔ بارہ بنکی۔

بارہ بنکی لکھنؤ سے ملا ہوا ایک ضلع ہے جس میں کئی مشہور قصبات مثلاً ردولی، دریاباد، دیوہ شریف، بڑاگاؤں، بدوسرائے، حیدر گڈھ، سبیحہ، جہانگیر آباد، زیدپور، رسولہ گاؤں، سترکھ، سہالی، صفدر گنج، فتحپور، گدیہ، کرسی، مسولی، بھٹوہیا جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے لیکر جنگ آزادی ہونے تک بارہ بنکی کے لوگوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اسی ضلع میں رفیع احمد قدوائی جیسا عالی دماغ سچا اور سرگرم رکن کانگریس پیدا ہوا۔ اسی ضلع نے مجاز جیسا شاعر، حکیم عبدالحبیب جیسا طبیب، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسا عالم اور ادیب اور چودھری محمد علی اور مجیب سہالوی جیسے طنز و مزاح نگار پیدا کئے۔ سرزمین بارہ بنکی کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس میں حضرت مخدوم عبدالحق جیسے صوفی اور شاہ وارث علی شاہ جیسے بزرگ مدفون ہیں۔

مؤلف کتاب ہذا ردولی کے مردم خیز محلے میں ایک تعلقدار خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلقداریاں ختم ہو گئیں۔ لیکن علی محمد زیدی صاحب نے اپنے حسن اخلاق سے اپنی وہی شان قائم رکھی جو تعلقداری کے دور میں تھی۔ لکھنا لکھانا آپ کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے موصوف نے سفرنامہ عراق، ایران اور دمشق مصباح الزائرین تین کتابیں تالیف فرمائیں۔ ان کے بعد العزا تالیف کی جو عزاداری کی انسائیکلوپیڈیا کہی جا سکتی ہے، پھر اپنی جنم بھومی ردولی پر اپنی یادیں، ردولی کی باتیں کے نام سے مرتب کی۔ یہ تینوں کتب ہاتھوں ہاتھ لی گئیں، اس لئے علی محمد زیدی صاحب نے "بارہ بنکی" کی تالیف کی جو اس ضلع کی ایک ایسی تاریخ ہے جس میں بارہ بنکی اور اس کے مشہور قصبات کا جغرافیہ بھی شامل ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں حیران رہ گیا کہ اتنا مواد چودھری صاحب نے کس طرح اکٹھا کر لیا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب نہایت دلچسپ ثابت ہوگی، اس لئے کہ مؤلف نے حتی الامکان بارہ بنکی کے تاریخی اور جغرافیائی حالات و کوائف کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ مصنف کے ذوق کے ساتھ ہی ساتھ تاریخی

مقامات کی تصاویر اور نقشہ بھی بارہ بنکی کے شامل ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ایک ایسی فہرست بھی ہوتی جس کی مدد سے مقامات اور شخصیات کے متعلق صفحات کے نمبر دیئے جاتے تاکہ ایک ہی نظر میں یہ معلوم ہو جاتا کہ بارہ بنکی میں کیا کیا تھا یا ہے۔ امید ہے دوسرے اڈیشن میں اس کا التزام کیا جائے گا۔ کتاب تنہا پر لوگ آیکت جسٹس رتضی حسین صاحب (رٹائرڈ) کا ایک پیش لفظ بھی شامل ہے جس نے کتاب کو اور دو قیمتی بنا دیا ہے۔

کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت پچیس روپیہ جو موجودہ گرانی کے اعتبار سے نہایت مناسب ہے۔ ملنے کا پتہ۔ عزمی پبلیکیشنز۔ ارشاد منزل رودولی۔ ضلع بارہ بنکی۔ (۲۲۵۴۱۱) کتاب نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ سے بھی مل سکتی ہے۔

"چراغ شہر جگر کے"۔ مجموعہ کلام شعرائے مرادآباد مرتبہ قمر قدیر ارم۔ سائز [illegible] صفحات ۲۰۸ کتابت و طباعت اوسط۔ جلد رنگین و دلکش قیمت ۳۵ روپیہ۔ مشہور غزل گو شاعر جناب جگر مرادآبادی سے ہر اردو داں واقف ہے۔ گو ان کے انتقال کو ۲۲ سال گذر گئے، لیکن جگر جیسے شاعر کبھی مرا نہیں کرتے، ان کا کلام انھیں زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔

ارم صاحبہ نے مرحوم جگر کی رعایت سے ہی اس مجموعہ کلام کا نام "چراغ شہر جگر کے" رکھا ہے اور کوشش کر کے اس میں مرادآباد کے تمام شعرا کے مختصر سوانح اور نمونہ کلام کو یکجا کر دیا ہے ساتھ ہی مرادآباد کے تاریخی و جغرافیائی حالات بھی بڑی تفصیل سے مرتب کر کے شامل کئے ہیں۔ بظاہر یہ مجموعہ کلام دوسرے شعرا کا ہے ارم صاحبہ نے اسے صرف ترتیب دیا ہے، لیکن یہ کام آسان نہیں۔ مؤلفہ کو نہ جانے تاریخ مرادآباد مرتب کرنے اور ان شعرا کا شجرہ اور کلام حاصل کرنے کیلئے کتنے پاپڑ بیلنا پڑے ہوں گے اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں، جنھوں نے کبھی اس طرح کا کام کیا ہو۔ بہرحال۔ ایک تاریخی اور ادبی حیثیت کی کتاب ہے اور امید ہے کہ عام شعری مجموعوں کی طرح اس کی ناقدری نہ ہوگی۔ ارم پبلیکیشنز قصر قمر۔ بارہ دری (دانگ) مرادآباد (۲۴۴۰۰۱) سے مل سکتی ہے۔ یہی ادارہ اس کتاب کا ناشر بھی ہے۔

مسعود رجہاں — گرد شیں ۱۵/- • ہم نشیں ۱۶/-
پیار کی خوشبو ۱۲/۵۰ • شہوار ۱۵/- • نئی صبح ۱۸/-

ہبیط جبریل (نعتیہ کلام کا مجموعہ از جناب مقصور لکھنوی) سائز [illegible] صفحات ۲۲۸۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ مجلد مع دیدہ زیب جلد گرد پوش۔ قیمت تیس روپیہ۔

جناب مقصور لکھنوی سے ہر وہ شخص واقف ہے جو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا ہے، مقصور صاحب کا تخلص واقعی بامعنی ہے اس لئے کہ ان کے اشعار واقعات کی تصویر بھی کھینچ دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے انھیں مشاعروں میں پڑھتے سنا ہے، انھیں یہ بھی علم ہوگا کہ ان کے پڑھنے کا انداز اور ان کی خوش گلوئی ان کے کلام پر گویا سونے پر سہاگہ ہوتی ہے۔

ہبیط جبریل مقصور صاحب کے صرف نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰ نعتیں ایک منقبت، کچھ رباعیات اور منظوم احادیث نبوی شامل ہیں۔ یہ ایسی رباعیاں اور احادیث ہیں جو صرف اسلامی معلومات سے ہی متعلق نہیں، سبق آموز بھی ہیں۔

مقصور صاحب کا کلام پڑھنے کے بعد یہ اندازہ کرنا دشوار نہ ہوگا کہ مقصور صاحب کا کلام صرف شاعرانہ ہی نہیں، ان کے والہانہ جذبۂ عقیدت رسول صلعم کا بھی آئینہ دار ہے۔ زائر حرم جناب حمید صدیقی مرحوم کے بعد میں مقصور صاحب کے کلام سے زیادہ کسی کے نعتیہ کلام سے متاثر نہیں ہوا۔ نمونتاً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

کفر کی تیرگی بے اثر ہو گئی — آپ تشریف لائے سحر ہو گئی

شاید حریم نور مقصور قریب ہے
اب ہر قدم پہ شوق کا سجدہ ہے اور ہم

مقصور مدینہ ہے وہ شمع روشن — کہ حسرت سے شمس و قمر دیکھتے ہیں

رباعی

آیا ہوا طوفان پلٹ جاتا ہے — زور آندھی کا گھٹا بھی ہو گھٹ جاتا ہے
اللہ سے مشکل میں دعا مانگ کے دیکھو — ہر کوہ گراں راہ سے ہٹ جاتا ہے

روایت ہے حسین ابن علی سے — کہ فرمایا شہ ہر دو سرا نے
سلوک ایسے کے بھی ساتھ اچھا کرو تم — جو سائل بن کر گھوڑے پر آئے

ہبیط جبریل عاشقان رسول صلعم کے لئے ایک تحفہ ہے۔ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ ملنے کا پتہ جناب مقصور لکھنوی ۱۹۸/۲/۵۰ عاطرالال خاں۔ امین آباد لکھنؤ۔ اور نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

بال عورت کے سر کے تاج

فرزانہ رفیق

بال جسم انسانی کی خوبصورتی اور سجاوٹ حسن میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یوں تو بال کم و بیش سارے جسم پر ہوتے ہیں۔ لیکن سر کے بال انسانی آرائش کا ایک اہم جز ہوتے ہیں۔

ذرا سوچیں تو سہی اگر ہمارے سر پر بال نہ ہوتے تو گنجی کھوپڑی سے ہماری شخصیت کا کیا اثر ہوتا ہے۔

حالانکہ ہم اپنی شخصیت کے نکھار اور خوبصورتی میں بالوں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ اور خاص طور پر مشرقی خواتین کا تو حسن ہی بالوں کو گردانا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے ہاں کی خواتین بالوں کی طرف سے اتنی لاپرواہ ہیں کہ وہ برش کرنے اور چوٹی باندھنے کے علاوہ اپنے بالوں کے لئے ذرا بھی وقت نہیں نکالتیں ہیں۔ اور اسی لاپرواہی کی وجہ سے وہ بالوں کے مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ پھر الٹی سیدھی ادویات اور نسخوں کے استعمال سے اپنے بالوں کے حسن سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔

یہاں میں بالوں کی مختلف قسموں اور ان کی حفاظت کے بارے میں مختصر لیکن جامع معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ خواتین اسی وقت اپنے بالوں کی اچھی طرح دیکھ بھال اور حفاظت کر سکتی ہیں۔ جب انہیں اپنے بالوں کی قسم اور بناوٹ کے بارے میں اچھی طرح معلومات ہوں بالوں کی حفاظت میں اہم ترین اور پہلا اسٹیپ بالوں کی صفائی ستھرائی ہے۔ بالوں کی بناوٹ اور قسم کوئی بھی ہو ان کو قائم اور دائم رکھنے اور پھلنے پھولنے میں صفائی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر آپ بالوں کی صفائی کے متعلق چند اصولوں کو اپنا لیں تو آپ کے بال زندگی بھر خوبصورت توانا اور دیرپا ثابت ہوں گے۔

۱۔ عام طور پر بالوں کو ہفتے میں ایک دفعہ اور چکنے بالوں کو ہفتے میں دو دفعہ معیاری اور موزوں شیمپو سے دھوئیں۔

۲۔ صبح شام بالوں میں باقاعدگی سے برش کریں۔

۳۔ ہفتے میں ایک دفعہ تیل سے بالوں میں اچھی طرح مساج کریں۔

۴۔ ہر مہینے بالوں کی نوکیں ترشوا لیا کریں۔

اگر تمام خواتین مندرجہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل کریں تو وہ اپنے بالوں کو مختلف امراض سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ بال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اور ان کی حفاظت کے طریقہ کار بھی مختلف ہوتے ہیں۔

۱۔ چکنے بال

۲۔ خشک بال

خشک بالوں کی حفاظت :۔

خشک بال دیکھنے میں روکھے پھیکے نظر آتے ہیں۔ جنہیں کوئی چمک نہیں ہوتی ہے۔ خشک بالوں میں خشکی بھی کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ جو کہ برش کرنے کے دوران سفید ذرّوں کی صورت میں نظر آتی ہے۔

خشک بال مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ہوتے ہیں۔

۱۔ بیماری

۲۔ بچے کی پیدائش۔

خشک بالوں کے لئے ہفتے میں دو دفعہ اچھی طرح تیل کا مساج کریں۔ اور ہلکے قسم کے شیمپو سے سر دھوئیں بالوں کو گرمی اور تیز دھوپ سے بچائیں۔ اگر تمام خواتین سنجیدگی سے بالوں کے لیے وقت نکال لیں اور اپنے بالوں کی اقسام کے لحاظ سے ان کی مناسب دیکھ بھال کریں۔ تو وہ اپنے بالوں کو مختلف امراض اور مسائل سے نجات دلا سکتی ہیں اور ان کے بال ہمیشہ خوش نما، خوبصورت اور صحت مند نظر آ سکتے ہیں۔ جن کو ہم نارمل بال کہتے ہیں۔

حریمی دسترخوان

کلیجی کے تکے

سامان۔ ۵۰۰ گرام کلیجی کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر کے اچھی طرح دھولیں' لہسن ایک آنٹھی۔ دہی ۱۰۰ گرام۔ ادرک ایک چھوٹی گانٹھ۔ سرخ مرچ حسب خواہش۔ کالی مرچ ۱۰ عدد۔ نمک حسب ضرورت۔ کچے پپیتے کا چھلکا ۵ گرام۔ گھی یا ڈالڈا جتنا صرف ہو۔

ترکیب:۔ تمام مسالوں کو جن کا اوپر ذکر ہوا ہے تھوڑا پانی ملا کر باریک باریک پیس کر رکھ لیں کلیجی کی بوٹیوں کو اسی مسالے میں لت پت کر کے لوہے کی پتلی سلاخ میں پرو دیں۔ بوٹیوں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ رکھیں۔ اگر سلاخیں رکھنے کا اڈہ ہو تو ٹھیک ہے۔ اسی میں سیخ یا سیخیں دکھا کر رکھیں۔ نیچے انگارے دہکا کر رکھدیں۔ سیخوں کو گھماتی رہیں اور بچارے سے گھی یا ڈالڈا ہلکا ہلکا لگاتی جائیں۔ مسالہ اگر بچ گیا ہو تو اسے بھی سینکتے وقت بوٹیوں پر کسی چمچے سے لگاتی جائیں۔

جب بوٹیاں اچھی طرح سک جائیں تو سیخ سے نکال کر گرم گرم کھائیں۔

اگر سیخیں رکھنے کا اڈا آپ کے پاس نہ ہو تو دو طرف دو اینٹیں رکھ کر ان کے درمیان انگارے رکھیں اور سیخ کو اینٹوں پر رکھ کر گھما گھما کر پکائیں۔

نمک اندازے سے ڈالا جاتا ہے۔ مسالہ پیسنے کے بعد چکھ کر دیکھ لیں۔ اندازہ ہو جائے گا۔

تلے آلوؤں کا سالن

آلو ڈال کر سالن ہر گھر میں تیار ہوتا رہتا ہے اس لئے مسالے اور پکانے کی ترکیب نہیں لکھ رہی ہوں۔ صرف آلوؤں کے تلنے کی ہی ترکیب بتاتی ہوں۔ تلے آلوؤں کا سالن بیحد لذیذ ہوتا ہے۔ بوٹیوں سے زیادہ کھانے والے آلوؤں کو نوش فرماتے ہیں۔

دیسی بڑے آلو ایک یا آدھا کلو لے کر چھیل ڈالیں' اور ان کے دو دو ٹکڑے کر کے کسی کانٹے سے گود کر۔ پانی میں ڈالدیں۔ تھوڑا نمک بھی ملا دیں۔ کچھ دیر آلوؤں کو پانی میں رہنے دیں۔ اس کے بعد نکال کر کسی سینی یا ٹرے میں رکھدیں کہ پانی ان کا خشک ہو جائے۔ اس کے بعد اگر آلو ایک کلو ہوں تو آدھا کلو ڈالڈا پتیلی میں ڈال کر اس میں آلوؤں کو اس طرح تلیں کہ آنچ ہلکی ہو اور اتنی دیر تک تلیں کہ آلو سرخ ہو جائیں۔

اس کے بعد نکال کر کسی برتن میں رکھدیں تاکہ جتنا گھی آلو جذب کر چکے ہوں نکل جائے۔ اس کے بعد عام ترکیب سے سالن پکائیں۔ ایک کلو آلو کم سے کم ۵۰۰ گرام یا ۷۵۰ گرام گوشت میں ڈالیں۔

مسالے دار مرچیں

ہری مرچیں ایک پتلی ہوتی ہیں ایک کانی موٹی۔ موٹی مرچیں کڑوی کم ہوتی ہیں۔ انھیں لے کر ایک طرف سے انھیں شگاف دیں۔ پسی ہوئی کھٹائی پسا ہوا دھنیا اور پسا ہوا سفید زیرہ ہم وزن اور نمک برائے نام ملا کر مرچوں میں بھریں اور باریک تاگے سے باندھ کر کڑوے تیل میں تل کر دال کے ساتھ نوش فرمائیں۔ بیحد لذیذ ہوتی ہیں۔

مرسلہ:۔ فیروزی تسیم اشرفی (لکھنؤ)

لطیفے

• کہتے ہیں یورپ میں ایک زمانہ وہ تھا جب اخبارات میں ضرورت رشتہ کے اشتہارات دینے کا رواج عام نہیں تھا۔ اس سنہری دور میں ایک صاحب نے اشتہار دیا۔ ضرورت ہے ایک بیوی کی اور جواب میں ان کو دوسو سے زیادہ خطوط ملے ان میں زیادہ تر خطوط ایسے لوگوں کے تھے جنھوں نے لکھا تھا تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری بیوی حاصل کرسکتے ہو اور وہ بھی بالکل مفت۔

• شادی شدہ شخص کو ہمیشہ یہ تجسس رہتا ہے کہ کنوارے اپنی آمدنی کا کیا کرتے ہیں۔

• مہمان خاتون نے پوچھا۔ تم نے ماہر آثار قدیمہ سے شادی کیوں کی۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ ہر وقت پرائے سامان ہی کی دیکھ بھال میں لگا رہتا ہے۔

میزبان خاتون نے کہا حقیقت یہ ہے کہ ماہر آثار قدیمہ ایک آئیڈیل شوہر ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ بیوی جتنی پرانی ہوتی ہے اس کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

• شوہر نے کہا بیگم میں چاہتا ہوں کہ یہ کھڑکی بند کرادوں اس لئے کہ پڑوسن ہماری باتیں سن لیتی ہے۔

بیوی نے کہا خدا کے لئے ایسا نہ کرنا ورنہ میں ان کی باتیں کیسے سن سکوں گی۔

• محبت میں شرافت اس وقت بہت مہنگی پڑتی ہے جب نتیجہ شادی قرار پائے۔

• ایک لڑکی نے کہا شادی سے پہلے ہر لڑکی کی زندگی نامکمل رہتی ہے۔ دوسری شادی شدہ لڑکی نے کہا "اور شادی کے بعد تو بالکل ہی ختم ہوجاتی ہے۔

• ایک مجرم نے اپنی ساس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ گواہوں کے بیانات سے یہ بات ثابت بھی ہوگئی۔ پھر بھی جج نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ مجرم ثابت ہے "اس کے باوجود میں تم پر صرف پچاس روپیہ جرمانہ کرکے چھوڑ رہا ہوں تاکہ تمہیں ایک موقع اور مل سکے۔

"آپ کے لیے چند مقبول ترین ناولیں"

صباحت	مشرف تمیز	۲۸/-
چشمہ	اے آر خاتون	۳۶/-
نیلوفر	شاہدہ بانو بلگرامی	۱۲/-
آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	۲۵/-
کنوارا دامن	نکہت شاجاپوری	۱۳/۵۰
سیپ (دو حصے)	ملقیس کنول	۶۰/-
اور تھا بے تاب	زہرہ رضویہ	۲۵/-
کنول	نادرہ خاتون	۲۰/-
دل آویز	نگار زریں	۳۰/-
آنگن	خدیجہ مستور	۳۰/-
فانوس	بدر انجم خاتون	۳۵/-
بہار آنے تک	نسیمہ منظر	۲۰/-
آہ	شہلا نرگس	۲۵/-
اندھی راہیں	تنویر زہرہ بخاری	۲۵/-
راضیہ	فریدہ جبیں	۲۲/-
بھنور اور ساحل	ماہ منیر عروج	۱۵/-
گردش دوراں	بیگم رفیعہ سلیم	۲۵/-
بھیگے ہوئے رخسار	ناظمہ طالب	۴۵/-
تمہارے لئے	عطیہ پروین	۳۰/-
صبرین	ایم سلطانہ فخر	۳۰/-
عائشہ	فرخندہ لگار	۲۵/-
شاید کہ بہار آئی	شمع قاضی	۱۵/-
نوبہار	زہرہ جبیں	۱۵/
پونم کا چاند	فرحت جبیں	۲۰/=
ببول کے سائے	ہاجرہ نازلی	۱۵/-
گلبن	بشریٰ رحمٰن	۴۵/=

دیبا خانم انتظار کا موسم ۔/۱۵ • رت جگا ۲۰/۰

آنکھ مچولی ۔/۲۰ • آخری وعدہ ۲۰/-

رضیہ فرحت رفاقت یہ ذرا سی ۲۵/۰ • رشتے ہیں پیار کے ۲۰/-

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریداروں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں اور پاکیزہ ہو نیز ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کیا گیا ہو۔ جس ماہ میں شعر شائع ہونے والا ہو اس سے پہلے ماہ کی ۔ ہر تاریخ تک ملنے والے اشعار ہی شائع ہوتے ہیں، جنوری کے لئے عنوان ہے "شوق" اور فروری کے لئے "محفل" یا "محفلوں"۔

کرتے رہے خطائیں، ندامت کے بعد بھی
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

مرسلہ:۔ پروین نذر (مدراس)

مرے احباب میرا حال کہہ دیتے ہیں کیوں جاکر
میں ان سے مل کے ہوتا ہوں خجل انکی ندامت پر

مرسلہ:۔ قرۃ العین (نندیال)

مری آنکھوں سے بہہ نکلے تھے جو آنسو ندامت میں
وہی بخشش کے موتی بن گئے دریائے رحمت میں

مرسلہ:۔ کا۔ کا۔ وحیدہ ناز (عمر آباد)

زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلئ ندامت ہے

مرسلہ:۔ کے سمیعہ (آمبور)

مرسلہ:۔ شمو نہ روحی (حیدر آباد)

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو، جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

مرسلہ:۔ جہاں آرا (گاڑ گنیشوری)

ہزاروں اشک قرباں اس کے افسردہ تبسم پر
چھپالی مسکرا کے جس نے شدت دردِ پنہاں کی

مرسلہ:۔ ثمینہ شاہین۔ (الہ آباد)

درد اٹھتا ہے اشک بہتے ہیں۔ یوں محبت مجھے عطا کی ہے
تجھ سے شکوہ تو کچھ نہیں لیکن، اے خدا میں نے کیا خطا کی ہے

مرسلہ:۔ سہیلہ بانو (ماسن)

شادی کا گیت

مرسلہ:۔ رخشندہ نسرین (گیا)

لاری مالن تو سہرا گلاب کا
میرے نوشہ کا بن ہے شباب کا
لاری مالن تو سہرا گلاب کا

جھوم کر سر پہ سہرے کی لڑیاں
مل کے آپس میں کہتی ہیں کلیاں
نیگ لینے کو سر پہ ہیں بہنیں کھڑی

آج دن ہے بڑے حساب کا
لاری مالن تو سہرا گلاب کا

ماسے چچا و ماموں ممانی بھی
دے رہے ہیں دعائیں تجھیں سبھی

ہوئے تیرا تخلص نواب کا
لاری مالن تو سہرا گلاب کا

آج دلہن کے آنے کا دن ہے
آج خوشیاں منانے کا دن ہے
ساس سسر نے دیکھا تو ہنس کر کہا

رُخ اٹھاؤ دلہن کے نقاب کا
لاری مالن تو سہرا گلاب کا
میرے نوشہ کا بن ہے شباب کا

بزم حریم

اِس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ چھپ سکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھ کر پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ جو خبریں ۲۰ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔

ولادت اطفال کی خبریں

• مومنہ مختار (میسور) میری تایا زاد بہن مشہود انہ بانو شاہین اور ماما میر رضا علی (چکمنگلور) کو اللہ پاک نے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ء بروز ہفتہ ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام مشہود علی قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

• فریدہ واحد (ٹمکور) میرے سب سے چھوٹے بھائی سید شفیع احمد اسسٹنٹ انجنیئر میسور اور بھابی شاہین بیگم کو اللہ پاک نے یکم جولائی ۱۹۷۳ء بروز اتوار ایک دختر عنایت فرمائی۔ نام شیبا رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ عمر خضر پائے اور صاحب نصیب ہو۔

• مشہور ناول نویس بہن نوشابہ سعید ناز صاحبہ کریم نگر سے تحریر فرماتی ہیں کہ ان کی بیٹی عائشہ سلمہا اور داماد خالد سلمہ کو اللہ پاک نے ۴ جون ۱۹۷۳ء کو بمقام کراچی پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی۔ نام سلمٰی خالد قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے عمر خضر عطا فرمائے اور بلند اقبال کرے۔

• نگار سلطانہ جلیلی (آمبور) میری پیاری آپا رضیہ سلطانہ اور بہنوئی سعد اللہ ہاشا (بر نام بٹ) کو اللہ تعالیٰ نے ۵ ستمبر ۱۹۷۳ء کی صبح ایک دختر عطا فرمائی۔ نام سعدیہ بتول عرف شکیبہ حرمین قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ شکیبہ حرمین عکس فاطمہؓ بنے۔

• اے۔ آر۔ اشرف النساء (ترچی وناپلی) میرے چھوٹے بھائی محمد عطاء الرحیم حمدانی اور بھاوج صغرا جبیں سلمہا کو اللہ پاک نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء بروز جمعہ بوقت شب نو بجکر پینتیس منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام سید ارشد رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اپنے بزرگوں کے سائے میں پھولے پھلے اور دین و دنیا میں سرخرو ہو۔

• سز اجرہ بانی (کونور) میری نواسی (مسز لبنیٰ شوکت) کو اللہ پاک نے ۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ نام مہناز رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

• نزہت علیم (کھوپالی) میری بہن نصرت علیم اور بہنوئی محمد سلمان کو اللہ پاک نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء بروز بدھ ۱۱ بجے شب میں پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد فرحان رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

• تصیرہ تبسم (آمبور) میری خالہ شاکرہ بیگم اور خالو شفیع اللہ کو اللہ پاک نے ۲۴ اگست ۱۹۷۳ء بروز جمعہ بوقت صبح ۸ بجے ایک دختر عطا فرمائی۔ نام عائشہ تمکین رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

پیغامات نشاط

• سائرہ بانو (کانپور) میری بہن شاہینہ بیگم (بنت نور الہدیٰ صاحب کانپور) کی شادی ہمراہ نوشاد عالم لاری سلمہ (پسر جناب نذیر الحق لاری) ۵ اکتوبر ۱۹۷۳ء بروز دوشنبہ بوقت ۷ بجے شام بخیر و خوبی انجام پائی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار گزرے۔

• یونس علی صاحب کی صاحبزادی اور مشہور طنز و مزاح نگار وجاہت علی سندیلوی کی نواسی اسما سلمہا کا عقد نکاح سید عارف شاہ سلمہ (فرزند سید امیر علی شاہ صاحب مرحوم حیدر آباد) کے ہمراہ ۱۲ نومبر ۱۹۷۳ء کی شام کو رحیم آباد ہاؤس لکھنؤ میں بخیر و خوبی عمل میں آیا، تقریب میں یونس علی صاحب کے اعزہ و اقربا اور معززین شہر کے ساتھ ہی بھوپال کی مشہور شخصیت جناب اسرار مسعود صاحب نے بھی شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• حاجی عبد الرحیم صاحب کی صاحبزادی اور حاجی امیر الدین صاحب کی پوتی روشن آرا سلمہا کی شادی محمد امین سلمہ (فرزند جناب

محمد نعیم مرحوم (رئیس چکردھر پور) کے ہمراہ ۱۸ر نومبر ۱۹۸۳ء کو کوئنس لین کلکتہ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• جلیس الرحمٰن صاحب (اینچولی۔ ضلع میرٹھ) کے فرزند فضا الرحمٰن، رضا الرحمٰن اور صاحبزادی اسما خاتون سلمہا کی شادیاں بالترتیب شاہین سلمہا (دختر انوار حسین صاحب) حور بانو (بنت نصیر الدین صاحب) اور خالد حسین صاحب (فرزند انوار حسین صاحب) کے ہمراہ بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اسما سلمہا کی رخصتی ۹ر نومبر کو ہوئی اور صاحبزادگان کے نکاح ۱۰ر نومبر کو ہوئے۔ اور ۱۱ر نومبر کو دعوت ولیمہ دی گئی۔

• رضیہ خاتون (بنگلور) میری دختر، اختر سلطانہ سلمہا کی شادی، عبد المجید خاں عرف مجمل سلمہ (فرزند جناب محبوب خاں صاحب) کے ہمراہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۳ء بروز اتوار بوقت صبح ۱۱ بجے بمقام فیروز شادی محل، چک بنگلور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• مرحوم جبار حسین صاحب کی صاحبزادی نصرت جبار سلمہا کی شادی آفتاب عالم خاں سلمہ (فرزند اشفاق عالم خاں صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو کاشانۂ ریاض، حبیب گنج بھاگلپور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• رقیہ شاہین (ویشالی) میری خالہ زاد بہن راشدہ عینی عرف ڈالی دختر شاہ قرۃ العین صاحب۔ پھلواری شریف پٹنہ) کی شادی علیم الدین سلمہ (موضع ڈھاب، ضلع شیرگھاٹی) کے ہمراہ ۲۹ر اپریل ۱۹۸۳ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری باجی اور دولہا بھائی ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• عزیز الحسن صاحب کے فرزند سہیل عزیز سلمہ کی شادی نجم السحر عرف نجمی سلمہا (دختر محمد رزاق صاحب۔ غازی روڈ گورکھپور) کے ہمراہ ۱۱ر نومبر ۱۹۸۳ء بروز اتوار بوقت ۶ بجے شام عزیز الحسن صاحب کی رہائش گاہ، شاہ معروف گورکھپور میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• انوار احمد صاحب (کانپور) کے فرزند ریاض احمد سلمہ کی شادی نسرین سلمہا (بنت جناب مصطفےٰ حسین صاحب لکھنؤ) کے ہمراہ عمل میں آئی۔ اس سلسلے میں ۱۳ر نومبر کو دلہن انھیں دعوت ولیمہ دی گئی۔ جس میں معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• جناب احمد دین صاحب مرحوم کے فرزند دلبند شکیل احمد سلمہ کی شادی ہمراہ قرۃ العین مسرت جہاں سلمہا (بنت فرمان الٰہی صاحب) بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں بیگم حاجی احمد دین صاحبہ نے اپنے اعزہ اقربا اور معززین شہر کو برلنگٹن ہوٹل لکھنؤ میں ۶ر نومبر کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پرملال کی خبریں

• میرے دیرینہ کرمفرما، مشہور ادویات ساز بخشی [illegible] کے روح رواں اور مدیر بخشیات کلکتہ جناب یوسف صاحب [illegible] ہمشیرہ یعنی مشہور ادیب جناب م۔ نسیم لکھنوی کی اہلیہ طاہرہ صاحبہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۳ء کو امریکہ کے شہر ہوسٹن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پرستار شوہر، جان چھڑکنے والے بھائی اور تمام اعزہ اقربا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئیں۔ مرحومہ ۲۷ر اپریل ۱۹۸۳ء کو ایک کار حادثہ میں زخمی ہوکر بیہوش ہوگئی تھیں اور یہ بیہوشی امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے ڈاکٹروں کی اجتماعی کوششوں کے باوجود ہوش میں بدل نہ سکی اور اسی عالم بیہوشی میں یہ پاکباز شوہر پرست نیک بی بی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور یوسف صاحب و نسیم صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے جو طاہرہ صاحبہ کی جدائی سے حد درجہ متاثر و مغموم ہیں۔ بھائی اپنی چہیتی بہن کا آخری دیدار نہ کرسکے اور شوہر ۵ ماہ تک اس امید میں اپنی جان سے زیادہ عزیز شریک حیات کو دیکھتے رہے کہ کب ان کے لب ہلیں اور کب وہ ان کی شیریں آواز سن سکیں۔ لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، اِنّا للّٰہ واِنّا الیہ راجعون۔ (شریک غم نسیم انہونوی)

• میرے مخلص دوست اور کرم فرما جناب توحید الحق صاحب پوسٹ ماسٹر ملیح آباد پوسٹ آفس۔ لکھنؤ کی ہمشیرہ محترمہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو بھوپال میں انتقال فرماگئیں۔ مرحومہ نہایت نیک پارسا اور عبادت گزار بی بی تھیں۔ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (نسیم انہونوی)

• نسیم بانو (گنٹور) ہمارے خالو حاجی محمد ریاض الدین انصاری صاحب ۱۲ جولائی ۱۹۸۴ء کو صبح بمقام ایلورا انتقال فرماگئے۔ مرحوم بڑے مخلص، سب سے محبت کرنے والے اور عبادت گزار تھے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• پی عقیلہ انجم (پرنام بٹ) میرے ماما عبداللہ پاشا صاحب ۱۸ ستمبر ۱۹۸۴ء بروز ہفتہ بوقت صبح ۷ بجے بمقام مدراس ایک مختصر علالت کے بعد انتقال فرماگئے۔ مرحوم نیک دل، خوش خلق اور ہر دلعزیز تھے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ادبی دنیا میں راجندر سنگھ بیدی اور فیض احمد فیض کے انتقال کی خبریں پڑھکر اردو دوستوں کو بہت زیادہ افسوس ہوا۔ نومبر ۱۹۸۴ء ہی میں یہ دونوں مشہور شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔ راجندر سنگھ بیدی ایک صاحب طرز افسانہ نگار تھے اور فیض احمد فیض عالمی شہرت رکھنے والے شاعر تھے۔

• رحمت النساء صاحبہ (گاندھی نگر میسور) کے والد جناب سید عبدالبشیر صاحب ۵ مارچ ۱۹۸۴ء بروز دوشنبہ بلڈ پریشر کی زیادتی کے باعث دماغ کی رگ پھوٹ جانے سے رحلت فرماگئے۔ اللہ مغفرت کرے مرحوم بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ہم پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی سہ پہر کو ۴½ بجے لکھنؤ کی مشہور اور ہر دل عزیز شخصیت جناب ابوالقاسم کا حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ ابوالقاسم صاحب مرحوم حاجی مصطفٰے خاں صاحب کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ کے فرزند تھے۔ بیحد ملنسار اور رنجامرنج قسم کے انسان تھے۔ اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• حریم کی کاپی پریس جاچکی تھی کہ انگلینڈ سے بہن فاطمہ ملک کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کے شوہر ملک عزیز احمد صاحب جو عرصہ سے بیمار تھے ۱۲ نومبر ۱۹۸۴ء بروز دوشنبہ بوقت ۴½ بجے صبح انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہن فاطمہ ملک ان حریمی بہنوں میں سے ہیں جو مجھے ہمیشہ سے سگی بہن جیسا پیار دیتی رہی ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ ملک عزیز احمد صاحب کے ساتھ لکھنؤ آئی تھیں اور میری بہن مہمان رہی تھیں۔ ملک صاحب بڑے نیک، پارسا اور سادہ لوح انسان تھے۔ ان کی سادگی لباس وغیرہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ انگلینڈ میں رہنے والا ایک انسان ایسی زندگی کیسے گزارتا ہے۔

بہن فاطمہ ملک کا سہاگ لٹ گیا، وہ بیوہ ہوگئیں، اس لئے ایک بھائی کی حیثیت سے مجھے جو صدمہ پہنچا ہے، اسے میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ملک صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (شریک غم نسیم انہونوی)

• روبینہ لاری (گورکھپور) افسوس میرے نانا محترم مشتاق احمد لاری ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء کو ۱۱ بجے شب میں حرکت قلب بند ہوجانے سے اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔ مرحوم بڑے غریب نواز، خلیق اور ملنسار تھے۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بحضور سرور کونین

حکیم افتخار فخر

ساقیِ کوثر ہادیِ عالم، صلی اللہ علیہ وسلم
مونسِ انساں، محسن اعظم، صلی اللہ علیہ وسلم

جانِ رسالت اوجِ نبوت آپ کا رتبہ آپ کی عظمت
بعد خدا ہے سب سے مکرم، صلی اللہ علیہ وسلم

روزِ ازل سے روزِ ابد تک آپ ہی اول آپ ہی آخر
آپ مؤخر آپ مقدم، صلی اللہ علیہ وسلم

شام و سحر ہے سب کی زباں پر ساقیِ کوثر ساقیِ کوثر
صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم

کون و مکاں کے سناٹے میں ایک ہی نعرہ گونج رہا ہے
ارض و سما کے لب پر ہر دم صلی اللہ علیہ وسلم

ناؤ بھنور میں دور کنارہ آپ کی رحمت کا ہے سہارا
آپ ہیں میرے مشفق و ہمدم، صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کا ثانی کوئی نہیں تھا آپ کا ثانی کوئی نہیں ہے
آپ حبیب ربِّ دو عالم، صلی اللہ علیہ وسلم

شاید سکتے ہو بھیا تو میرے ذہن سے وہ تصویر مٹا دو۔!" ماریہ نے آہ بھر کر
کہا اور سر پیچھے پیڑ سے ٹیک دیا۔!

اتنے میں نوشابہ، اماں اور وجاہت بھی کمروں سے نکل آئے۔! باتوں
کی آوازیں سن کر آئے تھے۔!

اے بیٹی۔ تم میرے پاس سے کب اٹھ کر آ گئیں؟" اماں بی حیرت
سے اسے دیکھنے لگیں۔

ماریہ؟ حد کرتی ہو" نوشابہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔" اٹھو
اندر چلو۔ اللہ توبہ۔ تم برف ہو رہی ہو۔ ارے۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھے
جگا لیا ہوتا۔ سب بیٹھ کے باتیں کرتے۔ تمہیں بیت بازی پسند ہے۔ کم سے کم
اشعار ہی سنا دیتے! آؤ چلو۔!"

نوشابہ۔!" ماریہ نے گلوگیر آواز میں پکارا۔

بولو۔ بہن بولو۔! کیا بات ہے" نوشابہ نے اسے چمکارا۔

دل گھبرا رہا ہے۔!

اچھا آج ہم سب میوزیم دیکھنے چلیں گے۔!

نہیں۔

پھر جہاں تم کہو۔

کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں زندگی ملتی ہو۔! زندگی کی خوشبو جس سے دماغ
میں ایسی ہوتی ہو نا کہ مہک سرا کے لیے فنا ہو جائے۔! میں سب کچھ بھول
جاؤں۔ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے نوشابہ۔!"

ارے لو۔ بچے بھی جاگ اٹھے۔! اماں بولیں۔

دونوں بچوں کو دیکھ کر ایک کرب سا ماریہ کے چہرے پر چھا گیا۔ [illegible]

(باقی آئندہ)

چھٹی قسط

ہاں!

کیا نام لیا تھا آپ نے؟

میں نے تم کو مخاطب کیا تھا!

کیا نام ہے میرا۔

تم بتاؤ! میں کیا جانوں۔؟

آپ بتائیے۔ یہ کون ہیں" ماریہ نے ماں کی طرف اشارہ کر کے الجھنے کے انداز
میں اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا" ان کی صورت مجھے کسی کی یاد دلا رہی ہے۔ میں
نے انہیں کہاں دیکھا تھا؟ کہاں دیکھا تھا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ انہیں کیا ہوا ہے۔!
کیا سو رہی ہیں یہ بے چاری۔ ان کے آل اولاد نہیں ہے کیا۔؟"

بہکی بہکی باتیں مت کرو۔ ماریہ ہوش میں آؤ" بڑی چچی نے کہا" یہ تمہاری
امی ہیں۔ تمہاری بھابی اور بھتیجی کے مرنے کا صدمہ نہ سہ سکیں۔ مر گئیں۔ یہ تمہاری ماں
کی لاش ہے۔ غور سے دیکھو۔ پہچانو۔ ذہن پر زور دو۔ تم ہی تو اولادوں میں ان کی کتنا
چاہتی تھیں یہ تمہیں۔ تمہارے پھانس بھی لگتی تھی تو تمہاری امی تڑپ اٹھتی تھیں۔ آج
ان کی لاش تمہارے سامنے ہے۔ مگر تم بڑی سنگدل ہو کہ اپنی ماں کے لیے تمہارے پاس
آنسو بھی نہیں۔ رو لو۔ جی بھر کے ماریہ رو لو۔ تمہاری امی جا رہی ہیں۔ تھوڑی
دیر میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو جائیں گی۔ تم ان کی صورت کو ترسو گی۔ ہاں ہاں۔
کوشش کرو کہ تمہیں سب کچھ یاد آ جائے۔ تم رو سکو۔ جی بھر کے رو کر تمہارے دماغ
پر چھایا ہوا غم کا کہرا چھٹ جائے۔ رحم کرو ماریہ۔ خود پر رحم کرو۔!

منہ کھولے دم بخود ماریہ ان کی باتیں سنتی رہی۔ اسے نہ تو کچھ یاد ہی آیا نہ رونا
آیا۔ اس نے چادر کا کونہ اماں کے چہرے پر پھر ڈال دیا اور ہنستی ہوئی بولی۔
کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ اللہ نہ کرے کہ میری امی مریں۔

وہ سنیں گی تو کتنا بُرا مانیں گی۔ میں خواہ مخواہ کیوں رد دُوں۔ میرے دشمن روئیں
یہ سچ ہے مجھے تو آپ کی باتوں پر بڑی ہنسی آ رہی ہے: یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے۔ جس میں اگر جاں نثاری کی شان ہے تو آمادۂ
انتقام ہو جانے پر کبھی کبھی جلاد بھی بن جاتی ہے۔ محبت کے بارے میں
مشہور ہے کہ اندھی ہوتی ہے۔ اور اندھے کے ہاتھ اگر کوئی مہلک ہتھیار آ جائے اسے
پرواہ نہ کی جائے کہ بے دھڑک اس کا استعمال کیا جائے تو پھر اندھا پرکھ پرکھ اندھا دھند
مہلک ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ اسے یہ دیکھنے کو ملتا ہی کب ہے کہ جس کی گردنیں
کٹ رہی ہیں وہ دوست ہیں کہ دشمن۔

رضوانہ ایک جذبات پرست، حساس اور زود رنج لڑکی تھی۔ کچھ دن پہلے تک
وہ اپنی ناتمام محبت کا ماتم کر رہی تھی۔ پھر جب سنبھلی تو اسے منفی احساسات پریشان
کرنے لگے!۔

یوں بھی اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی! کوئی اسکے محسوسات و خیالات کا رازدار نہ
تھا!۔ تنہا پسند بھی تھی۔ کوئی معمولی سا جذبہ بھی اسے بڑی شدت سے دیر تک
پریشان و سرگرداں رکھتا تھا۔! وہ اپنے پرنسپل کی محبت میں پرکھ پرکھ مخلص تھی۔
ان کے نام پر اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ کہیں ان کا تذکرہ ہوتا تو محبت و دلچسپی
سے کان دے کر سنتی!۔ ان کی دید کی پیاسی، ان کے قرب کی متلاشی ان سے گفتگو
کی مشتاق وہ روز بروز دیوانی بنتی چلی گئی۔ اگر دو پیش سے بے خبر ایک ایسے جہان
میں بس گئی تھی جہاں وہ تھی اور اس کے حسین محبوب، پسندیدہ شاعر، شباہت!!

جنوری کی ٹھنڈی دھوپ کپکپاتی ہوئی بلند و بالا دیواروں پر رینگ رہی
تھی۔ فضا میں منجمد کہرا آہستہ آہستہ بھاپ بن کر تحلیل ہو رہا تھا۔ رات کی شبنم
زمین میں جذب ہو رہی تھی!۔ دن کے نمودار ہوتے زندگی کی چہل پہل معمول
کے مطابق انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی!۔
مسہری سے واپسی پر شمعون نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور چھوٹا سا کپکپا ڈنڈ
مجبور کر کے اوپر آئے!۔ سردی تیز تھی انھوں نے مفلر سے کان لپیٹ لیے تھے اور لمبی
آستینوں والا گرم کارڈیگن پہن رکھا تھا!۔
صحن میں سردی کا احساس اور شدت سے ہوا۔ جامن کا گھنا پیڑ ہوا سے
جھوم رہا تھا!۔ اندر آتے ہی شمعون کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا!۔ کہرآلود صحن میں
انھوں نے دیکھا کہ جامن کے پیڑ تلے زمین پر ماریہ بیٹھی تھی!۔ موسم کی بلاخیزی
سے یکسر لاپرواہ۔ اس نے سر اٹھا کر شمعون کو دیکھا اور نم زمین پر لکیریں کھینچنے
لگی۔ شمعون نے آگے بڑھ کر دیکھا اور یک لخت سردی کی ایک لہر ان کے بدن سے
ہو کر نکل گئی۔ نم زمین پر ماریہ جنازے اور گہوارے کی تصویر بنا رہی تھیں
ماریہ بہن۔ آپ اندر چلیے۔! شمعون نے کہا: آپ نے کوئی گرم کپڑا نہیں
پہنا۔ سردی لگ کے آپ کو زکام ہو جائے گا!۔ اٹھیے۔ میرے ساتھ چلیے۔"
اندر میرا کیا کام ہے۔؟" ماریہ نے کہا اور گہوارے کی لکیروں کو گہرا کر کے
واضح کرنے لگی!۔
شمعون نے اچانک لکیریں مٹا کے زمین برابر کر دی!۔

وہ سمجھتی تھی کہ درد دل پہلے چاہنے والے کو تڑپاتا ہے۔ پھر محبوب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو وہ معاملہ تھا کہ جیسے پتھر پر کوئی برف رکھ دے کہ آگ ڈال دے۔ پتھر پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی والہانہ پرستش اپنی جگہ دیوانگی کی سرحدوں کو چھونے لگی۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گرنے لگی۔ اس نے اپنے خوبصورت خیالات کی شکست و ریخت کا دردناک سانحہ بھی سہہ لیا۔ اپنی تذلیل بھی گوارہ کر لی۔ اپنے آنسوؤں کو ناکام ہوتے دیکھا اور جس سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اسے وہ نہ پگھلا سکی۔ بلکہ خود سے متنفر اور بیزار دیکھا!۔

تب۔ اس کی محبت نے ایک اور کروٹ لی۔ اب وہ شاہت سے کوئی ایسا انتقام لینا چاہتی تھی۔ جوان کی ساری شہرت، ہر دلعزیزی اور مقبولیت پر پانی پھیر دے۔ انھیں بدنام کرنے کی ترکیبیں سوچا کرتی!۔ جب وہ اس قدر برگشتہ ہیں کہ اس کی شکل تک دیکھنا پسند نہیں کرتے تو وہ بھی انھیں اس قابل نہ رکھے گی وہ کسی کو اپنی شکل دکھا سکیں!۔

اگر آج بھی شاہت صرف ایک مرتبہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھ لیتے تو وہ الٹے قدموں پر آ رہتی!۔

مگر ان کی پر نفرت اور بیزار نظروں نے رضوانہ کے دل پر ناکامی کی برف تو گرا ہی دی تھی۔ اسے ذلیل بھی بے حد کیا۔

پھر بھی وہ ناامید نہیں ہوئی تھی۔ شاید پتھر سے تراشا ہوا دل کبھی گداز بھی ہو جائے! بارش کے مسلسل قطرے پتھر بھی پگھلا دیتے ہیں۔ کیا آدمی کا دل پتھر سے بھی بدتر ہے!۔

کتابوں کی واپسی کے حادثے نے رضوانہ کو جنگلی طور پر بیمار کر کے قریب المرگ کر دیا تھا! پھر یہ سوچ کر دل پر اثر دے لوٹ گئے کہ اس کی دوست اسی گھر کی

وہ، الیاس بھائی! اور ان کے بچے سب خوشی باجی کی سسرال ہی میں تو ہیں ان کی شریکچڑی سن کر عجیب حال ہوا۔

سنا میں نے بھی تھا۔ ابا جان کچھ کہہ رہے تھے کہ الیاس صاحب کے گھر سے تین دن میں تین جنازے نکلے!۔

خدا ان کے حال پر رحم کرے۔!

اب تم جانا تو دیکھنا آپا۔ مار بے چاری پہچانی نہیں جاتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے حواسوں میں نہ ہو۔ مجھے تو بڑی عبرت ہوئی!۔ خدا کبھی کو ایسی تکلیف نہ دے جو برداشت سے باہر ہو!۔

کل اتوار ہے" رضوانہ نے شوخی سے کہا " اس فردوس میں جاؤں گی اپنا مقام تلاش کرنے کے لیے۔!"

عمرانہ اسے اپنے حالوں سمجھ چھوڑ کر ماں باپ کے پاس جا بیٹھی۔ ان دنوں سعید صاحب تک ایک صاحبزادے کا پیغام پہونچا تھا۔ مقامی آلیون فیکٹری میں اسسٹنٹ منیجر کے پوسٹ پر تھے۔ کنبہ مختصر سا تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا دو بہنیں اپنے گھر کی تھیں۔ دو چھوٹے بھائی زیر تعلیم تھے۔ باپ ضعیف تھے گرہستی سنبھالنے کے لیے کسی عورت کا وجود ضروری تھا!۔ بڑے میاں سعید صاحب پر زور دے رہے تھے کہ جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو کر انھیں بھی ہر فکر و پریشانی سے آزاد کر دیں۔ سعید صاحب نے اپنے ایک معتبر آدمی کو صاحبزادے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دوڑا رکھا تھا۔!

رضوانہ نے برا سا منہ بنا کر سوچا تھا۔ اسے شادی کہاں کرنی ہے۔

بہو بن کر چلی گئی۔ تیسرا شاک اسے یہ لگا کہ پتہ چلا آج کل وہ سیٹھ الیاس کے گھر کے چکر لگا رہے تھے! کسی تقریب میں اس نے الیاس سیٹھ کی بہن ماریہ کو دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس کی قبول صورتی کی تعریف کرتے ہوئے رشک و حسد بھی محسوس کیا تھا۔ ماریہ جو شباہت کی شاگرد تھی جس کے نصیب میں ان کی دید کی نعمت لکھی تھی!۔

اور اب رضوانہ ان سب کی دشمن بن گئی تھی جو کسی نہ کسی طرح شباہت سے وابستہ تھے۔!

نوشابہ سے خار کھاتی تھی۔

ماریہ سے بیزار تھی۔

ان تمام لوگوں سے متنفر تھی جو شباہت سے قریب تھے!۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آخر چاہتی کیا تھی۔؟ بس۔ اپنے جذبوں کی ناکامی کے صدمہ میں موم کی طرح پگھل رہی تھی۔!

بہت سوچ سمجھ کے اس نے ایک خط نوشابہ کو لکھا تھا۔ اور واقعی ایک بار پھر اس پر پچھلے جذبوں نے یلغار کر دی تھی اور اس نے دل و جگر کاغذ پر نکال کر رکھ دیے تھے!۔

نوشابہ کا خط کا جواب نہیں دیا۔!

سمند ناز پر ایک شدید تازیانہ اور لگا۔

حسن اتفاق ہی تو تھا کہ انہی دنوں کالج میں تقسیم اسناد کا جلسہ منعقد ہوا تقریب بہرملاقات، بہت امید و تمنا کے ساتھ وہ کالج پہونچی تھی۔! شاید پرانے ساتھی ملیں۔ شاید وہ چہرہ بھی دکھائی دے جائے جس کی دید کی طلب جلسے کی شرکت کا بہانہ کرکے اسے کشاں کشاں یہاں لے آئی تھی!۔

منزل خوشی برداشت کیسے کر گئیں۔ شادی مرگ کیوں نہ ہو گئیں۔؟

کسی پسندیدہ ادیب نے مسکرا کر آپ سے کوئی ادبی بات کر لی ہوگی؟ برا سا منہ بنا کر عمرانہ نے کہا۔

کسی نے نہیں۔ آج تو وہی ملے تھے!۔

شباہت صاحب!" آنکھیں پھیلا کر عمرانہ نے پوچھا۔

ہاں۔ پورے دس منٹ تک ہم نے باتیں کی ہیں!۔

بیوقوف بنا رہی ہو۔

جیسی چاہو قسم لے لو۔! انھوں نے تو اپنے گھر پر بھی بلایا ہے۔

نہیں؟۔

اب میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں؟۔

تم تو ان سے اتنی ناراض تھیں رضوانہ آپا۔!

اب اسی قدر راضی ہو گئی ہوں کہ ان کے قدموں پر جان دینے کو جی چاہنے لگا ہے۔

بھئی توبہ۔ تم نے خود کو کتنا ارزاں بنا لیا ہے۔ تمھاری بھی تو کوئی پوزیشن ہے۔ وہ اگر چرخ ہفتم پر براجمان ہیں تو کیا۔؟

عمرانہ۔ پلیز۔ نوٹ کر دو۔ میں ان کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتی!۔

تعجب ہے کہ انھوں نے تم سے سیدھے منہ بات کی!۔

کیوں!

میں خوشی باجی کی بلائی ہوئی گئی تھی۔ ان کے گھر میں عجیب سا مجمع دیکھا! عمرانہ نے کہا: تم الیاس بھائی کی بہن ماریہ کو تو جانتی ہونا۔

ہاں۔! کچھ کچھ۔!

تزئین کے پاس آگئی ہے صاحب!۔

اچھا! انھوں نے رضوانہ کی طرف نظریں اٹھائیں۔ وہ ان کے حسن کی دید میں گم تھی۔ کیسا خوبرو، کتنا پرکشش، کتنا وجیہہ آدمی ہے۔

اب میں جاتا ہوں۔ اب ضرور کسی دن آکے اپنی کتابیں لے جائیے گا وہ بیحد نرم لہجے میں بولے۔

جی! اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا: آپ سے۔ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔

فوراً کہہ دیجئے۔ مجھے جلدی ہے۔! وہ جاتے جاتے پھر رک گئے۔

آپ نے ماہنامہ سحر کا تازہ شمارہ دیکھا!۔

کیوں۔

اپنی نظم۔ مم۔ میں نے۔ آ۔ آپ کے نام۔ معنون کی ہے: ڈرتی ڈرتی وہ بولی آپ نے۔ آپ نے۔ برا تو نہیں مانا۔!

قدردانی کا شکریہ۔ پرچہ گھر جاکے دیکھوں گا۔ خدا حافظ: وہ کمرے سے نکل کر چلے گئے اور رضوانہ کو لازوال فردوسی مسرتیں بخش گئے۔

محبت کی مسیحائی کیسی عجیب چیز ہے۔ اب اسے کسی سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ نہ اپنی زندگی سے نہ شبابستہ سے اور نہ ان کے دابستگان سے۔!

اسے بے حد مسرور و شگفتہ دیکھ کر عمران نے پوچھ ہی لیا۔ عرصے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ گھر آتے ہی اس نے ان کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر پھر ریک پر سجا دیا جنھیں ردی کہہ کر ایک طرف پھینک چکی تھی۔ پھر اپنی ادھوری کاوشوں کا فائل نکالا اور پچھلے جوش و خروش کے ساتھ پرانی ڈگر پر چل نکلی۔

آج مجھے جو خوشی نصیب ہوئی ہے وہ حضرت موسیٰ کو کوہ طور کا جلوہ دیکھ کر بھی نہ ہوئی ہوگی: اس نے عمرانہ کو جواب دیا تھا: تم یہ پوچھو کہ آپا تم اتنی

لیکن اسے بہت مایوسی ہوئی۔ کالج میں اس کی کوئی سہیلی ہم جماعت نہ تھی۔ اور اتنے دنوں بعد اس کی آمد اسے خود بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی ایک شکل بھی تو شناسا نہ تھی!۔

اکتائی اور بیزار سی وہ لیڈیز روم میں بیٹھی پرانا اخبار الٹتی پلٹتی رہی۔ کمرے میں نئی نئی لڑکیاں تھیں۔ ادھر ادھر کے موضوعات پر گفتگو کرکے قہقہے لگا رہی تھیں۔

جلسہ تھوڑی دیر بعد شروع ہونا تھا۔ میگزین روم میں اساتذہ اور طلبا اکٹھا ہو رہے تھے!۔ کہیں سے دس بجتے سنائی دیے۔ لڑکیاں بھی کمرے سے نکل گئیں۔

ایک بار اس نے دیوارگیر آئینے میں اپنی شکل دیکھی!۔

آئینہ اس کا منہ چڑھانے لگا۔

یہ بھی کوئی شکل ہے۔ پچکے گال کھچتے ہوئے۔ آنکھوں سے اداسی جھانک رہی ہے لب خشک قیافہ افسردہ۔ ارمانوں۔ کیا جذبوں کی شکست چہرے سے بھی ظاہر ہوتی ہے؟۔

ایک طویل سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں سے بال برابر کیے اور کمرے سے باہر نکلی!۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کیا یونہی جاکے کسی معزز مہمان کی طرح کرسی پر رونق افروز ہو جائے گی۔ اسے اپنی سند کب لینی ہے۔ تعلیم تو ادھوری چھوڑ کے گھر بیٹھ گئی!۔

وہ بونقوں کی طرح ہال میں ایک طرف بیٹھی آنے جانے والوں کو گھورتی رہی متعدد آوازیں ایک طویل بھنبھناہٹ بن کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں قدموں کی آہٹیں تھیں۔ کبھی قہقہوں کے درمیان تالیوں کی تڑتڑاہٹ سماعت

سے ٹکرائی۔ اور پھر کرسیوں کے گھسیٹنے، دروازوں کے کھلنے بند ہونے سے معلوم ہوا کہ جلسہ اختتام کو پہونچا۔ اس نے وسیع و عریض ڈائس کی طرف دیکھا۔ پرنسپل صاحب کی موجودگی تو ضروری ہی تھی!۔

اس کا دل بیٹھنے لگا!۔ ڈائس پر کئی جانی پہچانی شکلیں تو موجود تھیں مگر جسے ہونا تھا وہی نہ تھا!۔

سب سے اخیر میں وہ باہر نکلی اور کوریڈور سے گزرنے لگی!۔ اتفاقاً اسے اپنا ایک ساتھی مل گیا!۔

"آپ بہت دنوں بعد دکھائی دیں": وہ مسکرا کر بولا: "کہاں ہوتی ہیں؟ بی، اے بھی مکمل نہیں کیا آپ نے؟"۔

"ہاں۔ وہ کچھ یا رہ گئی تھی!"

"آئیے نا۔ ادھر کرسیوں پر بیٹھیں": لڑکے نے کہا۔

"نہیں اب میں چلوں گی!۔"

"آپ شاید صرف وقت گزارنے کے لیے آئی تھیں۔"

"کچھ ایسا ہی ہے!"

"آپ کی آزاد نظم میں نے ماہنامہ تحریر میں پڑھی تھی!": وہ بولا: "اچھی لگی۔ آپ نے مشہور شاعر شاہنت صاحب کے نام اس کا انتساب کیا ہے۔ شاید آپ کو خبر نہیں کہ یہ پرخلوص نذرانہ ادبی حلقے میں کچھ چرچے کا باعث بن گیا ہے۔"

"کیا!": رضوانہ کے ہونٹ سوکھنے لگے!: "مجھے نہیں معلوم۔ کیا ہوا۔ مجھے بھی بتایئے!"۔

"ارے وہ کچھ نہیں۔ شہر پسند ذہنیتیں ہیں": لڑکے نے جواب دیا: "رائی کا پہاڑ بناتی ہیں۔"

جذبے سینے میں کلبلا رہے تھے۔ اپنی پسندیدہ ہستی کا قرب ان سے ہم کلامی کی مسرت، اپنے پہچان لیے جانے کا فخر و غرور۔ بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھ رہی تھی: "میں نے کوئی گستاخی آپ کی خدمت میں کی تھی۔ اب میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ نے اپنی تحریر اپنے دستخط مجھے نہیں دیے۔ مجھے ایک بڑی محرومی نصیب ہوئی۔ آپ نہیں جانتے۔ مجھے آپ۔ آپ کا کلام کتنا پسند ہے۔!"

جواب میں انھوں نے سگریٹ سلگایا اور چہرہ پھیر کر کش لینے لگے۔ پھر انھوں نے کھانس کر گلا صاف کیا۔

"آپ کی کتابیں۔ میرے ہاں پڑی ہیں۔ کسی دن میرے غریب خانے پر تشریف لایئے اور اپنی امانت لے جایئے!"

وہ بے حد شرمندہ ہوئی۔ شبہ سا ہوا کہ لفظ غریب خانہ کہتے ہوئے وہ مسکرائے تھے!۔ رضوانہ کی ہمت کھل گئی۔ اب وہ ماہنامہ تحریر میں چھپی اپنی نظم کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتی تھی۔ پھر انتساب کے الفاظ یاد آگئے اور ہمت جواب دے گئی!۔ شاید کالج خالی ہونے لگا تھا۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے کا شور و ہنگامہ اب مطلقاً سکوت اور سناٹے میں بدل گیا تھا!۔

شاہنت نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ رومال سے لب پاک کیے اور پھر گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔

چپراسی اندر آیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"صادق صاحب ہیں کہ چلے گئے؟"

"وہ ابھی ابھی گئے صاحب!"

"میری گاڑی۔؟"

"کسی نے اس انتساب کے معنی کچھ اور لیے ہیں کیا؟"

"ہاں۔ وہ شہریار آفندی، امتیاز اور نجمہ وغیرہ اسی قسم کی گلفشانی کر رہے تھے کہ۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے!"

"میرے خدا" رضوانہ کو چکر آنے لگا "اگر شاہد صاحب نے بھی اسی طرح اندازہ لگایا تو پھر۔۔!" وہ نیم جان ہو رہی تھی۔

"آپ شاہد صاحب سے ملیں؟"

"نہیں۔ وہ تو مجھے ڈائس پر دکھائی نہ دیے!"

"اپنے اجلاس میں ہیں۔ دسمبر ٹسٹ کے پیپرز بنا رہے ہیں شاید!"

"انھوں نے اسناد تقسیم نہیں کیں۔"

"ہاں وہ یہاں کے ایک اور صاحب تھے۔ انھیں یہاں خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ سندیں انھی نے تقسیم کیں!"

"شاہد صاحب؟"

"فرمائیے!"

"کیا اجلاس میں شاہد صاحب کے علاوہ کوئی اور بھی ہے؟"

"اردو لیکچرر مسز بخشی تھیں۔ اب کا پتہ نہیں۔ کیوں۔ کیا آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں!"

"ڈر لگتا ہے۔ نجانے کیا کچھ مجھے سننا پڑے!۔ پھر بھی جی تو چاہتا ہے۔"

"ڈر کی کیا بات ہے" شاہد نے جواب دیا اور کندھے سکوڑ کر بولا "آپ اور وہ ایک ہی برادری سے متعلق ہیں۔ شاعرہ وہ ہیں شاعر آپ ہیں۔ ان کے نام اپنی نظم کا انتساب کر کے آپ نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ ادبی دنیا میں یہ لین دین تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اچھا۔ اب میں چلوں؟"

وہ ہزار چاہنے پر بھی کچھ نہ بول سکی۔!

اب کی اس کی مشکل خود انھوں نے آسان کی۔

"کیا آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں؟"

"جی۔ جی ہاں" اس نے ہکلا کر کہا۔ سر اٹھا کر بہت ملتجی اور خوشامدانہ انداز میں انھیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے گھور رہے ہوں۔ رضوانہ کا دل حلق میں آ گیا۔ اب انتساب کرنے کی پرسش ہوگی۔ وہ کیا جواز پیش کرے گی کہ آپ اور آپ کا فن بہت اچھا لگتا تھا لہٰذا۔ نہیں نہیں۔

"جو کچھ آپ کو کہنا ہو۔ کہہ دیجیے۔" وہ پھر بولے۔ ویسا ہی سرد خشک اور حوصلے پست کر دینے والا لہجہ تھا: "میں بس دس منٹ اور یہاں بیٹھوں گا!"

"جناب۔ آپ۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں" رفتہ رفتہ وہ اپنی بدحواسی پر قابو پا گئی۔

"آپ۔ ہاں۔ ہاں آپ کے کچھ دھندلا سا یاد آتا ہے۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

"کیا اسی کالج میں پڑھتی ہیں؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر۔۔!" ان کی آواز جھنجھلاہٹ سے پاک نہیں تھی۔

"میں اپنی آنٹی مسز شکیل کے ساتھ آپ کے غریب خانے۔۔ نہیں نہیں۔ معاف کیجئےگا۔ آپ کے دولت خانے پر آئی تھی" وہ بری طرح نروس ہو گئی۔ شرمندگی کے مارے پسینے میں شرابور ہو گئی اور پیشانی پسیج گئی!۔

"اچھا اچھا۔!" انھوں نے کہا اور پھر دو گھونٹ بعد بولے "آپ وہ ہیں شاید چند غزلیں آپ لائی تھیں۔ جن پر۔!"

"جی ہاں۔ وہ میری غلطی تھی" رضوانہ قریب تھا کہ رو پڑتی۔ عجیب عجیب

کیا ؟ ،، دل کڑا کر کے رضوانہ بولی اور ہنسنے لگی ،، ان کے اجلاس تک میری رہبری نہ کیجیے گا ۔

ضرور ۔ ضرور ۔ آئیے ۔ !"

بی اے کی سند ملی ہے آپ کو شاید ۔

پچھلے سال لے چکا ۔ جلسۂ سند کرنے آ گیا تھا ۔ میں آج کل ایل ایل بی کر رہا ہوں ۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے پرنسپل کے اجلاس تک آ گئے ۔ رضوانہ پھر پاتال میں اترنے لگی ، مگر اس کے دل کی حالت کی خبر شاہد کو کہاں تھی ۔ رخصتی انداز میں اس نے سر خم کیا اور رضوانہ کو خدا حافظ کہہ کے اپنی راہ لی ۔ !

رضوانہ بانات کے کھردرے دبیز قالین پر بت بنی کھڑی تھی ! ۔ اسے ایسی طرح احساس تھا کہ اس کے پاؤں اندر رہنے والوں کو ہاتھ ڈر سے بخوبی نظر آ رہے ہوں گے ! ۔

بیرون جو صرف پرنسپل صاحب کے لیے متعین تھا ۔ اس نے رضوانہ کی مشکل آسان کی ۔ !

آپ صاحب سے ملنا چاہتی ہیں کیا ؟ ،، وہ بھی اتنا سنجیدہ اور گھٹا گھٹا سا رہا تھا کہ اسی سے وہ مرعوب ہونے لگی ! ۔

کیا نام بتاؤں اگر صاحب نے پوچھا ۔ !

صرف یہ کہیے گا کہ انتساب کے سلسلے میں ملنا ہے ! ۔

کوئی نصاب آپ کو بھی پیش کرنا ہے ! ،، بیرون نے پوچھا ۔ ابھی وہ کوئی جواب نہ دے سکی تھی کہ اندر سے پُر شور آواز میں گھنٹی بجی ۔ چپراسی جھپٹ کر اندر گیا اور دوسرے ہی لمحے باہر نکل آیا ۔

جائیے ۔ آپ کو صاحب بلا رہے ! ،، وہ بولا ،، آپ کو اس دروازے سے ہٹ کر

کھڑے ہونا تھا ! ،،

اگر رضوانہ میں اتنی جرات ہوتی تو وہ الٹے پاؤں بھاگ نکلتی اب تو کوہ نِدا کا بلاوا آ ہی چکا تھا ۔ دل ہی دل میں ہمت اکٹھا کرتی ۔ اس نے ہاتھ ڈر کھولا اور اندر قدم رکھے ۔

اتنی کھلی ہوئی روشن اور نکھری ہوئی فضا تھی کہ اس کی پلکیں جھپک گئیں ۔ وہ بدحواسی میں دیکھ نہ سکی کہ کمرے میں کون کون تھا ! ۔ وہ تو شاہد کو بھی نہ دیکھ سکی ! ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لہراتی ہوئی چل رہی ہو ۔ اس کا جسم اس کے قابو میں نہ رہا ہو ۔ ! اگر وہ خود کو نہ سنبھالتی تو یقیناً اسی جگہ ڈھیر ہو جاتی ۔

دفعتاً ایک جانی پہچانی بھاری آواز اس کے دل سے ٹکرائی ۔

" آئیے ،، !

شاید شکریہ ادا کرنے کے لیے غیر ارادی طور پر اس کے لبوں نے حرکت کی ۔ اور وہ آگے بڑھ کر ایک کرسی کی پشت پر کھڑی ہو گئی ۔

" بیٹھیے ! ،،

حالانکہ وہاں کرسیاں بہت مناسب فاصلے پر بڑے سلیقے سے رکھی تھیں مگر وہ کرسی بڑی دور پیچھے کھسکا لے گئی اور اپنے ڈولتے کانپتے جسم کو سمیٹ کر یوں کرسی پر بیٹھی جیسے کانچ کی بنی ہو ۔ ذرا سی بے احتیاطی سے کہیں درک پڑ جائے گی ۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا ۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ اپنے پرس کو یوں دبوچ رہی تھی گویا وہ کوئی پرندہ ہو اور اس کے ہاتھوں سے نکل بھاگنا چاہتا ہو

" کہیے ،، !

یہی مفاہمانہ اور اجنبی الفاظ تھے ۔ جو رضوانہ کو قتل کر دیتے تھے یا نہیں وہ ان خوبصورت لبوں سے کیا سننے کی خواہش مند تھی ! ۔

تھی۔ نوشینہ سے ملاقات اور اس بدنام بازار میں سہم کر رہ گئی پھر اس نے کچھ مشتبہ نظروں سے اسلام کو دیکھا۔ اس کی نظروں کا شکوہ سمجھ کر وہ بولا۔
" نوشینہ یہیں ہے۔ اس تلخ حقیقت کو قبول کر کے آگے بڑھو " وہ آگے بڑھا اور شبینہ بھی اس کے ساتھ نفیسی بیگم کی حویلی میں داخل ہو گئی جہاں پہلے ہی سے اس کی آمد کی اطلاع تھی۔ نفیسی بیگم نے دیوان خانے میں ان کا استقبال کیا اور پھر دونوں کو لیے ہوئے نوشینہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

شبینہ خواب گاہ میں داخل ہوئی اور نوشینہ کے روپ میں بستر پر ہڈیوں کا ایک پنجر دیکھا وہ بے اختیار " آپا " کہہ کر لپٹ گئی۔ نوشینہ کا کمزور و لاغر جسم لرز رہا تھا کانپ رہا تھا اس کی آنکھوں نے سب کے دل ہلا دیے شبینہ بہن کو اپنی بانہوں میں سمیٹے بے اوسان رو رہی تھی۔ اور اسی کے ساتھ وہ نوشینہ کے چہرے، سر، گردن کو بار بار پیار کرتی جا رہی تھی۔ نفیسی بیگم کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ اتنی محنت سے تراشا ہوا ہیرا یوں چور چور ہو کر اس کے ہاتھ آئے گا۔

" آپا بہنا میری آپا بہن بتاؤ... بتاؤ کس ظالم نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے وہ کون بدبخت بدباطن تھا جس نے میری پھول سی بہن کو یوں روندا ہے۔ وہ خباثت کا پیکر نحوست کی علامت دوزخی عفریت... اس کا نام بتاؤ آپا بہن اس کا نام بتاؤ میں اس کی کھال کھنچواؤں گی اس کے جسم کا ایک ایک تار نچواؤں گی اسے زندہ زمین میں دفن کر دوں گی بتاؤ بتاؤ... خدا کے لیے...

کمزوری اور ملاقات کی خوشی اور اپنی بربادی کے خیال نے نوشینہ پر غشی سی طاری کر دی۔ اسلام خان نے شبینہ کو اس سے الگ کیا اور اس کا سر تھپتھپا کر بولا " شبینہ یاد رکھو انتقام لینے والا خود بھی اسی آگ میں جل مرتا ہے

پانچویں قسط

تیری ذہانت اور دوراندیشی کے ہم قائل ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ تیری کارکردگی ہمارے مستقبل کے لیے بڑے فاتحانہ منصوبے بناتی ہے۔ یقیناً تو ہمارے لیے مخلص ہے ورنہ وہی بات کیوں سوچتا جو ہم سوچ رہے ہیں۔ عنقریب ہم سانپ کا شکار کریں گے۔ اگرچہ ہمارا بھتیجا ہمایوں خان ایک عیاش طبع بدکار نوجوان ہے مگر وہ ناصر الدین جیسے باپ کا بیٹا بھی ہے "
" ایک بات اور عرض کرنی تھی " شبینہ سر جھکا کر بولی۔
" ہم سن رہے ہیں " وہ سنجیدگی سے بولا۔

فیروز شاہی غلام بھی انسان ہیں اور لغزش کرنا انسان کی ازلی صفت ہے۔ میں پھر بھی شرمسار ہوں یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے گروہ کا ایک بدبخت شخص ایسا بھی ہے جو تمہارے لیے ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے "

ابوبکر شاہ نے چونک کر شبینہ کی طرف دیکھا۔ جہاں شرمندگی بہت واضح تھی اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری وہ آہستہ سے بولا " وہ کون ہے جس نے ہماری ہمدردی اور دلجوئی کی بھی قدر نہیں کی اور تیرے ایثار کو بھی نظرانداز کر دیا "

ایک ایسا انسان جو انسانیت چھوڑ چکا، خودغرضی اور حرص و ہوس نے جسے بے بس کر رکھا ہے۔ عقل و شعور اس سے کوسوں دور جا چکے ہیں " وہ افسردگی سے بولی۔

" تو پھر اسے فیروز شاہی کیوں کہہ رہی ہے، شیطان کہہ وحشی کہہ درندہ خونخوار کہہ اسے انسان کیوں کہتی ہے "

شبینہ خاموش رہی تو اس نے پھر پوچھا " اس بدبختی کا کوئی خاص سبب؟ "
" میری اپنی ہی ذات " شبینہ آہستہ سے بولی۔

ہوں۔ ابو بکر شاہ نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھ کر ہنکارہ بھرا
تیرے ذہن میں اس کا علاج کیا ہے؟"
"ابو بکر شاہ۔ میں اگرچہ عورت ہوں جسے صنف نازک کہا گیا ہے لیکن میرا
دل بدکردار مردوں کے لیے پتھر کا ہے۔ نیکی کو برقرار رکھنے کے لیے پختہ ارادوں
اور اٹل یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں صرف نیک اخلاق پر یقین رکھتی ہوں
اس لیے کہ بدکردار و بددین لوگوں کو سزا دینا میرے مذہب میں لازم و
ملزوم ہے۔"
"ٹھیک کہا تو نے۔ اخلاقی زوال ذلتوں کا باعث ہوتا ہے" ابو بکر شاہ
نے تائید کی۔
"ہمارے آباؤ اجداد نے عزتوں کی حفاظت کے لیے مرنا اور جینا مقرر کیا
تھا۔ لیکن ہر شاہی گروہ کے لوگ ذلت کی زندگی سے نفرت کرتے ہیں اور
اس پر موت کو ترجیح دیتے آئے ہیں۔ آدم خان نے اگر بزرگوں کی عزت
اور ناموس کو بھول کر ذلالت کو اپنے لیے پسند کر لیا ہے تو میں ایسا نہیں
ہونے دوں گی۔ اس کی اپنی اور اپنے گروہ کی بھلائی کی خاطر اسے گرفتار
کر لیا جائے۔ یہ میری التجا ہے۔"
ابو بکر شاہ نے تعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک
ملکوتی وقار تھا۔
"کیا یہ تیرا قطعی فیصلہ ہے؟"
"یقیناً۔ عزت و آبرو اپنی ہو یا دوسرے کی اس سے کھیل کرنے والا اللہ
اور رسول کا مجرم ہے اور اس کی سزا انھوں نے ہی مقرر کی ہے۔ اس کے
علاوہ احسان فراموش بھی قابل سرزنش ہے۔ اس نے تم جیسے محسن سے

شبینہ اپنی بہن سے جنگل میں بچھڑی تھی اور پھر دونوں ہی ایک دوسرے
سے بے خبر رہی تھیں۔ اب ایک طویل عرصے بعد اسے بہن کی خیر خبر ملی تھی۔ وہ جلد
سے جلد شبینہ سے ملنا چاہتی تھی اسے اپنے انتقام کی داستان سنانا چاہتی
تھی اور اس سے سننا چاہتی تھی۔ اس نے فوراً ہی بہن سے ملنے کے لیے جانے
کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے لیے تحفہ تحائف لیے۔ کچھ قلمی مخطوطے منگوائے
نئے لباس سلوائے اور جمعہ کے روز جانے سے چند گھنٹے قبل ابو بکر شاہ کو بھی
اطلاع کر دی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا دل غیر معمولی طریقہ سے دھڑک
رہا تھا اور وہ کچھ بے چین و مضطرب سی ہے۔ بمشکل تمام وقت گزرا اور اندھیرا
پھیلتے ہی اسلام خاں نے اپنی آمد کی خبر بھجوائی۔ اس نے کنیز کو تمام سامان
دے کر بھیجا اور خود چادر سے جسم کو ڈھانک کر باہر آگئی۔ جہاں پہلے ہی
سے ایک سواری تیار کھڑی تھی۔
"میری آپا بہن کیسی ہیں۔؟" شبینہ نے بیٹھتے ہی اسلام خاں سے سوال کیا
"تم وہیں چل رہی ہو خود ہی دیکھ لینا۔"
"تمھیں ان کا پتہ کیسے چلا۔؟" وہ ابھی تک بے چین تھی۔
"جب تک وہ خود پوشیدہ رہی، ہم بھی بے خبر رہے۔ جب اس نے چاہا
مجھے اور تمھیں ڈھونڈ لیا۔ اس بات کا تعلق خود اسی سے ہے۔" اسلام خاں کے
لہجہ نے شبینہ کو خوفزدہ کر دیا اس نے اسلام خاں کا ہاتھ تھام لیا "سچ سچ
بتاؤ میری آپا بہن کو تم نے کس حال میں دیکھا ہے وہ کہاں ہیں۔؟"
"ہم شاید پہنچ چکے ہیں۔" اسلام خاں نے غنیس کی سست رفتار سے
اندازہ کیا اور پھر اس کے رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا "آؤ شبینہ
سے ملنے چلو" شبینہ نیچے اتری اور ادھر ادھر دیکھا وہ ایک نامانوس جگہ میں کھڑی

تو نے ایک سپاہی کو پسند کیا ہے اور ہم ایک سپاہی بن کر تجھ سے وعدہ کرتے ہیں اپنے ان ہاتھوں کے سایہ میں تجھے زندگی کی ہر مسرت بخشیں گے۔"

شبینہ مسکرائی اور بولی: "آج سے میں تمہارے ان ہاتھوں کو مسکول کا نام دے رہی ہوں۔ یعنی میان سے باہر تلوار۔ اور تم نے ان ہاتھوں سے میری حفاظت کا وعدہ کیا۔ بادشاہوں کا کردار ان کی اپنی شان اور اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے اور سپاہی دوسروں کے لیے جیتا اور مرتا ہے، رسول اللہؐ نے مسلمان کو سپاہی بن کر رہنے کی تلقین کی ہے بادشاہ بن کر نہیں۔ کیونکہ بادشاہت جاسکتی ہے شجاعت نہیں۔"

ابوبکر شاہ نے انتہائی پیار سے اس کا سر تھپتھپایا اور بولا۔ "ہم تجھے اپنی شریک زندگی بنا کر فخر محسوس کریں گے ہم چاہتے ہیں کہ جشن فتح سے پہلے نکاح کریں تا کہ تو ہماری ہر خوشی میں برابر کی شریک رہے۔"

شبینہ نے آہستگی سے سر جھکا دیا۔ اس کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ تھی۔

•

شبینہ نے اسلام خاں کے پیغام کو ایک بار نہیں بار بار پڑھا اور ہر بار نوشینہ کے ذکر نے اس کا دوران خون بڑھا دیا۔ اپنی بہن کو دوبارہ دیکھنے اور ملنے کا تصور بڑا روح افزا تھا۔ وہ خوشی سے بےحال ہوئی جا رہی تھی۔ اسلام خاں نے اسے اطلاع دی تھی کہ "اس نے نوشینہ کو ڈھونڈ لیا ہے۔ بلکہ نوشینہ نے خود اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ نوشینہ سے ملاقات سے محسوس ہوا کہ وہ ہم سب سے ملنے کے لیے بے حد بے قرار تھی اور خصوصی طور پر وہ تمہارے لیے تڑپ رہی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے کچھ فکرمند بھی ہے، میں پرسوں صبح کے روز مغرب کے بعد آؤں گا تمہیں لینے، تم تیار رہنا۔"

بے وفائی کی بات سوچی ہے۔ دنیاوی قوانین کے تحت بھی اسے سزا دینا لازم ہے۔ تا کہ آئندہ کوئی فیروزی غلام ایسی بات وہم و گمان میں بھی نہ لائے۔"

ابوبکر شاہ نے ایک تشکرانہ نگاہ شبینہ پر ڈالی اور نرمی سے بولا۔ "تیری حق گوئی کے ہم معترف تھے لیکن تیری منصفی کی ترازو کو ہم نے بڑا اعلیٰ معیار کا پایا۔ تیرے فیصلے بڑے جامع ہوتے ہیں اور تیرے انصاف سے نہ اپنا بچ سکتا ہے نہ غیر۔ یہی بات تجھے اوروں سے افضل بناتی ہے۔ اور تو لائق صد احترام بنتی ہے۔"

شبینہ نے فخر سے خم ہو کر شکر گزاری کا سلام پیش کیا اور بولی "وہ انصاف ہی کیا جو اپنے کو دیکھ کر جھک جائے۔ حدیث رسول موجود ہے کہ خون ناحق کرنے والے کو سخت ترین سزا دو اور فرمان الٰہی ہے کہ بدکار کو سنگسار کر دو۔ ناصرالدین شاہ سے ذاتی انتقام لینا میرا مقصد نہیں تھا بلکہ اسے یہ جتانا ہے کہ تو مسند بادشاہت پر بیٹھا تو مگر اسوۂ رسول کو بھلا دیا۔ تو پھر اقبال و نصرت کیسے پائے گا اور آدم خاں نے مجھ پر حسرت بری نظر ڈالی ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ اس کی دسترس سے باہر ہوں لیکن اس کی اس خبیثانہ فطرت کا شکار کوئی بھی دوشیزہ ہو سکتی ہے۔ یہاں پھر ہمیں اللہ تعالیٰ کے اشارے کو دیکھنا ہوگا۔ بس جب تک ہم اللہ اور رسول کی پیروی کرتے رہیں گے حق گو اور منصف رہیں گے خیر اور برکت پاتے رہیں گے۔"

"جزاک اللہ۔ مرحبا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نیک، تیری ذات زندگی کی ارفع و اعلیٰ حقیقتوں سے واقف ہے اور ان سے دوسروں کو روشناس بھی کراتی ہے۔" ابوبکر شاہ کی زبان سے بےساختہ تعریف نکلی۔

ابوبکرشاہ چونک پڑا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ شبینہ کے ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ تھی۔

"اگر تیرا سوال سنجیدگی سے ہے تو بخدا ہم تیرے دل کے حال سے واقف نہیں۔ کیا تو کسی اور کو منتخب کر چکی ہے؟"

"جی ہاں ۔!"

"کون ہے وہ خوش بخت ۔؟"

"ایک سپاہی ۔!"

ابوبکرشاہ کی آنکھوں میں صرف حیرت و استعجاب تھا۔

"میں حقیقت بیان کر رہی ہوں ابوبکرشاہ۔" شبینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "ایک سچا سپاہی اپنے عوام کا صحیح محافظ ہوتا ہے۔ بہادری اور جاں نثاری اس کے وصف عالیہ ہوتے ہیں۔ غیرت و شجاعت اس کی پہچان ہوتی ہے۔ اور یہ اوصاف اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں سے مجھے کبھی کوئی رغبت اور اُنس نہیں رہا۔ میں نے اپنے لیے ایک اعلیٰ کردار، وسیع النظر اور بہادر سپاہی کو منتخب کیا تھا۔ آج وہ بادشاہت حاصل کر چکا ہے لیکن میں اسے اپنے لیے وہی سپاہی سمجھتی ہوں جیسا کہ ابوبکرشاہ سپاہی بن کر میرا ہاتھ تھامنے آیا تھا۔"

ابوبکرشاہ خوشی سے بے اختیار سا ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور شبینہ کے قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولا "تیری بلندی فکر کو کوئی نہیں پا سکتا۔ شبینہ ہم تیرے ہیں اور صرف تیرے ہیں۔ ہر حیثیت سے۔ لیکن تیرے احساسات کی پاسداری کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم تیرے سامنے اس وقت بحیثیت شہنشاہ ہوتے تو تجھے زند جواہر سے تولتے، تجھ پر سرداریں نچھاور کرتے تیرے جسم کو موتیوں سے سجاتے لیکن

اگلے چند دنوں ہی میں ابوبکرشاہ نے بہت خاموشی سے آدم خاں کو گرفتار کر کے دارالسلطنت ہی کے ایک گمنام قید خانہ میں ڈلوا دیا اور پھر سمانہ پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں خاں جسے پہلے ہی یہ خدشہ تھا اپنی فوج لے کر سمانہ سے باہر پہنچ چکا تھا۔ اس کی فوج نے سمانہ سے نکلتے ہی دہلی کے آس پاس کے ہر قصبے اور شہر کو خوب لوٹا۔ برباد کیا۔ باپ کی شکست سے جھنجلایا ہوا شہزادہ فی الحال اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، جیسا حکمراں ہوگا ویسی ہی فوج ہوگی۔ اس کے سپاہیوں نے بھی اس لوٹ مار میں سرعام عورتوں کی عزتوں کو لوٹا اور داد عیش دیتے ہوئے پانی پت کے قریب جا پہنچے جہاں ابوبکرشاہ کی فوج اسی دن پہنچی تھی۔

جسے ملک شاہین جیسا زیرک سپہ سالار کمان کر رہا تھا۔ پانی پت میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ باپ کی شکست سے گھبرایا ہوا شہزادہ ابوبکرشاہ کی فوج کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔ ملک شاہین نے زبردست اور منظم طریقہ سے حملہ کیا اور ہمایوں شاہ کی فوج پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ اپنی فوج کی پسپائی دیکھ کر بزدل شہزادہ بھاگ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اس کی فوج بکھر گئی۔ جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگا۔ ایسی افراتفری مچی کہ ملک شاہین کو اپنی فوج کو واپس بلا لینا پڑا۔

ابوبکرشاہ اس معرکہ میں بھی کامیاب رہا۔ اس کا اعتقاد شبینہ پر پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کا ہر مشورہ اس کے حق میں مفید ثابت ہوا تھا اور ہر اطلاع صحیح اور بروقت پہنچی تھی۔ وہ شبینہ کو اپنے لیے تحفۂ خداوندی سمجھنے لگا تھا جس کی آمد نے اس کی شکست کو فتح میں بدل دیا تھا اور اس کا زوال پذیر نصیب مائل بہ پرواز تھا۔ دوسری طرف شبینہ وقت اور ماحول سے بے نیاز ہو کر اسلام خاں کے ذریعہ ناصرالدین شاہ کے راز حاصل کر کے دو محاذوں پر اس کو شکست دے چکی تھی۔ وہ ناصرالدین کا سکون و چین چھین چکی تھی۔ اس کا اطمینان اور اعتماد

[illegible] خوشی اور شکر کے جذبات سے دیکنے لگا وہ بولی۔ ابو بکر شاہ قسم ہے خدائے لایزال کی مجھے اپنا دل کی آج بھی اور روز محشر بھی کہ تم نے میرے ساتھ ہر حال میں عادلانہ عمل روا رکھا۔ وہ نیک عمل جس نے دکت اور ماحول کو دیکھے بغیر مجھے پاکیزہ زندگی دی۔ خلوت اور جلوت میں رب کعبہ سے ڈرتے رہے تم اللہ و رسول کی محبت میں اگر مجھے حکم دینا پسند نہیں کرتے تو میں بھی عظمت کوئی کے تحت تمہیں اس پر مجبور نہیں کروں گی۔ لیکن میرے محسن میری احسان شناسی اس بات کی اجازت بھی نہیں دے گی کہ تم مجھ ناچیز کے سامنے در خواست پیش کرو۔

ابو بکر شاہ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ تیری اعلیٰ ظرفی کی قسم کھا سکتے ہیں ہم شبینہ تو نے ہماری عنایات اور قدر افزائی سے تکبر اختیار نہیں کیا حفظ مراتب کے احساس کو فراموش نہیں کیا ہم تجھ سے اپنے دل کی خواہش کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔

میں ہمہ تن گوش ہوں۔ شبینہ نے سر جھکا لیا۔

شبینہ۔ ابو بکر شاہ ایک لمحہ رکا۔ تو اولو العزم والدین کی بیٹی ہے بلند کردار ہے، باعصمت ہے، مضبوط ارادوں کی مالک ہے۔ حالات کے تحت ثابت قدم ہے وفا شناس گروہ سے تعلق رکھتی ہے، عالمہ ہے، فنون حرب سے واقف ہے۔ ایک حکمران کی شریک حیات میں کیا یہی سب خوبیاں ہونا ضروری نہیں ہیں؟ ہم تجھ سے معلوم کرتے ہیں۔

شبینہ نے نگاہ اٹھائی اور جھکالی۔ ایک شہنشاہ کے لیے شریک حیات میں جن خوبیوں کی ضرورت تھی وہ تمہیں مجھ میں مل گئیں لیکن ان معاملات میں کیا میری رائے اور [illegible] کا کوئی دخل نہیں ہوگا؟ جبکہ اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے۔

ختم کر چکی تھی اور پے بہ پے حملے کر کے اسے خوفزدہ کرنا چاہتی تھی۔ ابو بکر شاہ کو پہلے تو اس نے محض مہرہ بنا کر استعمال کرنا شروع کیا تھا اور ابو بکر شاہ نے اسے باکمال دوشیزہ سمجھ کر قدر کی تھی لیکن رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے خلوص، سادگی، قدر دانی اور خیر خواہی کے اسیر ہوگئے۔

●

ہمایوں خاں شکست کھا کر اپنی فوج کو چھوڑ کر بھاگا اور سیدھا ساد پہونچا اس پر خوف و وحشت غصہ اور جھنجلاہٹ سوار تھی۔ وہ سیدھا اپنے محل میں پہنچا اور سب سے پہلے شراب منگوائی اور جام پہ جام چڑھاتا رہا وہ جنگ اور میدان جنگ کا ہر لمحہ فراموش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نوشینہ کو طلب کیا۔ کنیز گئی اور آکر بتایا کہ وہ بیمار ہے اور اس وقت حاضری سے معذور ہے۔ شہزادے کو یقین نہ آیا وہ اسے بہانہ سمجھ کر خود ہی نوشینہ کی محلسرا میں جا پہونچا۔ اس نے دیکھا نوشینہ واقعی بخار میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ شدت تکلیف سے سرخ ہو رہا تھا خادمائیں اس کے تلوے سہلا رہی تھیں۔ ہمایوں خاں کا شکست خوردہ دماغ اس وقت ایسی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ فوراً واپسی کے لیے مڑ گیا۔ نوشینہ نے آنکھیں کھولیں اور ہمایوں خاں کو بغیر کچھ کہے واپس جاتے دیکھا اس کا دل صدمے اور بیماری سے پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ شہزادے کی بے اعتنائی نے چور چور کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

ہمایوں خاں اپنے محل میں واپس آیا اور کنیزوں، رقاصاؤں اور ساقیوں کو بلا کر اپنا غم غلط کرنے میں لگ گیا۔ بیک وقت شراب نوشی عیاشی اور رقص و سرود کا ہنگامہ برپا تھا۔ ہمایوں خاں کو نہ یہ احساس تھا کہ نوشینہ بیمار ہے نہ تسلی دلاسے کی پرواہ تھی اسے ہر وقت شراب اور شباب کی ضرورت رہتی تھی

اور اسی چیز نے اسے بزدل اور کمزور بنا دیا تھا۔ وہ خلاف مزاج ماحول یا سخت
حالات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت کو کھوتا جا رہا تھا۔ میدان جنگ کا تصور اسے
لرزا کر رکھ دیتا تھا۔ خوشامدی لوگوں نے اسے اور بھی بے حیا بنا دیا تھا۔

کثرت شراب نوشی اور حد سے بڑھی ہوئی عیاشی نے امراض خبیثہ کی صورت
میں ہمایوں خاں کو گھیر لیا۔ کمزوری اور تکلیف کے باعث وہ محل ہی تک محدود
ہو کر رہ گیا۔ ہمت و مردانگی اس میں مفقود ہونے لگیں، ذہنی طور پر بھی وہ مختل
سے حواس کا ہو گیا تھا۔ اسے نوشینہ یاد آتی تھی مگر وہ اس تک جانے کی ہمت کھو
چکا تھا۔ نوشینہ بھی مستقل بیمار رہتی تھی اس کا حسن ماند پڑتا جا رہا تھا خوبصورت بدن
مرجھایا ہوا گلاب بن کر رہ گیا تھا اسے اکثر بخار رہتا اور جب اس نے ہمایوں
خاں کے پاس علاج کی درخواست بھیجی تو اس نے اپنے خاص طبیب کو بھجوا دیا
اور اسی دن نوشینہ پر یہ بھیانک حقیقت کھلی کہ اسے بھی شہزادے کے امراض
لگ چکے ہیں۔ اس دن وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ وقت اس کے ساتھ اتنا
سنگین مذاق کرے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ غلط انتقام کی
آگ نے اس کے جسم و جان کو گھن کی طرح کھا لیا تھا۔ نوشینہ کے دل میں سناٹے
سے تیر رہے تھے اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں وہ سارا دن اپنی
خوابگاہ میں پڑی روتی رہی۔ آج اسے شبینہ بھی بہت یاد آئی اور ماں باپ کا
خیال بھی رہ رہ کر اس کے دل کو مسلتا رہا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں
انتقام کا جوش نہ تھا بلکہ آنے والے دنوں کا خوف اور اپنی ناکامی کا احساس
تھا۔ بیماری، بے بسی، تنہائی اور کسمپرسی کی حالت میں اسے اسلام خاں
کی چاہت اور سرپرستی کی آرزو ہونے لگی۔ دل کا ہر کونا اسلام خاں کو بلا رہا
تھا اس نے بس ایک ہی دعا مانگی خدایا تو اسلام خاں اور شبینہ کو خوش رکھنا

کروائی تو شبینہ کو حیرت ہوئی کہ اتنی صبح وہ کیوں آ رہا ہے۔ نماز فجر کے بعد وہ تھوڑا
آرام کرتا تھا۔ بہرحال شبینہ نے تلاوت ختم کی اور قرآن مجید کو اٹھا کر طاق پر
رکھ دیا اور نشست گاہ میں پہنچ گئی۔ شبینہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد تلاوت
اور حدیث کا مطالعہ کرتی۔ اس وقت اس کا لباس ہمیشہ سادہ اور سفید ہوتا
۔ کچھ ہی دیر بعد ابوبکر شاہ آ گیا۔ شبینہ نے سفید دبیز ریشم کا لباس پہن رکھا
تھا ہر قسم کے سنگھار سے بے نیاز چہرہ پر ایمان اور پاکیزگی کا نور چھایا ہوا تھا۔
ابوبکر شاہ نے اسے دیکھا اور اس کے جمال و نور کو دیکھتا رہ گیا۔ تلاوت کلام پاک
اور مطالعہ حدیث نے اس کے چہرے پر بیک وقت پر عظمت جلال اور پرجمال
نرمی پیدا کر دی تھی۔ شبینہ نے قدرے جھک کر صبح کا سلام پیش کیا۔ ابوبکر شاہ
نے دعائے صبح دی اور بیٹھ کر بولا: "ہم تیرے پاس ایک درخواست لے کر آئے تھے"
"ایک شہنشاہ کو درخواست گزارنا زیب نہیں دیتا۔ تم مجھے حکم دے سکتے ہو
ابوبکر شاہ۔"

"نہیں۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ حکم دینے کے لیے تو اس وسیع دنیا میں
ہمارے لیے بہت انسان ہیں۔ لیکن تیرے سامنے ہم نے خود کو کبھی بھی شہنشاہ نہیں
سمجھا کیونکہ تو نے پہلے ہی دن اپنی شجاعت اور دیانت سے ہمیں مسخر کر لیا تھا۔ اگر
تو صرف خوبصورت حسینہ ہوتی تو ہم صرف عاشق ہوتے اگر تو فنون سپہ گری میں ماہر
ہوتی تو ہم ایک سپاہی کی حیثیت سے تیری عزت افزائی کرتے۔ لیکن تو ان تمام اوصاف
کے ساتھ قرآن، حدیث اور فقہ کی عالمہ ہے یعنی اللہ و رسولؐ سے قربت رکھتی ہے
ہم اس دنیا کے ایک ذرا سے حصہ کے حکمران ہیں ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ جس نے
ہمیں یہ سب کچھ عطا کیا اس سے محبت رکھنے والی پر حکم چلا کر رب العالمین
اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے منفعل اور شرمندہ ہوں۔"

نوشینہ کے دل میں اترتی جا رہی تھیں اور سارے بھید کھول کر نکال رہی تھیں۔
نوشینہ نے ایسا ہے آنکھیں بند کرکے گویا سب دروازے بند کر دیے۔ نیفی بیگم کے چہرے
پر ایک بھیگی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کر نوشینہ کے پہلو میں آ بیٹھی اور اس کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی: "تو میرے ہاں اجنبی بن کر آئی تھی اور ہمیشہ اجنبی ہی
رہی۔ تیری کسی بھی مصلحت کے سامنے میں کبھی کچھ نہیں بولی۔ مگر آج میں بہت کچھ کہنا
اور تجھ سے سننا چاہتی ہوں:"

نوشینہ نے آنکھیں کھولیں۔ اور ویران نظروں سے نیفی بیگم کو دیکھا۔ نیفی بیگم
کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ نیفی نے ہمیشہ خود کو پتھر کا
سمجھا تھا۔ لیکن تو وہ پانی کی بوند بن گئی جو پتھر میں سوراخ کر دیتی ہے۔ بیٹی۔
میں نہیں جانتی کہ میں نے تیرے اوپر کوئی احسان کیا ہے یا نہیں لیکن تو نے اس
کو اگر احسان سمجھا ہے تو اس کا صلہ بھی اس فراخ دلی سے دیا کہ میرا سر تیرے
سامنے جھک گیا ہے۔ میں خوش تھی تیری داد و دہش دیکھ کر کہ میرا شاہکار شاہی
محلات میں سجا ہوا ہے لیکن آج تیری حالت مجھے نادم کر رہی ہے اور میرا دل
رو رو کر کہہ رہا ہے کہ نیفی تو نے شیشہ کے دل کو پتھر کی حفاظت میں دیا تھا اگر
تو صرف آج کے لیے مجھے اس بالا خانے کی مالکن نیفی بیگم نہیں بلکہ ایک عورت سمجھ
لے جس کے سینہ میں دل ہوتا ہے اور دل میں محبت کے سوتے ہوتے ہیں تو مجھے اپنے بارے
میں سب کچھ بتا دے۔ میں آج بھی نہیں جانتی کہ تو کون ہے اور کہاں سے آئی ہے
مگر بے ہوشی میں تو نے بار بار کسی اسلام خاں کو پکارا تھا۔ اس کی مضبوط پناہوں
کو آواز دی تھی، مجھے بتا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

•

ابو بکر شاہ نے نوشینہ کو پھول اور خوشبوجات بھیج کر حسب روایت اپنی آمد کی اطلاع

دو تین روز کے بعد اس نے خود ہی ہمایوں خاں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا
اور بمشکل تمام وہ لرزتی کانپتی ہمایوں خاں کے محل میں پہونچ گئی۔ دیوان خانہ
میں ہمایوں خاں لیٹا ہوا تھا۔ دو کنیزیں اس کی پنڈلیاں دبا رہی تھیں ایک
سر سہلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور جسم لاغر۔ نوشینہ کو دیکھ کر
اس نے سب کنیزوں کو دیکھا اور پھیکے دل سے مسکرایا۔ نوشینہ آ کر اس کے
قریب بیٹھ گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ہمایوں
خاں نے اس کا اشارہ دیکھا اور بولا: "تجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ ان کے جانے کی
کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بیمار ہوں یہی میری خدمت کرتی ہیں۔" نوشینہ
کا چہرہ شرم و ندامت سے جھک گیا اور کنیزیں طنز سے مسکرانے لگیں۔ نوشینہ
کو شہزادے سے اتنی بے رخی کی امید نہیں تھی۔ وہ کچھ ناگواری سے بولی۔
"ہمایوں خاں تم نے میری بہار کو لوٹ کر میرے وجود کو خزاں رسیدہ بنایا
ہے۔ لیکن مجھے کمتری کا احساس تو نہ دلاؤ۔ کیا اس وقت میں تمہاری
محبت و پیار اور دلجوئی کی مستحق نہیں ہوں؟"

"ہم تیرے لیے کیا کر سکتے ہیں اس وقت تو ہماری اپنی ذات گرداب میں پھنسی
ہوئی ہے۔ ہم خود سہاروں کی تلاش میں ہیں۔ چہار طرف سے شکست کھا چکے
ہیں۔ نجانے کب ابو بکر شاہ نیست و نابود کرنے یہاں پہنچ جائے:"

جو مرد عورتوں کے سہارے زندگی گزارتا ہے وہ اسی طرح برباد ہوتا ہے۔
"نوشینہ انتقام بھول کر اپنی ذات کی بربادی پر شکوہ کناں ہو گئی۔

"تجھے کوئی حق نہیں ہے ہمیں کچھ کہنے کا۔ تو ایک طوائف کا تحفہ تھی جسے ہم
نے اسی طرح استعمال کیا جس طرح کہ ہمارا حق تھا:" شہزادہ بگڑ کر بولا۔
"تم نے مجھے تحفہ سمجھ کر قبول کیا تھا تو اس کا حق تو ادا کرتے۔"

وہ لڑکی تو ہم سے بچاؤ کر رہی ہے۔ وہ تیوری چڑھا کر بولا۔ ہم نے تیری جو قدر اور عزت افزائی کی ہے وہ تجھے اور کہاں مل سکتی تھی۔ یہ مت بھول کہ ہم ہمیشہ ہی حسن و جمال اور رنگ و نور میں ڈھلی جوانیوں کے درمیان رہے ہیں۔ لیکن ہم ہر کسی کو گلے کا ہار تو نہیں بنا سکتے۔"

نوشینہ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ وہ خاموش نگاہوں سے ہمایوں خان کو دیکھے جا رہی تھی جہاں اجنبیت ہی اجنبیت تھی۔ ہمایوں خان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر بولا: "تو چاہے تو کسی اپنے قریبی جا لکار کے ہاں واپس جا سکتی ہے۔" ہمایوں خان۔ نوشینہ چیخ کر بولی میں اپنے سارے رشتوں کو ختم کر کے آئی تھی۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ ....

"ٹھہر جا.... شہزادہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تیری چیخ پکار سے ہماری طبیعت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ ہمیں تجھ سے نہ شکوہ ہے نہ شکایت مگر ہم بھی بیمار ہیں اور تو بھی، جا محل کے کسی گوشے میں جا کر اس وقت کا انتظار کر جب کوئی اور آ کر تیری زندگی کو رنگین بنا سکے۔ جا چلی جا.... ہمارے پاس نہ اب صحت ہے نہ موافق حالات" نوشینہ کو ان ساری باتوں نے لرزا کر رکھ دیا۔ اس کا سر چکرایا اور جسم کانپنے لگا اس نے لڑکھڑاتی زبان سے اتنا ہی کہا" ہمایوں خاں میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں شدید نفرت ...." اور پھر وہ اپنے وجود سے بے خبر ہو گئی۔

•

نوشینہ کو ہوش آیا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ محل تھا نہ محلسرا نہ خادمائیں نہ کنیزیں۔ وہ ایک سادہ سے دیوان خانے میں لیٹی ہوئی تھی اور فیضی بیگم اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف سوال ہی سوال تھے فیضی بیگم نے اپنی زندگی میں سیکڑوں کو دے کہے تھے [illegible] اور دیکھا تھا جو

منافع ہوتا تھا وہی اس کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب کسی لڑکی نے اس سے دور ہونے کے بعد بھی اس کا اس قدر خیال رکھا [illegible] مالا مال کر دیا تھا۔ نوشینہ نے جتنا عرصہ ہمایوں خاں کے پاس گزارا وہ اسے تحفے تحائف، نقدی اور زر و جواہر بھیجتی رہی، احسانمندی کا یہ احساس فیضی کے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ متعجب تھی کہ یہ کس قماش کی لڑکی ہے جو اس کی خدمات کا صلہ بے حساب دیے جا رہی ہے۔

"میں کہاں ہوں۔؟" نوشینہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"تو میرے پاس ہے.... میرے گھر میں.... یا شاید.... اپنے گھر میں!" فیضی بیگم نے رک رک کر کہا۔

"میں یہاں کیوں ہوں۔؟" نوشینہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔

فیضی نے اسے پھر لٹا دیا اس کا جسم کانپ رہا تھا ہونٹ خشک تھے۔ فیضی نے نرم ہاتھوں سے اس کا سر سہلایا پانی پلایا اور بولی" وہ خادماؤں کے ساتھ ہمایوں خان کے آدمی تجھے لائے تھے اور یہ کہہ گئے ہیں کہ اب تو یہیں رہے گی"۔ فیضی نے سچ بولنا ضروری سمجھا۔ کچھ رک کر اس نے نوشینہ کو روتے دیکھا اور افسردہ ہو گئی" جتنا رو سکتی ہو رو۔ تیرا رونا بالکل برحق ہے، خوب رو دنیا کی بے ثباتی پر بھی رو اور انسان کی سنگدلی پر بھی رو، اور عورت کے ان مجبور لمحات پر بھی رو جو اپنے دیوان خانے سے کوٹھے پر پہنچاتے ہیں۔ اور کوئی بچانے والا نہیں ہوتا"

اتنا کہہ کر فیضی باہر نکل گئی۔ اور نوشینہ بڑی حالات کا ماتم کرتی رہی۔

سہ پہر کے قریب خادمہ نے نوشینہ کو دودھ پلایا اور اسی وقت دوبارہ فیضی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نوشینہ اب خاموش تھی۔ تقدیر کے اس کھیل نے اس کی گویائی سلب کر لی تھی۔ فیضی بیگم اس کے چہرے کو بغور پڑھ رہی تھی اس [illegible]